www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول
مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حماد

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

عکس — عمیرہ احمد 18
زندگی — ناہید سلطانہ اختر 108

مکمل ناول

روشن جگنو اور جل پریاں — عنیزہ سید 142

ناولٹ

کوئی شہر ایسا بساؤں میں — نگہت سیما 68
لاپتا — نمرہ احمد 194

افسانے

حصارِ محبت — عقیلہ حق 55
صلہ — شبانہ شوکت 101
ہم الزام ان کو دیتے تھے — سلمیٰ غزل 183
دھوپ چھاؤں — صائمہ حیدر 219
درد — نبیلہ ابر راجا 229
تہی دست — رفاقت جاوید 241
بیٹیاں پھول ہیں — عظمیٰ افتخار 259

خصوصی مضامین

روزے داروں کے لیے احتیاط و تدابیر — شائستہ زریں 269
ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو — رجا فاطمہ 278

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات

دین کی باتیں — ادارہ 16
بہنوں کی محفل — مدیرہ 280
پاکیزہ ڈائری — عظمیٰ آفاق سعید 293
جلترنگ — انجم انصار 296
میرا انتخاب — آمنہ حماد 300
سندیسے — پاکیزہ بہنیں 303
میں اکثر گنگناتی ہوں — صغریٰ زیدی 304
خوش ذائقہ — پاکیزہ بہنیں 306
روحانی مشورے — ادارہ 308
ہومیو کلینک 310

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور افراز علی ناز ش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528

ماڈل: رانیہ .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹوگرافر: موسیٰ رضا
جلد 40 • شمارہ 05 • اگست 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئین کرام! آپ سب کو نیکیوں کی بہار کا موسم رمضان المبارک مبارک ہو۔ اسی ماہ 27 رمضان کو ہمارا ملک وجود میں آیا تھا اس لیے دوہری مبارک باد کہ ہم جشن آزادی رمضان کے مقدس ماہ میں منا رہے ہیں۔

یہ ماہ مبارک اپنے جلو میں فیوض و برکات کا بے بہا خزانہ لے کر آتا ہے اور پوری دنیا میں لٹا دیتا ہے اور یہ بندے کے اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ فیوض اور برکات کے اس خزانے سے کتنا حصہ حاصل کرتا ہے۔ رمضان المبارک تزکیہ نفس کا مہینہ ہے۔ یہ ہمیں اپنے نفس کو پاک رکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور ہم اپنے نفس کو صرف اسی صورت میں پاک کر سکتے ہیں جب ہم روزے اس کی اصل روح کے ساتھ رکھیں اور اس کے تقدس کو برقرار رکھیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"ایک رمضان دوسرے رمضان تک گناہوں کا کفارہ ہے۔" بلاشبہ اس ماہ مبارکہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے اور عبادت کا اجر و ثواب کئی گنا زیادہ کر دیا جاتا ہے۔ تو آیئے ان چند دنوں کو غنیمت جانتے ہوئے اللہ کے حضور ہم اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں پر نادم و شرمندہ ہوں اور آئندہ کے لیے کوئی گناہ نہ کرنے کا عزم کریں اور جو بھی کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کریں۔ اس طرح ہم بھی جہنم سے خلاصی کا پروانہ حاصل کر لیں کہ اللہ توبہ کرنے والوں کو بے حد پسند کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اللہ منافقوں کو سخت ناپسند کرتا ہے...... آج ہم بحیثیت مسلمان، بحیثیت پاکستانی صرف ایک بار صدق دل سے اپنے آپ سے یہ پوچھ لیں کہ کیا ہم نے اپنے ملک کے لیے (اپنی سطح کے حساب سے) کچھ کیا ہے یا نہیں...... اور اگر نہیں تو کیا یہ ہمارا حق بنتا ہے کہ اپنے ملک کو برا کہیں......؟

مدیرہ
انجم انصار

اور بے شک اس نے (اپنی) کتاب میں تم پر (یہ حکم) نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جاتا ہے اور ان سے مسخرہ پن کیا جاتا ہے تو تم ان (کافروں) کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ اس کے سوا کسی (دوسری) بات میں وہ گفتگو کرنے لگیں بے شک (اگر تم اس وقت ان کے پاس بیٹھو گے تو) تم بھی اس وقت ان کی مثل ہو (جاؤ گے) بے شک اللہ منافقوں اور کافروں کو ایک ساتھ دوزخ میں جمع کرنے والا ہے (۱۴۰) وہ (منافق) لوگ جو تمہاری (اس) ٹوہ میں رہتے ہیں (کہ ہمیں فتح ہوتی ہے یا شکست) پھر اگر اللہ کی طرف سے تمہاری فتح ہو جائے تو کہتے ہیں (کہ ہمیں بھی مال غنیمت سے حصہ دو) کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ (فتح کا) حصہ مل جائے تو (کافروں سے) کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تم پر زبردستی نہ کی تھی (کہ مسلمانوں سے ضرور لڑو) اور کیا ہم نے تمہیں مسلمانوں (کے ضرر) سے نہیں بچایا پس (اے منافقو تمہاری اس دورنگی کا) قیامت کے دن اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر (غالب ہونے کی) کوئی راہ نہ دے گا (۱۴۱) بے شک منافق اللہ کو فریب دیتے ہیں اور وہ ان کو فریب دینے والا ہے اور (یہ منافق) جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں تو بے دل کھڑے ہوتے ہیں (ان کا دل نہیں لگتا یہ تو) لوگوں کو دکھانے (کے لیے نماز پڑھتے) ہیں اور (دل سے تو) اللہ کو (بہت) کم یاد کرتے ہیں (۱۴۲) کفر اور ایمان کے درمیان مذبذب ہیں نہ ان کی طرف ہیں اور نہ ان کی طرف (انہیں اللہ نے گمراہ کیا ہے) اور (اے نبی ﷺ) جسے اللہ گمراہ کرے تو تم ہرگز اس کے لیے (ہدایت کی) کوئی سبیل نہ پاؤ گے (۱۴۳)

(سورہ نسا آیت نمبر ۱۴۰ تا ۱۴۳)

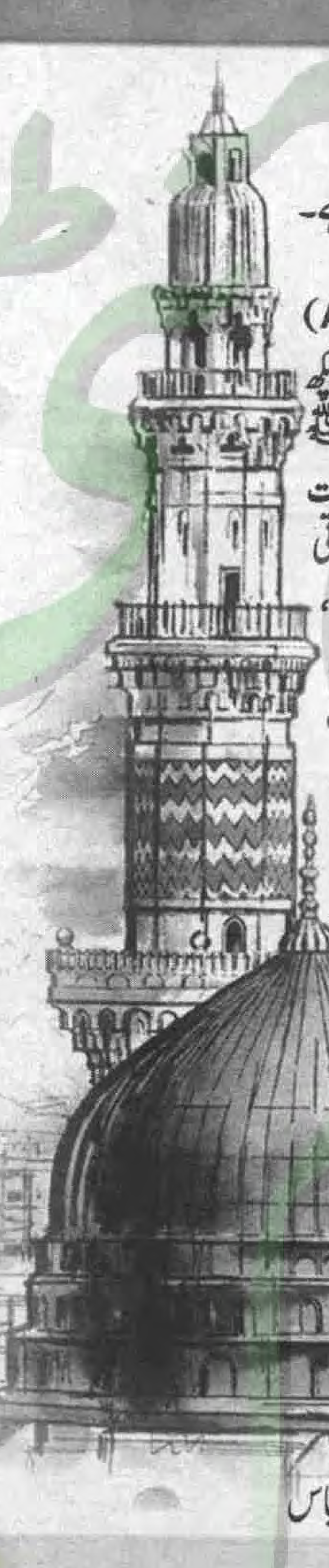

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ

3۔ تاریخ انسانی میں محمد ﷺ کا مقام سب سے بلند اور منفرد ہے۔

(اے گیلیوم)

(A Guillaumm.Islam.1963)

4۔ آپ ﷺ کی تعلیم میں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ جن کو دیکھ کر بے اختیار آپ ﷺ کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے اگر آپ ﷺ کچھ نہ کرتے۔ صرف خدا پرستی اور مساوات کی تعلیم پر اکتفا کرتے تو بہت کچھ تھا اور اتنے پر ہی دنیا ان کے قدموں پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتی مگر اب جبکہ آپ ﷺ کی تعلیمات میں توحید، تقویٰ نیکی، پارسائی، محبت، رواداری اور عورتوں کے حقوق و آزادی وغیرہ جیسی چیزیں بھی نظر آتی ہیں تو ایسی حالت میں ان کی تعریف سے چشم پوشی کرنا ہٹ دھرمی اور بدترین تعصب ہے۔

(ماسٹر شنگر داس گیانی)

5۔ ان (محمد ﷺ) سے بڑا انسان، انسانیت نواز، دنیا بھی پیدا نہیں کر سکے گی۔

(والٹیئر)

(Voltair Phylosophical Dictionary)

6۔ میں حضرت محمد ﷺ پیغمبر اسلام کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ کوئی شخص جو حضرت محمد ﷺ پیغمبر اسلام کے حالات زندگی پڑھے وہ آپ ﷺ کے شاندار کارناموں پر خراج تحسین کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت محمد ﷺ کی زندگی از حد مصروف زندگی تھی جو قابل تحسین کارناموں سے لبریز تھی۔ (بوکیباؤ نائٹ۔ بدھ مت کے رہنما)

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

عکس

قسط 13

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکا دینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بھوتے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانوان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے، ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔ گاؤں میں جب سب کو خیر دین کی نوکری ختم ہونے کا پتا چلتا ہے تو ان کے رویے بدل جاتے ہیں۔ خیر دین شہر واپس آتا ہے تو چڑیا کو واپس اسکول میں داخل کراتا ہے خیر دین نے ڈاکٹر فرح کے شوہر کو فون کیا تو پتا چلا کہ فرح کی ڈیتھ ہو گئی ہے لیکن عابد چیڑیا کی فیس دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ شیر دل پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہر بانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیر دل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ وہ پہلا سرکاری گھر تھا جو شہر بانو کو خوش کر گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر میونسپلٹی کے اہلکار خیر دین کی ریڑھی کا سامان پھینک دیتے ہیں اور اسے اس علاقے میں ریڑھی لگانے سے منع کر دیتے ہیں۔ باربی ڈول اسکول کے آخری دن چڑیا سے ملنے اپنی ممی کے ساتھ جاتی ہے۔ شیر دل اور عکس لاہور میٹنگ اٹینڈ کرنے جاتے ہیں، مثال اور شہر بانو بھی شیر دل کے ساتھ تھیں وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔ جواد کو پولیس نشے کی حالت میں پکڑتی ہے اور وہ عکس سے اپنا رشتہ ظاہر کرتا ہے۔ نیوز چینل پر یہ خبر بار بار آتی ہے۔ شیر دل اپنے تعلقات استعمال کر کے اس خبر کو رکوا دیتا ہے۔ ایبک، فاطمہ سے ملتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ شاید پہلے بھی اس سے ملا ہے لیکن کہاں اور کب یہ یاد نہیں۔ فاطمہ، ایبک سے باقاعدہ طور پر رشتہ بھیجنے کے لیے کہتی ہے۔ ایبک بتاتا ہے کہ اس کی منگنی اس کی کزن سے ہوئی ہے، وہ اسے ختم کرنے کی کوشش میں ہے۔ خیر دین نے گاؤں جا کر اپنے خاندان پر جعلسازی کے ذریعے زمین ہتھیانے کی ایف آئی آر درج کرائی۔ خیر دین کے خاندان نے ایف آئی آر کے جواب میں ایک مقامی ایم پی اے کی مدد لی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے۔ خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے۔ ایبک فاطمہ سے کہتا ہے کہ اس کی ممی اس سے ملنا چاہتی ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ ایبک کی والدہ اسے کہتی ہیں کہ وہ اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھے فاطمہ کی روم میٹ خانزہ اسے بتاتی ہے کہ اس کی طرح ایبک کے بھائی ایزد نے بھی اس کی بہن سے اسی طرح فائدہ اٹھایا تھا۔ 26 سال بعد اس شیشے کو وہی دیکھ کر ایبک رک گیا تھا۔ شیر دل حیران تھا کہ وہ عکس مراد علی کو پہچان نہیں پایا۔ عکس اسی گھر میں آ گئی تھی لیکن وہ یہاں چڑیا بن کر رہنا چاہتی تھی عکس مراد بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اس نے بغیر بتائے خیر دین کو بھی بلوالیا تھا۔ چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے یہ بھی ان ہی سے ایک تھا۔ عکس خیر دین کی زمین واپس لینے کے لیے کیس کرتی ہے۔ خیر دین پس وپیش سے کام لیتا ہے لیکن عکس اپنا حق چھوڑنا نہیں چاہتی۔ عکس، شہباز پر کیس کرتی ہے تو شیر دل اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ منزہ، شہر بانو کو فون کر کے کہتی ہیں کہ وہ شیر دل کو سمجھائے کہ وہ عکس کو کیس کرنے سے منع کرے۔ خیر دین کی طبیعت خراب ہونے پر شیر دل انتظام کر کے عکس کو سنگاپور سے پاکستان بھیجتا ہے اور اپنا موبائل بھی عکس کو دے دیتا ہے۔ موبائل پر شہر بانو کا میسج آتا ہے تو عکس فون آنے پر شیر دل کو بتا دیتی ہے۔ موبائل پر کسی مسز فاروقی کی کال آتی ہے اور وہ عکس کے نام بتانے سے پہلے ہی کہتی ہے کہ وہ عکس مراد علی ہے۔ عکس حیران رہ جاتی ہے اور شیر دل کا دوبارہ فون آنے پر اسے بتاتی ہے۔ شرمین کسٹڑ ایلینس سے ملتی ہے اور ان کے سب بتانے پر شہباز سے پوچھتی ہے کہ اس نے چڑیا کے ساتھ کیا کیا تھا لیکن شہباز چڑیا کو جاننے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ بات اتنی بڑھتی ہے کہ شرمین شہباز سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ شیر دل منزہ سے کہتا ہے کہ انہوں نے شہر بانو سے شیر دل کے منع کرنے کے باوجود بات کی اور شہر بانو نے شرمین کو سب بتا دیا۔ شہر بانو، شرمین سے پوچھتی ہے کہ اس نے طلاق کیوں لی لیکن شرمین بات ٹال دیتی ہے۔ شہر بانو بتاتی ہے کہ اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خیر دین کی خرابی طبیعت کا سن کر حلیمہ بھی آ جاتی ہے۔ عکس، حلیمہ سے جواد کے نہ ہونے اور خیریت نہ لینے پر افسوس کا اظہار کرتی ہے جواد کو فون کرتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کی ممی یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ منزہ، بختیار شیر دل سے کہتی ہے کہ وہ عکس کو سسپینڈ کروائیں اور بختیار شیر دل یہ کام کر گزرتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیں)

چند لمحے پہلے آئینے میں نظر آنے والے اپنے عکس کو اس بار اس نے خیر دین کی آنکھوں میں منعکس ہوتے دیکھا تھا۔

ایک سرخ اور سنہرے کامدار دوپٹے کے ہالے میں دلہن کا روپ لیے چمکتا ہوا اس کا چہرہ...... ماتھے کے بیچوں بیچ تاج کی طرح ٹکا اس کے لباس کے ہم رنگ سرخ پتھروں سے مرصع بیضوی شکل کا ایک ٹیکا...... اس کے کانوں میں ہلکورے لیتے لمبے لمبے جھمکے جن کے نچلے حصے پر لٹکتے سرخ باریک موتی اس کی قمیص کے گہرے گول گلے سے ہمیشہ کی طرح نمایاں کالر بون کو گردن کے ذرا سے خم پر چومنے لگتے تھے اور اس کی باریک صراحی دار گردن کے گرد موجود سرخ پتھروں کا وہ نیکلس جس کا نیچے کو نکلا ہوا سنہری بیضوی حصہ اس کی سرخ قمیص کے سرے کو چھو رہا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے شفاف اور واضح اس عکس کو دیکھ کر مبہوت نہیں ہوئی تھی۔ خیر دین کی آنکھوں میں اپنے دھند لائے ہوئے عکس کو دیکھ کر ہو گئی تھی۔ وہ اپنے نانا کی آنکھوں کی نمی میں ہلکورے لے رہی تھی یا شاید وہ اس کی اپنی آنکھوں کی نمی تھی جس نے خیر دین کی آنکھوں کی نمی میں --- دھندلاتے اس کے عکس کو کچھ اور دھندلا کر دیا تھا۔

لیکن خیر دین اور وہ پھر بھی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ...... بے یقینی کے ایک عجیب سے جہاں میں پہنچے ہوئے۔

اس کے چہرے سے بالآخر نظریں پہلے خیر دین نے ہی ہٹائی تھیں۔ وہ اپنی چڑیا کو اپنی نظر لگنے سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ یہ اس کا وہ روپ تھا جس کو دیکھنے کے لیے وہ کئی سالوں سے متمنی تھا اور آج اس روپ میں چڑیا کو دیکھتے ہوئے اس کا دل عجیب سی خوشی اور طمانیت کے ساتھ ساتھ بڑی عجیب سی کسک محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی چڑیا کو اپنا جیون ساتھی مل گیا تھا وہ اس کے ساتھ اب ایک نئے سفر پر اڑ جانے والی تھی۔

عکس نے خیر دین کو خود سے نظریں چراتے ہوئے آگے بڑھتے اور اسے اپنے ساتھ لپٹاتے دیکھا۔ وہ جذباتی نہیں تھی لیکن وہ اس لمحے رو دی تھی۔

وہ چند منٹ پہلے بیوٹی پارلر سے نکاح کی اس سادہ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچی تھی جو اسی گھر کے لان میں منعقد کی گئی تھی اور دروازے پر اس کا استقبال خیر دین نے ہی کیا تھا۔ وہ چڑیا کے چند گھنٹے پہلے پارلر جانے کے بعد سے وہاں مہمانوں کا استقبال کرتا وہاں سے ہلا نہیں تھا۔ اسے اپنی چڑیا کی واپسی کا انتظار تھا۔ دلہن کے روپ میں اس پر پہلی نظر ڈالنے کی بے قراری...... خیر دین کی نظریں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اور انہیں پائیں باغ کی طرف بھیجتے ہوئے بھی گیٹ پر جمی رہی تھیں۔

اور اب جب وہ گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے گھر کے اندر جانے کے لیے اپنی چند دوستوں کے ساتھ کھڑی تھی تو خیر دین کا دل عجیب طرح سے بوجھل تھا۔ وہ عام لڑکی نہیں تھی نہ خیر دین نے اسے عام طرح سے پالا تھا پھر بھی وہ ایک لڑکی تھی اور خیر دین کا دل ویسے ہی اندیشوں اور خدشات سے دوچار تھا جیسے اندیشے کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو ایک انجان آدمی کے ساتھ ایک انجان سفر پر رخصت کرتے ہوئے رکھتا...... چاہے وہ انجان آدمی جیون ساتھی ہی کیوں نہ ہوتا۔ چاہے وہ انجان سفر زندگی کا سفر ہی کیوں نہیں ہوتا۔

خیر دین نے اسے کندھوں سے تھامے ہوئے اس کے جھکے ہوئے سر کو پھر ماتھے کو چوما، عکس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اپنے نانا کو دیکھا وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی اس نے خیر دین کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا دعائیں کر رہا تھا وہ اس کے ساکت ہونٹ سے بھی سن سکتی تھی۔ عکس مراد علی نے اپنی ساری زندگی میں ایسا مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شفیق تھا، رہبر تھا، دوست تھا، غم خوار تھا، اس پر جان چھڑکنے والا تھا

اور وہ اس کے لیے اپنی انا اور عزت کو ہر بار کی طرح اس بار بھی کہیں بہت پیچھے رکھ آیا تھا۔ ایسا کون ملے گا اسے جو اسے خیر دین کی طرح چاہے گا...... کبھی کوئی نہیں مل سکتا، کوئی اس جیسا ہو ہی نہیں سکتا، کوئی اس کے لیے اپنے دل میں ویسی غیر مشروط محبت رکھ ہی نہیں سکتا۔ چڑیا نے اپنے نانا کی آنکھوں میں یہ سب پڑھا تھا۔ کھلی کتاب کی طرح جس کا ایک ایک لفظ خود بول رہا تھا۔

بنا کچھ کہے اس نے خیر دین کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس ہاتھ کے لمس میں وہ تشکر جھلک رہا تھا جو عکس کے دل میں تھا اور جو اس کے نرم ہاتھ کی سخت گرفت میں تھا۔

''میں تمہارے بغیر بہت اداس ہو جاؤں گا چڑیا۔'' خیر دین نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''نانا میں آپ کی زندگی سے کہیں جاؤں گی تو اداس ہوں گے نا آپ۔ میں کہیں نہیں جا رہی، میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہوں گی۔'' خیر دین رنجیدگی سے اس کی تسلی سنتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔ وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔

''رک کیوں گئیں؟'' خیر دین نے اسے گھر کے اندرونی دروازے میں رکتے دیکھ کر کہا۔

''نہیں...... ایسے ہی۔'' وہ چونکی تھی اور اس نے اپنے ان سات ساتھیوں سے نظریں ہٹالی تھیں جو ایک بار پھر اس کا استقبال کرنے کے لیے وہاں موجود تھے اور جنہیں وہ ہمیشہ اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہیں نہ کہیں دیکھتی رہی تھی۔ وہ سات اس کی زندگی کے اس نئے سفر پر اسے رخصت کرنے کے لیے ایک بار پھر وہاں موجود تھے۔

ٹوفو اس کے روپہلی چوڑی دار پاجامے کی چوڑیوں کے ساتھ لٹکا اپنا توازن برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ کنفا اس کی پینسل ہیل والے جوتے کے اسٹرپ سے چپکا اس کے پیروں پر بنے مہندی کے نقش و نگار پر غور فرمانے میں مصروف تھا۔ منفا ایک باجا پکڑے گھر کی دہلیز پر اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے اسے بجانے میں لگا تھا۔ ڈیڈوا اچھل اچھل کر اس کے ٹخنوں تک پہنچتی سرخ قمیص کے سنہری کام دار دامن کو پکڑنے کی کوشش میں لگا تھا۔ ٹو کو اس کے زمین تک لٹکنے والے دوپٹے کے پلو سے لٹکا ہوا تھا اور کٹو اور ٹنٹو خوشی سے بے قابو سر پر سالگرہ والی نوکدار لمبی ٹوپیاں پہنے پھرکی کی طرح گول گول گھومتے چکراتے پھر رہے تھے۔ وہ سب اس کی خوشیوں کو سیلیبریٹ کر رہے تھے۔ چڑیا نے اس غیر مرئی دنیا کو مسکراتے ہوئے دیکھا جو صرف اسے نظر آتی تھی اور جہاں کی ملکہ وہ تھی۔

ایلس آج اپنے اس ونڈر لینڈ کو چھوڑ کر اپنے جیون ساتھی کے ساتھ ایک نئے ونڈر لینڈ کو آباد کرنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ان دونوں نے بہت دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ شیر دل چند لمحے پہلے ہی ہاسپٹل کے اس کوریڈور میں داخل ہوا تھا جہاں خیر دین کا کمرا تھا اور عکس ابھی ابھی ہاسپٹل سے کسی کام کے لیے باہر نکل رہی تھی۔ شیر دل کو آتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ بہت دور سے بھی دونوں نے ایک دوسرے کو ایک خیر مقدمی مسکراہٹ دی تھی۔

''کب آئے؟'' عکس نے اس کے قریب آنے پر علیک سلیک کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ابھی، ابھی۔'' شیر دل نے جواب دیتے ہوئے اس کے چہرے کو جیسے کھوجنے کی کوشش کی، وہ ہمیشہ کی

طرح ناکام رہا تھا۔ وہاں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے علاوہ اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ ایک انتہائی اطمینان بھری مسکراہٹ جس میں کسی قسم کا کوئی اضطراب نہیں تھا۔

''کیا ضرورت تھی اتنی جلدی یہاں آنے کی؟ ریسٹ کرتے...... کل پرسوں آ جاتے یا فون پر حال پوچھ لیتے۔'' عکس نے اسے کہا۔

''انکل کیسے ہیں؟'' شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے پہلے سے بہت بہتر ہیں۔'' عکس نے جواباً کہا۔ ''تمہاری فلائٹ کیسی رہی؟''

''ٹھیک تھی، تم نے مجھے اپنی suspension کے بارے میں نہیں بتایا۔'' شیر دل نے چھوٹتے ہی وہ سوال کیا جو ہاسپٹل تک آنے کے پورے راستے میں اسے پریشان کرتا رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے اسی اطمینان سے کہا۔

''کیا بتاتی؟'' ایک لمحے کے لیے اس کے سوال نے شیر دل کو لاجواب کیا۔

''انفارم کرتیں مجھے، کل میری اور تمہاری بات ہوئی ہے تم نے ذکر تک نہیں کیا۔'' وہ بات کرتے کرتے شکایت کر گیا۔

''فائدہ کیا ہوتا؟'' اس کا اطمینان برقرار تھا۔

نقصان بھی کوئی نہیں تھا۔'' شیر دل نے جتایا۔

''میں نے نہیں بتایا تو بھی پتا تو چل ہی گیا نا تمہیں...... ایسا کوئی راز تو نہیں تھا کہ پتا نہ چلتا۔ نانا سے ملو گے؟'' اس نے اس کی شکایت کو بے پروائی سے نظرانداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' شیر دل نے مختصراً کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ عکس بھی اس کے ساتھ واپس پلٹ گئی تھی۔

''suspension کیوں ہوئی؟'' شیر دل نے ساتھ چلتے ہوئے اس سے پوچھا، وہ گردن موڑ کر اس کو دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''پوری چارج شیٹ سناؤں یا صرف بنیادی وجہ بتاؤں؟'' اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس سے شیر دل پر گھڑوں پانی پڑا تھا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا۔'' شیر دل نے اس سے نظریں چراتے ہوئے خفگی سے کہا۔ ''اسی سب سے بچانا چاہتا تھا تمہیں، اسی سب سے بچانے کے لیے وارن کر رہا تھا تمہیں۔''

''میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟'' اس نے شیر دل کی بات بڑے تحمل سے کاٹ دی تھی۔ ''اب تمہیں پتا چلا میں نے تمہیں کیوں نہیں بتایا تھا اپنی سسپینشن کے بارے میں۔''

''تم اپنا سروس ریکارڈ خراب کر رہی ہو عکس۔'' شیر دل چلتے چلتے رک گیا۔

''شیر دل وہ میرا مسئلہ ہے تم اس کے بارے میں پریشان نہ ہو۔ مجھے چارج کیا گیا ہے میں انہیں explanation دے لوں گی۔ اور میرے لیے یہ سب غیر متوقع نہیں ہے۔ جس دن میں نے کیس فائل کیا تھا مجھے اندازہ تھا کہ میں کون سا پینڈورہ باکس کھولنے جا رہی ہوں۔ اس لیے تم پریشان مت ہو۔ تم اپنی فیملی اور اپنے انکل کو defend کرو...... مجھے کیس لڑنے کے لیے جو کرنا پڑا میں وہ کروں گی لیکن ہم پھر بھی دوست رہیں گے۔'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے عکس مراد علی بے وقوف لگی تھی۔

''تم عقل سے پیدل ہو۔'' وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''اچھا؟'' وہ بے اختیار ہنس دی تھی۔

''تم اتنا آسان سمجھ رہی ہو یہ سب کچھ...... تمہارا خیال ہے کہ تمہیں اگر suspend کیا گیا ہے تو پھر تمہاری explanation لے کر تم سے معذرت کرتے ہوئے تمہیں بحال کر دیا جائے گا۔'' وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''شیر دل میں کیس واپس نہیں لوں گی اور اب تو بالکل بھی نہیں۔ تم نانا کی عیادت کرنا چاہتے ہو یا ویسے ہی واپس جانا چاہتے ہو؟'' اس نے شیر دل کی بات کاٹ کر اسے دوٹوک انداز میں کہا۔

''جہنم میں جاؤ تم۔'' شیر دل اس کے جملے پر بری طرح جھنجلایا...... وہ دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے مسکرائی۔

''میں وہاں سے گزر کر آئی ہوں۔ دوبارہ بھی جانا پڑا تو باہر نکلنے کا راستہ جانتی ہوں۔'' اس کا اطمینان... قابلِ داد تھا اور وہ داد دیتا اگر کیس اس کے اپنے خلاف نہ ہوا ہوتا۔

''اور اب نانا سے میری suspension کا قصہ لے کر مت بیٹھ جانا۔'' اس نے ساتھ چلتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

''انہیں کچھ بتانا ہوتا تو سب سے پہلے اس کیس کے بارے میں بتاتا۔'' وہ ساتھ چلتے ہوئے خفگی سے بولا۔

''عقل مند ہو گئے ہو۔'' وہ داد نہیں تھی راز کو راز..... رکھنے کی ترغیب تھی اور شیر دل یہ بات جانتا تھا۔

خیر دین بستر پہ لیٹے ہوئے دروازے میں داخل ہوتے شیر دل کو دیکھ کر مدھم انداز میں ہلکا سا مسکرایا تھا۔ شیر دل بھی جواباً مسکرایا۔ وہ عکس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس سے کچھ بات کرتے کرتے وہ خیر دین کے بستر کے قریب آ گیا۔ خیر دین پر ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے خیر دین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی نرم آواز میں اس سے پوچھا۔

''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے انکل؟'' خیر دین مسکرایا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' شیر دل مسکراتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ عکس اسے خیر دین کے بارے میں ڈاکٹر کی رائے بتا رہی تھی۔ خیر دین ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ دراز قد...... اسمارٹ...... خیر دین نے عجیب حسرت سے ان دونوں کو اکٹھے کھڑے دیکھا تھا۔ شیر دل وہ پہلا مرد تھا جس کو دیکھ کر خیر دین کو اسے چڑیا کا نصیب دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ وہ اسے کچھ ایسا ہی اچھا لگا تھا۔ وہ پہلی نظر کی پسندیدگی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ شیر دل کے شادی شدہ ہو جانے کے باوجود خیر دین کے دل سے وہ پسندیدگی ختم نہیں ہوئی تھی اور عکس، خیر دین کی اس پسندیدگی اور خواہش دونوں سے واقف تھی تب سے جب وہ شیر دل سے ملی بھی نہیں تھی جب شیر دل اس کے لیے صرف ایک غائبانہ وجود تھا جس کا ذکر وہ خیر دین سے سنا کرتی تھی اور اسے حیرت ہوتی تھی اس کا نانا کسی سے بھی اس طرح اتنی جلدی متاثر نہیں ہوتا تھا جس طرح وہ شیر دل سے ہو گیا تھا۔

خیر دین نے شیر دل کو پہلی بار اپنی دکان پر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ شکل صورت میں تو اچھا تھا ہی لیکن خیر دین کو وہ خوش شکل اور خوش لباس لڑکا اپنی تہذیب اور شائستگی کی وجہ سے اچھا لگا تھا۔ خیر دین نے پہلی بار اسے اپنی دکان پر آتے ہوئے صرف کھانا کھا کر جاتے دیکھا تھا وہ اس سے ذاتی طور پر نہیں ملا تھا یہ چند دنوں کے بعد خیر دین کی دکان پر شیر دل کا دوسرا چکر تھا جس میں خیر دین اس سے متعارف ہوا تھا۔ وہ ان دنوں امریکا میں پڑھ رہا تھا اور چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ میل ملاقاتوں میں

وہ لاہور اور اس کے آس پاس کے شہروں میں بھی گھوم پھر رہا تھا جہاں جہاں اس کے دوستوں کے والدین یا خود اس کے قریبی رشتے دار پوسٹڈ تھے اور اسی سیر و تفریح میں اسے ایک دوست کے ہاں قیام کے دوران خیر دین کی دال جو اس شہر کا تعارف بن چکی تھی شیر دل نے دریافت کی تھی۔ وہ پاکستانی روایتی کھانوں کا کوئی زیادہ شوقین نہیں تھا مگر چند ایک چیزیں جن کے ذائقے کو وہ پاکستان میں اس قیام کے دوران بھول نہیں سکا تھا ان میں سے ایک وہ دال بھی تھی۔ وہ اس کے بعد کئی بار خاص طور پر اس دکان کی دال کھانے کے لیے لاہور سے سفر کر کے آیا تھا اور ہر بار وہ اس دکان کے مالک اس بوڑھے بے حد سلجھے ہوئے آدمی سے گپ شپ لگا کر بے حد محظوظ ہوتا جو اپنے حلیے یا کسی بھی طرح سے ایک عام دکاندار نہیں لگتا تھا۔ ایک بے حد، شفیق، مہربان، نرم خو اور اپنی گفتگو سے بڑا پڑھا لکھا نظر آنے والا وہ بوڑھا جو ہر بار اس کے وہاں جانے پر اپنے ہاں کام کرنے والے ویٹرز کو ذاتی طور پر شیر دل کو سرو کرنے کے لیے کہتا تھا۔ شیر دل کو اس کا داڑھی والا چہرہ کئی بار بے حد شناسا لگا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی آواز...... دونوں چیزیں مگر وہ اسے اپنا وہم سمجھتا تھا۔ آخر لاہور سے سیکڑوں میل دور ایک شہر کی ایک چھوٹی سی ریسٹورنٹ نما دکان کے بوڑھے مالک کو وہ پہلے کیسے جان سکتا تھا جبکہ اس نے زندگی میں پہلی بار اس دکان پر کھانے پینے کے لیے آنا جانا شروع کیا تھا۔ ایک شیر دل نے اپنے ہر خیال کو وہم سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔

جو بات ایک شیر دل کو البتہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ اسے خاص طور پر وہاں دیا جانے والا پروٹوکول تھا۔ خیر دین اسے اتنی اسپیشل توجہ کیوں دیتا تھا؟ ایک شیر دل نے اس کی وجہ ڈھونڈنے پر بھی بڑا غور کیا تھا لیکن وہ ناکام رہا تھا۔ وہ اگر پہلے ہی اپنے دوستوں سے یہ نہ سن چکا ہوتا کہ اس دکان پر بڑی دور دور سے بہت امیر اور اثر و رسوخ والے لوگ بھی آیا کرتے تھے اور پھر خود وہ اپنی آنکھوں سے وہاں دکان کے باہر کھڑی بہت ساری سبز پلیٹوں والی سرکاری گاڑیاں نہ دیکھتا رہتا تو ایک شیر دل اس توجہ کو اس سرکاری گاڑی کی سبز نمبر پلیٹ کی مرہونِ منت سمجھتا جس میں وہ آیا کرتا تھا۔ وہ اس خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس ڈبل اسٹوری ریسٹورنٹ نما دکان کا مالک بڑی بڑی گاڑیوں میں آنے والے پرانے گاہکوں کو چھوڑ کر اس کی طرف کسی خاص لالچ میں متوجہ ہوتا تھا۔ خیر دین اور اپنی ہونے والی گپ شپ میں اس نے کبھی اپنے باپ کے عہدے کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی خیر دین نے اس سے اس کے باپ کے بارے میں کبھی پوچھا تھا تو پھر وہ کیا وجہ تھی جو اُن دونوں کے درمیان اس قسم کی شناسائی اور پسندیدگی کو وجود میں لے آئی تھی۔ شروع میں چند بار الجھنے اور سر کھپانے کے بعد شیر دل نے اس سوال کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اس کے لیے بس یہ کافی تھا کہ وہ وہاں جاتا تھا تو اسے خاص پروٹوکول دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جانے والے اس کے دوست اس چیز کو نوٹس کرتے تھے۔

ان چھٹیوں کے بعد بھی شیر دل پاکستان میں اپنے ہر قیام کے دوران وہاں باقاعدگی سے آنے لگا تھا۔ وہ اب یہ بھی جانتا تھا کہ خیر دین کی ایک ہی نواسی ہے جو ایک میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی اور اس دکان میں آنے والے پرانے گاہکوں میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو خیر دین کی اس لائق نواسی سے واقف نہ ہوتا جو خیر دین کے دل کی دھڑکن تھی اور جس کے ذکر کے بغیر خیر دین کا دن نہیں گزرتا تھا۔

شیر دل نے خیر دین کی نواسی کا پہلی بار خیر دین سے تعارف ستائشی مسکراہٹ کے ساتھ زیادہ دلچسپی کے بغیر سنا تھا۔ خیر دین اپنی نواسی کو میڈیکل کروا رہا تھا۔ اچھی بات تھی۔ وہ نواسی لائق تھی یہ اور بھی اچھی بات تھی۔ وہ خیر دین کا جوش اور فخر سمجھ سکتا تھا اس کے بیک گراؤنڈ کے کسی آدمی کا اپنی اگلی نسل کی کسی لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دلوانا

کسی معرکے سے کم نہیں تھا اور شیر دل کے خاندان میں کسی لڑکی کا کوئی پروفیشنل ڈگری لینا ایک معمول کی بات ...... شیر دل کے لیے خیر دین کی نواسی کی قابلیت قابلِ غور چیز تھی ہی نہیں لیکن وہ اسے خیر دین کی دلچسپی کا موضوع سمجھ کر سنتا رہا تھا۔ خیر دین کی وہ نواسی اس سے عنقریب کہاں ٹکرانے والی تھی شیر دل کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔

وہ STP کے دوران ایک فیلڈ ٹرپ کرتے ہوئے اپنے پورے گروپ کو وہاں لایا تھا۔ عکس بھی ان 25 لوگوں میں تھی جو اس گروپ میں شامل تھے۔ شیر دل کو وہاں ویسا ہی پروٹوکول ملا تھا جو اس کے لیے متوقع تھا۔ اس چھوٹے سے ریسٹورنٹ کی پہلی منزل پر موجود فیملی ایریا فوری طور پر ان لوگوں کے لیے خالی کروالیا گیا تھا۔ شیر دل کو وہاں داخل ہوتے ہوئے خیر دین نظر نہیں آیا تھا اور وہ پہلا موقع تھا جب اس کی وہاں آمد کے موقع پر اس کا اور خیر دین کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک ویٹر سے خیر دین کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ وہ نماز پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ فیملی ہال کی چند ٹیبلز کو چھوڑ کر ان لوگوں کے لیے ایک ہی لمبی ٹیبل تیار کردی گئی تھی۔ شیر دل نے ان ٹیبلز پر ایک دم نئے ٹیبل کور، بہت اچھی کراکری اور شیشے کے چمکتے ہوئے نئے گلاسز اور نئی کٹلری کو نوٹس کیا تھا۔ اس نے ان تین مستعد اور مؤدب ویٹرز کو بھی نوٹس کیا تھا جو صرف ان کے احکامات لینے کے لیے وہاں موجود تھے اور اس نے یہ بھی نوٹس کیا تھا کہ وہاں موجود تقریباً تمام عملے نے داخل ہوتے وقت شیر دل سے تو ہمیشہ کی طرح علیک سلیک کی تھی لیکن عکس سے بھی وہ بہت مؤدبانہ انداز میں مخاطب ہوتے رہے تھے۔

''لگتا ہے تمہیں بھی پہچانتے ہیں یہ لوگ۔ تمہارا تو شہر ہے، تم تو بہت بار آچکی ہوگی یہاں۔'' شیر دل کو اس کے علاوہ اس عجیب ''شناسائی'' کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی جو عکس کے لیے وہاں کے عملے کے رویے میں تھی۔

''بہت بار۔'' عکس نے جواباً ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ شیر دل بھی مطمئن انداز میں مسکرادیا۔

کھانے کی ٹیبل کے گرد کھانے کا انتظار کرتے ہوئے شیر دل ان تمام لوگوں کو اس دکان کے مالک بوڑھے خیر دین کے بارے میں بتاتا رہا جو اس کے نزدیک ایک انتہائی دلچسپ بوڑھا تھا۔ ایک حیران کُن قسم کا دکان دار...... وہ خیر دین کے ساتھ ہونے والی اپنی گپ شپ ان کے سامنے دُہراتا رہا۔ گروپ کے کچھ اور لوگ بھی خیر دین کی اس مشہورِ زمانہ دال اور اس جگہ سے واقف تھے اور وہاں آچکے تھے لیکن باقی لوگوں کے لیے وہ جگہ نئی تھی لیکن وہ تمام لوگ جو پہلے وہاں آچکے تھے ان میں سے کوئی بھی خیر دین کو ان حوالوں سے نہیں جانتا تھا جن حوالوں سے ایک شیر دل جانتا تھا۔

عکس مراد علی، ایک شیر دل کی اس ساری ''دلچسپ'' گفتگو کے دوران پانی کا ایک گلاس پکڑے اس لمبی میز کے ہیڈ پر بیٹھی تھی اور وقفے وقفے سے پانی پیتے ہوئے ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ شیر دل کی خیر دین کے حوالے سے وہ بے تکلفانہ گفتگو سنتی رہی جو وہ ایک ڈائٹ پیپسی کے کین کو پیتے ہوئے کرتا رہا تھا۔

''اور ہاں خیر دین کی ایک نواسی بھی ہے۔'' گیدڑ کی جب شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے کے مصداق ایک شیر دل کو بے حد غلط وقت پر وہ ''نواسی'' یاد آئی تھی جو اس وقت اس سے تین کرسیوں کے فاصلے پر ٹیبل کے ہیڈ پر پڑی کرسی پر بیٹھی گلاس کو اس کی جگہ پر دائرے کی شکل میں ہلکی گردش دیتے ہوئے ایک شیر دل سے ''اپنا تعارف'' سن رہی تھی۔

''بتا رہا تھا مجھے کہ اس کی نواسی گولڈ میڈلسٹ رہی ہے کس میں...'' شیر دل نے بات کرتے کرتے ایک لمحے کے لیے رک کر کچھ یاد کیا۔ ''ہاں بورڈ کے کسی ایگزام میں۔''

''سارے ایگزامز میں۔'' عکس نے بہت مدھم آواز میں تصحیح کی تھی، شیر دل نے روانی میں غور نہیں کیا۔

''لاہور کے کسی میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔''

''پڑھ لیا۔'' تصحیح ایک بار پھر ہوئی۔

''شاید علامہ اقبال میڈیکل کالج میں۔''

''کنگ ایڈورڈ میں۔'' وہ تیسری تصحیح تھی جس پر بالآخر شیر دل نے گلاس کے کناروں پر انگلیاں پھیرتی عکس سے پوچھا۔

'اوہ تم بھی تو KE سے ہی پڑھی ہو۔'' تم یقیناً جانتی ہوگی اسے۔'' شیر دل نے ہمیشہ کی طرح سوال کا جواب آنے سے پہلے ہی اپنا اندازہ لگایا تھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' عکس مسکرائی تھی۔ شیر دل نے اس کی مسکراہٹ پر غور نہیں کیا۔ اس نے ان تین ویٹرز پر بھی غور نہیں کیا جن میں سے دو عکس کے بالکل قریب ٹیبل کے دائیں جانب تھے اور تیسرا عکس کے بائیں جانب...... شیر دل خود عکس کی دائیں جانب تیسری کرسی پر تھا اور وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ویٹرز شیر دل کے ان لوگوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے شیر دل کے قریب تھے۔ وہ انگلش میں بات کررہا تھا۔ اردو میں کرتا تو اس کی گفتگو کا موضوع ان ویٹرز کو بھی بھونچکا کردیتا۔ ''عکس باجی'' کے ساتھ آئے ہوئے مہمان عکس باجی کو نہیں جانتے تھے یہ بات وہاں کام کرنے والے کسی بھی شخص کو ایسے ہی حیران کردیتی۔

''Now this is amazing'' شیر دل کہہ رہا تھا۔ ''کوئی ملک ترقی کرسکتا ہے تو اس اسپرٹ کے ساتھ کرسکتا ہے اور مجھے حیرانی ہوئی ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ایسی success stories ممکن ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں۔'' شیر دل اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے پیپسی پیتا ہوا بڑے اطمینان سے کہتا جارہا تھا۔ کھانا سرو ہونے لگا تھا۔ وہ لوگ کھانا کھانے لگے، گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

خیر دین بالکل اس لمحے سیڑھیاں چڑھ کر اس چھوٹے سے ہال نما کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جھجک گیا۔ اسے نیچے پتا چل گیا تھا کہ عکس کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں آئی تھی لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا وہ سارے اس کے بیچ میٹس تھے۔ وہ افسروں کے ساتھ تھی اس وقت اور زندگی میں پہلی بار خیر دین اپنی چڑیا سے جھجکا تھا۔ جو بھی تھا وہ ایک معمولی دکان دار تھا معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک معمولی شخص...... اس نے اپنی چڑیا کو اپنا خون پسینہ دے کر کامیابی کی سیڑھیوں پر چڑھایا تھا اور اب جب وہ وہاں چڑھ گئی تھی تو زندگی میں پہلی بار خیر دین کو اس کے سامنے احساس کمتری ہوا تھا۔ وہ اسے ان لوگوں کے درمیان اپنا حوالہ دینے سے جھجکا تھا۔ شاید یہ مناسب نہیں ہو، شاید چڑیا نے ان لوگوں کو اس کے بارے میں نہ بتایا ہو، پتا نہیں وہ چڑیا کے لیے وہاں ندامت اور خفت کا باعث نہ بن جائے۔ اس نے ہال میں جتنے جوش و خروش میں قدم رکھا تھا اسی تیزی سے وہ پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ عکس تب تک اسے دیکھ چکی تھی۔ سیڑھیوں سے اوپر آنے والا وہ راستہ اس کے سامنے تھا۔ ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ حیران ہوئی تھی خیر دین پیچھے کیوں ہٹا تھا اور پھر جیسے ایک جھماکے کے ساتھ اسے وجہ سمجھ آئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا دوسرا لقمہ اپنی پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے وہ کھڑی ہوگئی تھی۔

''نانا۔'' سیڑھی پر واپس پلٹتے خیر دین کے پیروں میں ایک بیڑی پڑی۔ ٹیبل کے گرد بیٹھے وہ سارے مرد یک دم چونکے تھے پھر انہوں نے عکس کی نظروں کے تعاقب میں اس بوڑھے باریش آدمی کو دیکھا جواب آگے بڑھ رہا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب ایک شیر دل کو بھی کرنٹ لگا تھا۔

''نانا!'' وہ زیرِ لب بے یقینی سے بڑبڑایا۔ ایک نظر اس نے عکس کو دیکھا پھر ٹیبل کے پار خیر دین کو۔

"میرے نانا اور دکان کے مالک۔" عکس مراد علی نے بے حد روانی اور اعتماد کے ساتھ اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے خیر دین کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو چند لمحوں کے لیے سکتہ ہوا تھا پھر وہ بیک وقت اپنی اپنی کرسیوں سے احتراماً کھڑے ہوئے تھے۔ وہ تب تک خیر دین کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس نے جا کر ہمیشہ کی طرح خیر دین کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے اس ننھی سی لڑکی کی وجہ سے اس کی زندگی میں...... اور ایسا ہی فخر کا ایک لمحہ وہ بھی تھا خیر دین کے لیے۔ وہ اسے اس جگہ پر own کر رہی تھی جہاں کا رزق اسے کھلا کھلا کر خیر دین نے پالا تھا۔ ان 24 لوگوں کے سامنے جن کے خاندانوں کی سات پشتوں میں کوئی مزدور نہیں رہا تھا اور اگر کبھی رہا تھا تو وہ عکس مراد علی جیسا دل گردہ نہیں رکھتے تھے کہ اس کا اعتراف سب کے سامنے کر پاتے۔

شیر دل ایک عجیب سی بے یقینی کی کیفیت میں خیر دین کو اپنے بیچ میٹس کے ساتھ متعارف ہوتے دیکھتا رہا پھر بالآخر عکس اور خیر دین اس کے سامنے آ گئے تھے۔ خیر دین کی آنکھوں میں وہی شناسائی جھلکی تھی۔ ایک عجیب سی ٹیس عکس کے دل میں اٹھی تھی، وہ اب جانتی تھی خیر دین اتنے سالوں سے کس نامعلوم لڑکے کن گاتا تھا۔ وہ شیر دل کی زبان سے خیر دین کی طرف سے کیے جانے والے خاص برتاؤ کے ذکر پر ہی چونک گئی تھی۔ اسے ایک عجیب انداز میں یقین ہوا تھا کہ خیر دین جس لڑکے جیسے مرد کو اس کا جیون ساتھی دیکھنے کا خواہش مند تھا وہ ایک شیر دل ہی تھا۔ کیا عجیب دل تھا ان دونوں نانا نواسی کا۔ ایک ہی شخص پر آیا تھا اور وہ بھی اس پر جس کا ساتھ ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ خیر دین نہیں جانتا تھا وہ خوش گمان تھا، پُرامید تھا۔ عکس جانتی تھی وہ خوش گمانیوں کو فریب سمجھتی تھی۔ امید اس جس چیز کی رکھتی تھی جو معجزے سے نہیں کوشش سے ملتی۔ اور وہی وہ ایک لمحہ تھا جب ایک شیر دل یہ جان گیا تھا کہ عکس مراد علی کو زندگی کا ساتھی بنانے کی خواہش اسے چھوڑنی پڑے گی۔ پہلے یہ کام مشکل تھا اب ناممکن تھا۔ اس کا خاندان جس حسب و نسب کا قائل تھا عکس مراد علی اب اس اسکیل پر چند درجے اور نیچے چلی گئی تھی۔

پنجاب کے ایک نامور جاگیردار خاندان کے سپوت اور انڈین سول سروس کے ممتاز ترین آفیسرز میں سے ایک شیر دل علی قلی کے پوتے کی شادی ایک لوہار خاندان سے تعلق رکھنے والے خیر دین دال والے کی نواسی سے تو نہیں ہو سکتی تھی۔ شیر دل ساری عمر ایچی سن اور پھر ہارورڈ میں پڑھا تھا۔ بنیادی انسانی حقوق میں مساوات کا قائل تھا تب تک جب یہ روشن خیالی اور انسانیت پسندی پاکستان سے باہر دکھانا مقصود ہوتا۔ اپنے ملک اور معاشرے میں آتے ہی وہ تمام خول اور ماسک چڑھانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ جس کے بغیر اس ملک میں تفریق رکھنا اور شناخت کروانا مشکل ہوتا تھا محبت ایک عظیم اور لافانی جذبہ تھا وہ جذبات میں آ کر جان دے سکتا تھا لیکن اپنے خاندان کی اگلی نسل کو اپنے خاندان سے کمتر خاندان کی ماں اور خون دینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اس دن عکس کو اندازہ نہیں ہوا خیر دین کے اس تعارف نے ایک شیر دل پر کیا قیامت ڈھائی تھی بالکل ویسے ہی جیسے خیر دین کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ جس ایک شیر دل پر جان و دل سے فدا تھا اس کا خاندان اس پر کیا قیامت ڈھا چکا تھا۔

شیر دل ایک کرسی کھینچ کر خیر دین کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا رہا تھا اور اس ساری گفتگو کے دوران وہ خیر دین سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ وہ اور اس کا خاندان اس بوڑھے کے خاندان کا بہت حوالوں سے مجرم تھا اور شیر دل ضمیر کو مسلسل سلانے کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اس

بوجھ کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔

وہ خیر دین سے اس دن بھی نظر نہیں ملا سکا تھا جس دن وہ کسی حوالے سے عدالتی نوٹس ملنے کے بعد اس کے پاس گیا تھا۔ خیر دین اس کی شناخت سے بے خبر تھا اگر نہ ہوتا تو کم از کم اس دن وہ ہمیشہ کی طرح اس سے معمول کی گفتگو میں مصروف نہیں رہتا۔ اس کا تعارف اگر صرف عکس مراد علی تک محدود تھا تو پھر اس کا یہ مطلب تھا کہ خیر دین کو اس یقین کے حوالے سے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود یہ نہیں کر سکا۔

پھر خیر دین کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ عکس کے ساتھ دوبارہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

"تمہارا فون ہے میرے پاس۔" عکس نے اپنے شولڈر بیگ کی ایک اندرونی جیب سے اس کا فون نکال کر اس کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے آف ہی رکھا تھا۔" انٹرنیشنل رومنگ کی سہولت ہونے کی وجہ سے شیر دل نے اسے اپنا فون استعمال کرنے کے لیے دیا تھا اور وہ سارے سفر کے دوران اسی فون کے ذریعے کویت اور پاکستان کے ساتھ ساتھ سنگاپور میں شیر دل سے بھی رابطے میں رہی تھی لیکن پاکستان آنے کے بعد اس نے اس فون کو بند کر دیا تھا۔ وہ مسز فاروق کی طرح کسی اور کی کال اٹھا کر شیر دل کے حوالے سے کسی سوال جواب کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ایک بات بتاؤ شیر دل، شہر بانو کی ممی مجھے کیسے جانتی ہیں؟ وہ یہ کیسے جان گئی تھیں کہ سنگاپور میں تمہارے فون پر ان کی کال ریسیو کرنے والی میں ہی ہو سکتی ہوں۔" شیر دل اس کے اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے پہلی بار سنگاپور سے اس کے اس سوال پر فون ڈس کنیکٹ کر کے خود کو بچا لیا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا وہ اس کے بالمقابل کھڑی بے حد سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے پوچھ رہی تھی۔

شیر دل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" یہ جملہ بولتے ہوئے بھی اسے اندازہ تھا کہ وہ کتنا بودا جواب دے رہا تھا۔

"تمہارے اور شہر بانو کے درمیان میری وجہ سے کوئی ناراضی ہے؟" اس بودے جواب کا نتیجہ ایک بے حد ڈائریکٹ اور بے لحاظ سوال میں آیا تھا۔

"تمہاری وجہ سے نہیں، اس کیس کی وجہ سے۔" شیر دل نے اس بار جھوٹ بولنا ضروری سمجھا۔ اس بار وہ اس سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔

"شہر بانو کو اس کیس کا کیسے پتا چل گیا؟ تم نے ذکر کیا؟" اس بار عکس کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔

"ہاں، ممی نے بتایا ہے اسے۔" شیر دل نے کہا۔ عکس چند لمحے خاموش رہی۔

"اس کی ممی جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟" اس نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"میں یہ بھی نہیں جانتا، وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی لیکن پاکستان واپس آ رہی ہے چند دنوں میں...... پتا چل جائے گا۔" عکس کو اس بار پہلی بار احساس ہوا کہ وہ پریشان تھا، تھکا ہوا نہیں تھا وہ اس کے اترے ہوئے چہرے کو تھکن کا نتیجہ سمجھ رہی تھی۔ ایک لمبی بے مقصد خاموشی دونوں کے درمیان آئی پھر عکس نے کہا۔

"شیر دل ہم آج کے بعد دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے نہ ہی فون پر رابطہ کریں گے۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

"کیوں؟"

"میرے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔" عکس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''تمہارے پاس ہر مسئلے کا ایک ہی حل کیوں ہوتا ہے؟ مجھ کو چھوڑ دینا۔'' وہ خفا ہوا تھا۔ ''اس سے آج تک کبھی کوئی مسئلہ حل ہوا؟''

''نہیں لیکن کوئی مسئلہ پیدا بھی نہیں ہوا۔'' اس نے جواباً کہا۔

''تمہارے لیے نہیں ہوا ہوگا میرے لیے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔'' شیر دل نے بے حد کھلے لفظوں میں کہا۔

''میں تمہارا گھر توڑنا نہیں چاہتی شیر دل۔ میں وہ وجہ نہیں بننا چاہتی جو تمہارے اور شہر بانو کے درمیان علیحدگی کا باعث بنے۔'' اس نے شیر دل کی بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے کہا تھا۔

''پھر تم یہ کیس واپس لے لو۔'' وہ شیر دل کے اس جملے پر بول نہیں سکی تھی۔

''میرے اور شہر بانو کے درمیان اگر کوئی مسئلہ ہوا تو تمہارے اس کیس کی وجہ سے ہوگا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''کیوں......؟ تم تو فریق ہو اس میں شہباز حسین کے وارث کے طور پر...... تم تو defend کرنے والے ہو شہباز حسین کے actions کو...... شہر بانو کو کیا مسئلہ ہوگا اس سے۔'' وہ واقعی الجھی تھی۔

''میری فیملی جانتی ہے تم میری دوست ہو۔'' شیر دل نے مدھم آواز میں کہا۔ ''ان کے لیے یہ قابلِ قبول اور ماننے والی بات نہیں ہے کہ تم میری دوست ہوتے ہوئے یہ کیس واپس نہیں لے سکتیں۔'' شیر دل نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے سامنے اسی ایک بات پر اڑا ہوا تھا کہ وہ اسے پریشرائز نہیں کرے گا۔ عکس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

''تو اس کا مطلب ہے اب تمہیں دشمن بنانا پڑے گا۔''

''بنا سکتی ہو؟'' سوال سیدھا سیدھا تھا اور شیر دل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا لیکن صرف وہ جانتی تھی کہ وہ سوال نہیں تھا چیلنج تھا۔ وہ اس سے نظر چرا گئی۔ نظر ملائے رکھنا مشکل تھا۔

''جانتی ہوں میں۔'' عکس نے قدم بڑھا دیا۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔'' وہ ساتھ بڑھا۔

''تم جانتے ہو؟''

''تم ڈھیٹ ہو؟'' شیر دل نے بے ساختگی سے کہا۔

''انگلش میں اسے steadfastness کہتے ہیں اور اکیڈمی میں یہ خصوصیت ہمارے اندر پیدا کرنے پر خاص زور دیا جاتا تھا۔'' وہ تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔ شیر دل اس کی بات سے محظوظ نہیں ہوا۔

وہ جس مصیبت میں پھنسا ہوا تھا اس میں وہ عکس مراد علی کی حسِ مزاح سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا۔

''انکل کو اس سارے معاملے کا پتا تک نہیں ہے اور تم کیس لڑ رہی ہو...... تم آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟''

وہ کچھ جھنجلایا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔

''میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ہم سب انسان ہیں اور ہم سب کی عزت برابر ہوتی ہے اور ہم سب کو اپنے حق کے لیے لڑنے کا حق حاصل ہے اور میں اس پر مزید بحث نہیں کروں گی تمہارے ساتھ...... تم کو میں نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ تم اپنی فیملی کو سپورٹ کرو...... ان کی طرف سے لڑو...... میں اور میرے نانا تمہاری ذمے داری نہیں ہیں، مجھے تم سے اس معاملے میں کوئی توقعات نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی شکایت ہوگی اور ایک شیر دل ہم آج کے بعد نہیں مل رہے۔'' وہ اس بار اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔

''تمہیں جواد نے منع کیا ہے مجھ سے ملنے سے؟'' شیر دل کو پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

''چلو تم ایسا ہی سمجھ لو۔'' وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر اس نے اتنی ہی روانی سے کہا۔ شیر دل اس بار بول نہیں سکا تھا۔ وہ دونوں عجیب خاموشی میں باہر پارکنگ میں اپنی اپنی گاڑیوں تک آئے تھے۔

☆☆☆

''پاپا ہمیں مس کر رہے ہیں نا؟'' شہر بانو اپنا سامان پیک کر رہی تھی جب مثال نے بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں اپنا ایک کھلونا پیکنگ کے لیے لا کر اس کے پاس رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ پاکستان واپس جانے کا سن کر بے حد ایکسائیٹڈ پھر رہی تھی اور اس کی ایکسائٹمنٹ شرمین اور شہر بانو دونوں کے لیے عجیب سے کرب کا باعث تھی۔

''پتا نہیں۔'' اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر پھر اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں وہ مجھے مس کر رہے ہیں۔'' مثال کے یقین میں کمی نہیں آئی تھی۔

''اچھا۔'' شہر بانو نے کسی دلچسپی کے بغیر اپنے کپڑے تہ کرتے ہوئے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو بھی مس کر رہے ہیں وہ۔'' مثال نے چند لمحوں کے بعد جیسے ماں کو عجیب سی تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ کپڑے تہ کرتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ بچے بعض دفعہ ایک جملے سے جیسے بڑوں کو دریا میں ڈبو چھوڑتے ہیں...... شہر بانو کو خود پر عجیب سا ترس آیا تھا۔ کیا وقت آنا تھا یہ تھی کہ اسے اپنی ہی کم سن چند سالہ بچی شیر دل کے حوالے سے تسلی دیتی...... یہ بتاتی کہ وہ اسے مس کر رہا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ کپڑے تہ کرتے کرتے رک کر اس نے مثال کو دیکھا پھر اس سے کہا۔

''مثال اِدھر آؤ۔'' مثال نے اپنے کھلونے اکٹھے کرتے کرتے چونک کر ماں کو دیکھا پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کے پاس آ گئی۔ شہر بانو اسے لیے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے مثال سے پوچھا۔

''اگر ہم کبھی ہمیشہ کے لیے امریکا آ گئے تو تمہیں اچھا لگے گا یہاں رہنا؟'' وہ اس سے کوئی اور سوال کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی زبان پر جملہ کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔

''یس......'' مثال نے بغیر کسی تامل کے بے حد خوشی کے ساتھ اسے یقین دہانی کروائی۔

''ہمیشہ کے لیے؟'' شہر بانو اب اپنے سوال کے مشکل حصے کی طرف آ رہی تھی۔

''یس......'' مثال نے اب بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ کچھ بھی سمجھے بغیر سر ہلایا۔ شہر بانو کچھ دیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''اگر صرف میں اور تم آ جائیں امریکا تو؟'' مثال نے اس بار پہلی بار ماں کا چہرہ غور سے دیکھا اور اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کی جو اس سے کیا جا رہا تھا۔

''صرف میں اور آپ کیوں؟ پاپا کیوں نہیں؟'' شہر بانو کو اس سے اسی قسم کے سوال کی توقع تھی۔

''ہو سکتا ہے پاپا نہ آ سکیں اسی لیے پوچھ رہی ہوں، میں اور تم بہت خوش رہیں گے یہاں...... تم نے دیکھا ہم نے کتنی سیر کی...... کتنا انجوائے کیا ہر جگہ...... سب نے کتنا پیار کیا تمہیں، کتنی ڈھیر ساری چیزیں لے کر دیں۔'' وہ اب اسے وہ سبز باغ دکھا رہی تھی جس میں کرب چھپا ہوا تھا لیکن یہ صرف وہ جانتی تھی۔

''لیکن پاپا ساتھ کیوں نہیں آئیں گے؟'' مثال نے اس کے سبز باغ کے اندر پنہاں پھندے کو دیکھ لیا تھا۔

''پاپا پاکستان میں بہت بزی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ یہاں آ جائیں۔'' شہر بانو اسے divorce کا مطلب سمجھانے کی جرات نہیں رکھتی تھی نہ ہی ابھی اپنے ذہن میں

اس خوفناک چیز کے بارے میں غور کررہی تھی۔

''we can wait جب پاپا کا کام ختم ہوجائے گا تو وہ بزی نہیں ہوں گے تو پھر ہم آجائیں گے۔'' مثال نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ اس نے اپنی طرف سے اس گمبھیر مسئلے کا ایک آسان حل نکالا تھا۔ وہ گمبھیر مسئلہ جو اس کی ماں سے حل نہیں ہورہا تھا۔ شہربانو چند لمحوں کے لیے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

''پاپا کا کام کبھی بھی ختم نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ بزی رہیں گے۔'' مثال نے کچھ الجھ کر ماں کو دیکھا۔

''he told you that'' اس نے جیسے بے یقینی سے ماں سے پوچھا۔

''yes he did'' اس نے آج تک کبھی مثال سے جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن آج وہ اس کے ساتھ جھوٹ بول رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی اب اسے مثال کے سوالوں سے بچنے کے لیے جھوٹ گھڑنا اور جھوٹ بولنا سیکھنا تھا۔

''میں ان سے پوچھوں گی وہ ضرور ہمارے ساتھ امریکا آجائیں گے...... holi days میں۔'' مثال کا باپ پر یقین ابھی بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔

''ہم دونوں اگر اکیلے امریکا میں آگئے تو ہم بہت خوش رہیں گے۔ یہاں گھومنے پھرنے کے لیے بہت ساری جگہیں ہیں...... میں تمہیں ڈھیروں کھلونے دلاؤں گی ڈھیروں چاکلیٹس اور سوئیٹس دلواؤں گی ہم بہت مزہ کریں گے، تم پاپا کو بالکل مس نہیں کروگی۔''

''تو ممی...... I will miss Papa'' مثال نے اس کی بات کاٹ کر جیسے اعلان کرنے والے انداز میں اس سے کہا تھا۔ وہ ہل نہیں سکی پھندے کوئی ایک دو نہیں تھے جو اس کے پاؤں میں تھے وہ ہر طرح سے جکڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے پاپا۔'' شیردل نے ہاسپٹل سے گھر پہنچتے ہی بختیار شیردل سے کہا تھا۔ وہ اس وقت آفس سے گھر آئے تھے اور شام کی فلائٹ سے اسلام آباد جارہے تھے۔ شیردل اور ان کی ملاقات لاؤنج میں ہی ہوئی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے فوراً بعد شیردل نے انہیں کہا تھا۔

''مجھے بھی تم سے کافی ضروری باتیں کرنی ہیں سات بجے کی فلائٹ ہے میری۔ تم آج یہیں ہو؟'' بختیار نے اس سے پوچھا تھا۔

''جی، میں آج یہیں ہوں۔'' شیردل کو ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس سے کس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے۔ عکس کی معطلی ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی اور اس معطلی کے لیے انہیں رضامند کرنے کے لیے بہت کچھ اُن کے علم میں لایا گیا ہوگا۔ یہ شیردل اندازہ کرسکتا تھا۔

''چینج کرکے میرے بیڈروم میں ہی آجاؤ، وہیں بات کرلیتے ہیں۔'' بختیار نے اس سے کہا تھا۔

''تمہاری ممی بھی تب تک آجائیں گی۔''

''میں ممی کے سامنے آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا پاپا، میں اس مسئلے پر آپ سے الگ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' شیردل نے بالآخر کسی تمہید کے بغیر موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ بختیار نے ماتھے پر بل لیے اسے دیکھا وہ الجھ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، ہم منزہ کے سامنے بات نہیں کریں گے، تم بیڈروم میں آجاؤ۔'' بختیار اس سے کہہ کر چلا گیا تھا۔

''آپ نے عکس کو suspend کروایا ہے؟'' آدھے گھنٹے کے بعد بختیار کے پاس بیڈروم میں آکر بیٹھتے ہی شیردل نے براہ راست اس سے پوچھ لیا تھا۔

''ہاں۔'' جواب مختصر تھا مگر وہی تھا جس کی شیردل کو توقع تھی۔ ''اور کیوں کروایا ہے یہ سب بھی تم جانتے ہوگے۔ وہ غیر ذمے دار ہے اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کررہی ہے۔'' بختیار نے اسی سنجیدگی سے ایک ہی سانس میں کہا تھا۔

''وہ ایسا کچھ نہیں کررہی۔'' شیردل نے ان کو ٹوک دیا۔

''تم میرے سامنے اس کو سپورٹ کرنے کا سوچنا بھی مت...... وہ تمہاری دوست ہے اور اس کی جرأت ہے کہ وہ تمہاری ہی فیملی کو ٹارگٹ کررہی ہے اور تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہو۔'' بختیار خفگی سے کہہ رہے تھے۔ ''میں ہمیشہ اس کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتا رہا مجھے اگر یہ اندازہ ہوتا کہ وہ اس طرح کے بیک گراؤنڈ کے ساتھ اس طرح کے کریمنل ریکارڈ رکھنے والے ایک تھرڈ کلاس خاندان سے تعلق رکھتی ہے تو میں تو تمہیں کبھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا اور تم اس سے شادی کے لیے مرے جارہے تھے کسی زمانے میں......'' بختیار کا غصہ بات کرتے کرتے اور بڑھ گیا تھا۔

''آپ سے کس نے کہا ہے کہ وہ کریمنل......'' بختیار نے شیردل کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

''شہباز نے اس کے نانا کو جاب سے اسی لیے نکالا تھا کہ وہ چوریاں کرتا رہا اس کے گھر اور چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔'' اس سے پہلے کہ بختیار کچھ اور کہتا منزہ دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی۔ وہ ابھی ابھی گھر پہنچی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی وہ سین نہیں تھا کہ جو اس وقت اس کے بیڈروم میں ہورہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت سی ہوگئی تھی۔ بختیار کی بلند آواز اور شیردل کے چہرے کے تاثرات اسے سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اندر کیا ہورہا تھا۔

''تم کب پہنچے ہو؟'' منزہ نے جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے شیردل کے سلام کا جواب دیا۔

''منزہ تم کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ ہم ایک اہم مسئلے کو ڈسکس کررہے ہیں۔'' علیک سلیک کے بعد بختیار نے اس سے کہا تھا۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ منزہ کسی بھی طرح ان دونوں کے درمیان ہونے والی اس اہم ڈسکشن کو چھوڑ کر کہیں چلی جاتی۔

''کیس کے بارے میں؟'' اس نے بختیار سے پوچھا اور شیردل کو دیکھا جو ماں سے نظریں چرا گیا تھا۔

''ہاں۔'' بختیار نے مختصراً کہا۔

''تو پھر میں کہیں نہیں جاؤں گی...... آخر اس کے بارے میں ایسا کیا ہے جو آپ دونوں میرے سامنے ڈسکس نہیں کرسکتے۔'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔ بختیار اور شیردل نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بختیار نے کہا۔

''شیردل یہ مسئلہ تمہارے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔''

''ہاں، میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ کیوں یہ مسئلہ میرے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا...... وہ عکس کو reinstate کروانا چاہتا ہوگا، یہ بات تو اس سے برداشت نہیں ہورہی ہوگی کہ اس کی چہیتی کو کچھ ہو۔'' منزہ نے بے حد تلخی سے شیردل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ممی عکس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیس کورٹ میں لڑا جاتا ہے، اس طرح نہیں۔'' شیردل نے بے اختیار اس سے کہا۔

''اس کا قصور نہیں ہے...... وہ پچیس...... تیس سال بعد منہ اٹھا کر میری فیملی کو ذلیل کرنے آگئی ہے اور اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' وہ بہت غصے سے بول رہی تھیں۔

''وہ ذلیل کرنے نہیں آئی آپ کی یا ہماری فیملی کو، یہ کام شہباز انکل نے کیا تھا۔'' شیر دل نے یک دم ماں کو ٹوک دیا۔ منزہ کی رنگت چند لمحوں کے لیے لٹھے کی طرح سفید ہوگئی۔ وہ مر کے بھی شیر دل کے منہ سے شہباز کے لیے ایسا جملہ سننے کی توقع نہیں کرسکتی تھیں۔

''تم اس لڑکی کی زبان مت بولو اس گھر میں...... تم اس لڑکی کی باتوں میں آکر اپنے خاندان پر خود کیچڑ اچھالو گے؟'' بختیار اس بات پر بری طرح برہم ہوگئے۔

''میں اس لڑکی کی زبان نہیں بول رہا ہوں پاپا۔'' شیر دل نے باپ کی بات کاٹی۔

''تم کیا جانتے ہو اس آدمی اور اس کے خاندان کے بارے میں جس کے لیے وہ لڑ رہی ہے، بلیک میلنگ کا طریقہ ہے۔''

منزہ کو یک دم جیسے ہوش آگیا۔ اگر زندگی میں کبھی شہباز حسین کو ان کی ضرورت تھی تو وہ اس وقت تھی۔

''وہ کیوں ہماری فیملی کو بلیک میل کریں گے؟ پوری دنیا میں انہیں اس کام کے لیے ہمارا ہی خاندان کیوں نظر آیا ہے؟'' شیر دل نے بے حد عجیب انداز میں منزہ سے کہا۔ منزہ کو اس کا انداز دہلا رہا تھا۔ شیر دل زندگی میں پہلی بار شہباز کے حوالے سے ان سے اس طرح بات کر رہا تھا۔

''تم جانتے ہو اس لڑکی کے نانا نے شہباز پر کیا الزام لگایا تھا؟ بختیار نے جیسے خاندان کا وہ راز شیر دل سے شیئر کرنے کا فیصلہ کیا جو اُن کی بیوی نے چند دن پہلے ان سے شیئر کیا تھا۔ شیر دل چند منٹ سپاٹ نظروں سے باپ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ایک جملے نے اسے ایک بار پھر اس رات کے جہنم میں پھینک دیا تھا۔

''جانتا ہوں......'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔ ''اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ الزام درست ہے۔'' بختیار کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

''تم اپنے خاندان کے مرد کو اتنا گھٹیا سمجھتے ہو کہ وہ ایک خانساماں کی بیٹی کے ساتھ افیئر چلائے گا، اپنی بیوی اور بیٹی کے ہوتے ہوئے؟'' بختیار نے بہت تیز اور چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

''کون سا افیئر؟'' ان کی بات شیر دل کے سر سے گزر گئی۔

''اس لڑکی کی ماں نے شہباز کے ساتھ تعلقات کا الزام لگایا تھا شرمین کے سامنے۔ اس لڑکی کے نانا نے چوری کے الزام سے بچنے کے لیے اپنی بیٹی کو استعمال کیا۔ شہباز کا گھر تڑوا دیا اس نے۔'' بختیار کہہ رہا تھا اور شیر دل صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''آپ سے ممی نے کہا یہ سب؟'' یہ راکٹ سائنس نہیں تھی کہ وہ سیکنڈز میں یہ نہ جان پاتا کہ بختیار کو یہ سب باتیں بتانے والا کون ہوسکتا تھا۔

''یہ سب کچھ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا صرف اس لیے کہ تمہاری اس لڑکی کے ساتھ دوستی ہے، تم اسے پسند کرتے تھے۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی حالانکہ میں اس لڑکی کے بارے میں یہ سب کچھ پہلے دن سے جانتی تھی۔ اسی لیے منع کر رہی تھی کہ یہ بلیک میلرز کی فیملی ہے۔ تم ان کا حصہ نہ بنو ان کی باتوں میں نہ آؤ۔'' منزہ نے بات شروع کی تو پھر وہ بولتی ہی چلی گئیں انہوں نے شیر دل کے تاثرات نوٹس کرنے کی کوشش نہیں کی یا اگر کی بھی تھی تو انہیں نظر انداز کر دیا۔

''پاپا، شہباز انکل نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اسے قتل کرنے کی کوشش تھی جب وہ نو سال کی تھی

اور اس معاملے کو چھپانے کے لیے انکل شہباز نے عکس کے نانا پر چوری کا الزام لگا کر اسے گھر سے نکال دیا تھا۔'' بختیار اور منزہ پر چند لمحوں کے لیے عجیب سا سکتہ ہوا تھا۔ پھر یہ منزہ تھی جس نے اس خاموشی کو ہذیانی انداز میں یہ کہتے ہوئے توڑا تھا۔

''Shame on you......Shame on you Sherdil...... تم اپنے انکل پر اتنا گھناؤنا الزام لگا رہے ہو...... تم اس دغا باز کی باتوں پر یقین کر رہے ہو؟''

"Just stop lieing... stop lieing Mummy" شیر دل اپنی آواز اور لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ وہ فیصلہ جو ضمیر نہیں کروا پا رہا تھا، وہ گالی کے ایک چھوٹے سے لفظ کی گونج نے کروا دیا تھا۔ منزہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ ان کی اولاد تھی، وہ ان پر چلا رہا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟'' بختیار بھی حواس باختہ ہوگئے۔

''ممی سے پوچھیں۔''

''شہباز یہ نہیں کرسکتا۔'' منزہ نے عجیب انداز میں کہا۔

''ممی سچ کہیں۔'' شیر دل یک دم کرسی سے اٹھ کر منزہ کے پاس چلا گیا۔

''الزام ہے یہ۔''

''میں نے دیکھا تھا انکل شہباز کو اس رات یہ سب کرتے......''

''وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ آدھی رات کے وقت کیسے آئی وہ اس گھر میں...... اپنی مرضی سے آئی ہوگی...... یہ نوکروں کے بچے، بچے تو نہیں ہوتے یہ تو adult ہوتے ہیں۔ میچور ہوتے ہیں۔ یہ بچیاں جان بوجھ کر اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں۔ tempt کرتی ہیں پیسوں کے لیے۔'' شیر دل نے منزہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''مت کہیں ممی...... یہ سب مت کہیں۔ وہ باتیں مت کہیں کہ آپ میری نظروں سے گر جائیں۔ وہ نو سال کی ایک بچی تھی۔ Just a child...... میں نے اسے اس رات بلوایا تھا...... چیس کھیلنے کے لیے، میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔'' وہ انکشاف پر انکشاف کر رہا تھا اور منزہ کی آنکھوں میں عجیب التجا تھی یوں جیسے وہ چاہتی ہوں وہ وہ راز نہ اگلے جو کم از کم ان کے لیے راز نہیں تھا۔ بات کرتے ہوئے شیر دل کی آواز بھرا گئی۔ اس نے منزہ کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیا۔

''اس رات وہاں جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار میں بھی تھا لیکن انکل شہباز...... وہ انسان نہیں تھے He was an animal۔'' وہ ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس بت پر ضربیں لگا رہا تھا جو منزہ اپنے بھائی کا لیے پھرتی تھیں۔ بختیار ساکت تھا اور منزہ گونگی ہوچکی تھیں۔

''انکل شہباز نے ایک خاندان تباہ کیا تھا اس رات...... صرف ایک نہیں...... میں باپ ہوں ایک چار سال کی بچی کا۔ میں سمجھ سکتا ہوں اس تکلیف اور بے عزتی کے احساس کو جو عکس کے نانا کو ہوئی ہوگی۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو اس شخص کو مار ڈالتا جو......'' منزہ نے اس کی بات کاٹی۔

''تم نو سال کے بچے تھے تب خود شیر دل...... تم کیسے سمجھ سکتے ہو یہ سب کچھ...... ہوسکتا ہے تم نے اس رات کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور یہ سب کچھ تمہارے ذہن نے خود بنا لیا ہو۔ خیر دین اور شہباز کا جھگڑا ہوتے اور ان کی باتیں سنتے ہوئے تم نے یہ سمجھ لیا ہو کہ واقعی ایسا کچھ ہوا تھا...... تم کتنی باتیں اور چیزیں اپنے پاس سے گھڑ لیا کرتے تھے۔'' منزہ ایک عجیب اضطراب کے عالم میں ایک آخری کوشش کر رہی تھیں شہباز کی عزت بچانے کی۔ ایک آخری کوشش...... اپنے مرے ہوئے اکلوتے بھائی کو اس کے گناہ پر کی

جانے والی ملامت سے بچانے کی آخری کوشش۔ ''آپ کو تو یاد ہی ہوگا بختیار...... یہ کیسی کیسی باتیں سوچ لیا کرتا تھا بچپن میں...... جو ممکن ہی نہیں ہوتی تھیں اور ہم ہنستے تھے اس کی باتوں پر کہ کیا imagination ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رک گئیں۔ بختیار کی آنکھوں میں کچھ تھا جو انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

''انہی دنوں یہ بہت اپ سیٹ تھا۔ اکثر راتوں کو ڈر جاتا تھا...... آپ کو تو یاد ہوگا آپ امریکا میں تھے اور جب واپس آئے تھے تو آپ بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے...... ہوسکتا ہے اس نے خواب میں ایسا کچھ دیکھا ہو اور اس نے سچ سمجھ لیا ہو۔'' منزہ نے یک دم اپنی بات بدل دی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ ان کی بات ناقابلِ قبول تھی وہاں بیٹھے ہوئے دونوں مردوں کے لیے۔

''ممی! آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتی تھیں انکل شہباز نے کیا، کیا تھا۔'' شیر دل نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ماں کو ایک بار پھر ٹوک دیا۔ ''میں شاید تیرہ چودہ سال کا تھا جب شہباز انکل اور شرمین آنٹی کے درمیان divorce ہوئی کیونکہ شرمین آنٹی کو اس سارے جھگڑے کا پتا چل گیا تھا۔ آپ نے انکل شہباز کو گھر بلایا تھا۔ ان سے بات کی تھی۔ میں نے وہ باتیں سنی تھیں۔'' منزہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''انہوں نے آپ سے کہا تھا وہ شراب پیے ہوئے تھے اس رات جب چڑیا ان کے اسٹڈی روم میں چیس کھیل رہی تھی، وہ اتفاقاً وہاں چلے گئے تھے اور انہیں نہیں یاد انہوں نے کیا کیا...... شاید کچھ غلط ہوا ہو...... لیکن انہوں نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا تھا...... وہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ آپ شرمین کو سمجھائیں اور آپ نے ان پر چلانے اور غصہ کرنے کے بعد ان سے کہا تھا کہ وہ جھوٹ بولتے رہیں۔ اس جرم کا کبھی اعتراف نہ کریں۔ I had heard every single word of your conversation اور مجھے آپ دونوں کی ایک ایک بات آج بھی یاد ہے...... مجھے شرمین آنٹی کے ساتھ آپ کا آرگومنٹ بھی یاد ہے...... کیا آپ کو وہ بھی سناؤں۔'' منزہ کے کندھے پہلی بار جھکے۔ تنا ہوا جسم اور گردن یک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ کچھ رازوں کو کہیں بھی دبا آؤ، وہ کہیں نہ کہیں سے باہر نکل آتے ہیں...... کچھ آوازوں کو کتنا ہی دبا لو اُن کی بازگشت کہیں نہ کہیں سے ضرور سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے شکست خوردہ انداز میں شیر دل کا چہرہ دیکھا پھر بختیار کا۔ وہ اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کو ان کی نظروں میں ولن بننے سے نہیں روک پائی تھیں۔

''Disgusting'' انہوں نے بختیار کی آواز سنی۔ وہ لفظ کوڑے کی طرح پڑا تھا ان پر۔ وہ جانتی تھیں وہ کس کے لیے کہا گیا تھا...... شہباز کے لیے...... ان کے جان سے عزیز چھوٹے بھائی کے لیے۔ وہ لوگ شہباز کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ لوگ کبھی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ سر جھکا کر وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگیں۔ وہ شہباز حسین کو دوسری بار بھی نہیں بچا سکی تھیں۔

☆☆☆

''مونی میں چاچا کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔'' سات سالہ شہباز نے بے حد اضطراب کے عالم میں منزہ کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' وہ اصرار کررہا تھا۔

''تم ہمیشہ مجھے اسی طرح تنگ کرتے رہتے ہو...... چاچا کے ساتھ اکیلے جانے میں تمہیں کیا مسئلہ ہے، جاؤ سوئمنگ کے لیے...... ورنہ ممی آئیں گی اور ان کو پتا چلا کہ تم نے آج پھر سوئمنگ مس کردی ہے تو وہ ناراض

ہوں گی۔'' گیارہ سالہ منزہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے بیٹ مین کو آوازیں دینا شروع کردی تھیں۔ ننھے شہباز پر ایک عجیب سا خوف لہرانے لگا۔ خوف، بے چارگی، بے بسی...... منزہ ہمیشہ الجھتی تھی جب شہباز بیٹ مین حفیظ گل کے ساتھ کہیں بھی جانے سے بری طرح بدکتا تھا۔ حالانکہ حفیظ گل ان کا بارہ سال پرانا بیٹ مین تھا۔ ان دونوں کی پیدائش سے بھی پہلے سے حسین کے پاس کام کررہا تھا۔ اور بے حد وفادار اور قابلِ اعتبار تھا۔ وہ واحد ملازم تھا جس پر حسین اور اس کی بیوی اپنے بچوں کے حوالے سے اندھا اعتبار کرتے تھے۔ منزہ، حفیظ گل کے ساتھ بے حد اٹیچڈ تھی اور حفیظ گل شہباز پر جان چھڑکتا تھا لیکن وہ شہباز پر جتنا نثار رہتا تھا، شہباز اس سے اتنا ہی بھاگتا تھا۔ حفیظ گل کے ساتھ اکیلے کہیں جانے سے اس کی جان جاتی تھی لیکن جیسے ہی حفیظ گل سامنے آجاتا تھا وہ بالکل گونگا ہوجاتا تھا پھر وہ میکانیکی انداز میں اس کے ساتھ چل پڑتا تھا۔

چالیس سالہ حفیظ گل شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ وہ ایک بے حد مستعد، خوش مزاج اور محنتی آدمی تھا۔ ایمانداری اس کی ایک اور خوبی تھی اور اس کی انہی تمام خوبیوں نے اسے حسین کے گھر کا ایک فرد بنا دیا تھا۔ وہ کھلے عام گھر میں کہیں بھی آجاسکتا تھا۔ بچوں کے کمرے تک میں...... اور یہ آمدورفت صرف حسین اور اس کی بیوی کی موجودگی میں ہی نہیں رہتی تھی ان کی عدم موجودگی میں بھی حفیظ گل کو گھر کے ہر حصے تک آنے جانے میں اتنی ہی آزادی تھی۔

شہباز حسین کو بچپن سے حفیظ گل ہی نے کھلایا تھا۔ حسین آرمی میں تھا اور حفیظ گل ان کے ساتھ جاتا تھا۔ دونوں میاں بیوی بے حد سوشل تھے خاص طور پر حسین کی بیوی۔ منزہ کے حوالے سے وہ بچپن میں کچھ محتاط رہی تھی لیکن شہباز کو بچپن سے ہی اس نے زیادہ تر حفیظ گل کے سر پر ہی ڈالا ہوا تھا۔ وہ لیڈیز کلب کی ایک سرگرم عہدے دار تھی۔ دونوں میاں بیوی کا تعلق اپر کلاس سے تھا اور ان کے شوق اور سرگرمیاں بھی بے شمار تھیں۔ وہ دونوں خود بھی نوکروں والے گھروں میں نوکروں کے ہاتھوں ہی پلے بڑھے تھے ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ ننھے شہباز کو حفیظ بہت بچپن میں ہی حسین یا اس کی بیوی کے کہنے پر پرام میں ڈال کر باہر سڑک پر گھمانے لے جایا کرتا تھا یا اپنے کوارٹر میں لے جاتا۔ حسین یا اس کی بیوی کو کبھی اندازہ نہیں ہوا وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کے لیے ایک جہنم تیار کررہے تھے نہ انہیں کبھی حفیظ پر یہ شبہ ہوا کہ اس کے کردار میں کوئی خرابی ہوسکتی ہے...... نہ ہی شہباز کے آہستہ آہستہ حفیظ سے دور بھاگنے کی کوشش پر انہیں کبھی یہ احساس ہوا کہ ان کا بچہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔

پہلی بار شہباز نے دس سال کی عمر میں بالآخر اپنی بہن کے ساتھ اپنی زندگی کا وہ جہنم دکھایا تھا جس میں وہ پچھلے کئی سالوں سے جھلس رہا تھا۔ منزہ شاک میں آگئی۔ چودہ سال کی اس بچی کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ماں باپ کو یہ سب بتادے جبکہ شہباز اس سے اصرار کررہا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے ورنہ حفیظ گل ان سب کو مار ڈالے گا۔ اس نے منزہ کو ان چاقوؤں کے بارے میں بتایا تھا جو حفیظ گل کے پاس تھے اور اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ کس طرح ان چاقوؤں کے ساتھ اس کے ماں باپ کو ذبح کردے گا اور پھر ان کے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کردے گا جس طرح وہ ہر بقرعید پر ان بکروں کے کرتا تھا جنہیں وہ قربانی کے لیے حسین کے گھر پر ذبح کرتا تھا۔

اس نے منزہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی کو نہیں بتائے گی لیکن وہ اسے حفیظ گل سے بچالے گی... اور منزہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی لیکن وہ اپنے آپ پر کنٹرول نہیں کرسکی تھی۔ شدید طیش کے عالم میں اس نے اپنا ٹینس ریکٹ نکالا تھا اور وہ بھاگتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی.... حفیظ گل پورچ میں کھڑی گاڑی

دھو رہا تھا۔ منزہ نے باہر نکلتے ہوئے بھاگتے ہوئے حفیظ گل کے سر پر عقب سے وہ ریکٹ مارا تھا۔ حفیظ گل خوش قسمت تھا کہ ریکٹ کی ضرب سے اس کو نقصان نہیں پہنچا لیکن وہ چلّا کر بے اختیار اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ دس سالہ شہباز خوف کے عالم میں بھاگتا ہوا باہر آیا لیکن وہ بیرونی دروازے سے باہر نہیں نکل سکا۔ اس نے اپنی چودہ سالہ بہن کو اس ٹینس ریکٹ کو فرش پر گرے حفیظ گل پر برساتے دیکھا اور اس نے حفیظ کو کسی کیچوے کی طرح اپنے دفاع کی کوشش میں زمین پر لوٹتے پوٹتے اپنے سر اور چہرے کو بچانے کی کوشش کرتے دیکھا...... جن مکھی بن گیا تھا...... وہ جن جو ایک بچے کے پورے بچپن کو کھا گیا تھا، وہ کتنا کمزور اور ڈرپوک تھا، یہ اس بچے نے وہاں کھڑے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ منزہ جو کچھ اس پر ریکٹ برساتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی، حفیظ گل کو وہ چند جملے ہی یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اس کا بھیانک راز افشا ہو چکا تھا۔ حسین اس وقت تک کرنل بن چکے تھے اور ایک کرنل ایک بیٹ مین کے ساتھ اس واقعے کے بعد کیا کر سکتا تھا۔ حفیظ گل کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ حسین اور اس کی بیوی دونوں اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ حفیظ کے پاس اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع تھا۔ وہ ان دونوں بچوں کو جان سے مار دیتا اور گھر میں چوری کی واردات ہو جانے کا ڈراما کرتا تو وہ بچ سکتا تھا، یہ اس کا خیال تھا۔ مار کھاتے کھاتے اس نے منزہ اور اس کے ریکٹ کو پکڑ لیا تھا اور منزہ نے یک دم بلند آواز میں چلّانا شروع کر دیا تھا۔

دروازے میں کھڑا شہباز، منزہ کو حفیظ کی گرفت میں اس طرح چلّاتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بھی دروازہ کھول کر بلند آواز میں روتے اور چلّاتے ہوئے باہر آ گیا تھا۔ حفیظ گل بہ مشکل منزہ کا منہ دبا کر اس کی آواز بند کر پایا تھا مگر وہ ایک وقت میں دونوں بچوں کا شور ختم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی وہاں پورچ میں دن کے وقت...... صرف چند منٹ لگے تھے اور آرمی آفیسرز کی اس کالونی میں آس پاس کے گھروں سے بیٹ مین اور دوسرے لوگ نکل کر بھاگتے ہوئے وہاں آ گئے تھے۔ بند گیٹ کے پار پہلے شخص کو دیکھتے ہی حفیظ گل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بیٹ مین گیٹ کے اوپر سے کود کر اندر آ گیا تھا اور تب حفیظ گل نے بے اختیار منزہ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر بھاگتا ہوا گھر کے عقب میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ وہاں اکٹھا ہونے والا مجمع جب تک اس کوارٹر تک پہنچ کر دروازہ توڑ کر اسے اندر سے نکالتا وہ اپنے پاس موجود ایک ریوالور سے اپنے آپ کو شوٹ کر چکا تھا۔

حفیظ گل ختم ہو گیا تھا لیکن اگلے کئی سال تک حسین اس کی بیوی اور وہ دونوں بچے اس trauma سے باہر نہیں نکل پائے تھے...... اور شہباز حسین ساری زندگی بچپن کے ان اذیت ناک سالوں کے سائے میں رہا تھا۔ حسین نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بہترین سائیکاٹرسٹ کے پاس زیر علاج رکھا تھا۔ وہ اس کے ذہن اور اس کی مسخ شدہ شخصیت کو ایک بار پھر سے سنوارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ شہباز آہستہ آہستہ نارمل ہوتا گیا تھا یا کم از کم اس کے والدین کو یہ لگا تھا کہ وہ نارمل ہو رہا ہے لیکن انسانی ذہن بچپن کے تکلیف دہ واقعات اور حادثات کو بڑے عجیب طریقوں سے رجسٹر کرتا ہے۔ زندگی میں ان یادوں کا کھاتہ کبھی

بھی کھل سکتا ہے اور کھل جاتا ہے۔ شہباز کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

شراب نوشی کی عادت اس نے امریکا میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں اپنائی تھی اور اس عادت کا تعلق اس ڈپریشن کو ختم کرنے کی کوششوں سے تھا جو کبھی کبھار اچانک بچپن کے اس حادثے کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے ہو جاتا تھا۔ اس کی زندگی میں صرف یہی ایک سیاہ داغ تھا جو اس نے شرمین کے ساتھ کورٹ شپ اور شادی کے بعد بھی اس سے شیئر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی بڑا ہو جانے کے بعد اس کے ماں باپ اور منزہ میں سے کسی نے اس سے دوبارہ کبھی ان تمام تکلیف دہ واقعات کے بارے میں بات کی تھی لیکن اس حادثے کے بعد منزہ شہباز کے ساتھ جیسے سائے کی طرح لگی رہی تھی۔ وہ اس کے علاوہ اب اور اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے ماں باپ کی طرح وہ بھی اس حادثے کے لیے خود کو بھی blame کرتی تھی۔ اگر وہ شہباز کے اصرار پر اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی اور زبردستی مجبور کر کے حفیظ گل کے ساتھ نہ بھیجتی تو شاید یہ کبھی نہ ہوتا۔ چودہ سال کی ایک بچی ہوتے ہوئے بھی وہ ایک بڑی بہن کے طور پر اپنی کوتاہیوں پر نادم تھی۔

اس حادثے کے بعد جو ایک تبدیلی حسین کے خاندان میں آئی تھی، وہ نوکروں کے لیے ان کا بدلا ہوا رویہ تھا۔ وہ نوکروں پر اب کسی بھی طرح سے اعتبار کرنے پر تیار نہیں تھے نہ اعتبار کرنے پر نہ ہی ان کے ساتھ بے تکلفی رکھنے پر...... ایک واضح لکیر تھی جو اس خاندان نے مالک اور نوکر کے درمیان کھینچ دی تھی۔

اور زندگی میں اس trauma کے ساتھ پل کر بڑا ہونے والا شہباز حسین اس رات ہمیشہ کی طرح ڈپریشن کے ایک اور دورے میں تھا اور اس ڈپریشن پر قابو پانے کے لیے اس نے ہمیشہ کی طرح اس رات بھی شراب نوشی کی تھی اور شراب کے اس نشے میں اس نے اپنی اسٹڈی میں چڑیا کو دیکھا تھا۔ وہ اسٹڈی میں صوفے کے پاس پڑی ایک سینٹر ٹیبل پر اس کی میگنیٹک چیس لیے گھٹنوں کے بل ٹیبل پر اپنی کہنیاں ٹکائے بڑے اشتیاق سے بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازہ اس وقت کھلا تھا اس لیے اس نے شہباز حسین کے کمرے میں داخل ہونے کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے پورے

انہماک کے ساتھ چیس بورڈ کی طرف متوجہ تھی۔ شہباز حسین کی طرف اس کی پشت تھی۔ کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی شہباز نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک عجیب سی خفگی اور غصے نے اسے اپنی گرفت میں لیا تھا۔ وہ بغیر اجازت رات کے اس پہر ان کی اسٹڈی میں کس طرح آگئی تھی اور کیوں آئی تھی۔ انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور اس بار قدموں کی چاپ پر چڑیا کچھ ہڑبڑائی اور اس نے بیٹھے بیٹھے مڑ کر دروازے کو دیکھا۔ وہاں ایک بونا کھڑا تھا...... ایک بے حد بدصورت بونا۔

☆☆☆

عکس نے اپنی آنکھیں بند کر کے رگڑیں پھر غنی سے کہا۔

''تھینک یو۔'' اس نے چند لمحے پہلے میز پر وہ خط لفافے میں ڈال کر رکھا تھا جو اس کا پی اے اس کے آفس کی کچھ دوسری ڈاک کے ساتھ اس کے لیے لے کر آیا تھا۔ وہ اس کی معطلی کی منسوخی کے آرڈرز تھے۔ اسے فوری طور پر اسی جگہ اور اسی عہدے پر دوبارہ کام کرتے رہنے کا حکم دیا گیا تھا جہاں وہ کام کر رہی تھی۔ دو دن کی معطلی میں اس کے ماتحت عملے میں جیسے ایک ہلچل مچ گئی۔ اس نے چھٹی بڑھا لی تھی اور وہ ابھی بھی لاہور میں خیر دین کے پاس ہی تھی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے...... دو چار دنوں میں انکوائری بھی رک جائے گی...... شوکاز نوٹس بھی کینسل ہو جائے گا۔'' غنی اسے بتا رہا تھا۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا بختیار، شیر دل کو کیا ایشو ہوا ہے تم سے......؟ تمہارے اور شیر دل کے درمیان اب دوستی نہیں ہے کیا؟......'' غنی اپنی کافی میں چمچ ہلاتے ہوئے کچھ الجھے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ عکس کے معطل ہونے کی خبر پر سب سے پہلے اسے فون کرنے والا وہی تھا۔ عکس نے اس کا اصل مسئلہ بتانے کے بجائے ٹال مٹول والے انداز میں اس سے بات کی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ غنی جب اسے بحال کروانے کی کوشش کے لیے اپنا اور اپنی فیملی کا اثر و رسوخ استعمال کرے گا تو اسے یہ جاننے میں دقت نہیں ہوگی کہ اسے معطل کرنے اور انکوائری کے لیے پریشر کہاں سے آیا تھا اور وہ یقیناً اسی طرح ہکا بکا رہ جائے گا جس طرح وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ بختیار شیر دل کی فیملی اگر establishment کا ایک ستون تھا تو غنی حمید کا خاندان دوسرا ستون تھا۔ عکس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس دوسری فیملی سے بھی کسی نہ کسی طرح وابستہ تھی...... غنی اور اس کی دوستی پسندیدگی اور غنی کی طرف سے شدید قسم کی پسندیدگی کے بہت سارے مراحل طے کرنے کے باوجود شادی جیسے رشتے میں تبدیل نہیں ہو سکی تھی...... غنی ڈرنک کرتا womanizer تھا اور جاب میں آنے کے بعد مالی بے ضابطگیوں میں بھی انوالو ہوتا رہا تھا۔ شیر دل اور اس کے خاندان کے درمیان فرق صرف reputation کا تھا۔ شیر دل کے خاندان کا دامن اس حوالے سے صاف تھا اور ان کی reputation اور کارکردگی غنی حمید کے خاندان سے بہت بہتر تھی جو سیاسی گھرانوں کے زیادہ قریب تھا اور ان پر نوازشات کرنے اور انہیں ان سے مراعات لینے کا ماہر تھا۔

غنی حمید کے خاندان کی ایسی ساکھ نہ بھی ہوتی تب بھی عکس کے لیے اس کو ریجیکٹ کرنے کے

لیے یہ وجہ کافی تھی کہ وہ شراب پیتا تھا۔ صرف غنی حمید ہی نہیں، کسی بھی مرد کو رد کرنے کے لیے اس کے لیے یہی ایک وجہ کافی تھی۔ وہ زندگی میں بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ کمپرومائز کر سکتی تھی لیکن شراب پینے والے مرد کے ساتھ نہیں۔ یہ ایک چیز تھی جسے وہ شعوری یا لاشعوری کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کر پائی تھی۔ شیر دل نے غنی کی ان عادات کے بارے میں اسے بہت پہلے بتا دیا تھا اور شیر دل کے سامنے یہ ظاہر کرنے کے باوجود کہ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی، عکس، غنی کے حوالے سے ایک دم بہت محتاط ہو گئی تھی۔ غنی کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنے کے بعد عکس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شیر دل نے اس کے حوالے سے جو بھی کہا تھا، وہ صرف جیلسی نہیں تھی حقائق تھے۔ غنی نے عکس کے سامنے کسی گفتگو میں ایک بار شراب پینے کا اعتراف کیا تھا اور بہت فخریہ انداز میں کیا تھا۔ البتہ اس نے عکس کے سامنے کبھی لڑکیوں کے ساتھ اپنے افیئرز اور تعلقات کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس حوالے سے محتاط تھا۔ یہ وہ بات تھی جو کسی بھی عورت کے لیے قابلِ قبول نہ ہوتی اور اتنے کھلے اعترافات کے بعد کوئی بھی لڑکی ایسے کسی شخص کو لائف پارٹنر بنانے سے پہلے سو بار سوچتی لیکن غنی کو اندازہ نہیں تھا کہ عکس کے لیے اس کی شراب نوشی اس کے افیئرز سے زیادہ repulsive تھی۔ غنی حمید کو اس نے ان مردوں کی فہرست میں کبھی شامل ہی نہیں کیا تھا جنہیں وہ لائف پارٹنر کے طور پر چننے کے لیے غور کرتی۔ غنی نے جب پہلی بار اسے پرپوز کیا تھا تو عکس نے اسے بڑے واضح اور صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ اسے بہت پسند کرتی تھی لیکن دوستی کے علاوہ اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں چاہتی۔

غنی نے اس کے انکار کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ اپنی رائے بدل دے گی خاص طور پر اس لیے کیونکہ ان کے درمیان بہت اچھی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ شیر دل کے برعکس غنی حمید status conseious ہونے کے باوجود شادی کے معاملے میں اپنی پسند کو ایک حسب نسب کی شادی پر ترجیح دینے پر یقین رکھتا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اپنے خاندان کو عکس کے ساتھ اس کی شادی کرنے پر تیار کر لے گا اور اس کا اظہار اس نے

عکس سے کئی بار کیا تھا۔

''شیر دل نے تمہیں میرے حوالے سے برین واش کیا ہے؟'' غنی حمید نے کئی بار شادی کا پروپوزل رد ہونے کے بعد بالآخر عکس سے کہا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا ان کی دوستی کے دوران میں کہ ان کے درمیان شیر دل کے حوالے سے اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب عکس کو احساس ہوا کہ غنی حمید، شیر دل سے ہمیشہ بے نیازی اور لاتعلقی ظاہر کرنے کے باوجود بھی اس سے خائف تھا۔ وہ شیر دل کے چارم سے خائف تھا...... عورتوں میں اس کی مقبولیت سے خائف تھا اور وہ کبھی بات نہ کرنے کے باوجود بھی شیر دل اور عکس کی دوستی سے خائف تھا۔

''شیر دل نے مجھ سے کبھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہا۔'' عکس نے زندگی میں پہلی بار شیر دل کے حوالے سے غنی سے جھوٹ بولا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''یہ سفید جھوٹ ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''شیر دل اور کبھی تم سے میرے بارے میں کچھ نہ کہتا ہو، وہ میرا بچپن کا حریف ہے۔ میں اور وہ ایک دوسرے کی کمینگی کو تمہارے لاکھ جھوٹ کے ساتھ بھی پہچانتے ہیں۔'' اس نے عکس کا مذاق اڑایا۔

''میری زندگی کے کسی فیصلے پر شیر دل کی کسی رائے کا اثر نہیں ہوتا۔'' عکس نے ایک اور جھوٹ بولا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا تھا کم از کم اس نے اس بات پر اس کو ٹوک کر اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا تھا۔ عکس کے ساتھ اتنا عرصہ رہنے کے بعد اسے بھی یہ اندازہ تھا کہ وہ دوسروں کی باتوں اور رائے کے مطابق اپنے فیصلہ نہیں کرتی...... لیکن اس مسئلے میں بات شیر دل کی ہو رہی تھی اور وہ عکس اور شیر دل کی close association سے واقف تھا...... ایک لمبی بحث تھی جو اُن دونوں کے درمیان تب ہوئی تھی اور اس بحث کا نتیجہ وہی رہا تھا جو پہلے تھا۔ غنی حمید بہت مایوس ہوا تھا لیکن اس نے عکس کے انکار کو کسی ذاتی ہتک کے طور پر نہیں لیا تھا نہ ہی انا کا مسئلہ بنایا تھا۔ ان دونوں کے درمیان دوستی اسی طرح چلتی اور قائم رہی تھی جیسے پہلے تھی۔ عکس مراد علی، غنی حمید کے بیچ میٹ کی واحد لڑکی تھی جس کے ساتھ غنی حمید کی اس طرح کی دوستی تھی...... باقی لڑکیوں کے ساتھ غنی حمید کی چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی اور اس حوالے سے بہت کم ہی کوئی لڑکی ایسی تھی جو غنی حمید کی دل سے عزت یا احترام کرتی ہو۔ شیر دل اس کے برعکس ایک پرفیکٹ جنٹلمین تھا خواتین بیچ میٹس کے ساتھ وہ بھی بے تکلف تھا اور ان میں بہت پاپولر بھی لیکن اس کی بے تکلفی اور دوستیاں ایک حد تک رہتی تھیں۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ فضول چھیڑ چھاڑ کے حوالے سے بے حد محتاط تھا اور شیر دل میں بے حد دلچسپی کے باوجود اس کے حوالے سے کسی لڑکی کو کوئی ناگوار تجربات نہیں ہوئے تھے۔ اس کی ریپوٹیشن اس حوالے سے بہت اچھی تھی...... اور عکس مراد علی اپنے کامن کے ''ہیرو'' اور ''ولن'' دونوں کے ساتھ قریبی دوستی رکھتی تھی۔ ''ہیرو'' اور ''ولن'' اس کے لیے ایک جیسا احترام رکھتے تھے۔ یہ ایک عجیب وغریب تکون تھی جو ان تینوں کے درمیان تھی۔ اس تکون کو غیر متوازن ہونے سے بچانے کا سارا کریڈٹ عکس مراد علی کو جاتا تھا۔

''شیر دل کے ساتھ میرا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟'' وہ غنی حمید کے سوال پر مسکرا دی۔

''پھر بختیار شیر دل نے کیوں......؟'' عکس نے غنی کو ٹوک دیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''میرے نانا نے اپنے پروفیشنل کیریئر میں اپنے ساتھ ہونے والی ایک بے انصافی کے لیے کیس کیا ہے اور وہ شیر دل کے ایک انکل کے خلاف ہے جو کبھی ان کے پاس رہے تھے۔'' اس نے بہت مختصراً غنی سے کہا۔

''wow۔'' وہ بے اختیار کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''وہ یقیناً ایک کارنامہ تھا۔ اور تم نے انہیں کرنے دیا؟'' غنی کے لیے حیرت کا اصل باعث یہ بات تھی۔

''ہاں۔'' عکس یہ چھپا گئی کہ کیس اس کی طرف سے تھا اور شیر دل بھی اس میں نامزد تھا ایک وارث کے طور پر۔

''Now I understand۔'' غنی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور شیر دل کے ساتھ اب اس کیس کے بعد تو......'' عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''we are still friends۔'' اس نے کہا۔ وہ بے یقینی سے مسکرا دیا۔

''مشکل کام ہے۔ میں شیر دل کی جگہ ہوتا تو کبھی ایسی دوستی نہیں رکھ سکتا تھا۔'' غنی نے بے ساختہ کہا۔ عکس مسکرا دی۔

''تم شیر دل نہیں ہو غنی۔'' کیا تھا اس جملے میں کہ غنی ہل نہیں سکا تھا۔ اس نے اپنے اور شیر دل کے تعلق کو اس سے پہلے ایسے واضح لفظوں میں نہیں جتایا تھا۔ غنی بہت دیر تک بول نہیں سکا۔

''تم سمجھتی ہو کہ شیر دل اپنی فیملی کے بجائے تمہیں سپورٹ کرے گا...... کیونکہ تم اس کی دوست ہو؟'' ایک لمبی خاموشی کے بعد غنی نے عجیب مذاق اڑانے والے انداز میں اسے سلگایا۔

''سپورٹ کا میں نے نہیں کہا اور نہ ہی مجھے اس کی سپورٹ کی ضرورت ہے...... لیکن دوست ہم اس جھگڑے کے بعد بھی رہ سکتے ہیں۔''

''خوش فہمی ہے تمہاری۔'' غنی نے اسی انداز میں کہا۔ آج پہلی بار شیر دل کے لیے عکس کی یہ جانبداری اسے زہر لگی تھی۔

''انسانوں کے حوالے سے میں خوش فہمیاں رکھنے کی قائل نہیں ہوں۔ یہ کام ساری زندگی نہیں کیا تو اب کیا کروں گی۔'' وہ اسی اطمینان سے بولی۔

''مجھ سے کیوں اس کیس کی بات نہیں کی تم نے؟ میں آخری حد تک جا کر تمہاری مدد کرتا۔'' غنی نے یک دم بات بدلتے ہوئے کہا۔

''اپنے مسئلے انسان کو خود نمٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' وہ مسکرا دی۔

''مجھے جاننا ہے یہ سب۔'' غنی نے کچھ دیر خاموش رہتے ہوئے اس سے کہا۔ اس پوری گفتگو کے دوران میں پہلی بار اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے غنی کو یہ بتانا چاہیے تھا یا نہیں کہ اس کی اور

جواد کی منگنی ختم ہوچکی تھی۔

''شیر دل سے کہو وہ اس ایشو پر تمہاری مدد کرے لیکن اپنی زندگی کی اس اسٹیج پر بختیار شیر دل کے خاندان سے کسی قسم کا جھگڑا مول مت لو۔'' عکس کو یقین نہیں آیا یہ مشورہ اسے غنی حمید دے رہا تھا۔ شیر دل اور اس کے خاندان کا ازلی حریف۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ شیر دل کا خاندان اس مسئلے پر تمہیں کس حد تک تنگ کر سکتا ہے اور جواد اور اس کی فیملی کبھی تمہیں سپورٹ نہیں کرے گی۔ وہ تمہارے نانا کے ایک پرانے مسئلے کے لیے شیر دل خاندان کی دشمنی کبھی مول نہیں لیں گے نہ ہی تمہیں لینے دیں گے۔'' وہ اس وقت ایک مخلص دوست کی طرح اور صرف دوست ہی بن کر اسے مشورہ دے رہا تھا۔ جواد کے خاندان کو وہ بھی شیر دل کی طرح اچھی طرح جانتا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں...... پوری کوشش کروں گا کہ کہیں بھی تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو کم از کم پروفیشنلی لیکن عکس یہ پاکستان ہے...... یہاں ایک عورت کو دھمکانے اور تنگ کرنے کے لیے بہت سے طریقے اور حربے ہیں۔ ابھی انکوائری اور شوکاز نوٹس اختیارات کے غلط استعمال کے حوالے سے ہے۔ کل کو تمہاری character assasination بھی کی جاسکتی ہے یا کروائی جاسکتی ہے۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہمارے جیسے ملک میں اس کا عورت ہونا ہے اور مرد کی سب سے بڑی طاقت اس کا مرد ہونا...... یہ پیدائشی تفریق اور امتیاز ہے جو یہ معاشرہ کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہ تعلیم، کیریئر اور باقی ساری چیزیں مل کر بھی اس بیلنس آف پاور (طاقت کے توازن) کو عورت کے حق میں تبدیل نہیں کرواسکتیں...... تو انکل خیر دین کو کوئی ایسا کام مت کرنے دو جس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے۔ وہ انکل خیر دین کو کچھ نہیں کہیں گے، وہ جو بھی کہیں گے تمہیں کہیں گے۔ تمہیں پہنچنے والا نقصان تمہارے نانا کے پیر اکھاڑنے اور انہیں پچھاڑنے کے لیے کافی ہوگا...... اور میں تمہیں نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ خاموش بیٹھی بڑی سنجیدگی اور غور سے غنی حمید کی ایک ایک بات سنتی رہی اور اس نے اعتراف کیا کہ اس نے غنی کو underestimate کیا تھا۔ وہ شیر دل سے کدورت اور تعصب رکھنے کے باوجود اس معاملے پر بہت حقیقت پسند ہو کر اسے اپنی رائے دے رہا تھا۔

''غنی، جواد سے میری منگنی ختم ہوچکی ہے۔'' اس نے اس کی اس گفتگو کے جواب میں کہا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

''کب؟...... کیوں؟''

''آٹھ دس دن پہلے۔ اس کی فیملی کچھ ناخوش تھی اس رشتے سے۔'' اس نے شیر دل کے حوالے سے جواد کے الزامات غنی سے شیئر نہیں کیے۔

''اس کی فیملی ناخوش تھی تو یہ مسئلہ تو رشتہ ہونے سے پہلے اٹھنا چاہیے تھا۔ اب شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد۔'' وہ یک دم سے بے حد خفا ہوگیا۔ ''میں اپنے کچھ رشتے داروں کے ذریعے ان کو اپروچ کرتا ہوں۔ ہمارے کچھ رشتے داران کے قریبی فیملی فرینڈز میں سے ہیں۔''

''نہیں غنی، میں اب اس رشتے کو دوبارہ جوڑنا نہیں چاہتی جو بھی ہوا اچھا ہوا اور ٹھیک وقت پر ہوگیا اور مجھے کوئی افسوس نہیں ہے اس حوالے سے۔'' اس نے غنی کو روک دیا۔ وہ واقعی نہیں چاہتی تھی کہ غنی اس کے اور جواد کے درمیان کسی پیچ اَپ کی کوشش کرے اور اسے جواد سے یا اس کی فیملی سے عکس اور شیر دل کے افیئر کے حوالے سے منزہ کے الزامات کے بارے میں پتا چلے۔ جواد وہ رشتہ ختم نہ بھی کرتا تو جو کچھ اس نے جواد کے منہ سے اپنے اور شیر دل کے حوالے سے سنا تھا، اس کے بعد وہ کبھی اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش مند نہ ہوتی۔ وہ ایک تنگ نظر سوچ اور ذہنیت کے ساتھ جانتے بوجھتے ہوئے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ ایشو صرف شیر دل کا نہیں تھا، ایشو کسی بھی مرد کا ہو سکتا تھا، سو اس نے اگر یک طرفہ الزامات پر اسے صفائی کا موقع دیے بغیر اس پر فردِ جرم لگا دی تھی تو یہ سب کچھ دوبارہ بھی ہو سکتا تھا۔ بار بار ہو سکتا تھا خاص طور پر اس لیے کیونکہ وہ ورکنگ وومن تھی اور ایک ایسے کیریئر میں تھی جس میں مردوں سے میل جول اس کا روزمرہ کا معمول تھا...... اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ جواد کی خواہش تھی وہ اپنی جاب کو شادی کے بعد بھی جاری رکھے۔ وہ زندگی میں بہت سے جھمیلوں سے نبرد آزما رہی تھی لیکن وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ جانتے بوجھتے صرف شادی شدہ کا لیبل لگوانے کے لیے کسی جہنم میں نہیں کود سکتی تھی۔

''میں جواد کو اتنا کمزور نہیں سمجھتا تھا کہ گھر والوں کے کہنے میں آکر وہ اس طرح کا قدم اٹھا لے۔ اگر اتنا ہی کمزور تھا وہ تو پہلے کس طرح اپنی فیملی کو منایا تھا اس نے؟'' غنی حمید چند بار مل چکا تھا جواد سے...... اور اب وہ حیران تھا جواد اور اس کی فیملی کی طرف سے کیے جانے والے اس فیصلے پر۔

''جو بھی ہوا...... ہم دونوں کے لیے بہت اچھا ہوا۔ میں اسے اس بریک اپ کے لیے الزام نہیں دینا چاہتی۔'' عکس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں پھر بھی کہوں گا کہ میری اس بات کے بارے میں سوچو۔'' غنی نے کہا۔ وہ اس کا ریفرنس سمجھ گئی۔

''غنی...... یہ سارے حساب کتاب اس کیس کو شروع کرنے سے پہلے میں کر چکی تھی۔ میں عورت ہوں...... یہ معاشرہ میرے لیے کتنا تعصب رکھتا ہے اور میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے مجھے اس کا فرسٹ ہینڈ ایکسپیرینس ہے۔'' اس نے کافی کا آخری سپ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ معاشرہ میرے لیے اپنے اصول اور ضابطے اور روایات نہیں بدلے گا لیکن میں پھر بھی انصاف کے لیے آواز اٹھاؤں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں کیس ہار جاؤں گی۔ یہ ہوگا کہ مجھے کیریئر میں نقصان پہنچے گا۔ جاب سے ہٹانا آسان نہیں ہے لیکن وہ مجھے OSD بنا دیں گے اور ایک لمبے عرصے تک مجھے پوسٹنگ ہی نہیں ملے گی۔ میرے بیچ میٹس کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے اور میں کہیں بھی نہیں...... کیریئر assasination کریں گے...... الزامات لگائیں گے...... میں ایک مشکوک کردار والی آفیسر کہلائی جاؤں گی...... اور...... بس...... اس سے بڑھ کر کیا ہوگا؟'' وہ بے حد سنجیدگی سے غنی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں نے اور میرے نانا نے زندگی میں ہر چیز کے لیے بہت جدوجہد کی تھی۔ جدوجہد کا لفظ میرے لیے نیا نہیں ہے اور نہ ہی مجھے جدوجہد کرنے سے خوف آتا ہے۔ جنگ میں بھی ہر سپاہی کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہی جنگ جیتیں گے۔ صرف امید ہوتی ہے کہ وہ اگر پوری طاقت سے لڑیں تو جنگ جیت سکتے ہیں...... میں بھی اسی امید کے ساتھ یہ کیس لڑ رہی ہوں۔" وہ بول رہی تھی اور وہ اس کی بات کاٹے بغیر سن رہا تھا۔

"میں عورت ہوں اور میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں، یہ معاشرہ اور مرد تھوڑی طے کریں گے میرے لیے...... یہ تو میں طے کروں گی کہ میں کیا کر سکتی ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے اور جب ایک دفعہ ایک عورت ایک ناممکن کام بھی کر لے گی تو پھر معاشرہ اور مرد نہ بھی بدلے...... وہ سوچے گا ضرور...... میں بس اتنا سا فرق چاہتی ہوں اس معاشرے میں...... اور اتنا سا تو لا ہی سکتی ہوں...... پہلا آدمی جو ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے نکلا تھا، اسے لوگوں نے پاگل کہا تھا...... آج اس کا نام تاریخ کا حصہ ہے۔ انصاف کے لیے جدوجہد کرنا "انسان" کا حق ہے صرف "مرد" کا حق نہیں ہے...... اور میں ایک انسان ہوں...... اور ایک انسان کے طور پر اپنے حق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے میں ہر طرح کے چیلنجز کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔" غنی حمید نے اس عورت کو عجیب مرعوب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا وہ اس عورت کا احترام کرنے پر ایسے ہی مجبور نہیں ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی "نسوانیت" کو اتنا "نڈر" نہیں دیکھا تھا۔ غیر متزلزل لہجے میں بڑی نرم آواز میں کہی گئی دوٹوک بات...... وہ اکیڈمی میں اپنے اسی انداز اور لب و لہجے کے لیے پہچانی جاتی تھی۔ اپنے اسی انداز سے کشتوں کے پشتے لگاتی تھی۔ Come what may...... والی بے جگری جو بہت سے مردوں میں بھی ناپید تھی۔

"As expected......" وہ مسکرا کر گہری سانس لیتے ہوئے بالآخر اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "مجھے پتا تھا تم سے میں یہی کچھ سننے والا ہوں Aks Murad Ali. you are one hell of a good speaker۔" اس نے اسے داد دی تھی۔ وہ مسکرا دی۔

"میں دیکھوں گا، کیا کر سکتا ہوں تمہارے لیے اس سلسلے میں۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی غنی...... میں اپنا ہوم ورک بہت اچھی طرح کر چکی ہوں اور میں اس کیس کو میرٹ پر جیتنا چاہتی ہوں تعلقات کے ذریعے نہیں......" عکس نے اسے دوٹوک انداز میں کہا۔

☆☆☆

مثال نے شیر دل کو بہت دور سے دیکھ لیا تھا۔ شہر بانو کے دیکھنے سے بھی پہلے...... وہ ارائیول لاؤنج کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور ان کا منتظر تھا۔ مثال یک دم بے حد خوشی کے عالم میں شہر بانو کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پاپا، پاپا کہتے ائرپورٹ کی اندرونی عمارت کے

سامنے دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کی آواز پر شیر دل نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اس نے بہت دور سے مثال کے لیے اپنے بازو پھیلا دیے تھے۔ شہر بانو نے اس سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ اس نے اپنی نظر کسی اور طرف کر لی۔ بختیار شیر دل کے عملے کا ایک شخص امیگریشن کاؤنٹر پر پہلے ہی ان دونوں کی انٹری کروا کر ان دونوں کا بیگیج وصول کر کے ٹرالی میں سامان لیے ان کے ساتھ تھا۔ شہر بانو نے واپسی کی اطلاع اور فلائٹ کے ٹائم کے بارے میں صرف منزہ ہی کو بتایا تھا اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ ائرپورٹ پر شیر دل اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگا۔ وہ فی الحال اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک عجیب سے رنج اور غصے نے ایک بار پھر اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ جب تک لاؤنج سے باہر آئی۔ مثال شیر دل کی گود میں چڑھی ہوئی اس کی گردن کے گرد بازو ڈالے اس سے باتوں میں مصروف تھی۔ شیر دل، مثال سے باتیں کرنے کے ساتھ ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ چوم رہا تھا لیکن ساتھ وقفے وقفے سے وہ دور سے آنے والی شہر بانو کے قریب آ جانے کا بھی منتظر تھا۔ جسے اس نے ائرپورٹ کی Exit تک پہنچتے پہنچتے سن گلاسز پرس سے نکال کر آنکھوں پر چڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ واضح طور پر اس سے eye contact سے بچنا چاہتی تھی۔ شیر دل سے سن گلاسز کے بغیر نظر نہ ملانا تو آسان تھا لیکن آنکھوں میں امڈتی نمی کو روک لینا بہت مشکل۔ وہ چلتے ہوئے بالآخر اس کے قریب آ گئی۔ شیر دل نے ہمیشہ کی طرح ایک بازو پر مثال کو اٹھائے ایک بازو خیر مقدمی انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف پھیلایا تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ایک دم اپنے عقب میں آتے پروٹوکول والے اس اہلکار سے اس سامان کے حوالے سے کچھ کہا اور چند منٹوں تک وہ وہاں کھڑی اس سے بات کرتی رہی۔ شیر دل کو اندازہ ہو گیا تھا وہ کس موڈ میں تھی۔ اس کے ساتھ کھڑے اس کے ڈرائیور اور عملے کے ایک دوسرے شخص نے پروٹوکول اہلکار سے وہ سامان لے لیا تھا اور پارکنگ کی طرف جانے لگے۔ شہر بانو بھی اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ان کے پیچھے چل پڑی۔

"فلائٹ کیسی تھی؟" مثال کو اٹھائے اس کے ساتھ چلتے ہوئے شیر دل نے اس کے موڈ کو بحال کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

"ٹھیک تھی۔" سرد مہری سے جواب آیا۔

"مثال نے تنگ تو نہیں کیا؟" شیر دل نے گفتگو کے سلسلے کو ایک اور سوال سے جوڑے رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" لہجے کی خنکی برقرار تھی۔ شیر دل اس سے بات کرنے کی ایک اور کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی مثال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

گاڑی سے گھر تک کے سفر میں دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شیر دل، مثال سے باتیں کرتا رہا۔ ڈرائیور اور گارڈ کی موجودگی میں وہ نہیں چاہتا تھا ان کے درمیان کسی قسم کا آرگومنٹ

ہو۔ نہ ہی وہ شہر بانو کی سرد مہری اور بگڑا ہوا موڈ ملازمین کے نوٹس میں لانا چاہتا تھا۔

وہ پہلا سفر تھا جس سے واپسی پر شہر بانو کو بالکل خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ائیر پورٹ سے GOR تک کے سفر میں باہر جھانکتی مسلسل ڈپریسڈ رہی۔ شیر دل اور مثال کے درمیان ہونے والی کسی گفتگو پر اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ صرف کھڑکی سے باہر آس پاس کے ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ شیر دل، مثال سے باتوں کے دوران وقفے وقفے سے اس کو دیکھتا اور الجھتا رہا۔ ان کی شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا بڑا کرائسس آیا تھا اور نہ اس سے پہلے شہر بانو کی خفگی کو اس نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ منٹوں میں نہیں تو گھنٹوں میں مان جاتی تھی۔ کبھی اتنے دن نہیں گزرے تھے ان کی بات چیت ختم ہوئے...... اور اب اسے اپنے سامنے اس طرح کے موڈ میں دیکھ کر شیر دل کو صورتِ حال کی سنگینی کا صحیح معنوں میں احساس ہوا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ بہر حال پاکستان آچکی تھی اور وہ اس کو سامنے بٹھا کر اس سے بات کر سکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا انہوں نے منزہ کے ساتھ کھایا تھا...... منزہ اور شہر بانو کے درمیان رسمی بات چیت کے سوا اور کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ شہر بانو کو منزہ بہت بجھی بجھی لگی تھی۔ اس کے اور شیر دل کے درمیان موجود خاموشی کو بھی اس نے نوٹس کیا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ کھانے کی میز پر شیر دل کے سامنے نہیں تو کھانے کے بعد وہ اس سے کچھ بات چیت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اسے صورتِ حال میں ہونے والی کسی نئی تبدیلی کے بارے میں آگاہ کرے گی لیکن منزہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

کھانے کے کچھ دیر بعد شیر دل نے واپسی کا اعلان کر دیا تھا۔ شہر بانو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وہ لوگ سہ پہر کو ہی گھر پہنچ گئے تھے۔ مثال راستے میں ہی شیر دل کی گود میں سو گئی تھی اور شہر بانو بھی اتنی تھکی ہوئی تھی کہ وہ بھی گاڑی کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑکی سے تقریباً چپکی ہوئی سو گئی تھی۔ شیر دل نیند کی حالت میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ سفر کے دوران اس کے ساتھ لگ کر سونے کے بجائے گاڑی کی سیٹ اور دروازے کے ساتھ ٹک کر سوئی تھی۔ شیر دل اسے ہمیشہ کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لپٹا لینا چاہتا تھا۔ سڑک پر آنے والے ہر گڑھے کے دھچکے پر وہ بے اختیار شہر بانو کو دیکھتا تھا یوں جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کا سر دروازے سے زیادہ زور سے نہ ٹکرا جائے۔ وہ کئی دفعہ ان دھچکوں سے جاگتی رہی لیکن پھر سو جاتی۔ پتا نہیں وہ پورے راستے کون کون سی چیزیں خواب میں دیکھتی رہی تھی۔ سمندر کے زیرِ آب مچھلیاں اور عجیب عجیب سے پودے اور جانور...... عجیب شکل کے گھونگھے اور سیپیاں...... وہ زیرِ آب پانی میں تیر نہیں رہی تھی قدم اٹھاتے ہوئے چل رہی تھی جیسے وہ چہل قدمی کر رہی ہو اور پھر اس نے سمندر کی تہ میں بہت سے حصوں والا اور رنگوں والا ایک عجیب وغریب آکٹوپس دیکھا جو بالکل ساکت تھا۔ وہ اس کے قریب چلتی گئی...... اور قریب...... پھر اس نے آکٹوپس کے سر پر موجود ایک آنکھ کو یک دم کھلتے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ گئی۔

''شیبی گھر آگیا ہے۔'' گاڑی ان کے پورچ میں کھڑی تھی اور شیر دل اس کے کندھے کو تھپک

رہا تھا۔ وہ اس کا کندھا تھپتھپانے کے بعد خود سوئی ہوئی مثال کو کندھے سے لگائے ہوئے گاڑی سے نکل گیا۔ شہر بانو کچھ دیر کے لیے اسی طرح پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ وہ اس کا گھر تھا نہ اس کے اندر داخل ہونے والا شخص اس کا وہ شوہر جس پر وہ کبھی جان چھڑکتی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ وہ عجیب دل گرفتگی سے بوجھل وجود کے ساتھ نیچے اتر آئی۔

شیر دل بیڈ روم میں نہیں تھا۔ وہ یقیناً مثال کے بیڈ روم میں اس کے پاس تھا۔ شہر بانو کمرے میں داخل ہوتے ہی کپڑے تبدیل کیے بغیر بیڈ پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ شیر دل جب تک بیڈ روم میں آیا وہ گہری نیند میں تھی...... ہمیشہ کی طرح بیڈ کے ایک کونے میں کسی ننھے بچے کی طرح سکڑی سمٹی ہوئی...... شیر دل نے کمبل کھول کر اس پر پھیلا دیا پھر وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر آئے ہوئے بالوں کو اس نے غیر محسوس انداز میں بہت آہستگی سے چہرے سے ہٹا دیا تھا۔ وہ نیند میں تھی لیکن اس حالت میں بھی تھکن اور اسٹریس اس کے چہرے پر چھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس کے قریب بیٹھا یہ طے کرتا رہا کہ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں اسے کیا کہنا تھا۔ منزہ نے اپنے غصے اور جوش میں اسے بے حد مشکل میں پھنسا دیا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو کی آنکھ کھلی تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ بیڈ روم میں اندھیرا تھا۔ اس نے سائڈ ٹیبل لیمپ جلا کر گھڑی دیکھی پھر برابر والے بیڈ پر دیکھا، وہ خالی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سات آٹھ گھنٹے سو لینے کے بعد بھی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا اور اسے بھوک لگ رہی تھی۔

کپڑے تبدیل کرنے اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد وہ کچن میں آگئی۔ انٹر کام کے ذریعے کسی ملازم کو بلانے کے بجائے وہ ایک ہلکا سینڈوچ اور کافی تیار کر کے واپس بیڈ روم میں لے آئی اور تب اس کا سامنا شیر دل سے ہوا۔ وہ واش روم سے نائٹ سوٹ پہن کر نکلا تھا۔

''فریج میں کھانا تھا، تم ملازم کو کہتیں وہ کھانا لگا دیتا۔'' اس نے شہر بانو کے ہاتھوں میں سینڈوچ اور کافی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جواب دینے کے بجائے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ شیر دل نے بیڈ سائڈ ٹیبل سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور چند لمحے کھڑے کھڑے چینل سرفنگ کرتا رہا۔ وہ شہر بانو کو دانستہ موقع دے رہا تھا کہ وہ سینڈوچ اور کافی ختم کر لے۔ چینل سرفنگ کرنے کے دوران ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنا سینڈوچ ختم کر چکی تھی۔ ٹی وی آف کرتے ہوئے ریموٹ واپس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ صوفے پر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ کافی کے سپ لے رہی تھی۔

''تم کب تک ناراض رہنے کا ارادہ رکھتی ہو؟'' اس نے بڑی نرمی سے صلح جو انداز میں کہا۔

''عکس نے پاپا کے خلاف کیوں کیس کیا ہے؟'' اس کے سوال کا جو جواب آیا تھا اس نے شیر دل کو چند لمحوں کے لیے خاموش کرا دیا تھا۔ وہ شہر بانو سے اتنے سیدھے سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ چند لمحے جیسے وہ کچھ سوچتے ہوئے وہ لفظ ڈھونڈتا رہا جس میں وہ شہر بانو کو کچھ مناسب جواب دے سکے۔

''انکل شہباز اور اس کے نانا کے درمیان کچھ مسئلہ ہوا تھا۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ شاید

انکل شہباز نے اس کے نانا کو غلط سزا دی تھی کسی کو بھی جاب سے اس طرح نکالا نہیں جا سکتا جس طرح انہوں نے عکس کے نانا کو نکالا تھا۔ وہ اس punishment کو چیلنج کر رہی ہے اور اسے revoke کروانا چاہتی ہے۔'' اس نے بڑے نپے تلے الفاظ میں شہر بانو کو سمجھایا۔ وہ شہر بانو کو خیر دین کے ساتھ ہونے والے اصل ظلم کی تفصیلات نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ منزہ نہیں تھی جسے یہ سب جتانا اور بتانا ضروری تھا۔

''اتنے سالوں بعد اسے یہ سب کیوں یاد آیا ہے؟'' وہ بے حد عجیب لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

''کوئی کبھی بھی اپنی چیز کو کلیم کر سکتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی بے انصافی پر آواز اٹھا سکتا ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہ وقت کیوں chose کیا ہے۔'' شیر دل نے ایک بار پھر بڑے نپے تلے لفظوں میں اس سے کہا۔

''پاپا کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔'' اس کی بات کے جواب میں شہر بانو نے کافی کا مگ سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے مستحکم اور دوٹوک انداز میں کہا۔ شیر دل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ یہ جملہ نہ بھی بولتی وہ تب بھی جانتا تھا کہ وہ شہباز سے کس طرح کی وابستگی رکھتی تھی۔ اسے اس سے اسی طرح کے جملوں کی توقع تھی۔ ''میں کبھی یہ نہیں مان سکتی کہ انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہوگی۔ انہوں نے جو بھی کیا ٹھیک کیا ہوگا۔'' اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تو شیر دل نے کہا۔

''ہر انسان غلطی کر سکتا ہے۔ error of judgement ہر ایک سے ہو سکتا ہے اور شہباز انکل بھی ایک انسان تھے۔'' شہر بانو اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تلخ مسکراہٹ آئی۔

''اور تمہاری غلطی کیا ہے، مجھ سے شادی؟'' شیر دل ایک بار پھر اس کی بات کے جواب میں فوری طور پر نہیں بول سکا۔

''ایک بات بتاؤ شیر دل...... تم عکس سے محبت کرتے ہو؟...... اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

☆☆☆

خیر دین لاٹھی کے سہارے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں بیٹھے مرد اور عورت میں سے مرد کھڑا ہو گیا تھا لیکن یہ صوفے پر بیٹھی ہوئی عورت تھی جس کے چہرے نے خیر دین کو فریز کیا تھا۔ اتنے سالوں کے بعد بھی اسے دقت نہیں ہوئی تھی اس عورت کو پہچاننے میں۔ وہ مصافحہ کرنے والے اس شخص کو ایک شیر دل کے والد کے طور پر پہچانتا تھا اور اس کے ساتھ موجود وہ عورت اگر بختیار شیر دل کی بیوی تھی تو پھر ایک شیر دل...... وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا آ گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

حصارِ محبت

عقیلہ حق

وہ کاغذ اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ جس پر لکھی تحریر اس نے پچھلے چار دنوں میں نہ جانے کتنی دفعہ پڑھی تھی۔ جس پر لکھے اِک اِک لفظ پر نہ جانے اس نے کتنے آنسو بہائے تھے۔ جس کو پڑھتے پڑھتے نہ جانے وہ کتنا سفر کر چکی تھی۔ نہ جانے کون کون سی بات تھی جو یاد نہ آئی۔ کون سا زخم تھا جو اُدھڑا نہ تھا، کون سا دکھ تھا جو یاد نہ آیا۔ یہ کاغذ جس کی ہر سطر میں اس کا تشخص جھلک رہا تھا۔ جس کے ہر لفظ سے محبت

ٹپک رہی تھی۔ جس میں کیا گیا ہر سوال جواب کی امید رکھتا تھا۔ جس میں آس تھی، امید تھی، زندگی تھی، خوشی تھی۔

ان چند سطروں میں واضح تھا کہ وہ بے مول نہیں۔ وہ بھی۔۔۔ انمول ہے، وہ راہ کا پتھر نہیں...... مان لیا گیا ہے وہ تاج میں لگانے والا یاقوت ہے۔ آج فیصلے کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہے لیکن آج اس نے کلینڈر پر نگاہ ڈالی۔ آج فیصلے کا دن ہے اگر آج کا سورج ڈوب گیا۔ اگر آج کا دل گزر گیا تو...... تو پھر یہ صرف کاغذ کا اِک ٹکڑا رہ جائے گا۔ ایک سفید، سادہ کاغذ جس پر کوئی تحریر کسی نے نہیں لکھی اور پھر اس کی زندگی......

☆☆☆

”ندرت تم کہاں ہو؟ کہاں کونوں کھدروں میں گھسی بیٹھی رہتی ہو؟“ اور ندرت جو کچن میں کھڑی اپنی ساس کے ناشتے کے لیے بل دار پراٹھے بنا رہی تھی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ اندر کی طرف دوڑی کہ احسن کے غصے سے اس کی جان جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں جب احسن گھر میں ہوتا تو اس کا سارا اعتماد کہاں غائب ہو جاتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر کام غلط کیوں ہونے لگتا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ احسن اس کا ہر کام غلط ثابت کر دیتا۔

”مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے، میرا بریف کیس کہاں ہے؟“ احسن چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے اس کو دیکھتے ہی دہاڑا۔

”یہ رہا!“ اس نے ڈریسنگ روم میں سے بریف کیس لا کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ روز یہیں تو رکھتے ہیں۔“ اس نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔

”تو محترمہ زوجہ صاحبہ آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مخصوص جگہ پر ہونے کے باوجود میں آپ کو ستانے کے لیے آوازیں دے رہا تھا.. یا آپ کے رخِ روشن کا میں بہت دیوانہ ہوں، آپ کو دیکھے بغیر مجھے چین نہیں آتا، سانس رکنے لگتی ہے، سو بہانے بہانے سے آپ کو آوازیں دیتا ہوں۔“ احسن نے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے اس کے کلیجے میں چٹکیاں لینے والے انداز میں کہتے ایک طنزیہ نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا جہاں ناشتے کی میز پر اس کی ماں ساری کارروائی سنتے ہوئے مطمئن انداز میں چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”بات بے بات میری بے عزتی کرنا، میرے وجود کی تحقیر کرنا، شاید احسن کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔“ اس نے آنکھ میں آئے آنسو پیے اور واپس کچن کی طرف چل دی کہ ناشتے میں دیر ہو جانے کے سبب اب ساس کی صلواتیں بھی تو سننی تھیں۔

☆☆☆

احسن سے میری شادی، میری امی کے ایک جاننے والی نے کروائی، احسن ایک کاروباری، خوش شکل، تعلیم یافتہ لیکن ایک انا پرست مرد ہیں۔ ایک ایسا مرد جس کے نزدیک بیوی صرف پیر کی جوتی ہوتی ہے۔ عورت صرف مرد کی تسکین کے لیے ہوتی ہے۔ عورت صرف عورت ہوتی ہے، انسان نہیں۔ نہ عورت کو سوال کرنے کا حق ہے اور نہ جواب طلب کرنے کا اختیار......

احسن کا اپنا الیکٹرونکس کا بزنس ہے۔ گھر میں خوشحالی ہے، پیسے کی فراوانی ہے، کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ان کے پاس سب کچھ ہے صرف میرے لیے عزت نہیں ہے۔ محبت نہیں ہے، ان کی تجوری بھری ہے لیکن میرے کاسۂ دل میں ڈالنے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں۔ ان کو کون بتائے کہ عورت اللہ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ ایک عورت کو صرف عزت ہی دوسری عورت سے ممتاز کرتی

ہے۔ بازاری عورت کے بھی دو ہاتھ، دو پیر، اور ایک چہرہ ہوتا ہے لیکن وہ معاشرے میں دی گئی عزت ہی کی وجہ سے وہ ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے منصب پر فائز ہوتی ہے۔ ایک اللہ پر ایمان رکھنے والے، عورت کے بارے میں اللہ کے احکامات بھول جاتے ہیں، وہ رسول خدا ﷺ کی نصیحت کو کیوں فراموش کر بیٹھے، وہ اپنے آخری نبی ﷺ کی وصیت کو بھی بھلا بیٹھے، کیوں؟

میں ندرت سلامت علی اپنے والدین کی لاڈلی بیٹی دو بھائیوں اور دو بہنوں سے چھوٹی، اماں کی لاڈلی اور ابا کی آنکھ کا تارہ تھی۔ جب میں نے بی فارمیسی.... میں گولڈ میڈل لیا تو اپنے بابو جی کی آنکھوں میں چمکتا فخر آج بھی میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑاتا ہے۔ میں اپنے تعلیمی دور کی بہترین شاعرہ، مقررہ اور ڈرامیٹک سوسائٹی کی صدر تھی۔ میرے برجستہ فقرے محفل کو زعفرانِ زار بنا دیتے۔ میرے مضامین اخبارات میں تہلکا مچاتے۔ جس مشاعرے میں جاتی وہ مشاعرہ میرا ہو جاتا، تقاریر میں میرے دلائل پر مخالفین کو پسینہ آ جاتا۔ میری یہ تمام صلاحیتیں میری کم تعلیم یافتہ سسرال میں میرے لیے طعنہ بن گئیں اور میں اس چکر میں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی اچھی بیویاں اور اچھی بہویں ہوتی ہیں...... سب کچھ کہیں رکھ کر بھول گئی یاد رہا تو صرف یہ کہ وقتِ رخصت جب کسی نے سرگوشی میں کہا کہ بھائی دیکھو، یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی اور باپ کی لاڈلی بیٹی سسرال میں کیا کرتی ہے تو میرے بابو جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ یہ میری بیٹی ہے! یہ مجھے کبھی شرمندہ نہیں کرے گی اور مجھے ان کا مان رکھنا تھا۔ مجھے ثابت کرنا تھا کہ میرے ماں باپ کا فخر درست تھا، میرے ماں باپ کی تربیت میں کہیں جھول نہیں اور مجھے یقین ہے کہ جدوجہد مسلسل رائگاں نہیں جاتی۔ ایک دن میرے بھی دن بدلیں گے.. لیکن کب......

☆☆☆

میں نے ندرت کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے پہلی دفعہ اس کو شادی کی رات اپنے بستر پر تمام حشر سامانیوں کے ساتھ اپنے لیے سجا سنورا دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو تو میں اس کی معصومیت اور کم عمری میں کھو سا گیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ سب فراموش کر دوں لیکن میرے کانوں میں میری ماں کی سرگوشی گونج رہی تھی۔

”دیکھ احسن وہ کم عمر ہے اور بہت پڑھی لکھی ہے، آج جو جیت گیا وہ جیت گیا...... تو مرد ہے اور تجھے مردوں کی طرح رہنا ہے، یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بہت نخرے والی اور چالاک ہوتی ہیں۔ مردوں کو دبا کر، مرد بن کر ان کو رہنا آتا ہے لیکن یاد رکھ تو مرد ہے۔ میرا اکلوتا شیر، جا اندر جا اور بلی مار دے۔“

”بھائی جان تم میرے اکلوتے بھائی ہو، بدل نہ جانا، تم جانتے ہو میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں۔“ میری چھوٹی لاڈلی بہن جس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا تھا۔

تو دوسرے کان میں میرے دوستوں کے قہقہے اور محبت بھرے طنز کہ اتنی حسین دلہن ملنے کے بعد میں ہاتھوں سے گیا۔ وہ لوگ باطن کی نگاہ سے مستقبل کا جورو کا غلام دیکھ رہے تھے۔ میں ان سب کو بھول کر بیوی کو پیارا ہو جاؤں گا۔

اور واقعی میں سب کچھ بھول گیا، یاد رہا تو صرف یہ کہ ایک کامنی نازک سی لڑکی میرے بستر پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے۔ جس پر میں شرعی حق رکھتا ہوں اور وہ مجھے بے حد پسند آئی ہے اور اتنا تو میرا حق تھا کہ آج کی رات اور اس کے بعد آنے والی چند راتوں تک میں ہر چیز بھول جاؤں۔ یاد رکھنے کے لیے پوری زندگی کافی ہے اور میں بھی تو وقتی طور پر ہی

بھولا تھا......اور میں سب کچھ بھول کر اس میں کھو گیا۔

☆☆☆

رات کو وہ احسن کے بستر پر ایک گلاب کی طرح کھلتی، چنبیلی کی طرح مہکتی، کلیوں کی طرح چٹکتی اور صبح ایک سمجھدار اور ہمدرد ساتھی کی طرح ساتھ ہوتی۔ گھر کے ماحول میں رچی بسی بہو ہوتی......خوب صورتی اس کے انگ انگ سے ٹپکتی سمجھداری لفظ لفظ میں بولتی۔ وہ واقعی نعمت تھی اور جو نعمت ناشکروں کے ہاتھ لگ جائے تو کیا ہوتا ہے؟

☆☆☆

جلد ہی احسن کو احساس ہو گیا کہ وہ ایک بہت سمجھدار اور پُراعتماد لڑکی ہے اور احسن جیسا خود پرست مرد یہ کیسے برداشت کرتا کہ کوئی اس سے برتر ہو......وہ بھی ایک لڑکی۔

اور لڑکی بھی وہ جو بیوی ہو، جو صبح اٹھو تو گھر میں موجود اور شام کو استقبال کے لیے موجود، اس کی کیا وقعت اور پھر قدم قدم پر ماں کی ہدایتیں بھی تو ساتھ تھیں۔ اب کچھ خمار بھی تو اترنے لگا تھا اور جب مرد کا خمار اترے اور انا حاوی ہو تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو احسن نے ندرت کے ساتھ کیا۔ وہ اس پر پیر رکھتا چلا گیا اور وہ کسمسائی تک نہیں اور کچل گئی۔ ایک گھر کی خواہش عورت کو کیسے پامال کرتی ہے، کوئی اس سے پوچھتا لیکن کون پوچھتا۔

☆☆☆

''احسن دیکھیں میرا آرٹیکل اخبار میں چھپا ہے۔'' اس نے احسن کے آگے خوشی سے اخبار پھیلاتے ہوئے کہا۔

''تو......؟''

''تو کیا......! پڑھیں!'' خوشی میں وہ احسن کی سرد مہری کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو ندرت اب یہ چھچھورپن چھوڑو، شاعری ہو رہی ہے، آرٹیکل لکھے جا رہے ہیں، دو بچوں کی اماں ہو، تمیز اور طریقے سے رہو، ویسے تو یہ کہتی ہو کہ ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی تو ان فضولیات کے لیے ٹائم کیسے ملتا ہے۔'' اس نے سفاکی سے کہا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں احسن......کبھی کبھار لکھ لیتی ہوں لیکن آپ کے یا گھر کے کس کام کو تو میں پسِ پشت نہیں ڈالتی۔ نہ جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے کبھی میرے کسی کام سے خوش ہی نہیں ہوتے۔ لوگوں کی معمولی صورت شکل کی بیویاں ہوتی ہیں اور وہ اس قدر محبت کرتے ہیں، آپ نہ میری تعریف کرتے ہیں نہ کبھی کوئی محبت بھری بات کرتے ہیں، میں نے ہر چیز پر صبر کر لیا لیکن کم از کم میرے شوق کی تو بے عزتی مت کیا کریں۔'' وہ رو دی۔

''تو کیا آپ کو یہ خوش فہمی ہے کہ آپ خوب صورت ہیں۔'' احسن قہقہہ مار کر ہنسا اور وہ دم بخود اس کی طرف دیکھے گئی۔

کبھی کبھی ہوتا ہے نا کہ کہنے کو ایک لفظ نہیں رہتا دیواریں بولتی ہیں، جسم کا......عضو بولتا ہے لیکن زبان خاموش رہتی ہے اور وہ بھی خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

''احسن کہاں کی تیاری ہے بیٹا؟'' وہ آفس سے آ کر شاور لے کر نکلا ہی تھا کہ اس کی امی چلی آئیں۔ وہ احسن کی سوتیلی والدہ تھیں کہ اس کی سگی ماں تو اس کی پیدائش پر ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں لیکن انہوں نے احسن کو ایک سگی ماں ہی کی طرح پالا تھا اور اپنی بیٹی شہناز اور احسن میں کبھی فرق نہیں سمجھا......احسن بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا اور ان کی ہر بات احسن کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

''کہیں نہیں امی!'' احسن نے گیلا تولیا صوفے کی پشت پر پھیلا کر گیلے بالوں کو انگلیوں سے درست کرتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔

''آج تمہارا بیوی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟''

''نہیں تو، کیوں......؟''

''بس صبح سے بیگم صاحبہ کا منہ سوجا ہوا ہے، نہ کسی سے کوئی بات چیت نہ کوئی کام، سارا دن کمرے میں منہ لپیٹے پڑی رہی، میں نے تو کچھ پوچھا نہیں۔ پتا نہیں پلٹ کر کیا کہہ دے، بھائی کماؤ مرد کی بیوی ہے، مجھ بیوہ کو تو ڈرنا ہی چاہیے۔'' دلشاد بیگم بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ کمرے میں چائے لے کر آتی ندرت کے قدم جیسے من من کے ہو گئے۔

''امی، آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے سارے گھر کا کام تو کیا تھا، آپ کو وقت پر کھانا اور دوائی دی، میرے دانت میں درد تھا اس کی وجہ سے میرے چہرے پر سوجن آ گئی ہے اور دوپہر کو جب آپ سونے کے لیے لیٹیں تو آپ کو بتا کر میں بھی آ کر لیٹ گئی۔'' ندرت غصّے کو دبا کر نرمی سے بولی۔

''تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میری ماں جھوٹ بول رہی ہیں اور تم جو میرے سامنے اتنی زبان چلا رہی ہو تو میرے پیچھے نہ جانے امی کے ساتھ کیا کرتی ہو گی۔'' احسن نے غصے سے چائے کا کپ ٹرے میں پٹخا۔

''احسن صفائی پیش کرنے اور زبان چلانے میں فرق ہوتا ہے۔'' وہ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم ٹھہرائی گئی۔

''چل چھوڑ میرے بچے......تو کیا جانے یہ میرے ساتھ کیا کرتی ہے، یہ تو ہے ہی ایسی تو اپنی جان کیوں جلاتا ہے، لے پکڑ چائے اور میرے کمرے میں چل۔ مجھے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں شہناز بھی آنے والی ہے۔'' دلشاد بیگم نے بازو پکڑ کر احسن کو اٹھایا اور اس پر ایک فاتحانہ نظر ڈال کر چل دیں۔

''اور سنو ماتم بعد میں کرنا، میری بہن آ رہی ہے، جلدی سے اچھے کھانے کا بندوبست کرو......اور آئندہ پلٹ کر میری ماں کو جواب دیا تو انجام کی ذمّے دار تم ہو گی۔'' احسن نے اس کمزور سسکتی ہوئی عورت پر ایک پیر اور رکھا اور وہ سر جھکائے روئے چلی گئی۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی لیکن اس کے اندر سلگتی آگ......

☆☆☆

وقت کا کام گزرنا ہے اور وہ گزرتا چلا جاتا ہے، اب اس کے پہیوں تلے کون کچلا، کس کی انا پسی، اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں، وقت واقعی بے رحم ہوتا ہے گھر بنانا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ کوئی اس عورت سے پوچھے جو ایک اینٹ رکھتی ہے تو دوسرے ٹھوکر مار کر دو اینٹیں گرا دیتے ہیں۔ جس کی روح اور ہاتھ دونوں گھائل ہو جاتے ہیں، ایک گھر بنانے کی خواہش میں اور پھر اس کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے تو اس کو پتا چلتا ہے، سب رائگاں گیا، بند مٹھی میں ریت کے سوا کچھ بھی نہیں اور جب ہاتھ کے ساتھ دل بھی خالی رہ جائے تو......

☆☆☆

میں احسن جواد علی کبھی اپنی بیوی ندرت کے کسی کام کی تعریف نہیں کرتا۔ اگر اس کے کام میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی خرابی نظر نہ آئے تو پھر ایک سرد سا تاثر چہرے پر سجا لیتا ہوں اور میری آنکھوں کی سفاکی اس کو بوکھلائے رکھتی ہے۔ وہ تیار ہوتی، بجتی سنورتی ساری دنیا اس کی تعریف کرتی، میں چپکے چپکے اس کو دل میں سراہتا لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا اور جو وہ خود ہی ڈھیٹ بن کر مجھ سے پوچھتی کہ میں کیسی لگ رہی ہوں تو میں بے پروائی سے کہتا۔ پتا نہیں۔

اس لمحے اس کا چہرہ شرمندگی سے سفید پڑ جاتا، اس کے گلابی ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلتے اور کوئی آواز نکالے بغیر ایک دوسرے میں پیوست

ہو جاتے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ برتری کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے اور میں اس نشے کا عادی تھا نہیں لیکن اب ہو چکا ہوں مجھے عادی کرنے والی کون ہے؟ میری پیاری بے وقوف سی بیوی...... جو مجھے خوش کرنے کے لیے نہ جانے کیا، کیا جتن کرتی رہتی اور میں اس کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ میں اس سے خوش ہوں بلکہ میں اس کی محبتوں کا اور خدمتوں کا عادی ہو چکا ہوں، میں یہ اس کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگے۔ کہیں اس کا کھویا ہوا اعتماد بحال نہ ہو جائے، کہیں وہ میرے فیصلوں میں شریک نہ ہونے لگے۔ وہ مجھے حالتِ کمزوری میں اچھی لگتی ہے اور بیوی اور جوتی دونوں پیر کے نیچے ہی اچھی لگتی ہیں۔ یہ میری ماں کی ہدایت ہے اور میں ایک فرمانبردار بیٹا ہوں۔

☆☆☆

''مجھے احسن سے بہت شدید محبت ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ ہم دونوں نکاح کے مقدس بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں اور میری امی کہتی تھیں کہ شریف اور پاکباز عورت کے دل میں نکاح کے دو بول کے ساتھ ہی اس کے مجازی خدا کی محبت وحی کی صورت میں اترتی ہے۔'' ندرت نے نرگس سے کہا۔

نرگس اس کی بچپن کی دوست تھی اور آج کافی عرصہ ملک سے باہر گزارنے کے بعد وطن واپس آتے ہی سب سے پہلے اس سے ملنے آئی تھی۔

ندرت بھی دنیا میں اپنی واحد دوست کے آگے دل کھول کر بیٹھ گئی کہ کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے کہ کوئی اس کی سنے، کسی سے وہ، وہ بات کہے جو سینے میں راز کی طرح ہے۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ احسن بھائی کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے، تمہاری وہ بالکل قدر نہیں کرتے۔'' نرگس نے اس سے پوچھا کہ وہ بھی جانتی تھی کہ اس کی بہ صلاحیت دوست اندر سے کس قدر صابر اور سمجھوتا کرنے والی لڑکی ہے اور اس کی اداس اور پھیکی ہنسی نرگس کو تکلیف دے رہی تھی۔

''نہیں، خیر کوئی ایسا برا سلوک بھی نہیں کرتے، لوگوں کو تو عادت ہوتی ہے رائی کا پہاڑ بنانے کی، میں ٹھیک ہوں، بس یہ سمجھ لو کہ احسن ایک انا پرست اور خود پسند شخص ہیں۔ ایک خود پرست اور کانوں کا کچا مرد، یقیناً مشکل ثابت ہوتا ہے لیکن میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس پتھر میں اپنی خدمت گزاری اور محبت سے دراڑ ڈال دوں اور تم تو جانتی ہو کہ اگر پتھر پر بھی قطرہ قطرہ پانی گرے تو شگاف پڑ ہی جاتا ہے۔ وہ تو انسان ہیں، ان کے سینے میں بھی گوشت پوست کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ ایک دن میں ان کا دل جیتنے میں انشاءاللہ کامیاب ہو جاؤں گی۔'' ندرت نے اپنا بھرم رکھتے ہوئے صفائی پیش کی۔

'' میں نے سنا ہے تمہارے گھر میں تو جھگڑا رہتا ہے اور جہاں جھگڑا ہو، وہاں سے محبت روٹھ جاتی ہے۔ اپنائیت سسکتی رہتی ہے اور خلوص مر جاتا ہے۔'' نرگس سب سمجھ رہی تھی کہ اس کی پیاری سہیلی کس کرب سے گزر کر اپنا گھر اور بھرم بچا رہی ہے لیکن وہ بھی آج تہیہ کر کے آئی تھی کہ اس سے اس کے دل کی ہر بات سنے گی۔

''پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم میرے اور میرے گھر کے متعلق کہاں سے سن کر آئی ہو، وہ کون ہے جو میری جاسوسی پر لگا ہوا ہے۔'' ندرت، نرگس کی سنجیدگی پر بے ساختہ ہنس کر پوچھ بیٹھی۔

''اور سننا ہی چاہتی ہو تو سنو، ہمارے گھر میں جھگڑا نہیں ہوتا، جھگڑا وہاں ہوتا ہے جہاں دو فریقین لڑتے ہیں، میں تو ہمیشہ خاموش رہتی ہوں، ہمارے گھر میں زیادتی ہوتی ہے، تم سے زیادہ میری

عادتوں سے کون واقف ہوگا کہ اگر کبھی کسی سے میرا جھگڑا ہو جائے تو پھر میں کوشش کے باوجود اس سے بات نہیں کر سکتی کہ جس کو گالی دے دی اور جس کی گالی کھالی... اس سے پھر کیا کہنا اور کیا ملنا۔ احسن اور احسن کی ماں بہن کے ساتھ مجھے ہمیشہ رہنا ہے تو میں لڑ کر کیا کروں؟ سو میں خاموش رہتی ہوں، یہ الگ بات ہے یہ چپ مجھے دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے لیکن مجھے گھر کرنا ہے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے ماں باپ کی عزت کے لیے اور چاہے ہم عورتیں کتنا ہی برابری کا دعویٰ کریں معاشرے میں مستحکم مقام اور عزت حاصل کرنے کے لیے ہم کو مرد نام کی چادر کی ضرورت ہوتی ہے، میں نے احسن کے لیے ہر وہ کام کیا جس سے وہ خوش ہوں لیکن مجھے آج تک نہیں پتا میری فرمانبرداری، تابعداری، ان کو خوش یا مطمئن کرتی ہے یا نہیں، میں ان کی طرف سے کسی بھی قسم کی حوصلہ افزائی سے محروم ہوں۔ وہ میرے خاندان، میرے بہن، بھائیوں اور میرے ہر ملنے جلنے والے سے بہت ریزرو ہو کر ملتے ہیں، عین عید اور بقر عید والے دن بغیر کسی وجہ کے منہ بنا لیتے ہیں اور ان کے خراب موڈ کی وجہ سے خود بخود گھر کی فضا سوگوار ہو جاتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ ہمیں چھوڑ کر اپنی امی کے ساتھ کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں اور میرے یہ دن بھی اداسی میں ڈوب جاتے ہیں، پہلے میں یہ سوچ کر صبر کیا کرتی تھی کہ ایک دن وقت بدلے گا لیکن میری وہ آس اب ختم ہو چکی ہے، اب میرا دل، میری خوشیاں، میری امیدیں، میری خواہش، سب ناامیدی کی قید میں دفن ہو چکی ہیں...... لیکن اب میں اپنے بچوں کے لیے سب سہتی ہوں اور مزاجاً کیونکہ صابر ہوں اس لیے صبر کرتی ہوں اور تم تو جانتی ہو انسان صبر کتنی بے بسی میں کرتا ہے اور میں بھی شاید خوشی، امید، آس کے دائرے سے نکل کر مایوسی اور صبر کے دائرے میں خاموشی سے گھوم رہی ہوں۔''

ندرت نے نرگس کے بہت سے ان کہے سوالوں کے بھی جواب دے دیے کہ وہ اپنی دوست کی مزاج آشنا تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ اب کیا پوچھے گی اور تب کیا سوال کرے گی۔ ''اور اگر تمہارا تھیسس میری ذات پر، میری زندگی پر مکمل ہو گیا ہو تو کوئی اور بات کریں۔'' ندرت نے موضوع بدلنا چاہا۔

''لیکن ندرت......''

''بس نرگس کچھ اور نہ پوچھو، بس میرے لیے دعا کیا کرو، بعض اوقات انسان بڑے بڑے امتحانوں سے گزر جاتا ہے، بڑے بڑے ظلم سہہ جاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی معمولی جملہ یا اس کی طرف پھینکا گیا ایک پھول ہی اس کی برداشت ختم کر دیتا ہے، تم دعا کرو کہ میری زندگی میں وہ لمحہ کبھی نہ آئے، جہاں میری برداشت جواب دے دے۔ بس ختم کرو، کچھ اپنی سناؤ، اپنے بارے میں بتاؤ۔'' ندرت نے گویا بات ختم کری اور نرگس بھی چپ ہو گئی۔

☆☆☆

''میں سوچ رہا ہوں کہ بچوں کے لیے ٹیوشن رکھ لوں۔'' وہ دونوں بچوں کا رزلٹ لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں احسن نے کہا۔

''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ میں ان کی پڑھائی کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''لیکن ہمارے بچوں کا رزلٹ تو بہت اچھا آیا ہے، بہترین اسٹوڈنٹ اور اٹینڈنس ایوارڈ بھی ملے ہیں۔'' ندرت حیران حیران سی بولی۔

''بس مجھے اس سے بھی زیادہ بہترین رپورٹ چاہیے۔''

''خدا کا شکر ہے کہ ان کی اسکول کی رپورٹ

بہترین آ رہی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ میں شادی سے پہلے اسکول ٹیچر تھی، میں نے سیکڑوں بچوں کو پڑھایا ہے تو کیا میں اپنے بچوں کو پڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟'' صدمے اور دکھ سے ندرت کی آواز بھرا گئی۔

''پڑھایا ہوگا لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔'' لفظ تھے یا پتھر وہ فرق نہ کرسکی۔

''احسن کیا ہماری پندرہ سالہ شادی شدہ زندگی میں کوئی لمحہ ایسا آیا کہ میں آپ کے معیار پر پوری اتر سکی ہوں، میرا کوئی کام، میری کوئی بات آپ کو اچھی لگی ہو۔''

''نہیں!'' برف پوری گاڑی میں بھر گئی۔

''کبھی کبھی انسان کو کندھے پر ایک تھپکی کی ضرورت پڑتی ہے، مجھے بھی اپنے شولڈر پر آپ کی تھپکی چاہیے، شاباش دیتی، ہمت بڑھاتی تھپکی۔'' ندرت نے تھک کر بڑی دل گرفتگی سے کہا۔ گاڑی میں سرد رویوں کی برف بڑھتی جارہی تھی اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

''اگر تھپکی والا کام کیا ہو تو......!'' احسن نے گاڑی گھر کے ڈرائیووے میں پارک کرتے ہوئے انتہائی سرد مہری سے کہا اور اندر قدم بڑھادیے۔ بغیر یہ دیکھے کہ بارش شروع ہوگئی ہے کوئی بھیگ رہا ہے، کوئی پور پور بھیگ گیا ہے۔

☆☆☆

باہر چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور اندر ندرت کی آنکھیں، باہر برستی بارش ندرت کی آنکھوں سے برستی بارش سے کم نہیں تھی۔ بادل گرج سکتے تھے غصہ آئے تو بجلی گرا کر ہر چیز بھسم کرسکتے ہیں لیکن ہائے رے انسان اور اس پر عورت، جو سوال بھی کرے تو جرم، جو جواب طلب کرے تو قصوروار، جو حق مانگے تو گناہ گار، سو وہ بھی بے آواز رو رہی تھی، تکیہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

''اے میرے مالکِ برحق! تو نے عورت کے اندر ان وسیع بادلوں سے زیادہ صبر اور برداشت بھردی تو ان بادلوں جیسی عزت اور اونچائی بھی دینا، اے میرے رب تو نے ہم عورتوں کو اتنے حقوق دیے اور یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کررہے ہیں۔ نکاح کے نام پر عورت کی عمر بھر کی غلامی لکھوا لیتے ہیں، یا اللہ کیا یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم بھی انسان ہیں، گوشت پوست کے انسان۔'' آج ندرت بہت دل گرفتہ تھی، بستر کے دوسری طرف اس کا مجازی خدا کروٹ لیے ایک مطمئن نیند لے رہا تھا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے سروں پر آسمان گر جاتا ہے اور ہم اس کا ملبہ ریت کی طرح جھاڑ دیتے ہیں، زلزلہ آتا ہے اور ہم کروٹ لے کر دوبارہ سوجاتے ہیں لیکن بعض اوقات ہماری طرف پھینکا گیا اِک پھول، کوئی معمولی جملہ، کوئی سرد نگاہ ہم سے ایسا فیصلہ کروالیتی ہے جو ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے اور احسن کے اس جملے نے کہ اس نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کو سراہا جائے، اس کو تڑپا کر رکھ دیا۔ اس کے دل کو توڑ دیا اور جو عورت کا دل ٹوٹے تو جڑنا مشکل ہوتا ہے، بالکل کانچ کی چوڑی کی طرح جو جڑ بھی جائے تو بال تو آ ہی جاتا ہے۔

''ابا آپ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، زندگی میں آپ نے جو دعا دی مجھے وہ دعا لگی، شاید آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ میری کوئی بے قدری کر ہی نہیں سکتا، تو آپ نے کبھی یہ دعا نہ دی کہ بیٹی اللہ قدر دانوں سے واسطہ ڈالے۔ اور میری وہ بے قدری ہوئی کہ اگر آپ زندہ ہوتے تو شاید میرے دکھ سے مرجاتے، میں ان بیش قیمت زیورات، ان سونے کی دیواروں کا کیا کروں؟ عورت اظہار کی محتاج ہوتی ہے اور میں بدنصیب ایک محبت بھرے

جملے کے لیے ترستے ترستے تھک گئی۔'' وہ خیالوں میں اپنے مرحوم باپ سے باتیں کرتے کرتے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کے اندر برسوں کا دبا احتجاج چیخنے لگا، ہر زخم جیسے تازہ ہوگیا، ہر بات یاد آنے لگی، برسوں سے دبا ہوا فیصلہ سر اٹھانے لگا اور پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔

☆☆☆

''اُف یہ بھائی جان، ان کے تو بہت ہی نخرے ہیں، آدھے گھنٹے سے گھڑی گھڑی بچوں کو بھیج رہی ہوں کہ چائے تیار ہے لیکن آ کر ہی نہیں دے رہے۔ میرے بچے کسی کے نوکر نہیں ہیں، آواز دیجیے اپنے لاڈلے کو ہاں نہیں تو......'' کچن میں کھٹر پٹر جاری تھی۔ میری چھوٹی بہن کی بڑبڑاہٹ کے ساتھ......

یہ میری اس بہن کی آواز ہے جس کو میں نے انتہا چاہتا ہوں جس کی شادی پر میں نے اپنی بیوی کے سارے زیورات چڑھا دیے تھے جو گھر آتی تو ندرت کے لیے حکم تھا اس کا اور اس کے بچوں کا ہر کام اس کے کہنے سے پہلے ہوجانا چاہیے۔ جس کے بچوں تک کو میں اپنے بچوں پر فوقیت دیتا تھا جو گھر آتی تو میں حکم کا غلام بنا سر کے بل خود بھی کھڑا رہتا اور ندرت کو بھی کھڑا رکھتا۔ ''کیا وہ سچ ہے کہ جو میرے منہ پر کہا جاتا ہے یا یہ سچ ہے جو میرے پیٹھ پیچھے کہا جارہا ہے۔ کیسا پردہ سرکا ہے میری آنکھوں پر سے۔'' احسن دم بخود ایک صدماتی کیفیت میں لاؤنج سے آتی آوازیں سن رہا تھا۔

''ارے بس بیٹا کیا کروں، ایسا ہی ضدی اور بدتمیز ہے، بچپن ہی سے بہت ستاتا ہے، میرا اپنا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اس کو کب کا گھر سے نکال باہر کرتی، کیا کروں۔ اب یہی میرے بڑھاپے کا سہارا ہے، وہ اللہ میاں کی گائے اس کے کھونٹے سے باندھی تھی۔

نئے موسم کی بدلتی رُتیں اگست 2012ء کے شمارے کی لطافتیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

جال در جال

جنگل بیابان سے جدید نخلستان کا رخ کرلینے والی سنسنی خیز کہانی کے اختتامی واقعات
سلیم فاروقی کے مخصوص آہنگ و رنگ

سرورق کی کہانیاں

محبت کی نرم گفتاریاں...... نفرت کی چنگاریاں......
دوستی کی دل فریبیاں...... اور دشمنوں کی عیاریاں...... دل پسند سرورق کہانیاں

مشرق و مغرب کے رنگ ڈھنگ

مغربی دنیا کے رسم و اطوار...... معاشرت و تغیرات کے گرد گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

سحر انگیز سلسلے

للکار...... بدلتے ماحول اور گرجتے دشمنوں کی للکاریں
طاہر جاوید مغل کا معرکہ...... ایک نئی ڈگر پر گامزن
اسما قادری کا سلسلہ گرداب

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے...... مشورے...... محبتیں......
شکایتیں...... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

اور وہ سب جو جاسوسی کا خاصہ ہے

ہر کام بلا چوں و چرا کرتی، اس کے نخرے اٹھاتی لیکن یہ بدنصیب اس کو نہ بسا سکا۔ لوگ کہتے ہیں اس کی دوسری شادی کر دوں اب کسی کو کیا بتاؤں جب ندرت جیسی ہیرا صفت لڑکی اس کے ساتھ نہ رہ سکی تو کوئی نہیں رہ سکتا۔ لگتا ہے اب ساری زندگی ایسے ہی لنڈورا پھرے گا، اب پتا نہیں اس گھر کا کیا ہوگا؟

کیونکہ بھئی میرے اندر تو ہمت نہیں ہے کہ اس کے بدتمیز بچوں کو سنبھالوں اور گھر بھی دیکھوں، جب وہ بچوں کو بھی لے کر جا رہی تھی تو لے جانے دیتا، بچوں کو بھی روک لیا اور وہ بھی ایسی تنگ آئی ہوئی تھی کہ بچوں کی بھی پروا نہیں کی۔ اب تو مجھے ایک پل کا آرام نصیب نہیں ہوتا۔ دو دن پہلے میں گئی تھی ندرت کی ماں کے گھر کہ اس کو منا کر لے آؤں، ظاہر ہے مجھے تو خدمت کے لیے 24 گھنٹے کوئی چاہیے، وہ تو سامنے بھی نہیں آئی اس کی ماں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں چھ ماہ ہو گئے اب آپ کو خیال آیا ہے، آنا تھا تو احسن کو ساتھ لے کر آتیں، آپ نے اور آپ کے بیٹے نے جس طرح بھی ہماری بیٹی کو رکھا ہم نے کبھی شکایت نہیں کی، ہمیشہ اپنی بیٹی ہی کو دبایا لیکن آخر کب تک، بیٹی بیاہی ہے بیچی تھوڑی ہے آپ کے ہاتھوں اور ہم تو خلع لینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ احسن کی وجہ سے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی، پندرہ سالوں سے وہ اس خبطی اور جھکی کا بھرم رکھ رہی تھی اب بھی رکھ لیتی، جا کر سب کچھ ماں باپ کے سامنے اگل دیا، بڑا ہی ناقدرا نکلا، یہ احسن تو......'' وہ بولے جا رہی تھیں۔

یہ میری امی کی آواز تھی، میری پیاری امی، جنہوں نے ہمیشہ عورت پیر کی جوتی ہوتی ہے کا سبق پڑھایا، جنہوں نے شادی کی پہلی رات ہی مجھے سمجھا دیا تھا کہ آج تم کو بلی مارنی ہے اور جو میں نے ان سے پوچھا کہ امی یہ بلی مارنے سے کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے مجھے یہ کہاوت سنائی کہ ایک راجا تھا اس کی شادی ہوتی ہے شادی کی رات حجلۂ عروسی میں بلی آجاتی ہے، بلی اس راج کماری کی ہوتی ہے جس کی راجا سے شادی ہوتی ہے، راج کماری بہت نخریلی اور غصے والی تھی، جب راجا کمرے میں آیا اور اس نے اپنے سے پہلے راجکماری کے پاس بلی کو دیکھا تو وہیں تلوار نکالی اور بلی کے دو ٹکڑے کر دیے۔ راجکماری جو راجا کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی میرے نزدیک بلی بہت اہم ہے، وہ راجا کے غصے سے سہم گئی کہ بلی کی جگہ وہ بھی تو ہو سکتی تھی۔ راجکماری سہم کر راجا کے پیروں میں گر گئی وہ اپنا غصہ اور نخرہ سب بھول گئی اور پھر پوری زندگی اس محل میں صرف راجا کی مرضی چلی۔

یوں انہوں نے میرے دماغ میں اپنی بات بٹھائی اور میں بھی اپنے آپ کو کوئی راجا سمجھنے لگا اور جو کبھی شادی کے اولین دنوں میں ندرت سے ہنس کر بات کر لیتا تو وہ منہ پھلا لیتیں کہ میں جورو کا غلام بن گیا ہوں، انہوں نے میاں بیوی کے درمیان کبھی محبت پیدا نہ ہونے دی بلکہ اس رشتے کو صرف ضرورت تک محدود کر دیا۔ انہوں نے ندرت کی وہ غلطیاں بھی مجھے نوٹ کرائیں جو کم از کم میں کبھی نوٹ نہیں کر سکتا تھا۔ ان کو ندرت کے کھانے پینے، چلنے پھرنے تک پر اعتراض تھا۔ ان کو ہمیشہ یہ قلق رہا کہ مجھ جیسے قابل، لائق نادر و نایاب قسم کے مرد کے لیے وہ گھنی، میسنی، روتی شکل، منحوس، پھوہڑ، بدتمیز اور بدزبان ہی رہ گئی تھی۔ انہوں نے دو بچے ہونے کے باوجود ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان تکلف کی دیوار نہ گرنے دی کیونکہ بقول ان کے وہ پھوہڑ اس قابل ہی نہیں تھی کہ مجھ جیسا مرد اس کو اپنے مقابل بٹھاتا اور آج میری پیٹھ پیچھے وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ میں نے اس ہیرا صفت لڑکی کی قدر نہ کی کیونکہ میں ناشکرا

☆☆

ہوں، میں نے ندرت کو بہت تنگ کیا کیونکہ میں جھکی، میری وجہ سے ندرت چلی گئی۔ وہ ندرت جو رات دن ان کی صلواتیں بھی سنتی اور ان کے پیر بھی دباتی تھی۔ وہ ندرت جس نے کبھی مجھ سے کسی قسم کی اور گھر کے کسی فرد کی شکایت نہیں کی۔ مجھے ان کی باتوں کا اتنا افسوس نہ ہوتا اگر وہ میرے منہ پر کہتیں، دکھ تو اس بات کا تھا یہ سب باتیں میرے پیٹھ پیچھے ہو رہی تھیں۔

''ہم مرد بھی کتنے کم عقل ہوتے ہیں، دوسروں کو خوش کرنے کے لیے اپنے گھر کا سکون برباد کر دیتے ہیں، خدا کے گھر گناہگار بن جاتے ہیں، یا اللہ میں کیسے اندھیرے میں تھا۔'' احسن اپنے کمرے کے بیچوں بیچ، ساکت کھڑا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ جو خوش خوش اپنا پاسپورٹ نکال کر ماں اور بہن کو دکھانے جا رہا تھا کہ اس کا اس کے بیوی بچوں کے ساتھ امریکا کا ویزا لگ گیا ہے، اب وہ جلد ہی صرف اپنے بچوں کو لے کر امریکا چلا جائے گا اس ندرت کو روتا چھوڑ کر جو اس کی امی اور بہن کو پسند ہی نہیں تھی۔ ہاں بس وہ جاتے ہی اپنی پیاری امی کو اپنے پاس بلانے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس کی امی، دنیا میں واحد اس کی مزاج آشنا ہیں۔

لیکن وہ بھول گیا تھا اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، رات جب بہت گہری ہو جائے تو سمجھ لو صبح قریب ہے، انسان کو ظالم کے ظلم سے زیادہ صابر کے صبر سے ڈرنا چاہیے کہ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ندرت کا صبر بھی اللہ کے دربار میں قبول ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پشیمانی، افسوس، پچھتاوا اور دکھ سب اس کے آنسوؤں میں گڈمڈ ہو گئے۔

☆☆☆

حکمت بھری مفید باتیں

کیا آپ جانتے ہیں یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر عمل کر کے ہم بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

☆ سورۂ فاتحہ پڑھ کر پیٹ پر دم کرنے سے پیٹ کا درد ختم ہوتا ہے۔

☆ عجوہ کھجور کے سات دانے صبح کھانے سے جادو اور آسیب سے محفوظ رہیں گے۔

☆ اپنا سیدھا ہاتھ اپنے سیدھے گال کے نیچے رکھ کر سونے سے ہارٹ اٹیک سے محفوظ رہتے ہے۔

☆ آبِ زم زم کو جس بیماری کی شفا کی نیت سے پیا جائے اس سے شفا ہوتی ہے۔

☆ اگر کوئی لمبی زندگی چاہتا ہے تو اسے چاہیے اپنے رشتے داروں کے ساتھ نیک سلوک کرے۔

☆ رات کا کھانا نہ کھانا جلد بڑھاپا لاتا ہے۔

☆ روزانہ ۵۰۰ مرتبہ درود شریف پڑھنے والا کبھی تنگ دست نہیں ہوگا۔

☆ نامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر انگوٹھے چومنے سے آنکھوں کی روشنی تیز ہوتی ہے۔

☆ اپنا چہرہ یا ہاتھ دوپٹے یا لباس سے پونچھنا بھولنے کی بیماری پیدا کرتا ہے۔

☆ اگر کسی کو حج پر جانے کی طلب ہو اور کوئی وسیلہ نہ ہو تو روزانہ 21 مرتبہ سورۂ فتح کی آیت نمبر 27 کا وِرد کریں۔ یہ وِرد اس وقت تک جاری رکھیں جب تک امید کی کرن نظر نہ آجائے۔

مرسلہ: عروج ذکی آفندی، کراچی

اس نے بند مٹھی کھول کر اس کاغذ کو ایک بار پھر نکال کر کھولا اور اس کی نظریں تحریر پر پھسلنے لگیں۔

''میری زندگی، میری ندرت۔

میں ایک انا پرست مرد ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی کا طلبگار ہوں، ہر اس دانستہ اور نادانستہ زیادتی اور غلطی کے لیے جو میں نے تمہارے ساتھ کی، میں اس لڑکی سے معافی کی امید رکھتا ہوں، جس کی زبان سوال و شکایت کرنا ہی نہیں جانتی، جو صرف دینا جانتی تھی جو اپنے لیے کیسی چیز کی طلبگار ہی نہیں، آج مجھے یہ کہنے میں کوئی اعتراض نہیں کہ میرا گھر اور میری زندگی اس کے بغیر نامکمل ہے، جس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ نہ صرف وہ ایک ہمدرد ساتھی تھی بلکہ ایک بہترین ماں بھی ہے، مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس کے نازک کندھوں پر میرا پورا گھر تھا، وہ کامنی سی لڑکی جس نے میری ساری ذمے داریاں بہت خوش اسلوبی سے نبھائیں، ہاں میں اس لڑکی سے صرف تلافی کا ایک موقع چاہتا ہوں، جو میرے سارے کام بھی کرتی اور میری بوڑھی سخت مزاج ماں کی خدمت بھی کرتی اور بچوں کے لیے سر کے بل کھڑی رہتی اور میری تلخ مزاجی بھی سہتی جو بیک وقت بیوی بھی تھی دوست بھی تھی، بیٹی، ماں، معلم، نرس، خدمت گار سب کچھ تھی، وہ یہ سب کس لیے کرتی تھی، صرف میرے لیے، میری خوشی اور میری محبت کے حصول کے لیے لیکن میں بدنصیب اس کی صفات کو تعصب کی عینک سے دیکھتا تھا۔ وہ جو ہر دم مسکراتی رہتی تھی کہ کوئی اس کی زندگی کا سیاہ باب نہ پڑھ لے، کہیں اس کا بھرم نہ کھل جائے، کہیں بند مٹھی کا بھید نہ کھل جائے جو میری اور میرے خاندان کی عزت رکھتے رکھتے نڈھال ہوگئی وہ میرا لباس تھی وہ میرا پُرشکوہ لباس تھی جس کی میں نے قدر نہ کی اور جو جسم پر لباس نہ رہے، تو آدمی پر کیا گزرتی ہے، بس وہی میرا حال ہے، کیا تم..... مجھے معاف کروگی؟ کیا تم اس بے لباس مرد کو دوبارہ لباس مہیا کروگی، میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی کا طلبگار ہوں، ہمارا امریکا کا ویزا لگ گیا ہے میں تم کو بچوں کو لے کر امریکا جانا چاہتا ہوں، ایک نئی دنیا بسانے جہاں ماضی کا سایہ نہ ہو۔ کوئی گھریلو سیاست نہ ہو، میں نے اس یقین کے ساتھ تمہارا بھی ٹکٹ لے لیا ہے کہ تم مجھے معاف کردوگی۔ پانچ نومبر کو ہماری فلائٹ ہے اور تم میرے ساتھ ہوگی۔ کیا تم میرے یقین کا ساتھ دوگی! کیا تم صرف ایک بار پھر مجھے موقع دوگی؟

بہت شرمندہ معافی کا طلبگار
صرف تمہارا احسن''

اس نے بھیگی آنکھوں سے خط کو پڑھنے کے بعد دیوار پر لٹکتے کیلنڈر پر نگاہ ڈالی پانچ نومبر بڑے بڑے حروف میں آویزاں تھی۔ عورت کو بہت اچھا لگتا ہے جب مرد اس کو منہ پر بٹھا کر ایک معصوم بچے کی طرح اس کے پیروں میں آکر بیٹھ جاتا ہے، اس وقت عورت محبوبہ سے ماں بن جاتی ہے اور ماں کے پاس سوائے معافی کہ کچھ نہیں ہوتا اور عورت بھی اس وقت مرد کے سو خون معاف کر کے اس کے سینے سے جا لگتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ آج پانچ نومبر ہے، شام سات بجے کی فلائٹ ہے، وہ بہت خوش تھی کہ احسن کو اس کی قدر آہی گئی۔ وہ بہت بے چین تھی اپنے بچوں سے ملنے کے لیے احسن سے ملنے کے لیکن کوئی تھا جو اس کو روک رہا تھا۔

اس کے اندر کی عورت کہہ رہی تھی کہ احسن نے صرف خط کیوں لکھا وہ خود کیوں نہیں آیا؟ لیکن ایک ماں اس کو اکسا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ بھول جا سب کچھ بھول جا، جا تیرے بچے خوش ہوں گے جا اپنا سنسار سنبھال، اپنے میاں کے پاس جا، تو سہاگن ہے تیرے پیا کی سیج تیری منتظر ہے۔ اس کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے پھر خیال آیا کہ جب پریشانی ہو کوئی راہ نہ سوجھے تو اللہ سے رجوع کرنا چاہیے اور نماز سے بڑا اللہ اور بندے کے درمیان رابطہ کیا ہوگا، سو اس نے دو نفل صلوٰۃ الحاجات کی نیت باندھ لی اور فیصلہ خالقِ حقیقی پر چھوڑ دیا۔

''ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے بندہ تو ویسے ہی اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرلیتا ہے، کتنے بدنصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو کسی برائی کا حصہ بنتے ہیں۔ کیا کوئی کسی کی تقدیر چھین سکا؟ کیا کوئی کسی کا نصیب بدل سکا؟ نہیں، تو پھر یہ بات لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔'' وہ جاءنماز پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اپنی ماں کی آواز پر چونک گئی۔

''ندرت کہاں ہو بیٹا؟ دیکھو کون آیا ہے۔''

اس نے نگاہ اٹھائی تو سامنے احسن دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑے کھڑا تھا، آنکھوں میں آس و امید کی قندیل جلائے اور پھر جیسے منظر سے سب غائب ہوگئے صرف وہ اور احسن رہ گئے۔

ہاں احسن، اس کا محبوب اس کا شوہر جو ہر حال میں اس کو منانے کا فیصلہ کر کے آیا تھا اور پھر فیصلہ ہوگیا۔

☆☆☆

نیویارک ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی برفیلی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اس نے اوورکوٹ کے کالر اونچے کیے اور مضبوطی سے ندرت کا ہاتھ تھام کر قدم آگے بڑھا دیے۔ ایک نیا سنسار بسانے کے لیے وہ پھر محبتوں کے حصار میں تھا کہ تقدیر اس پر دوبارہ مہربان ہوگئی...... زندگی میں ہر ایک کو بار بار موقع نہیں ملتا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

ناولٹ

کوئی شہر ایسا بساؤ من میں

نگہت سیما

دوسرا حصہ

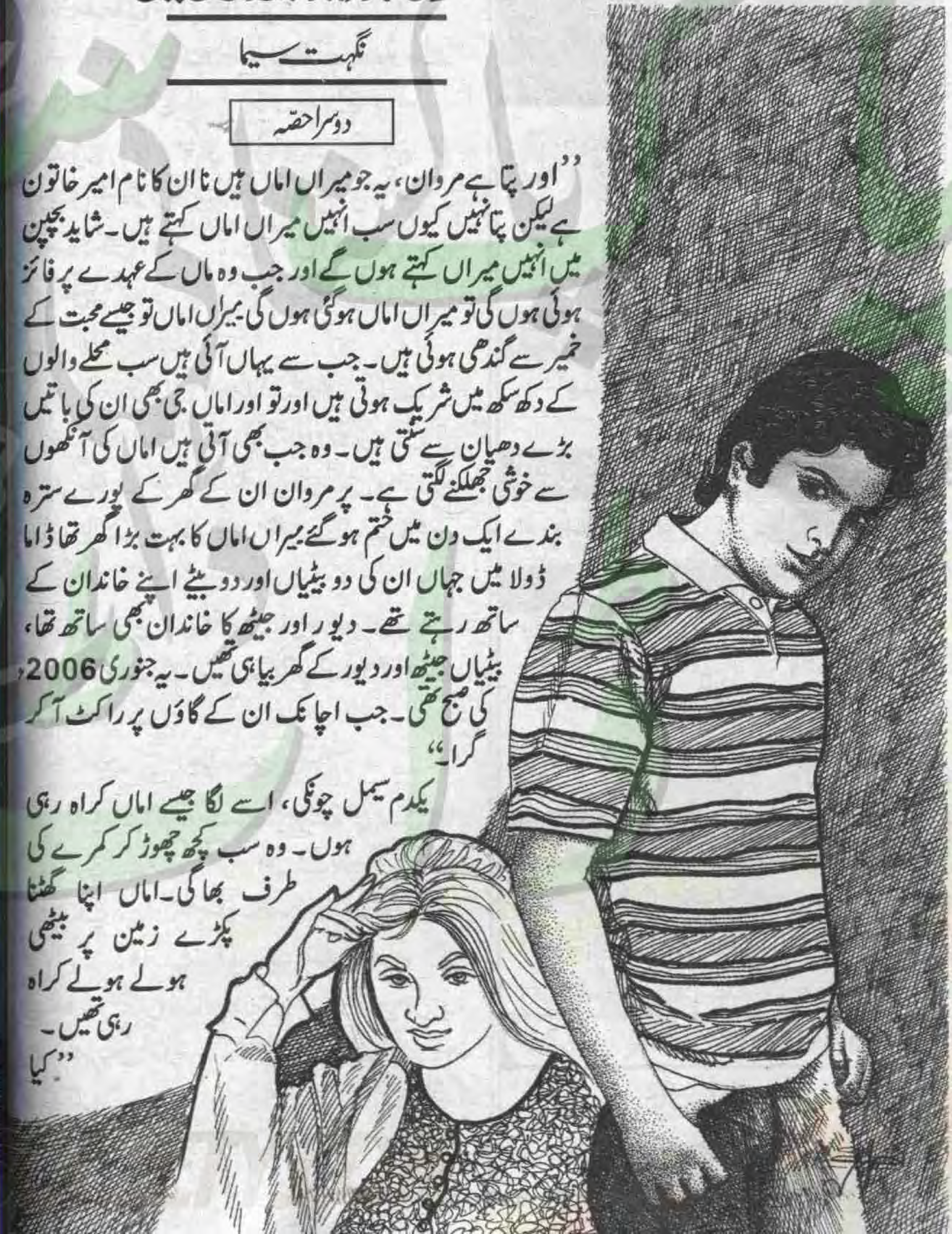

''اور پتا ہے مروان، یہ جو میراں اماں ہیں نا ان کا نام امیر خاتون ہے لیکن پتا نہیں کیوں سب انہیں میراں اماں کہتے ہیں۔ شاید بچپن میں انہیں میراں کہتے ہوں گے اور جب وہ ماں کے عہدے پر فائز ہوئی ہوں گی تو میراں اماں ہوگئی ہوں گی۔ میراں اماں تو جیسے محبت کے خمیر سے گندھی ہوئی ہیں۔ جب سے یہاں آئی ہیں سب محلے والوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہیں اور تو اور اماں جی بھی ان کی باتیں بڑے دھیان سے سنتی ہیں۔ وہ جب بھی آتی ہیں اماں کی آنکھوں سے خوشی جھلکنے لگتی ہے۔ پر مروان ان کے گھر کے پورے سترہ بندے ایک دن میں ختم ہوگئے۔ میراں اماں کا بہت بڑا گھر تھا ڈاما ڈولا میں جہاں ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ دیور اور جیٹھ کا خاندان بھی ساتھ تھا، بیٹیاں جیٹھ اور دیور کے گھر بیاہی تھیں۔ یہ جنوری 2006ء کی صبح تھی۔ جب اچانک ان کے گاؤں پر راکٹ آ کر گرا۔''

یکدم سیمل چونکی، اسے لگا جیسے اماں کراہ رہی ہوں۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ اماں اپنا گھٹنا پکڑے زمین پر بیٹھی ہولے ہولے کراہ رہی تھیں۔

''کیا ہوا اماں جی......؟'' وہ گھبرا کر اُن کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے پلنگ کے پائے کی طرف اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی۔ اماں شاید واش روم.... گئی تھیں اور باہر آتے ہوئے وہ پلنگ کے پائے سے ٹکرا گئی تھیں۔ اماں کے ساتھ پچھلے سات آٹھ بلکہ نو سالوں سے یہ مسئلہ بھی تھا کہ وہ کبھی کبھی یوں ہی ناک کی سیدھ میں چلتی رہتی تھیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سامنے کوئی چیز ہے۔ اس نے جلدی جلدی ان کی شلوار کا پائنچہ اوپر کیا، گھٹنے سے نیچے ٹانگ پر نیل پڑ چکا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اسے رگڑا پھر دوڑ کر آئیوڈیکس لے آئی اور نرم ہاتھوں سے آئیوڈیکس لگا کر انہیں سہارا دے کر اٹھایا۔

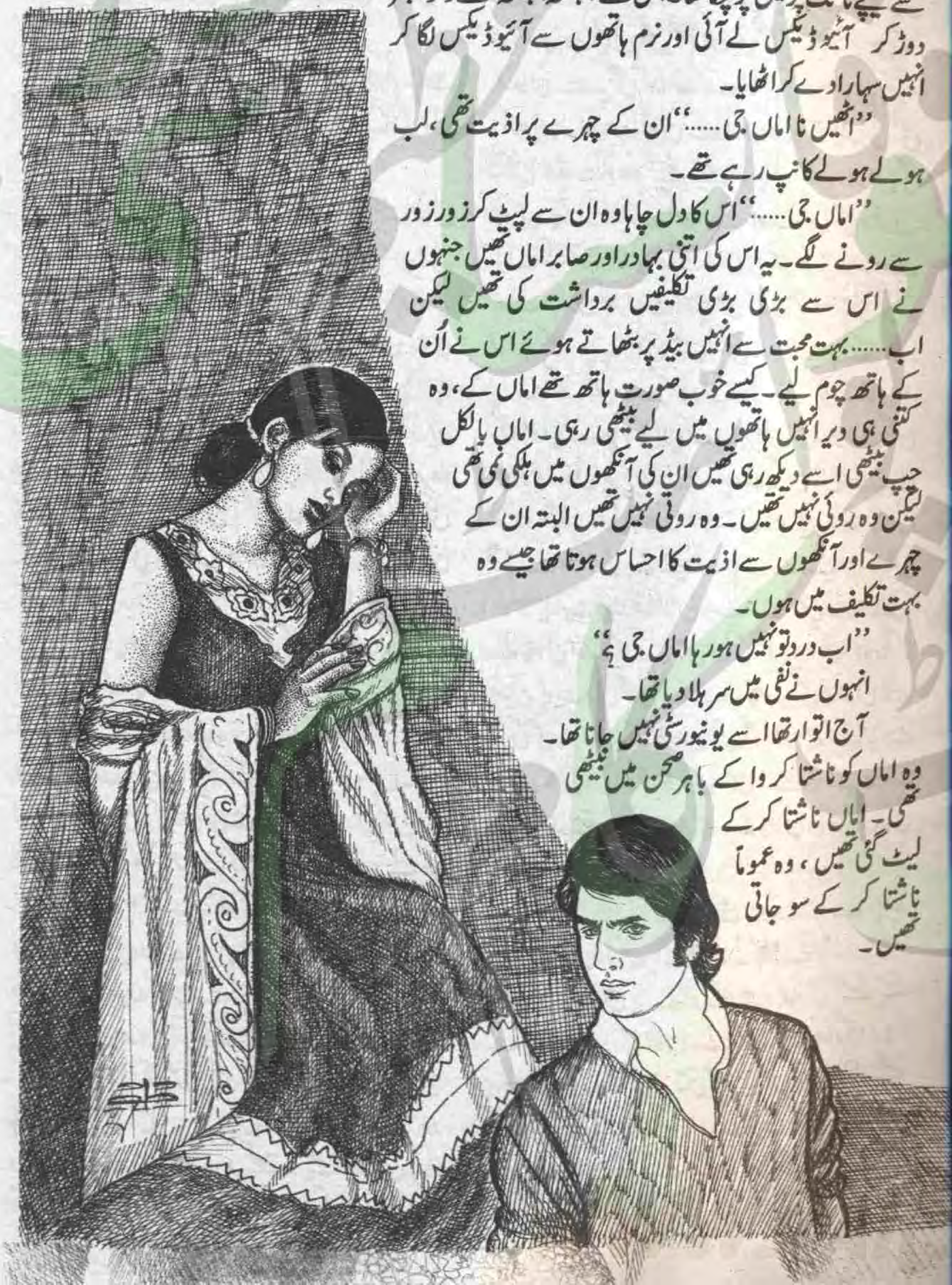

''اٹھیں نا اماں جی......'' ان کے چہرے پر اذیت تھی، لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

''اماں جی......'' اس کا دل چاہا وہ ان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگے۔ یہ اس کی اتنی بہادر اور صابر اماں تھیں جنہوں نے اس سے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں لیکن اب...... بہت محبت سے انہیں بیڈ پر بٹھاتے ہوئے اس نے اُن کے ہاتھ چوم لیے۔ کیسے خوب صورت ہاتھ تھے اماں کے، وہ کتنی ہی دیر انہیں ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہی۔ اماں بالکل چپ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھوں میں ہلکی نمی تھی لیکن وہ روئی نہیں تھیں۔ وہ روتی نہیں تھیں البتہ ان کے چہرے اور آنکھوں سے اذیت کا احساس ہوتا تھا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہوں۔

''اب درد تو نہیں ہو رہا اماں جی؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

آج اتوار تھا اسے یونیورسٹی نہیں جانا تھا۔

وہ اماں کو ناشتا کروا کے باہر صحن میں بیٹھی تھی۔ اماں ناشتا کر کے لیٹ گئی تھیں، وہ عموماً ناشتا کر کے سو جاتی تھیں۔

"آپ مجھے آواز دے لیتیں اماں جی۔ آج فضیلت آجائے تو میں یہ بیڈ ذرا سا پیچھے کروا دیتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں کی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ سوال کرتی التجا کرتی۔

"ابھی آتی ہوں اماں...... وہ میں مروان کو بتا رہی تھی میراں اماں کے متعلق۔"

مروان کے نام پر اماں کی آنکھیں یکدم سپاٹ ہوگئی تھیں۔ یوں جیسے وہ ...... اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہوگئی ہوں۔

"بس ابھی آئی اماں جی۔" اس نے انہیں حال میں واپس لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن اب وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں بلکہ سامنے دیوار پر نظریں جمائے پتا نہیں کس منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہ افسردہ سی صحن میں آگئی اور تخت پر پڑا اپنا موبائل، ڈائری اور قلم اٹھایا۔ موبائل کی اسکرین روشن تھی اس نے بغیر نمبر دیکھے فون آف کیا اور افسردہ افسردہ سی اماں کے پاس آگئی۔ اماں اب لیٹ چکی تھیں اور اُن کی آنکھیں چھت پر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

"پتا نہیں اماں کب اپنی زندگی کی طرف لوٹیں گی اور اماں کو کیا پتا کہ ان کی یہ چپ مجھے اندر ہی اندر ہولے ہولے مارے جا رہی ہے۔ میں کتنا ترس گئی ہوں ان کے لیے حالانکہ اماں میرے پاس ہیں۔" وہ ان کی پائنتی بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی لیکن ان کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی وہ ویسے ہی سیدھی لیٹی اوپر چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ وہ ان کی ٹانگیں دباتی ان کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھتی رہی شاید وہ اس سے کہیں۔

"بس کرو بیٹا، تھک جاؤ گی۔" شاید وہ کچھ نہ کہیں لیکن اپنی ٹانگیں کھینچ لیں، اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھیں جیسے منع کر رہی ہوں لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ یونہی چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے سو گئیں۔ وہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

فضیلت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اتوار کو وہ کچھ دیر سے آتی تھی لیکن آج کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی تھی۔ اس نے سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے اور اسے ڈاکٹر عرفان کی طرف جانا تھا۔ اماں کی دوائیاں بھی ختم ہو رہی تھیں اور اسے ڈاکٹر عرفان سے یہ بھی کہنا تھا کہ وہ اماں کی دوائیاں کچھ کم کردیں۔ ان دوائیوں سے اماں کو بہت نیند آتی تھی بعض اوقات تو وہ بیٹھے بیٹھے سو جاتی تھیں اور ان کی طویل نیند سے اسے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی، خوف آنے لگتا تھا۔ اماں جاگ رہی ہوتیں تو جیسے سارے خوف ساری گھبراہٹ آپ ہی آپ ختم ہو جاتی تھی۔ اماں بھلے چپ رہتی تھیں لیکن ان کے جاگنے سے پورے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اماں پر کندھوں تک چادر ڈال کر وہ باہر نکل آئی۔ دھوپ صحن کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ پورے صحن میں موتیے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے موتیے کے پھول توڑے اور اماں کے تکیے کے پاس رکھ دیے...... اماں کو موتیا بہت پسند تھا اماں جب ٹھیک تھیں تو وہ موتیے کے پھول اپنے کانوں میں ڈالتی تھیں اور گجرا سا بنا کر چٹیا پر لپیٹ لیتی تھیں۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اماں سے کہتی تھی کہ اس کے کانوں میں بھی موتیے کے بالے ڈالیں لیکن اس کے کانوں میں اتنے بڑے بڑے سوراخ نہ تھے جن میں موتیے کے پھول کی ڈنڈی چلی جاتی۔

"اماں آپ نے اتنے بڑے بڑے چھید کروائے ہیں اور میرے چھوٹے چھوٹے۔"

"یہ خود ہی بڑے ہوگئے ہیں بھاری جھمکے پہننے سے، تمہاری دادی اماں نے مجھے بہت بھاری زیور پہنایا تھا۔ اور جتنا عرصہ میں گاؤں میں رہی مامی مجھے جھمکے اور چوڑیاں نہیں اتارنے دیتی تھیں۔ نئی بیاہی دلہنیں خالی کان خالی گلے کے ساتھ اچھی نہیں لگتیں۔ تو بس وہ بھاری جھمکے پہننے سے چھید بڑے ہوگئے

تھے۔" اور اماں کے کانوں میں تین چھید تھے۔ اور اب تو اماں کبھی کبھی ہیرے کے چھوٹے چھوٹے نگوں والے ٹاپس پہنتی تھیں یا پھر صبح صبح موتیے کے پھول کانوں میں اڑس لیتی تھیں وہ ٹاپس اور اماں کا سارا زیور تو وہیں رہ گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ آہستگی سے بھیڑ کر باہر آگئی۔ باہر کے دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"اوہ فضیلت آگئی۔" وہ خوش ہوگئی۔ فضیلت کو سارا کام سمجھا کر جب وہ گھر سے نکلی تو ساڑھے دس بج رہے تھے اور دھوپ چبھ رہی تھی۔ جون کی تین تاریخ تھی اور دس بجے ہی سورج آگ برسا رہا تھا۔ اگر فضیلت جلدی آجاتی تو وہ سویرے سویرے ہی اپنے کام نبٹا لیتی۔ چادر کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے یکدم ہی تنگ گلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ یہاں اس گلی میں دھوپ براہِ راست نہیں پڑتی تھی۔ اونچے چھتوں والے مکانوں کے شیڈز اور گیلریوں سے گلی سایہ دار تھی۔ اسے لگا جیسے وہ یکدم کھلے میدان سے کسی سایہ دار جگہ پر آگئی ہو۔ یہ راستہ تھوڑا لمبا تھا لیکن وہ براہِ راست دھوپ سے تو بچ جاتی۔ وہ سکون کی سانس لیتے ہوئے اماں کے متعلق سوچتے ہوئے چل رہی تھی کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور اندر سے... نوشیرواں عادل نے باہر قدم رکھا۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت اتری تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رکی اور پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیے لیکن نوشیرواں لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا اور اب اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ تنگ گلی میں دونوں کے درمیان بس دو ہاتھ کا فاصلہ ہی تھا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"ڈاکٹر عرفان کے کلینک۔" اس نے نوشیرواں کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اماں کی دوائیاں ختم ہوگئی تھیں اور پھر انہیں اماں کی طبیعت کا بھی بتانا تھا۔"

"آپ مجھے کہہ دیتیں، لائیں مجھے دیں اماں کا نسخہ۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن سیمل بدستور چلتی رہی۔

"نہیں، مجھے ان سے اماں کے متعلق تفصیلی بات بھی کرنی ہے۔"

"کیوں کیا ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

"نہیں بلکہ مجھے لگ رہا ہے کہ وہ کچھ improve کر رہی ہیں۔"

"گڈ......" وہ مسکرایا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اسے مسلسل ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر سیمل نے پوچھا۔

"آپ کے ساتھ جا رہا ہوں کلینک...... میں یہاں آیا تھا حیدر کے گھر پر پیچھے حیدر کا گھر ہے۔ میرا بیٹ مین تھا۔" وہ ذرا سا چونکی۔ اس کا خیال صحیح تھا نوشیرواں کا تعلق فوج سے ہی تھا۔ وہ نیچے زمین کی طرف دیکھتی چل رہی تھی۔ اس کی نظریں نوشیرواں کے پاؤں پر پڑی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر غور کیا وہ ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کلینک نہ جائے وہ اکیلی جاسکتی ہے اور پہلے بھی تو اکیلی ہی جاتی رہی ہے۔

یہ ساری گلیاں اب برسوں سے اس کی جانی پہچانی تھیں۔ اب یہاں چلتے ہوئے اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ یہاں آس پاس سب اچھے اور ملنسار لوگ رہتے تھے حالانکہ شروع شروع میں...... وہ بہت ڈرتی تھی اور سارے رستے...... آیت الکرسی پڑھتی جاتی تھی تب بھی تو اکیلے ہی جاتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ گلی سنسان تھی۔ کبھی کبھار کسی گھر کا دروازہ کھلتا اور اندر سے کوئی عورت یا بچہ نکل کر کسی سمت چلا جاتا۔ اس کے قدموں کی رفتار ذرا دیر کو مدھم ہوئی وہ رک کر اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ تکلیف نہ کرے اسے کوئی ڈر نہیں ہے لیکن جب اس نے نوشیرواں عادل کی طرف دیکھا تو وہ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سیمل بی بی۔ میں

آپ کے ساتھ جا رہا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں آپ کو میرے ساتھ کی ضرورت نہیں۔'' وہ چپ کر گئی۔ وہ کسی کے سامنے۔ یونہی لاجواب ہو جایا کرتی تھی اور مروان کہتا تھا۔

''جو تمہارے دل ہوتا ہے کہا کرو..... کسی کی غلط بات پر چپ نہ ہو جایا کرو بلکہ تردید کیا کرو، دلیلوں سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا کرو۔''

اب پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس کا یوں ساتھ ساتھ چلنا پتا نہیں اسے اچھا لگ رہا تھا یا نہیں لیکن ایک تحفظ کا احساس ہو رہا تھا جیسے مروان کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ چلتے چلتے روڈ پر آ گئے تھے۔ نوشیرواں نے پھر کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی سیمل نے کچھ کہا تھا حالانکہ کتنی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس سے گل کے متعلق پوچھے۔ وہ اسلام آباد گیا تھا۔ کیا اسے گل کا کچھ پتا چلا۔ اس نے سنا تھا کہ اسلام آباد میں ایک آفس سے لاپتا افراد کے متعلق پتا چل جاتا ہے۔ حمنہ نے اسے بتایا تھا پتا نہیں صحیح تھا یا غلط۔ حمنہ کے ایک دور کے عزیز جو راولپنڈی میں رہتے تھے وہ بھی عین ان کی بیٹی کی شادی والے دن گھر سے غائب ہو گئے تھے اور ابھی تک ان کے متعلق کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ وہ کہاں ہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ ان کا بیٹا بھاگ، بھاگ کر تھک گیا تھا۔ کبھی کسی دفتر میں کبھی کسی دفتر میں لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور حمنہ کو ہی کسی نے بتایا تھا کہ اسلام آباد میں کسی سوشل ورکر نے آفس کھولا ہے وہ پتا کروا دیتا ہے۔ شاید نوشیرواں کو بھی کسی نے اس آفس کا بتایا ہو اور شاید اس سوشل ورکر نے اسے بتا دیا ہو کہ گل کہاں ہے اور میری اماں کتنی خوش ہوں گی۔ اس نے سڑک عبور کرنے کے انتظار میں کھڑے کھڑے نوشیرواں کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیا پوچھنا ہے سیم...... پوچھ لیں۔'' اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی تھی اور سیمل نے جھنجلا کر سوچا تھا۔

''افوہ...... یہ نوشیرواں عادل ہے یا نوشیرواں نجومی پتا نہیں کیسے دل میں سوچی گئی بات بھی جان لیتا ہے۔ نوشیرواں نجومی'' اس نے دُہرایا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

نوشیرواں نجومی...... آیئے دل کا حال معلوم کیجیے۔ قسمت کا احوال جانیے اور پیش بندی کے لیے...... دیواروں پر لکھے اشتہار اس کی آنکھوں کے سامنے آئے تو اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اگر وہ یہاں سڑک پر نوشیرواں کے ساتھ نہ کھڑی ہوتی تو کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ آنکھوں کے سامنے جگہ جگہ دیواروں پر لکھا نوشیرواں نجومی...... ملک کے ماہر ستارہ شناس آ رہا تھا اور نوشیرواں کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ لبوں پر کھلتی مسکراہٹ نے تپتی دھوپ میں گلستان مہکا دیے تھے۔ وہ ایک وارفتگی کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

''یہ لڑکی خوب صورت ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اتنی ظالم ہے اس کا اندازہ مجھے ہرگز نہیں تھا'' اس نے سیمل پر سے نظریں ہٹا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ ٹریفک رک گیا تھا۔

''آیئے......'' اس نے جیسے اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا پھر ہاتھ نیچے کر لیا۔ سیمل نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سڑک عبور کی۔ کچھ آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑ گئے تھے۔ دو گلیاں آگے جا کر پھر ایک سڑک تھی جس پر ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ ریسپشن پر اماں کی فائل دے کر وہ ویٹنگ روم میں آئے تھے وہاں صرف تین مریض تھے۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے حسبِ عادت چادر کے پلو سے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور نوشیرواں عادل کو دیکھنا چاہا تو وہ اسی صوفے پر بیٹھا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے آہستگی سے کہا۔

''اگر آپ فیصلہ کر چکی ہوں تو پوچھ لیں کیا

پوچھنا ہے۔'' لمحے بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری تھی اور پھر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''گل...... مجھے گل بھائی کے متعلق پوچھنا تھا۔''

''گل...... گل بھائی.... ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''کچھ پتا چلا ان کا۔'' اب وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں سے گہرا حزن جھانکنے لگا تھا اور چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ حمنہ...... میری دوست ہے نا وہ کہہ رہی تھی کہ وہاں اسلام آباد میں ایک شخص تھا......''

''سب فراڈ تھا۔'' اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انسانی لاشوں پر بھی اپنی سوداگری جما لیتے ہیں۔ وہ بھی کوئی ایسا ہی شخص تھا۔ انسانی لاشوں کا کاروبار کرنے والا۔'' اس نے تنفر سے ہونٹ سکیڑے۔

''لوگوں کے جذبات سے کھیل کر ان کی مجبوریاں خریدنے والا۔ آپ کو پتا ہے سیم مجھے وہاں ایک خاتون ملی تھیں۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے، اس کے شوہر کو لاپتا ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا سارا زیور فروخت کر دیا تھا اور اس شخص نے اس سے دو لاکھ لیے تھے۔ اس کے شوہر کے متعلق خبر دینے کے عوض...... کاش میں ایسے لوگوں کو سولی پر لٹکانے کا اختیار رکھتا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''مجھے وہ مل جاتا تو میں اسے نہ چھوڑتا۔'' اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

''تو آپ......''

''میں جی۔ ایچ۔ کیو گیا تھا۔ میرے ایک بہت مہربان ہیں بریگیڈیئر مصطفیٰ ان سے التجا کرنے کہ وہ گل کی تلاش میں میری مدد کریں۔ اماں جان ساری ساری رات سجدے میں گر کر رو رو کر اس کی واپسی کی دعا مانگتی ہیں۔ مجھ سے اماں جان کا رونا نہیں دیکھا جاتا سیمل ورنہ جہاں میں نے سب پر صبر کر لیا تھا اس پر بھی صبر کر لیتا۔'' سیمل کی آنکھیں جیسے بہنے کو بے تاب ہو رہی تھیں لیکن وہ ہونٹ بھینچے نوشیرواں عادل کو سن رہی تھی۔

''آپ کو اماں جان نے گل کے متعلق بتایا کچھ۔''

''نہیں......'' سیمل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''گل بہت پیارا تھا، بہت نازک۔ لڑکیوں ایسا حسن تھا اس کا۔ بچپن میں ہم سب اسے چھیڑتے تھے کہ اللہ میاں نے غلطی سے اسے لڑکا بنا دیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکیوں کی طرح رو پڑتا تھا۔ وہ میرے بڑے ماموں کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی تین بہنیں تھیں۔ وہ سب کا لاڈلا تھا۔ سب اس کا یوں خیال رکھتے جیسے وہ کوئی کانچ کا گڈا ہو، ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جائے گا۔ اماں جان تو صبح شام اس پر نظر کی دعا پڑھ کر پھونکا کرتی تھیں۔ پتا ہے سیم اس کا دل تو چڑیا جتنا تھا۔ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر کر مر جاتا تو وہ گھنٹوں روتا رہتا۔ بلی یا کتے کے پلے کو شریر بچے رسی باندھ کر گلی میں گھسیٹتے تو وہ ان سے لڑ پڑتا کہ یہ ظلم ہے...... اور پھر اس ظلم پر آنسوؤں سے روتا اور کئی دنوں تک اداس رہتا تھا۔ گلی میں کسی فقیر کو دیکھتا تو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ یہ بھیک کیوں مانگ رہا ہے۔ اس کے کپڑے اچھے نہیں ہیں۔ اس کے بچوں کو کھانا کون دیتا ہے۔ وہ اماں جان کو اپنے سوالوں سے زچ کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی اماں جان جھنجلا جاتیں۔

وہ جنوری کا مہینہ تھا جب ہم یکایک بھرے پُرے خاندان سے محروم ہو گئے تھے۔ اور اگست میں ہم بچ جانے والے تین افراد میں سے ایک اور کم ہو گیا تھا'' وہ جیسے تھک کر چپ ہوا تھا اور سیمل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے تسلی دے۔ ایسے زخم بھلا تسلی کے چند لفظوں سے بھرتے ہیں۔ یہ تو سدا رستے رہتے ہیں، ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں۔ وہ جیسے بے بس سی ہو کر چپ کر گئی تھی تب وہ ہولے سے کھنکھارا تھا۔

"تم کچھ بھی نہ کہو...... کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ صرف میرا یا میرے خاندان کا دکھ نہیں ہے۔ ہم تو جیسے اب خود کو پرسا دیتے ہیں اور خود ہی تسلی کے لفظ اپنے اندر انڈیل لیتے ہیں۔" وہ پھر جیسے اس کے دل کی بات جان گیا تھا۔ سیمل حیران ہوئے بغیر اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماحول کا تناؤ دور کرنے کے لیے وہ مسکرایا۔

"آپ کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں سیمل۔" یک دم اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ تب ہی ریسپشن پر کھڑی لڑکی اندر آئی۔

"مس سیمل......"

"جی......" اس نے اندر جانے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ سیمل اٹھی تو نوشیرواں بھی اٹھ گیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کلینک میں آئے تھے۔ ڈاکٹر عرفان نے اس کے پیچھے آتے نوشیرواں کو دیکھا تو یک دم ہی اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور میز کے پیچھے سے نکل کر انتہائی گرم جوشی سے اسے گلے لگایا۔

"یہ تم ہی ہو نا میجر نوشیرواں آج ہماری یاد کیسے آ گئی۔ خواب تو نہیں دیکھ رہا میں۔" نوشیرواں مسکرایا تھا۔

"بس یار میں پچھلے ایک سال سے کم کم ہی اِدھر آیا ہوں لاہور۔"

"اور اماں جان......" ڈاکٹر عرفان پوچھ رہا تھا۔

"جب اُدھر تھا گلبرگ میں تو ایک مستقل ملازمہ تھی ان کے پاس اور اب یہاں سمن آباد میں حیدر کا گھر ہے نا پاس ہی تو جب میں نہیں ہوتا گھر پر تو اس کے گھر سے کوئی آ جاتا ہے ان کے پاس۔" سیمل کو اپنی بے خبری پر ندامت ہوئی۔ اسے تو کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ میراں اماں گھر پر بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔

"سمن آباد میں تم کہاں رہ رہے ہو؟" ڈاکٹر عرفان واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

"ان کا پڑوسی ہوں۔" نوشیرواں نے مڑ کر اسے دیکھا اور تب پہلی بار ڈاکٹر عرفان اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ارے سیمل بی بی کیسی ہیں آپ اور آنٹی کا کیا حال ہے؟" اور جب وہ اماں کے متعلق تفصیل بتا رہی تھی تو نوشیرواں بھی درمیان میں لقمے دیتا جا رہا تھا اور اس رات کی اماں کی حالت اس نے تفصیل سے بتائی تھی اور سیمل چپ ہو گئی تھی۔ وہ اماں کے متعلق ہر بات یوں ڈاکٹر عرفان سے ڈسکس کر رہا تھا جیسے مروان کرتا تھا۔

"اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے بندوں کو نہیں بھولتا۔" ایک بار مروان نے کہا تھا۔ "وہ ہماری بھی ضرور سنے گا۔"

ڈاکٹر عرفان بہت پُرامید تھے۔ اماں کے متعلق اس ایک ماہ میں وہ کب ہنسی تھیں، کب انہوں نے کوئی بات کی تھی۔ سیمل نے ایک ایک بات تفصیل سے بتائی تھی۔

"یہ بہت خوش آئند ہے سیمل بی بی۔ مجھے یقین ہے کہ آنٹی اب جلد واپس اپنی نارمل حالت میں آ جائیں گی۔" انہوں نے کچھ دوائیں تبدیل کی تھیں اور سیمل جب نوشیرواں کے ساتھ کلینک سے باہر نکلی تو اتنی خوش تھی کہ اس نے نوشیرواں کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ جب وہ کلینک میں داخل ہو رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ واپس جاتے ہوئے وہ نوشیرواں کو صاف صاف منع کر دے گی کہ خوامخواہ اس کی عادتیں خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ کتنی مشکلوں سے تو اس نے تنہا جینا سیکھا تھا مروان کے بغیر لیکن واپس جاتے ہوئے وہ صرف اماں کے متعلق سوچ رہی تھی اور مروان کے متعلق......

"کیا سوچ رہی ہیں؟" سڑک کے کنارے کھڑے نوشیرواں نے پوچھا تھا۔

"میں سوچ رہی ہوں مروان کو جب پتا چلے گا کہ اماں بہتر ہو رہی ہیں تو وہ کتنا خوش ہوگا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" نوشیرواں مسکرایا تھا اور اس نے ماتھے پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ سڑک کے دوسری طرف کھڑی خواتین میں سے ایک لڑکی پر اسے حمنہ کا گمان گزرا تھا۔ دوسری طرف کھڑی لڑکی تو نہ جانے کون تھی لیکن سیاہ ہنڈا سٹی میں سے جھانکتے شخص سے نظر ملتے ہی وہ ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کا رنگ یکدم زرد ہو گیا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں اشارے پر رکی ہوئی تھیں۔ اسے لگا سیاہ ہنڈا سٹی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص فرنٹ ڈور کھول رہا ہے۔ لیکن اشارہ کھل گیا تھا اور یکدم بہت ساری گاڑیوں کے ہارن بج اٹھے تھے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی لیکن خوفزدہ نظروں سے اُدھر ہی دیکھتے ہوئے اسے لگا جیسے گاڑی یوٹرن سے مڑ کر واپس آ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر سڑک پر ڈالی اور پھر مڑ کر دوڑ لگا دی، وہ سامنے والی گلی میں گھس گئی تھی۔ نوشیرواں نے ایک لمحے رک کر اسے خوف زدہ ہو کر دوڑتے دیکھا تھا اور پھر خود بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پیچھے گلی میں گھس گیا۔

☆☆☆

دو دن رہ کر اماں اسپتال سے گھر آ گئی تھیں۔ ان دو دنوں میں ابا ایک بار بھی اسپتال نہیں گئے تھے۔ اکیلا رومی تھا جو اماں کے پاس تھا اور اسے گڑیا کی بھی فکر تھی جو گھر میں اکیلی تھی۔ اگرچہ وہ دو تین چکر گھر کے لگاتا تھا۔ نازو کو بھی سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ گڑیا کا خیال رکھے پھر بھی دو دنوں میں گڑیا کا ذرا سا منہ نکل آیا تھا۔ ابا کو اپنی پوجا سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ گڑیا یا کسی اور طرف دھیان دیتے۔ ڈاکٹر نے رومی سے پوچھا تھا۔

"تمہارے گھر میں کوئی بڑا نہیں ہے بیٹا؟ تمہارے والد یا کوئی اور۔"

"نہیں۔" رومی نے چپکے سے اماں کو دیکھا تھا۔ نرس ان کا بی پی چیک کر رہی تھی۔

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبّی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوا لیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبّی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

”میرے والد گھر پر نہیں ہیں۔ دادا کا انتقال ہوچکا ہے اور گھر میں بس چھوٹی بہن ہے۔“ ڈاکٹر خاصا ہمدرد تھا اور نرسیں بھی اچھی تھیں۔ شام کو جب وہ گڑیا کو لاتا اماں سے ملانے تو ڈیوٹی پر موجود نرسیں اسے بہت پیار کرتیں جب وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر اماں کے لیے دعا کرتی تو اس پر بے ساختہ پیار آتا تھا پھر ڈاکٹر نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔

”خون کی شدید کمی ہے اور کمزوری بھی بہت ہے۔ لگتا ہے یہ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہیں۔ ان کی ڈائٹ کا خیال رکھا کریں۔“ ڈاکٹر نے تاکید کی۔

گھر میں سب کچھ وافر تھا لیکن شاید اماں کی بھوک ہی مر گئی تھی۔ گھر آنے کے بعد رومی اماں کی خوراک کا بھی خود خیال رکھنے لگا تھا۔ ابا نے احوال تک نہ پوچھا۔

”آپ اسپتال نہیں آئے؟“ رومی نے گلہ کیا۔

”میں نے کیا کرنا تھا وہاں آکر، تم تھے نا اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لیے۔“ رومی کو افسوس ہوا تھا کہ اس نے ان سے کیوں کہا۔ حالانکہ وہ ابا سے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا پھر بھی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔

رومی کی زندگی اب گڑیا اور اماں کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس نے ابا کی طرف دیکھنا اور خود سے ان سے بات کرنا چھوڑ دیا اور ابا خود سے کبھی کوئی بات کرتے تو وہ جواب دے دیتا تھا اور ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ ابا اس سے بات کریں۔

آج کل وہ فارغ تھا اس لیے اس کا سارا وقت اماں اور گڑیا کے ساتھ گزر رہا تھا۔ گڑیا کو خود اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا، گھر آتا تو اماں کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ وہ کچن میں ہوتیں تو وہ پاس کھڑا ان سے باتیں کررہا ہوتا۔ لاؤنج میں آتیں تو اُن کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈراموں پر تبصرہ کرتا۔

ان دنوں اماں کی صحت اچھی ہوگئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ خود ان کے کمرے میں دودھ کا گلاس لے کر جاتا اور جب تک وہ پی نہ لیتیں نہ اٹھتا۔ پھر گڑیا کو کہانی سناتا۔ گڑیا کہانی سنے بغیر سوتی ہی نہیں تھی۔ اس کی اپنی دلچسپیاں بالکل محدود ہو کر رہ گئی تھیں لیکن وہ خوش تھا۔

ابا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر، لاؤنج میں کہیں بھی وہ طنز کرنے سے باز نہ آتے۔ انہوں نے کبھی گڑیا یا رومی کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی کسی معمولی بات پر پہلے کی طرح ہی آپے سے باہر ہوجاتے پھر چیزوں کی شامت آجاتی تھی لیکن رومی کی موجودگی میں وہ ان پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اب۔

اس روز وہ اماں کے پاس بیٹھا انہیں اپنے ایک دوست کے متعلق بتا رہا تھا اور اماں پالک کاٹ رہی تھیں کہ اچانک ہی وکیل کا فون آگیا۔ وہ اماں سے بات کرنا چاہتے تھے۔ تب اسے یاد آیا کہ اس روز جب اماں بے ہوش ہوئی تھیں تو جھگڑا اماں کے نام کی گئی جائداد پر ہوا تھا۔ اماں بات کرچکیں تو اس نے تفصیل پوچھی تب اماں نے بتایا۔

”ماموں جان نے اپنی تمام پراپرٹی اور بینک میں موجود رقم میرے نام کی ہے کیونکہ میں ان کی واحد وارث ہوں شرعاً اور قانوناً۔ وکیل نے مجھے یہی بتایا ہے۔ تمہارے ابا کے نام کچھ نہیں ہے سوائے اس کوٹھی کے جس میں وہ رہ رہے ہیں۔“

”وکیل نے اب آپ کو کیوں فون کیا ہے؟“ اماں جھجک گئیں۔

”وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا میں نے تمہارے ابا کو کوئی مختار نامہ دیا ہے۔“

”آپ نے کیا کہا؟“ رومی اماں کی کمزوری کو جانتا تھا۔ وہ جھگڑے اور ابا کے غصے سے بہت گھبراتی تھیں۔

”وہ...... وکیل نے مجھے ملنے کو کہا ہے۔“

”ابا یقیناً کوئی فراڈ کررہے ہیں تب ہی اتنے دنوں سے انہوں نے پھر جائداد کا ذکر نہیں کیا۔“ یہ رومی کا خیال تھا۔

وہ اماں کو لے کر خود وکیل کے پاس گیا تھا۔ ابا نے ایک جھوٹا مختار نامہ تیار کرکے اس پر اماں کے جعلی دستخط کردیے تھے۔ ”ان پر فراڈ کا کیس بھی چل سکتا ہے۔“

”نہیں، نہیں وکیل صاحب بس بات ختم کردیں۔“ انہوں نے مختار نامہ پھاڑ دیا۔

”کوئی فراڈ ہوا تو نہیں نا!“ رومی کی اتنی زیادہ توجہ اور سہارے نے اماں کے اندر خود اعتمادی پیدا کی تھی اور اسی خود اعتمادی کے سہارے انہوں نے سب پراپرٹی اور نقد رقم رومی اور گڑیا کے نام کردی تھی۔ ابا کو پتا چلا تو وہ بہت چلائے اور بہت ہنگامہ کیا۔

”تم چالاک...... عورت، میسنی...... کس کے ساتھ وکیل کے پاس گئی تھیں۔“

”میں اماں کے ساتھ گیا تھا۔“ قمیص کی آستینیں فولڈ کرتا رومی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔

”اس احمق عورت کو عقل نہیں کہ بچوں کے نام سب کچھ کردیا۔ ضائع ہوجائے گا، کوئی بچوں کے ساتھ دھوکا بھی کرسکتا ہے۔“

”کی تو تھی ایک کوشش آپ نے فراڈ کی۔ جعلی مختار نامہ تیار کرکے اور اماں کے جعلی دستخط کرکے۔“ رومی نے اب ان سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کو ان کا رنگ بدلا تھا۔

”میں نے تمہارے لیے کیا تھا اپنے بچوں کے لیے ورنہ اس بے وقوف جاہل عورت سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ یہ اتنی بڑی پراپرٹی سنبھال سکتی۔“ انہوں نے پینترا بدلا تھا۔

”دادا جان نے سب بندوبست کردیا تھا۔“ بڑے رسان سے جواب دیتا وہ اماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ زمینیں ٹھیکے پر ہیں۔ رقم اماں کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہے گی۔“

”وہ شخص تمہارا دادا نہیں تھا۔“

”سوری! نانا ابا نے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ وکیل نے آپ کو بتایا نہیں نانا جان نے آپ کے اکاؤنٹ میں بھی ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم کی جمع کروائی ہے۔ آخر کو انہوں نے آپ کو پالا تھا۔“

”لعنت بھیجتا ہوں میں اس رقم پر...... میں مہینے میں لاکھوں کماتا ہوں۔“ وہ سامنے پڑی چھوٹی ٹیبل کو ٹھوکر مارتے لاؤنج سے نکل گئے...... رومی کی نظر سیڑھیوں پر پڑی تھی، ریلنگ پر ہاتھ رکھے گڑیا اوپر والی سیڑھی سے خوف زدہ سی جھانک رہی تھی۔

”گڑیا نیچے آجاؤ، واک کے لیے چلتے ہیں۔“ رومی بہت خوش تھا اسے لگا تھا کہ آج ابا لاجواب ہوگئے تھے۔ اس روز وہ پھر ضد کرکے اماں کو ساتھ لے گیا تھا اور اس روز پھر انہوں نے ایک بہت اچھا اور خوب صورت دن گزارا تھا۔ واپسی پر اس نے ابا کے لیے بھی آئس کریم اور بروسٹ پیک کروالیا تھا۔ اس کا خیال تھا بلکہ یقین تھا اسے کہ ابا دونوں چیزیں اٹھا کر پھینک دیں گے لیکن خلافِ توقع انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بلکہ شکریہ کہہ کر نازو کو پلیٹیں لانے کے لیے کہا تھا اور آئسکریم فریج میں رکھوادی تھی۔

اس روز رومی بڑے دنوں بعد پُرسکون نیند سویا تھا اور خواب میں اس نے مکمل گھرانا دیکھا تھا۔ ابا، اماں، وہ اور گڑیا۔ یہ خواب وہ جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھتا تھا اور اس رات اس نے سونے سے پہلے بڑے دنوں بعد ہوم سوئیٹ ہوم کی کہانی گڑیا کو سنائی تھی۔ نیلی چارلس کا سوئیٹ ہوم۔ جس میں نیلی اپنے دو جڑواں بھائیوں اور اپنے مما پپا کے ساتھ رہتی تھی۔ نیلی کا گھر جس میں محبت کی گرمی اور حدت تھی۔ جہاں غربت تھی اور جہاں نیلی کو ہفتے میں ایک بار بھوکے پیٹ سونا پڑتا تھا پھر بھی نیلی خوش تھی کہ اس کے ماما، پاپا ان تینوں سے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اور اس گھر میں سب ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کو تیار رہتے تھے حتیٰ کہ ننھے جون اور ولیم بھی...... اور کوئی یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ اس نے قربانی

دی ہے۔ گڑیا نے ہمیشہ کی طرح کہانی بہت سے شوق سے سنی تھی اور سنتے سنتے سو گئی تھی۔ ابا ان دنوں لڑائی جھگڑا نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے گڑیا سے بھی باتیں کی تھیں اور رومی سے بھی اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھا تھا حتیٰ کہ اس نے ایک روز انہیں اماں سے بھی نرمی سے بات کرتے دیکھا تھا اور ابا کے اتنے سے التفات پر جیسے اس کے اندر کے غصے پر پانی کے چھینٹے پڑ گئے تھے اور اس کی ساری تلخی ختم ہو گئی تھی۔ پھر بہت سارے دن سکون سے ہی گزر گئے تھے۔ ابا نے صرف چند بار طنز کرنے کے اماں سے کچھ نہیں کہا تھا پھر اس کا رزلٹ آ گیا۔ اس نے اے پلس گریڈ لیا تھا۔ اماں بے حد خوش تھیں۔

”شکر ہے تو اس عورت پر نہیں چلا گیا۔ میری ذہانت ملی ہے تجھے۔“ اس کا دل بے حد برا ہوا تھا ابا کی بات پر لیکن اس نے اگنور کیا۔ نیچر کہاں بدلتی ہے بھلا اس نے انہیں نیچر کا مارجن دے کر اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا۔ تب ابا نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے تعلیم کی غرض سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔ یو کے۔ یو ایس اے جہاں وہ چاہے تب اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”نہیں مجھے باہر نہیں جانا۔“ مجھے جو کچھ کرنا ہے یہیں پاکستان میں رہ کر کروں گا۔ میں اماں اور گڑیا کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیوں تمہاری اماں کو چور پکڑ رہے ہیں کیا۔ وہاں جا کر کچھ تہذیب اور ادب آداب سیکھ لیتے۔“

”وہ تہذیب جو آپ سیکھ کر آئے ہیں۔“ رومی کا جی چاہا وہ کہے لیکن اب مدت ہوئی اس نے ان سے بحث کرنا چھوڑ دی تھی کرنا اس نے وہی تھا جو اس نے سوچ رکھا تھا۔ اس کی پہلی ترجیح آرمی جوائن کرنا تھی۔

”اگر مجھے کمیشن نہ ملا تو میں بی ایس سی کر لوں گا اور ایک بار پھر ٹرائی کروں گا۔“ اس نے اماں کو بتایا تھا رومی کو کمیشن مل گیا اور وہ پی ایم اے کے لانگ کورس کے لیے اکیڈمی چلا گیا۔ گڑیا تب نو سال کی تھی جب وہ اکیڈمی جا رہا تھا اور جب دو سال بعد وہ پاسنگ آؤٹ کے بعد واپس آیا تو گڑیا گیارہ سال کی ہو چکی تھی۔ یہ دو سال اماں نے بہت مشکل سے گزارے تھے لیکن جب کبھی وہ چھٹی پر گھر آتا اماں نے کبھی اس پر کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ البتہ گڑیا اسے ہمیشہ ہی ڈری سہمی اور خوف زدہ سی ملتی تھی۔ اس کی غزل آنکھوں میں جیسے خوف بس گیا تھا۔ اماں کی صحت پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔

”اماں......“ ان کے گلے کے گرد باہیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”آرمی میں جانا میرا شوق تھا لیکن آرمی جوائن کرنے کی ایک وجہ بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا بھی تھا۔ میں آپ کو یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ جہاں بھی رہا گڑیا اور آپ میرے ساتھ ہی رہیں گی۔“

اس کی پاسنگ آؤٹ پر کوئی نہیں آیا تھا۔ اماں اور گڑیا تو اکیلے آ نہیں سکتی تھیں اور ابا...... اس نے انہیں فون کر کے کہا بھی تھا کہ وہ گڑیا اور اماں کے ساتھ آئیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے آنے کا۔“ اس کی پہلی پوسٹنگ کھاریاں میں ہوئی تھی۔ وہ اب لیفٹیننٹ تھا اور چاہتا تھا اماں اور گڑیا اس کے ساتھ چل کر رہیں۔ اسے آرمی کی طرف سے گھر نہیں ملا تھا لیکن اس نے کہا تھا وہ کہیں باہر کرائے پر گھر لے لے گا لیکن اماں نے منع کر دیا۔

”تمہارے ابا ناراض ہوں گے۔“ اماں کی آنکھوں کی التجا پر وہ چپ ہو گیا۔ وہ ہر ویک اینڈ پر گھر آ جاتا۔ اور یہ دن گڑیا اور اماں کے ساتھ پلک جھپکتے میں گزر جاتے۔ وہ انہیں میس میں ہونے والے لطیفے سناتا اور اپنے ساتھیوں کی اپنی باتیں بھی...... وہ بہت خوش تھا۔ بچپن میں جو اس نے سوچا تھا کہ وہ فوج میں جائے گا اس کا وہ خواب پورا ہو گیا تھا لیکن ابا کے بدل جانے کا خواب پورا نہیں ہوا تھا۔ ابا ویسے ہی تھے تنگ دل، اکھڑ اور بدمزاج۔ اب تو انہوں نے اماں کے

کمرے میں آنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا اور گیسٹ روم مستقل اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پر لاؤنج میں لیونگ روم میں ان کی زبان زہر اگلتی رہتی۔ اماں کے علاوہ ان کا نشانہ دادا جان اور دادی کی ذات ہوتی۔ کبھی کبھی وہ دادا جان کو خوب گالیاں دیتے اور رومی کا دل دکھتا۔ اماں چپکے چپکے روتیں اور گڑیا ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی ہولے ہولے کہتی رہتی۔

”اماں نہ روئیں، اماں چپ کریں۔“ اور کبھی جو ابا کی نظر اماں پر پڑ جاتی تو ان کا رونا انہیں بھڑکا دیتا۔

”کس بات کا پیٹنا ہے ناشکری عورت! تجھ جیسی عورت کو میرے جیسا بندہ مل گیا۔ شکر کر۔“ اور پھر لاتیں مکے تھپڑ...... اور گڑیا اماں کو بچاتے اکثر ان کی زد میں آ جاتی اور ایسا اس وقت ہوتا جب رومی گھر پر نہ ہوتا، رومی کی موجودگی میں وہ غصے میں آنے سے گریز ہی کرتے تھے۔ اماں ہر بات رومی سے چھپانے لگی تھیں۔ انہیں جوان بیٹے کے غصے سے خوف آتا تھا اور وہ گڑیا کو بھی سختی سے منع کر دیتیں۔

”رومی کو کچھ نہ بتانا...... خوامخواہ باپ سے جھگڑا کرے گا۔“ اور گڑیا تو یوں بھی جھگڑنے سے گھبراتی اور ڈرتی تھی سو وہ رومی کے لاکھ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بتاتی تھی اور پھر جب گڑیا نے میٹرک کا امتحان دیا تو... رومی کی پوسٹنگ لاہور ہو گئی۔ رومی کی یہ تیسری پوسٹنگ تھی اور وہ لاہور آ کر بے حد خوش تھا۔ گڑیا اور اماں کے لیے یہ دن زندگی کے خوب صورت ترین دن تھے۔ ابا یو۔ کے گئے ہوئے تھے اور گھر میں معمولی سی بھی ٹینشن نہ تھی، ان دنوں رومی کے ساتھ وہ پورا لاہور گھومی تھی۔ وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی لہٰذا اس کے پاس بہت وقت تھا۔ ان دنوں رومی نے اسے ڈھیروں کتابیں خرید کر دی تھیں اور وہ بڑے بڑے ادیبوں سے روشناس ہوئی تھی۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ وغیرہ ان سب کو اس نے تب ہی پڑھا تھا۔ رومی بھی کتابوں کا کیڑا تھا۔

کوئی بھی نئی کتاب پڑھنے کے بعد وہ اس پر تبصرہ کرتے۔ اس نے اماں کو بھی پڑھنے کا چسکا ڈال دیا تھا۔ اب اماں بھی فارغ وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوتیں۔ اب وہ خود پڑھ سکتی تھی لیکن اسے اب بھی رومی سے کہانی سننا اچھا لگتا تھا۔ وہ فرمائش کر کے رومی سے کہانی سنتی۔ رومی بھی اس کی فرمائش ضرور پوری کرتا جیسے وہ ننھی بچی ہو۔ اسے آج سولہ سال کی عمر میں بھی نیلی کے سوئیٹ ہوم والی کہانی بہت پسند تھی اور جب نیلی کا گھر بک جاتا تھا اور انہیں ایک پہاڑ کی کھوہ میں رہنا پڑتا تھا تو آج بھی اسے سنتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور رومی ہنستا۔

”پگلی...... یہ کہانی ہے۔“

”کہانیاں بھی تو زندگی کے المیوں اور واقعات سے کشید کی جاتی ہیں۔ کیا خبر کہیں حقیقت میں بھی کوئی نیلی ہو جسے کبھی کسی پہاڑی غار میں پناہ لینی پڑی ہو۔“ وہ سوچتی تھی۔

اس روز جب پہلی بار اس نے رومی کے ساتھ انارکلی سے پرانی کتابیں خریدی تھیں تو رومی اسے انارکلی کی بانو بازار کی چاٹ کھلانے لے گیا تھا۔ واپسی پر وہ یونہی وہاں رک کر کتابیں دیکھنے لگے تھے اور رومی نے اس کے لیے وہاں سے قرۃ العین کی آگ کا دریا لی تھی۔ ان دنوں اماں کتنی خوب صورت لگنے لگی تھیں۔ اسمارٹ اور باوقار، نازک سی اماں۔ وہ اکثر سوچتی تھی آخر ابا کو اماں پسند کیوں نہیں ہیں۔ اماں تو کسی بھی شخص کا آئیڈیل ہو سکتی تھیں پھر...... ابا یو کے سے آئے تو اماں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

”بڑی عیاشیاں ہو رہی ہیں میرے پیچھے۔“

ابا اچانک آئے تھے۔ وہ تینوں باہر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ دراصل رومی اور گڑیا نے چپکے چپکے اماں کی سالگرہ کا پروگرام بنایا تھا۔ آج ان کا برتھ ڈے تھا۔ گڑیا اور رومی نے خود اماں کے لیے کپڑے

سلیکٹ کیے تھے اور گڑیا نے ضد کر کے ان کا لائٹ سا میک اپ کیا تھا وہ ٹی پنک اور لائٹ فیروزی امتزاج کے سوٹ میں بے حد دلکش لگ رہی تھیں۔

"تم جاؤ رومی، گڑیا کو لے جاؤ۔ تمہارے ابا آ گئے ہیں، میں نہیں جاؤں گی۔" انہوں نے آہستہ سے رومی سے کہا تھا اور ابا کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"آپ فریش ہوجائیں میں چائے لگواتی ہوں۔"

"نہیں بھئی تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ سیر سپاٹے کرو۔ نازو ہے دے دے گی مجھے چائے۔"

"دراصل ابا۔" رومی نے بڑے تحمل سے کہا۔ "آج اماں کی سالگرہ ہے اور ہم نے اماں کو... سرپرائز دینے کا پروگرام بنایا تھا۔ تو ایسا ہے کہ آپ فریش ہوجائیں پھر آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ۔"

"نہ جی، مجھے تو بخشو، تم اٹھاؤ اپنی ماں کے چوچلے۔"

"ابا جی...... یہ زندگی بہت مختصر ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہم سب مل جل کر منالیں تو زندگی بڑی سہل ہوجاتی ہے۔"

"مجھے فلسفہ نہ پڑھا، تجھ سے زیادہ علم ہے میرے پاس، اس احمق عورت کے ساتھ زندگی کی خوشیاں بانٹنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی کنوئیں میں چھلانگ لگادے۔" بڑے دنوں بعد آج رومی کے سامنے انہوں نے اس طرح اماں کو مخاطب کیا تھا۔ اماں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ رومی نے بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ گڑیا، اماں کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"ٹھیک ہے ابا جی، آپ آرام کریں۔ نازو ہے گھر میں، چائے کھانا جو بھی چاہیے ہوگا کہہ دیجیے گا اس سے۔" اس نے اماں کا ہاتھ پکڑا۔

"چلیں اماں۔"

اماں نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اماں پلیز! میں نے کیک آرڈر کیا ہوا ہے اور......"

"نازو......" ابا چلائے۔ "میرا بیگ رکھ میرے روم میں۔" اور خود بریف کیس اٹھا کر زور زور سے پاؤں زمین پر مارتے باہر چلے گئے۔ اماں لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

"چلیں اماں۔" رومی سنجیدہ تھا۔

"مجھے اس امتحان میں نہ ڈال، ضد نہ کر۔ انہیں اور غصہ نہ دلا۔" رومی کو اماں کی بے چارگی پر دکھ ہوا۔

"ٹھیک ہے اماں جی ریلکس ہوجائیں، میں کیک پیک کروا کے گھر ہی لے آتا ہوں۔" ان کے گرد بازو حمائل کر کے وہ انہیں صوفے کی طرف لے گیا اور صوفے پر بٹھایا۔

"گڑیا! اماں کا خیال رکھنا۔ میں ابھی آیا۔" وہ اپنی جیپ کی چابی اٹھاتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ رومی کے جانے کے بعد اماں اٹھیں۔

"گڑیا تو بیٹھ اِدھر میں تیرے ابا کے کپڑے نکال دوں۔"

"اماں۔" گڑیا نے ان کا ہاتھ پکڑلیا۔ "وہ غصے میں ہیں۔"

"وہ کب غصے میں نہیں ہوتے گڑیا۔" انہوں نے آہستگی سے کہا اور گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز تھے۔

"آپ نے جوتے بھی نہیں اتارے۔" انہوں نے کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے ان کے جوتے اتارے۔ "ایزی ہو کر لیٹ جائیں۔ میں واش روم میں کپڑے لٹکا دیتی ہوں۔ کچھ ریسٹ کرلیں پھر نہا...... لیجیے گا۔" نرمی سے کہتی وہ وارڈ روب کی طرف مڑ گئیں۔ وہ زہریلی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اماں کو ان کی نظریں اپنی پیٹھ میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ شلوار قمیص کا سوٹ نکال کر مڑیں تو وہ جیسے پھنکارے تھے۔

"دو تین ماہ کے لیے گھر سے گیا تھا۔ عیاشیاں ہونے لگیں۔ ہوٹلنگ ہوتی تھی روز...... میرے پیسے پر رنگ رلیاں منائی جارہی تھیں۔ میرا...... میرا پیسہ تھا امینہ بیگم...... میرا حق تھا۔ بیٹا تھا میں ان کا لیکن تو نے اپنی چالاکی اور میسنے پن سے اپنے نام کروالیا سب کچھ میرا حق تھا میرا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"آپ بیٹے ہی تو نہیں بنے ان کے حبیب...... بیٹا بن کر دکھاتے تو ماموں مامی یوں زخمی دل لیے اس دنیا سے نہ جاتے۔" سگے ماموں کا دکھ امینہ کو کبھی بھی رُلا دیتا تھا اور اسی دکھ کے زیرِ اثر آج پہلی بار انہوں نے حبیب خان کی بات کے جواب میں پلٹ کر کچھ کہا تھا۔

"تو...... تو دو ٹکے کی عورت مجھے بتا رہی ہے کہ مجھے کیا کرنا تھا...... تو......" انہوں نے ایش ٹرے اٹھا کر ان کی طرف پھینکا تھا اور پھر امینہ بیگم تھیں اور حبیب خان کے جوتے مکے لاتیں اور زبان سے نکلنے والی گالیاں۔

رومی جب کیک لیے گھر آیا تو گڑیا جو دروازے کے ساتھ سہمی کھڑی تھی روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اسے پچکارتے ہوئے اس نے نازو کی طرف دیکھا جو گیسٹ روم کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے گڑیا کو صوفے پر بٹھایا اور نازو کو پانی لانے کے لیے کہا اور خود بے حد ضبط کیے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔ تب ہی گیسٹ روم کا دروازہ کھلا اور ابا نے اماں کو باہر دھکا دے کر دروازہ بند کرلیا۔

وہ تیر کی طرح اماں کی طرف لپکا تھا پھر اس نے انہیں اپنے توانا بازوؤں میں اٹھالیا اور سیدھا سیڑھیاں چڑھتا ہوا ان کے کمرے میں آیا تھا۔ اماں ہولے ہولے سسک رہی تھیں۔ ان کا چہرہ نیل سے بھرا تھا۔ اس نے ان سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ گڑیا کو آئیوڈیکس لانے کا کہہ کر وہ ان کے بیڈ کے پاس ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ گڑیا نے انہیں آئیوڈیکس لگائی تھی اور گرم گرم دودھ کے ساتھ پین کلر کھانے کو دی تھی۔

"اماں پلیز میری بات مان لیں۔" بڑی دیر بعد اس نے کہا تھا۔ انہوں نے اپنے جوان مضبوط بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور تڑپ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے رومی جیسے تیری مرضی۔" اور انہوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس رات گڑیا نے اور اس نے پوری رات اماں کے سرہانے جاگ کر گزاری تھی اور اگلے روز سے ہی وہ ایک چھوٹے لیکن اچھے سے گھر کی تلاش کرنے لگا تھا۔ وہ یہ گھر خریدنا چاہتا تھا مستقل ٹھکانے کے طور پر ورنہ اس کی جہاں بھی پوسٹنگ ہوتی اماں اور گڑیا نے اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ بالآخر اسے ایک اچھی سوسائٹی میں دس مرلے کا گھر پسند آگیا تھا۔ اردگرد کے لوگ بھی اچھے تھے لیکن جب وہ اماں سے چیک لے کر گیا تو پتا چلا کہ ان کے اکاؤنٹ میں تو صرف دس ہزار ہیں وہ بنا کچھ کہے بینک سے گھر آگیا تھا۔

"اماں آپ نے کبھی ابا کو چیک دیا، کوئی رقم......"

"ہاں دو دفعہ، انہیں رقم کی ضرورت تھی تو انہوں نے مانگے تھے مجھ سے۔"

"کتنے؟"

"ایک دفعہ پچاس ہزار اور ایک دفعہ دو لاکھ۔"

رومی خاموش تھا۔

"بیٹا وہ تمہارے باپ ہیں اور ماموں جان نے انہیں بیٹا بنایا تھا۔"

"اماں انہوں نے آپ کے اکاؤنٹ سے سب پیسہ نکلوالیا ہے، آپ کے جعلی دستخط کر کے۔" یہ بھی غنیمت تھا کہ اماں نے رومی اور گڑیا کے اکاؤنٹ میں بھی رقم جمع کروائی تھی۔

"بیٹا اپنے باپ کے خلاف کوئی کیس مت کرنا۔ کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ اتنی پراپرٹی ہے کچھ فروخت کردو اور گھر لے لو۔ اچھا سا ہی ایک بار......" اور رومی اماں کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں ابھی ہم کوئی گھر کرائے

پر لے لیتے ہیں۔'' اور ابھی اسے کوئی گھر پسند ہی نہیں آیا تھا کہ وہ واقعہ ہو گیا۔ اماں لاؤنج میں بیٹھی تھیں اور ان کے چہرے پر ابھی بھی نیل پڑے ہوئے تھے۔ ماتھے پر گومڑ تھا۔

''اماں جی۔'' وہ ان کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں نے آج ایک گھر لے لیا ہے کرائے پر بعد میں پھر اپنا لے لیں گے، آپ اپنی ضروری چیزیں پیک کر لیجیے گا۔''

''رومی کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے بیٹا، کیا ہم یہاں رہ کر سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتے۔''

''اماں جی ہم نے اب تک اتنے سالوں میں کیا ٹھیک کر لیا ہے۔ ابا جی نہیں بدلیں گے اور مجھ سے آپ کی عزتِ نفس بار بار مجروح ہوتی نہیں دیکھی جاتی۔ میرے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے شاید ہمارے چلے جانے سے انہیں اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو جائے۔''

تب ہی ابا نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہمیشہ کی طرح وہ بہت شاندار لگ رہے تھے۔ ٹائی سے لے کر جوتے تک ہر چیز برانڈڈ تھی۔ ان کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے لاؤنج کے داخلی دروازے پر رک کر رومی اور اماں کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اماں کا ہاتھ رومی کے ہاتھ میں تھا۔

''تو دلجوئیاں ہو رہی ہیں ماں کی۔'' لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ اور لہجے میں تلخی...... رومی نے کچھ نہیں کہا تھا بس ایک شاکی نظر ان پر ڈالی تھی اور پھر نظریں جھکا لی تھیں۔

''یہ میرے پیچھے ماں کو کس راستے پر لگا دیا تھا تو نے۔'' رومی نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں ابا؟''

''سنا ہے بڑی پارٹیوں شارٹیوں میں لے جاتا تھا اپنے افسروں کو پیش کرتا......''

''ابا جی......'' رومی زور سے دہاڑا تھا۔ ''اس سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا، نہیں تو......''

''نہیں تو کیا کر لے گا تو۔'' انہوں نے ہاتھ دیوار پر رکھا۔ رومی نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ رومی نے مڑ کر دیکھا۔ اماں کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

''یہ آپ کے گندے خون کا اثر ہے کہ آپ کی سوچ اتنی گھٹیا ہے۔''

''اچھا میرا خون گندہ ہے...... تو کس کا خون ہے کیا کسی اور کا۔''

''میرے وجود میں میری ماں کا خون بھی ہے جو آپ کے خون پر غالب آ گیا ہے۔''

''اچھا میں سمجھا کسی اور کا خون ہے۔'' طنزیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

''ابا......'' اب کے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ ''آپ کو میری ماں کی پاکیزگی پر الزام لگاتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔''

''اچھا۔'' وہ تیر چلا کر واپس مڑے اور انہوں نے دروازہ کھول کر نازو کو آواز دی تھی۔ ''اندر آ جاؤ باہر ہی کھڑی ہو گئی ہو۔'' نازو اندر آئی تھی۔ شرماتی لجاتی، دوپٹے کے کونے کو انگلی پر لپیٹتی۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس، کسی مہنگے بوتیک سے خریدا گیا وہ سوٹ اس کے جسم پر اجنبی سا لگ رہا تھا۔

''میں نے نازو سے شادی کر لی ہے۔'' انہوں نے ایک اور تیر چلایا تھا...... ''اور اب تم اپنی ماں کو یہاں سے لے کر دفع ہو جاؤ۔'' حیرت کا جھٹکا کھا کر رومی نے نازو کو دیکھا۔ سولہ سترہ سال کی نازو...... ان پڑھ جاہل...... اس کی اتنی شاندار، باوقار اور میٹرک پاس ماں انہیں ساری زندگی احمق اور جاہل دکھتی رہی تھی اور اب یہ نازو...... کیا یہ کیمبرج یا آکسفورڈ سے پڑھ کر آئی تھی۔ اماں کا ہاتھ اس کے بازو سے ہٹ گیا تھا۔ ابا نازو کا ہاتھ پکڑے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ ساکت

بیٹھی تھیں اور سامنے دیوار کو سپاٹ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اماں جی۔'' اس نے ان کا بازو ہلایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظروں کے خالی پن سے گھبرا کر اس نے انہیں جھنجوڑ ڈالا۔

''اماں...... اماں جی۔'' وہ لہرا کر اس کی گود میں آ گری تھیں اور وہ ان کے رخسار تھپتھپا رہا تھا۔ انہیں آوازیں دے رہا تھا لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت پڑی تھیں۔

☆☆☆

بھاگتے ہوئے وہ پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ یکدم بھاگتے بھاگتے اس کا پاؤں مڑ گیا۔ وہ یک دم پاؤں پکڑ کر بیٹھی تھی اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ تو ڈاکٹر کے کلینک کی طرف بھاگی تھی لیکن یہ گلی تو کوئی اور تھی۔ پاؤں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی تب اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو بے اختیار اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ نوشیرواں تھا۔

''سیمل...... سیمل کیا ہوا۔ آپ کس سے خوف زدہ ہو کر بھاگی تھیں۔ میں تھا نا آپ کے ساتھ آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' اس نے غیر ارادی طور پر قریب آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

''کوئی میری لاش سے گزر کر ہی آپ کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہم قبائلی لوگ اپنی عزت کے لیے جان سے گزر جاتے ہیں۔''

''وہ بس ایسے ہی میں ڈر گئی۔'' وہ ہکلائی تھی۔

''او کے چلیں ابھی گھر چل کر تفصیل سے بات ہوتی ہے۔''

''مگر وہ...... وہاں ...... روڈ پر تو میں نے خود انہیں یوٹرن سے گاڑی موڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا مجھے آپ کے ساتھ کھڑے۔'' وہ زرد ہو رہی تھی۔ نوشیرواں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور تسلی کے سے انداز میں مسکرایا۔

''میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔'' لیکن وہ یوں ہی گھبرائی سی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی جیسے ابھی کسی گلی سے وہ نکل آئیں گے۔

''او کے ہم یہاں پچھلی گلی سے نکل کر چوک پر پہنچ جائیں گے اور وہاں سے پھر رکشا کر لیں گے۔''

''آپ کو پتا ہے ان رستوں کا۔''

''ہاں......'' وہ مسکرایا۔

''رستے نہ بھی پتا ہوں تو تلاش کرنے کا ہنر آتا ہے مجھے۔'' وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ سہمی سہمی خوف زدہ سی۔

پھر نوشیرواں نے ایسا ہی کیا تھا جانے کن کن گلیوں سے نکل کر وہ چوک پر آ گئے تھے۔ وہاں سے رکشا کر کے جب وہ اپنی گلی میں گھر کے سامنے پہنچی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

''تھینک یو۔'' اس نے متشکر نظروں سے اسے دیکھا۔ ''یہ دوسری بار ہے جب آپ نے میری مدد کی۔''

''تو کبھی آپ بھی ہماری مدد کر دیجیے گا۔''

''میں بھلا کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی۔'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''وقت آنے پر بتا دیں گے۔'' اس نے دروازے پر دستک دی تو نوشیرواں نے پوچھا۔

''کیا وہ یہاں بھی آ سکتا ہے۔''

''نہیں...... انہیں اس گھر کا پتا نہیں ہے......''

جواب دے کر وہ پھر دستک دینے لگی۔ دیر ہو گئی تھی اماں شاید جاگ گئیں ہوں گی اس نے سوچا تب ہی فضیلت نے دروازہ کھول دیا۔

''اماں جاگ گئیں کیا؟''

''نہیں۔'' فضیلت جواب دے کر پلٹ گئی۔ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے دیکھا وہ بھی اپنے گھر جا رہا تھا۔

اماں کے کمرے میں آ کر اس نے چادر اتارنے سے پہلے اے سی آن کیا۔ اماں کروٹ کے

بل سو رہی تھیں۔ چادر کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اطمینان کی سانس لی۔ جیسے وہ کسی محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی ہو۔ پھر اس کی نظر اپنے دائیں ہاتھ پر پڑی اور اسے لگا جیسے نوشیرواں کا لمس زندہ ہو گیا ہو۔ کلائی پر جہاں سے نوشیرواں نے اسے پکڑ کر اٹھایا تھا جیسے اب بھی وہ اس کے ہاتھ کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ''یہ نوشیرواں......''

''نہیں بھلا میں کیوں اس کے متعلق سوچ رہی ہوں۔'' اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور فضیلت کو آواز دی۔

''ایک گلاس پانی پلا دو۔''

''میں چلی جاؤں جی۔'' پانی کے گلاس کے ساتھ ہی فضیلت فرمائشیں لیے کھڑی تھی۔

''کیوں؟''

''آپ تو گھر میں ہونا جی اماں جی کے پاس۔''

''ہاں...... لیکن۔''

''وہ جی کام تو میں نے سارا کر دیا ہے۔ صفائی، برتن، آٹا بھی گوندھ دیا ہے۔ بس جی ہانڈی آپ خود بنا لینا۔ کپڑے میں کل دھولوں گی آ کر۔''

''تمہیں پتا ہے فضیلت میں کام کی وجہ سے نہیں اپنی تنہائی کی وجہ سے شام تک تمہیں روکتی ہوں۔ میرا دل گھبراتا ہے اکیلے ورنہ اتوار والے دن تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔''

''وہ تو جی ٹھیک ہے پر مجھے آج کام سے جانا تھا۔ آپ کا دل بہت گھبرائے تو آپ اُدھر میراں اماں کی طرف چلے جانا۔ اماں جی کو بھی لے جانا۔ اچھا ہے ہر وقت گھر میں رہتی ہیں کہیں آتی جاتی بھی نہیں۔ خوش ہوں گی دیکھ لینا۔'' وہ تو مشورے دے کر چلی گئی تھی لیکن سیمل کو اس کا مشورہ پسند آیا تھا۔

''ہاں اماں تو ہمیشہ گھر میں رہتی ہیں۔ اگر میں انہیں کہیں لے جایا کروں تو شاید ان پر اچھا اثر پڑے۔ شام کو اور کبھی رات کو۔ سب بلاک کی اکثر عورتیں پارک میں واک کے لیے جاتی تھیں۔ میں بھی اماں کو لے جاؤں گی۔'' اس نے فیصلہ کیا۔

کھانا تیار کر کے اس نے اماں کو اٹھایا پھر اماں کو نہلا کر کپڑے بدلوا کے ان کے بال بنائے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ اماں کو نہانے کے لیے واش روم چھوڑ کر آتی تو وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی تھیں۔ تب وہ نہانے میں ان کی مدد کرنے لگی تھی۔ ان کے بال سلجھاتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح باتیں کرتی رہی۔ اس نے انہیں آج کے واقعے کے متعلق بھی بتایا تھا۔

''اماں ہم مروان کے بغیر کتنے تنہا ہیں۔ ہمیں کتنی ضرورت تھی نا اس کی...... ہر قدم پر، ہر لمحے......''

اس نے دیکھا مروان کے نام پر اماں نے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ پھر سر جھکا لیا تھا۔

اماں کبھی کبھی میں بہت تھکنے لگتی ہوں۔ جی چاہتا ہے میں اور آپ کچھ کھا کر سو جائیں۔ ہمیشہ کی گہری نیند۔'' اماں نے جھرجھری لی تھی۔ ان کی چٹیا بنا کر وہ ان کے سامنے آ بیٹھی، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''اماں جی۔'' اس نے ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''یوں لگتا ہے اماں جیسے اس بھری دنیا میں صرف ہم دونوں ہی ہیں جو بالکل تنہا ہیں اکیلے...... کوئی اپنا نہیں...... کیوں نہ اماں ایسا کریں کسی دن دونوں گھر سے نکل چلیں اور ریل کی پٹری پر جا کر لیٹ جائیں اور پھر کوئی ریل ہمیں کچلتی ہوئی چلی جائے اور بس سب دکھوں کا خاتمہ ہو جائے۔'' پتا نہیں کیوں آج وہ اتنی قنوطی ہو رہی تھی اور اتنی مایوس حالانکہ مروان اسے کتنا سمجھاتا تھا۔

''سیمل یہ زندگی بہت مشکل ہے۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ تمہارا ہاتھ پکڑ کر نہیں چلوں گا۔ کچھ لمحے ایسے بھی آئیں گے جب تمہیں اکیلے چلنا پڑے گا پھر کیا کرو گی بیٹا ان لمحوں کے لیے خود کو بہادر بناؤ۔ یہ ڈر جو تمہارے اندر بیٹھ گیا ہے اسے دل سے نکال دو۔'' وہ مروان کے متعلق سوچنے لگی تھی اور اسے محسوس بھی نہیں ہوا تھا کہ اماں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں اور اس کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھ رہی تھیں، اس کا دھیان نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے سکون مل رہا تھا اور پھر وہ یونہی سوچتے سوچتے اماں کی گود میں سر رکھے سو گئی۔

پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی وہ یونہی سوتی رہی۔ پھر شاید کوئی آہٹ ہوئی تھی یا یونہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی وہ ابھی تک اماں کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور اماں اسی طرح بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سپاٹ، خالی آنکھوں میں محبتوں کے رنگ جھلملاتے صاف نظر آ رہے تھے۔

''اماں جی۔'' وہ یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ اماں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اور ہولے ہولے اسے تھپک رہی تھیں۔

''اماں جی۔'' اس نے ان سے الگ ہو کر ان کے ہاتھ چومے اور پھر ان کے گھٹنے دبانے لگی۔

''اماں جی۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔'' اماں اسی محبت سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس کا جی چاہا وہ گول گول چک پھیریاں کھائے، خوش ہو، اماں نے کتنے سالوں بعد اسے یوں محبت سے دیکھا تھا۔

''مروان...... مروان......'' وہ اسے بتانے کے لیے باہر بھاگی پھر پلٹ آئی۔

''اماں جی آج آپ نے دوائی بھی نہیں کھائی۔'' پھر اس نے انہیں ان کی ٹیبلٹ دیں اور چائے کا پوچھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا پھر لیٹ جائیں تھک گئی ہوں گی۔'' انہیں لٹا کر وہ اپنی کتابیں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اسے نوٹس تیار کرنا تھے لیکن پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ابھی صرف پانچ بجے تھے اور باہر پورے صحن میں دھوپ پھیلی تھی...... اسے پھر نوشیرواں کا خیال آ گیا۔ اس کی نظر اپنی کلائی پر پڑی۔ وہ کتنی ہی دیر کلائی کو دیکھتی رہی اور پھر کتاب پر نظریں جما لیں لیکن لفظ آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کتابوں کے صفحوں میں سے جیسے نوشیرواں جھانکنے لگا تھا۔

اس نے جھنجلا کر کتاب بند کر دی۔ اماں بیڈ پر لیٹی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ آج ڈاکٹر نے دوائیں بدل دی تھیں ورنہ اماں دوا کھاتے ہی سو جاتی تھیں۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آئی۔

''اماں جی سکنج بین بنا کر لے آؤں؟'' انہوں نے سر ہلایا تھا۔ وہ ایک بار پھر حیران ہوئی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ہی اماں سے ہر بات پوچھتی تھی عادتاً۔ اماں نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جلدی جلدی کچن میں گئی اور سکنج بین بنا کر لے آئی۔

''بہت گرمی ہے آج...... ہیں نا۔'' اس نے گلاس انہیں پکڑاتے ہوئے کہا۔ آپ کو یاد ہے نا جب مروان ایسے موسم میں یہاں ہوتا تو روز ہی سکنج بین بنوا کر پیتا تھا۔'' اماں بس غور سے اسے دیکھ رہی تھیں، پتا نہیں اس کے چہرے میں کیا کھوج رہی تھیں۔

مغرب کے بعد وہ اماں کو ساتھ لے کر میراں اماں کے گھر آئی۔ یہ پہلی بار تھا جب وہ ڈاکٹر کے علاوہ اماں کو کہیں لے کر آئی تھی۔ دروازہ میراں اماں نے ہی کھولا تھا اور انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں۔

''یہ تم نے اچھا کیا سیمل...... امینہ بہن کو لے آئیں، میں صبح بھی شیری سے کہہ رہی تھی۔ اکیلی بچی ہے ماں کو کہیں لے جا بھی نہیں سکتی کہ ان کا دل بہلے۔'' وہ ان کے ساتھ برآمدے تک آئی۔ یہاں بھی برآمدے میں بالکل ویسا ہی تخت بچھا تھا جیسا ان کے ہاں تھا۔ اور غالباً یہاں بھی پہلے سے موجود تھا اور ان کے آنے سے پہلے میراں اماں شاید یہیں بیٹھی تھیں کیونکہ

”یہاں ہی بیٹھ جاتے ہیں اماں جان۔“ انہیں اندر کی طرف جاتے دیکھ کر اس نے کہا اور برآمدے کے دائیں طرف پڑی کرسی اٹھالائی اور تخت کے قریب رکھ کر اماں کو اس پر بٹھایا اور خود تخت پوش پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”بچہ یہ ادھر اس کمرے میں شیری ہوگا ذرا اسے تو بلالا دوڑ کر بازار سے کچھ لے آئے اور چائے کا پانی رکھ دے۔“

”نہیں، اماں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تکلف نہیں بچہ ہماری خوشی ہے، امینہ بہن پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی ہیں۔ جا شاباش بچہ......“ وہ جھجکتے ہوئے اٹھی، اماں کی طرف دیکھا۔ اماں بے نیاز سی بیٹھی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور نوشیرواں ایک میز کے پاس کھڑا تھا۔ دروازے کے پاس جا کر وہ رک گئی۔ نوشیرواں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اسکیل تھا۔

”آجائیں...... میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”جی...... میرا...... لیکن آپ کو کیسے پتا چلا میں آج اِدھر آؤں گی۔“ اسے حیرت ہوئی۔

”میرے وجدان نے مجھے بتایا تھا۔“ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں میں کوندا سا لپکا تھا۔ وہ حیران سی دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

”آجائیں ناں رک کیوں گئی ہیں۔“

”کیا آپ سچ مچ میں کوئی نجومی ہیں؟“ اسے اپنی صبح والی بات یاد آئی تو بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ نوشیرواں ہنسا اور ہنسی نے اس کا پورا چہرہ روشن کر دیا تھا۔

”دراصل یہ میرے دل کی خواہش تھی سیمل بی بی جسے میں نے انتظار کا نام دیا۔ ورنہ میں ان معنوں میں ہرگز نجومی نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“ وہ اس کے لفظوں پر غور کرتے ہوئے اندر کمرے میں آئی تو اس کی نظر میز پر پڑی۔ میز پر ایک بڑا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ کئی جگہوں پر سرخ نشان لگے تھے۔

”یہ آپ کیا کر رہے تھے۔“

”میں یہ نقشہ دیکھ رہا تھا۔ یہ کارگل ہے، یہ چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہ کارگل کا پہاڑی سلسلہ ہے جو تقریباً 44 میل لمبا اور 7 میل چوڑا ہے۔“ وہ ذرا سا منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے نقشے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”سوری۔“ وہ چونکا۔ ”میں خوامخواہ آپ کو بور کرنے لگا۔ دراصل یہ میرا ایک ویک پوائنٹ ہے۔ کارگل۔ ابھی جب آپ آئیں تو میں تصور ہی تصور میں خود کو کارگل سیکٹر میں دیکھ رہا تھا۔ یہی جون کا مہینہ تھا جب میں......“ وہ نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی شاید اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی تب ہی بات ادھوری چھوڑ کر وہ اسے دیکھنے لگا۔

”بیٹھیں نا پلیز، مجھے آپ سے کچھ باتیں بھی کرنا تھیں۔“

”وہ میں......“ وہ چونکی تھی۔ ”اماں جان نے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے مجھے۔“ وہ ایک گہری نظر اس پر ڈال کر نقشہ رول کرنے لگا۔ وہ یکدم بہت خاموش اور سنجیدہ لگنے لگی تھی۔ میراں اماں نے اس کے منع کرنے کے باوجود نوشیرواں کو بازار بھیج دیا تھا۔

”نہ بچہ...... امینہ بہن پہلی دفعہ میرے گھر آئی ہیں۔ کبھی کبھار انہیں گھر سے باہر کہیں لے جایا کرو، کبھی ہمارے ہاں، کبھی بازار......“ میراں اماں کہہ رہی تھیں لیکن اس کا ذہن اندر ٹیبل پر موجود نقشے کی طرف تھا۔ وہاں نقشے پر کارگل کے گرد سرخ دائرہ لگا ہوا تھا۔ کارگل جس کے متعلق مروان نے اسے بتایا تھا۔ سائبیریا کے بعد دوسرا سرد ترین علاقہ ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت منفی 60 ہے۔ یہاں برف ہی برف ہے۔ ٹھنڈ ہڈیوں میں اتری جاتی ہے پھر بھی ہم اپنے مشن کی کامیابی تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہاں مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر حسام کھڑا ہوا ہے۔ کیسا بانکا جوان ہے کبھی کبھی مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے پاؤں frostbite کے باعث گل چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے لیکن یہ یہاں سے جانے کو تیار ہی نہیں۔ اس کا جذبۂ شہادت دیکھنے کے لائق ہے۔ سیمل پتا ہے جب بھی اسے آرام کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو مسکراتا ہے اور کہتا ہے کہ میں شہادت کے لیے چن لیا گیا ہوں۔ جب بھی تمہارا اور اماں کا خیال مجھے کمزور کرنے لگتا ہے تو کیپٹن حسام کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔“ وہ ہاتھ گود میں دھرے سامنے صحن کی دیوار کو دیکھ رہی تھی اور اس کے سامنے کارگل کے برف زار تھے پھر برف زاروں پر خون پھیل گیا۔ سفیدی سرخی میں بدل گئی۔

”سیمل بچہ......“ میراں اماں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”بچہ اندر کچن میں جا کر چائے کا پانی رکھے دے۔ شیری آتا ہوگا۔ چائے وہ آکر بنا دے گا۔“

”میں چائے بنالوں گی اماں جان۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن سامنے ہی تھا صحن میں دائیں طرف، کچن کے آگے شیڈ سا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے اس کے گھر میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے دیکھا۔ اماں کا ہاتھ میراں اماں کے ہاتھ میں تھا۔ اماں کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔ اماں کو میراں اماں کی باتیں پسند آرہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اس کا رسپونس دے رہی تھیں اور یہ کتنی بڑی کامیابی تھی۔ ڈاکٹر عرفان بہت پُرجوش تھے، انہوں نے تاکید کی تھی کہ وہ اگلے ہفتے اماں کو ضرور لے کر آئے۔ وہ خود ان کے ساتھ ایک میٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ابھی تک مروان کو اماں کی اس امپرووومنٹ کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ یہاں سے جا کر پہلے وہ مروان کو بتائے گی اماں کے متعلق۔

کچن میں جا کر اس نے چائے کا پانی رکھا۔ پھر اس کی نظر ٹرالی پر پڑی تو اس نے ٹرالی میں پلیٹیں چمچ شوگر پاٹ وغیرہ رکھے۔ اب پتا نہیں نوشیرواں کیا کیا لے کر آتا ہے۔ اس نے صافی اٹھا کر کاؤنٹر پر گرا پانی پونچھا تب ہی نوشیرواں شاپرز اٹھائے کچن میں آیا۔

”ارے آپ نے کیوں تکلیف کی میں کر لیتا خود آکر۔“

”مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔“ اس نے نوشیرواں کے ہاتھ سے شاپر لے لیے۔

”ارے یہ اتنا کچھ کیوں اٹھالائے ہیں آپ۔ اماں کی خوراک تو بالکل کم ہے۔“

”دل کی خوشی کے لیے۔“ اس نے زیرلب کہا تھا۔ وہ آہستگی سے کہہ کر کیبنٹ سے ڈشز اور پلیٹیں نکالنے لگا۔ دہی بلے، میڈیم سائز پزا، کیک، پیٹیز، چکن رول، نمکو اور جانے کیا کیا۔

”لگتا ہے آپ نے ہمیں بہت پیٹو سمجھ لیا یا آپ کا خیال ہے کہ ہم کسی قحط زدہ علاقے سے آئے ہیں۔“ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ وہ کیبنٹ سے نکالی جانے والی پلیٹوں کو صافی سے پونچھنے لگا۔ سیمل ان میں سامان رکھنے لگی۔

کاش کوئی یہ منظر ہمیشہ کے لیے یہاں ہی ساکت کر دیتا...... ایک مکمل مطمئن ہیپی فیملی کا یہ منظر...... اس کے اندر حسرت نے چٹکی بھری۔ وہ ایک مکمل، خوش اور مطمئن گھر کو ترسا ہوا تھا۔ وہ ٹرالی لے کر باہر جانے لگا۔

”آپ بھی آجائیں چائے میں آکر بنالیتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے میں بھی چائے اچھی ہی بنالیتی ہوں۔“

”آپ......“ وہ رکا۔ ”آپ تو سب ہی کچھ اچھا کرتی ہوں گی سیم مجھے یقین ہے۔“ اس کی آواز سیمل کو بوجھل سی لگی لیکن وہ سر جھٹک کر ٹی پاٹ میں

پتی ڈالنے لگی۔

چائے دم کر کے وہ واپس آئی تو وہ اماں کو اپنے ہاتھ سے پزا توڑ توڑ کر کھلاتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہا تھا۔ اماں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی بالکل ایسا ہی ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا تھا۔ نوشیرواں کی جگہ مروان تھا اور اماں کے منہ میں یونہی پزا کے نوالے بنا بنا کر ڈال رہا تھا۔ اماں ہنس رہی تھیں اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر منع کر رہی تھیں۔

''میں خود کھالوں گی بیٹا...... بس مجھے پزا کچھ خاص پسند نہیں ہے۔ اچھا دو میں خود کھاتی لیتی ہوں۔'' اس کے کانوں میں اماں کی آواز آ رہی تھی اور پھر مروان کی آواز......

''نہیں آج تو میں اپنی اماں کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا۔'' یکدم اماں نے نوشیرواں کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''میں خود کھالوں گی۔'' اور پھر چونک کر انہوں نے نوشیرواں کے بازو سے اپنا ہاتھ ہٹالیا تھا۔ اب وہ اجنبی نظروں سے نوشیرواں کو دیکھ رہی تھیں۔

سیمل اماں کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ بھی اسی منظر میں چلی گئی تھیں۔ پیچھے کئی سال پہلے...... سیمل کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میراں اماں اور نوشیرواں کے خیال سے اس نے دل پر جبر کر کے ساری چیزیں ہی چکھی تھیں۔ نوشیرواں نے کئی بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر جب اس نے چائے بنا کر سب کو دی تو نوشیرواں نے ایک گھونٹ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ واقعی بہت اچھی چائے بناتی ہیں۔ مجھ سے کبھی ایسی چائے نہیں بنی۔ کبھی کڑوی ہو جاتی ہے، کبھی بالکل ہی پتی کم......''

''مجھے مروان نے چائے بنانا سکھائی تھی۔'' سیمل مسکرائی۔

''اچھا تو آپ مجھے سکھا دیجیے گا۔'' اس نے سر ہلایا۔ عشا کی اذان کے بعد وہ گھر جانے کے لیے اٹھی تھی۔ اماں ساتھ نہ ہوتیں تو وہ سیڑھی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جاتی لیکن اب اماں ساتھ تھیں اور اسے گلی سے جانا تھا۔ وہ اٹھی تو نوشیرواں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''آیئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

''نہیں یہ ساتھ تو گھر ہے۔'' اس نے منع کیا تھا لیکن نوشیرواں بنا کچھ کہے ان کے ساتھ ہولیا تھا۔ اس کا یہ کیئرنگ انداز سیمل کو اچھا لگا تھا۔ دروازے کا لاک کھول کر اس نے اندر قدم رکھا اور اماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اللہ حافظ......'' نوشیرواں کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

''اللہ حافظ......'' اماں اس سے ہاتھ چھڑا کر برآمدے کی طرف جا رہی تھیں۔

''دوسروں کی دل آزاری نہ کرنا اور ان کا خیال رکھنا اچھی بات ہے لیکن اتنا جبر بھی اچھا نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب ہے؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا۔

''آپ کا جی نہیں چاہ رہا تھا کچھ کھانے کو لیکن آپ ہمارے خیال سے...... بہت شکریہ لیکن مجھے آپ کا خود پر جبر کرنا......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ وہ تو اماں کی طرف متوجہ تھا پھر اس نے کب اسے مانیٹر کیا تھا...... وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گلی میں جلتے بلب کی روشنی نوشیرواں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ براؤن آنکھیں، خمدار پلکیں، دراز قد، سیمل نے نظریں جھکا لیں۔

''کیا مروان کا خیال آ گیا تھا آپ کو؟'' اس نے اچانک کہا تھا۔

''ہاں۔'' وہ چونکے بغیر بولی۔

''مروان بالکل آپ کی طرح کبھی کبھی اماں کو نوالے بنا کر کھلاتا تھا۔''

''آپ مروان کو اتنا مس کرتی ہیں تو اسے بلا کیوں نہیں لیتیں۔ کیا اس کا آنا بہت مشکل ہے۔''

وہ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے ساکت

کھڑی تھی۔

''آپ مروان کو کہیں...... اماں کی خاطر وہ ایک چکر لگا جائے۔ اماں کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ اسے ہر صورت آنا ہو گا سیمل، اماں کی صحت کے لیے یہ سب ضروری ہے۔'' پتا نہیں کب اس نے اماں کو اماں کہنا شروع کیا تھا۔ سیمل نے اب کے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر جانے کے بجائے سامنے والی گلی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے اسے گلی کا موڑ مڑتے دیکھا اور پھر دروازہ بند کر کے اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ چکی تھیں۔ دروازے سے ٹیک لگائے ہوئے اس کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ ''اسے ہر صورت آنا ہو گا......

...... مگر کیسے...... کیسے آئے گا وہ اتنی دور سے۔ مروان آ جاؤ، پلیز......'' روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اماں پتا نہیں کب اٹھ کر اس کے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

''اماں مروان...... وہ کیوں نہیں آتا ہمارے پاس...... ہمیں اس کی بہت ضرورت ہے، بہت زیادہ......'' اماں اسے تھپک رہی تھیں اس کے ہاتھوں اور رخساروں کو چوم رہی تھیں اور وہ مروان کو پکار پکار کر رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اماں کی نگران اور محافظ بنی ہوئی تھی اور آج اماں اس کی نگران بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ پھر اس کے ہاتھ پکڑے پکڑے اپنے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ اماں نے اسے بیڈ پر لیٹنے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گئی تو وہ واش روم سے تولیا گیلا کر کے لے آئیں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ پھر اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگیں۔ اماں کے ہاتھوں کے لمس میں کتنا سکون تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے پھر آنسو مچل اٹھے تھے لیکن اس نے ان آنسوؤں کو بہنے نہ دیا۔ اماں ہولے ہولے اس کا سر دبا رہی تھیں۔ بند آنکھوں کے سامنے نوشیرواں کا سراپا آ گیا۔ ایک پاؤں پر زور دے کر بڑے بڑے قدم اٹھا کر گلی کے کونے میں غائب ہوتا ہوا، گلی میں جلنے والے بلب کی روشنی میں اس کا دراز قد کتنا نمایاں ہو رہا تھا اور پتا نہیں اس نے مجھ سے کیا باتیں کرنا تھیں سوچتے سوچتے جانے کب وہ سو گئی تھی۔

☆☆☆

تین بیڈروم کا یہ چھوٹا سا گھر بالکل نیا بنا ہوا تھا۔

احمق

دنیا میں لڑکیوں سے زیادہ احمق کوئی اور نہیں ہوتا۔ خوش فہمی کا آغاز اور اختتام ہم پر ہی ہوتا ہے۔ ساری عمر ہم محبت کی بے ساکھیوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں تاکہ زندگی کی ریس شروع کر سکیں۔ ہمیں ہر مرد کے بارے میں خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ آئے گا ہمیں دیکھے گا اور ہمارا ہو جائے گا کوئی ہم سے ہمدردی کرنے لگے تو ہمیں خوش فہمی ہونے لگتی ہے۔ کوئی ہمیں سراہے تو ہمیں اپنی مٹھی میں قید نظر آنے لگتا ہے۔ کوئی ہمارے ساتھ وقت گزارے تو ہمارے ہوش و حواس اپنے ٹھکانے پر نہیں رہتے۔ عمر کا خیال ہے مجھ میں میچورٹی نہیں، یہ تو کسی لڑکی میں نہیں ہوتی۔ کبھی لڑکیاں بھی میچور ہوتی ہیں، ہم میں میچورٹی صرف تب آتی ہے جب ہمیں ریجیکٹ کیا جاتا ہے۔

عمیرہ احمد کے ناول امر بیل سے

انعم وقار حیدر کا انتخاب

روی نے چند ہی دنوں میں گھر کو کسی حد تک فرنشڈ کر لیا تھا۔ جب وہ گڑیا اور اماں کو لے کر گھر آیا تو گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اماں کو وہ سیدھے اسپتال سے اِدھر ہی لایا تھا اور پھر گڑیا کے ساتھ وہ گھر سے اپنی گڑیا اور اماں کی ضروری چیزیں لینے گیا تھا۔ ابا اپنے آفس میں تھے، گھر میں نازو تھی اور ایک نئی ملازمہ۔ نازو لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور اس کی گود میں دھری پلیٹ ڈرائی فروٹ سے بھری ہوئی تھی اور مزے سے کھاتے ہوئے وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جونہی روی نے اندر قدم رکھا وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تو اس کی گود سے پلیٹ نیچے کارپٹ پر گر گئی اور کاجو، اخروٹ، بادام اور کشمش نیچے کارپٹ پر بکھر گئے۔ وہ یکدم نیچے بیٹھ کر انہیں اٹھانے لگی۔ ایک ناگوار سی نظر اس پر ڈالتا ہوا گڑیا کا ہاتھ پکڑے وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ جب ضروری سامان پیک کر کے وہ نیچے اترے تو نازو پھر پہلی پوزیشن میں بیٹھی فلم دیکھتے ہوئے کاجو کھائے جا رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر بے نیازی سے فلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سارا سامان گاڑی میں رکھ کر وہ پھر واپس آیا اور گڑیا کو نیچے لاؤنج میں ہی کھڑا کر کے وہ اوپر گیا۔ کتابوں والا بیگ اوپر ہی رہ گیا تھا۔ جب وہ بیگ لے کر نیچے آیا تو گڑیا ریلنگ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔

''کیا ہوا گڑیا؟'' بیگ آخری سیڑھی پر رکھ کر وہ تیزی سے گڑیا کی طرف لپکا۔

''کیا نازو نے کچھ کہا؟'' اس نے گھور کر نازو کی طرف دیکھا۔ جو ایک بار پھر بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''نہیں۔'' گڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔ اور تیزی کے ساتھ ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے تھے۔

''بس ایسے ہی مجھے لگا روی بھائی جیسے میں ہوم سوئیٹ ہوم کی نیلی ہوں اور مجھے نیلی یاد آ گئی تھی۔ اسے جب اپنا گھر چھوڑنا پڑا ہو گا تو اسے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ ہے نا......؟'' روی نے ایک ہاتھ میں بیگ اٹھاتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ...وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا اور اس وقت گڑیا کے دل کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔

''ہاں گڑیا اسے بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ اتنی ہی تکلیف جتنی آج تمہیں ہو رہی ہے لیکن کبھی کبھی اچھے مستقبل کے لیے یہ تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آؤ......'' گڑیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''اپنا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا گڑیا۔'' اس کی آواز میں آنسو گھلے تھے لیکن اس کی آنکھیں شفاف تھیں۔ پورچ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے مڑ کر اندرونی دروازے کو دیکھا۔ لکڑی کا یہ بھاری منقش دروازہ انتہائی خوب صورت تھا۔ اماں نے اسے بتایا تھا کہ ان کے گاؤں کے ایک مستری جس نے ان کی حویلی میں لکڑی کا کام کیا تھا یہ دروازہ پورے چھ ماہ میں بنایا تھا۔ انتہائی خوب صورت کام تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔

''میں اس گھر سے کبھی بھی نہیں جانا چاہتا تھا گڑیا کبھی بھی نہیں...... میں نے ہمیشہ اماں ابا اور تمہارے ساتھ ایک مکمل گھر کی دعا کی تھی لیکن کبھی کبھی دکھ برداشت کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔'' وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھا تھا۔ بیگ ڈگی میں رکھ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اندرونی گیٹ کھول کر تیز تیز چلتے ہوئے ابا باہر نکلے تھے۔ شاید وہ سو رہے تھے یا اپنے کمرے میں تھے اور اس نے سوچا تھا کہ وہ آفس میں ہیں۔ وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ ''رکو......'' وہ پورچ کی سیڑھیاں اتر کر آئے۔

''گڑیا تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔''

''کیوں......؟''

''مجھے تم پر اور اس احمق عورت پر اعتبار نہیں ہے۔''

''اور مجھے آپ پر اعتبار نہیں ہے۔'' روی نے جواب دیا تھا۔ اس کے برابر بیٹھی گڑیا کا رنگ زرد

پڑ گیا تھا۔

''گڑیا یہاں رہے گی اپنے باپ کے گھر۔'' وہ چلائے تھے۔

''گڑیا اپنی ماں کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر رہے گی ابا جی۔ آپ کے پاس آپ کی بیوی ہے جائیے اس کی جا کر ناز برداریاں کیجیے۔'' وہ تلملائے تھے۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو روی۔''

''سوری اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو۔''

''میں عدالت کے ذریعے گڑیا کو لے لوں گا۔''

''کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔'' روی مسکرایا تھا۔ ''عدالت ماں کا حق صائب مانتی ہے بیٹی کے لیے۔'' اور پھر وہ تیزی سے گاڑی گیٹ سے نکال کر لے گیا تھا۔

نیا گھر اچھا تھا وہاں سکون تھا۔ ابا کے جھگڑے نہیں تھے لیکن اماں ٹھیک نہیں تھیں وہ جب سے اسپتال سے آئی تھیں بالکل چپ تھیں۔ جہاں بیٹھی ہوتیں وہیں بیٹھی رہتیں۔ روی اور گڑیا کوئی بات کرتے تو خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہتیں۔ کبھی کبھی ان کی نظروں میں اتنا سپاٹ پن ہوتا کہ گڑیا گھبرا کر رونے لگتی۔ وہ جیسے اپنے اردگرد سے بے خبر ہو جاتیں۔ روی انہیں مختلف ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتا۔

''دراصل یہ سائیکولوجیکل شاک کی کیفیت ہے۔'' ڈاکٹر عمر نے کہا تھا۔ ''وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس شاک سے نکل آئیں گی۔ اس میں کچھ وقت لگ جائے گا۔''

''اندازاً کتنا......؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا، کم بھی ہو سکتا ہے زیادہ بھی......'' کبھی کبھی وہ بالکل نارمل لگتیں لیکن زیادہ تر وہ چپ رہتی تھیں۔

''انہیں تنہا مت رہنے دیا کریں، ان سے باتیں کیا کریں۔ بھلے وہ جواب دیں یا نہیں۔ زندگی کی سرگرمیوں میں انہیں انوالو کریں۔''

ہولے ہولے وہ گھریلو امور میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ کبھی پیاز کاٹ دی، کبھی ایسا ہی چھوٹا موٹا کام...... روی نے گھر کے لیے ملازمہ کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ جب بھی فارغ ہوتا اماں اور گڑیا کو آؤٹنگ پر لے جاتا۔ کبھی اماں کا موڈ نہ ہوتا تو وہ صرف گڑیا کو لے جاتا۔ ان دنوں گڑیا فارغ تھی اور اس نے اس کے ساتھ جا کر بے شمار کتابیں خریدی تھیں۔ روی کو اماں کی بہت فکر تھی۔

''اماں کچھ بولا کریں نا۔''

''کیا بولوں؟'' بہت کم وہ جواب دیتیں۔

''کچھ بھی اماں......'' وہ ان کا ہاتھ تھام لیتا۔

''جو آپ کے دل میں ہے۔''

''میرے دل میں......'' وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگتیں۔

''ہاں آپ کا کیا جی چاہتا ہے اماں......؟ مجھے بتائیں نا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا دیتیں۔ وہ پریشان ہو جاتا گڑیا رونے لگتی۔ لیکن ڈاکٹر عمر بہت پُر امید تھے۔

''وہ بات تو کرتی ہیں نا کبھی کبھی۔ یہ خوش آئند ہے۔''

ایک دن چوبیس گھنٹے کی مسلسل بے ہوشی کے بعد وہ ہوش میں آئی تھیں۔ تب روی ان کے پاس اسپتال میں ان کے بیڈ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ نہیں تھے۔

''کوئی شدید ذہنی شاک......؟'' ڈاکٹر عمر نے روی سے استفسار کیا تھا۔

''پتا نہیں کون سا صدمہ زیادہ شدید تھا۔'' روی نے سوچا تھا۔ ''ان کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کا صدمہ...... یا پھر ان کی ملازمہ کو ان کی سوکن بنا کر سامنے لا کھڑا کرنے کا صدمہ......''

"اپنے پیشنٹ کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر کو پیشنٹ کے حالات جاننا ضروری ہوتا ہے۔ جب ہمیں اس ذہنی شاک کا پس منظر پتا چلے گا تو ہمارے لیے آسانی ہوگی کیپٹن۔" تب رومی نے مختصراً ابا کی دوسری شادی کے متعلق ڈاکٹر کو بتا دیا تھا۔

"ہم پوری کوشش کریں گے لیکن آپ کو بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا تا کہ یہ اس کیفیت سے نکل آئیں۔" رومی کسی ننھے بچے کی طرح اماں کا خیال رکھتا۔ کبھی کبھی نوالے بنا کر خود انہیں کھلاتا۔ اکثر انہیں اور گڑیا کو آؤٹنگ کے لیے لے جاتا۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ کافی امپروو کر رہی ہیں۔ وہ بولتی نہیں تھیں لیکن ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے سے ان کے احساسات کا اظہار ہوتا۔ گڑیا کے میٹرک کا رزلٹ گلبرگ کے اس گھر میں آنے کے چند دن بعد ہی آ گیا تھا۔ تب رومی انہیں باہر لے گیا تھا۔ اس نے گڑیا کو خوب صورت کتابوں کا سیٹ تحفے میں دیا تھا۔ تب اس روز اماں کے چہرے سے بھی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ گڑیا کالج جانے لگی تھی۔ گھر میں ایک مستقل ملازمہ رومی نے رکھ لی تھی جو اس کے یونٹ کے کسی حوالدار کی عزیزہ تھی۔ وہ بیوہ تھی اور آگے پیچھے کوئی نہیں تھا سوائے ایک بیٹے کے جو ماں سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ حوالدار اسے گاؤں سے لے آیا تھا۔ اس کے آنے سے رومی بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ جب گڑیا کالج جاتی اور وہ اپنے یونٹ میں تو عذرا بی بی کے ہونے سے اسے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ عذرا بی بی نے بھی اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھا تھا۔ گڑیا اور رومی انہیں خالہ جی کہہ کر بلاتے تھے۔

ابا اور نازو کیسے تھے۔ کس طرح کی زندگی گزار رہے تھے گڑیا نہیں جانتی تھی۔ اسے ابا کی پسند پر حیرت ہوتی تھی اور وہ سوچتی تھی کہ کیا ابا نازو پر بھی یونہی چیلاتے ہوں گے جیسے اماں پر چلاتے تھے۔

"شاید ...... اور شاید نہیں ......" ایک روز اس نے رومی سے پوچھا تھا۔

"دراصل ابا خود پرست تھے بلکہ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پرفیکٹ ہیں حالانکہ اس دنیا میں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہے۔ کامل ذات تو صرف اللہ کی ہے۔" رومی نے اسے سمجھایا تھا۔

ان دنوں رومی کو اسلامی کتب کے مطالعے کا بھی بہت شوق ہو گیا تھا۔ وہ خود خریدنے کے علاوہ آرمی کے میس سے بھی کتابیں پڑھنے کے لیے لاتا رہتا تھا۔

"دراصل ابا خود کو دنیا کا حسین ترین مرد سمجھتے ہیں اور ذہین ترین بھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لیے بیوی بھی ایسی ہی ہونا چاہیے لیکن جب ایک دیکھی بھالی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی جسے انہوں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی اور جو اُن کی نظر میں ایک عام سی کم علم لڑکی تھی تو ان کی خود پسندی اور خود پرستی نے اپنی انا کی تسکین کا یہ راستہ اپنایا...... اماں کی عزتِ نفس مجروح کر کے وہ اپنے نفس کی تسکین کرنے لگے تھے۔"

"تو انہیں تو کسی سائیکا ٹرسٹ کی ضرورت تھی نا رومی بھائی۔" گڑیا کے لبوں سے نکلا تھا۔

"ہاں، اچھا خیال ہے، کسی روز ملے تو میں انہیں ضرور مشورہ دوں گا۔"

"لیکن آپ نے میری بات کا جواب تو دیا ہی نہیں۔"

"کیا چندا......؟"

"وہ نازو......"

"دے تو دیا کہ شاید ہاں شاید نہیں لیکن ایک بات طے ہے بیٹا کہ ابا کی نازو سے نبھے گی نہیں۔"

یہ رومی کا خیال تھا جبکہ گڑیا سوچتی تھی کہ ابا اور نازو مزے سے زندگی گزار رہے ہوں گے۔

اس روز وہ اماں کو معمول کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر عمر اماں کی امپروومنٹ پر بہت خوش تھے۔

"اب یہ اپنے اردگرد کے ماحول میں دلچسپی لینے لگی ہیں اور اپنے اطراف کو محسوس کرنے لگی ہیں۔

بہت جلد انشاء اللہ یہ نارمل لائف کی طرف واپس آ جائیں گی۔ بعض اوقات چوٹ اس زاویے سے لگتی ہے کہ ان بریک ایبل گلاس بھی کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ اکثر مرد شادی کر لیتے ہیں دوسری عورتیں برداشت کر لیتی ہیں لیکن آپ کی اماں برداشت نہیں کر سکیں۔" اس روز وہ واپسی پر بہت خوش تھے۔

"اماں نارمل ہو گئیں تو میں ایک بہت بڑی پارٹی دوں گا، تم بھی اپنی سہیلیوں کو بلانا سب کو...... جتنی بھی ہوں۔ دس پندرہ بیس پچاس......" وہ مسکرایا تھا۔

"لیکن میری تو ایک سہیلی بھی نہیں ہے رومی بھائی......"

"ارے ایک سال میں تم نے کوئی سہیلی نہیں بنائی کالج میں۔" یہاں اس گھر میں آئے انہیں ایک سال ہونے والا تھے۔

"نہیں۔"

"کیوں نہیں۔"

"پتا نہیں بس میں آج تک کوئی سہیلی بنا ہی نہیں سکی۔"

"تو چلو آج سے میں تمہاری سہیلی بلکہ سہیلا۔"

"رومی بھائی آپ......" وہ ہنسی تھی۔ وہ اس سے گیارہ سال بڑا تھا اور اس کے ساتھ بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا بلکہ کبھی کبھی بیٹا کہہ کر بھی بلا لیتا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا خود کو اور بھی بزرگ اور بڑا سمجھنے لگا تھا۔

"کیوں، میں اچھی سہیلی نہیں بن سکتا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "یا تم مجھے سہیلی بنانا نہیں چاہتیں۔"

"نہیں تو...... آپ تو بہت اچھے ہیں رومی بھائی۔ لیکن سہیلیوں کے ساتھ ہر بات شیئر کی جاتی ہے...... تو آپ کے ساتھ کیسے شیئر کروں گی۔"

"بھئی جیسے سہیلیوں کے ساتھ کرتی ہو ویسے ہی میرے ساتھ کر لینا۔ آخر تم اپنے رومی بھائی کے ساتھ بھی اپنی باتیں شیئر کرتی ہو نا اپنے ٹیچرز کی اپنی......"

"ہاں۔ تو اب رومی بھائی...... بھائی کے ساتھ دوست بھی بن جائیں گے...... ٹھیک۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور رومی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ اس رات اپنے بیڈ پر لیٹنے کے بعد اس نے اماں کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا تھا۔

"رومی بھائی دنیا کے سب بھائیوں سے اچھے بھائی ہیں۔ بالکل "روزلی" کے بھائی جیسے۔ اسے روزلی اور اس کے بھائی رچ کی کہانی بھی بہت پسند تھی اور رچ بھی روزلی کو رات سونے سے پہلے کہانیاں سناتا تھا۔

روزلی جو چھ سال کی تھی تو اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی اور روزلی رچ کے ساتھ چھ ماہ اپنے باپ کے ساتھ اور چھ ماہ ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

"نہیں۔" اس نے جھرجھری سی لی تھی۔ کتنے دنوں بعد آج پھر وہ روزلی کے لیے چپکے چپکے روئی تھی اور رومی کہتا تھا وہ کہانیوں میں خود کو اتنا انوالو نہ کرے۔ کہانی تو کہانی ہوتی ہے لیکن کہانی حقیقت سے ہی تو جنم لیتی ہے یا پھر کبھی کبھی کہانی حقیقت میں ڈھل جاتی ہے۔

اور پھر اگلے کئی دن روٹین ہی کے گزر گئے۔ وہی کالج جانا۔ اماں اور رومی کو کالج کی ہر بات بتانا۔ خالہ جی کے ساتھ کچن میں ان کا ہاتھ بٹانا۔ رومی کے ساتھ کبھی کبھی آؤٹنگ کے لیے جانا، کبھی اماں کے ساتھ اور کبھی اکیلے۔ جب وہ اکیلے جاتے تو بانو بازار کی چاٹ کھانے ضرور جاتے اور پھر واپسی پر پرانی کتابیں چھانتے، کبھی کبھی بہت اچھی کتابیں مل جاتی تھیں۔

اس روز بھی وہ فیروز سنز سے نکلے تھے۔ اماں گھر پر تھیں اور رومی کو اپنے لیے کتابیں خریدنی تھیں۔

وہ کتابیں خرید کر باہر نکلے تو رومی کو کیپٹن عثمان مل گئے۔

"ارے تم یہاں؟" کیپٹن عثمان نے پوچھا

تھا۔
"بس کچھ کتابیں لینے نکلا تھا۔ یہ میری چھوٹی بہن ہے۔" کیپٹن عثمان نے مسکرا کر اسے وش کیا تھا۔
"یار کبھی لاؤ نا اپنی مدر اور سسٹر کو ہمارے گھر۔"
"ضرور۔"
وہ تینوں پارکنگ کی طرف جا رہے تھے۔ عثمان اور رومی ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھے جب اس نے ایک گاڑی سے ابا اور نازو کو اترتے دیکھا تھا۔ شاید ابا نے نئی گاڑی لی تھی۔ اس نے گاڑی کا ماڈل دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ عین اسی وقت نازو کی نظر اس سے ملی تھی۔ یہ وہ ڈیڑھ سال پہلے والی نازو تو نہیں تھی۔ اس نے سلیقے سے میک اپ کیا ہوا تھا اس کے جسم پر بڑے چکن کا کسی اچھے بوتیک سے خریدا ہوا سوٹ آج اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی سانولی رنگت پر سلیقے سے کیا گیا میک اپ اسے دلکش بنا رہا تھا۔ نازو نے مڑ کر ابا سے کچھ کہا تھا۔ ابا نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ نازو چپکے چپکے کچھ کہہ رہی تھی اور ابا پتا نہیں کیوں غصے میں لگ رہے تھے۔ جانے نازو ان سے کیا کہہ رہی تھی۔ ان سے نظریں ہٹا کر اس نے رومی کی طرف دیکھا تھا۔ رومی کیپٹن عثمان کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ عثمان نے رومی سے ہاتھ ملانے کے بعد اسے مخاطب کیا تھا۔
"گڑیا...... آپ ضرور آیئے گا۔ یہ آپ کا بھائی تو بھلکڑ ہے گھر میں آپ کی بھابی کے علاوہ میری بھی چھوٹی بہن ہے، آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی۔" وہ مسکرا دی تھی۔
نازو کے ساتھ کھڑے حبیب خان بہت غصے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا لیکن نازو نے ایک ادا سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر روک دیا تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گڑیا نے نازو کو نہایت لگاوٹ سے ابا کو دیکھتے اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھے دیکھا تو اس کا دل جیسے اندر ہی اندر رو پڑا۔ اس نے اس منظر میں اپنی پسند کے رنگ بھرنا چاہے تھے۔ اماں، ابا کے بازو پر ہاتھ رکھے کھڑی اور ان کی طرف محبت سے دیکھتے ابا لیکن وہ اس منظر کو اپنی پسند کے منظر میں تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ تب ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
"ارے کیا ہوا گڑیا۔" مین روڈ پر آتے ہی رومی کی نظر اس پر پڑی تھی اور اس کا اتنا پوچھنا غضب ہو گیا تھا۔ گڑیا کے آنسو روانی سے اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔
"وہاں پارکنگ میں ابا تھے اور نازو۔"
"سو واٹ!" رومی نے کندھے اچکائے تھے۔ "اپنے آپ کو مضبوط بناؤ گڑیا۔ اسی ایک شہر میں رہتے ہوئے تم کئی بار کئی مقامات پر ابا اور نازو کو دیکھو گی تو کیا ہر بار اسی طرح روؤ گی وہ ہمارے باپ ہیں۔ ہمارا یہ رشتہ ہمیشہ ان سے رہے گا۔ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ دس شادیاں کیوں نہ کر لیں...
...... مجھے ابا کے شادی کرنے کا افسوس نہیں ہے گڑیا۔ ہاں انہوں نے اماں کی قدر نہیں کی مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ جب میں اماں کو ساتھ لے آؤں گا تو ابا کو مشورہ دوں گا کہ وہ کسی اپنے اسٹینڈرڈ کی ایسی لڑکی سے شادی کر لیں جس سے شادی کرنا ان کا خواب تھا اور اماں پر اپنا غصہ نکالنا بند کر دیں لیکن انہوں نے نازو سے شادی کر لی۔ مجھے اس کا بے حد صدمہ ہے۔ ان کے اپنے معیار سے اتنے گر جانے کا دکھ ہے۔ انہوں نے اماں پر نازو کو ترجیح دی، مجھے اس کا صدمہ اور رنج ہے اور شاید اماں کو بھی جو شاک لگا ہے اسی وجہ سے ...... وہ کسی خاندانی لڑکی سے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی بہت خوب صورت ہوتی ان کے مقابلے کی ہوتی اس سے شادی کرتے تو شاید اماں کو اتنا صدمہ نہ ہوتا کیونکہ انہوں نے خود ابا کو کئی بار کہا تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کر لیں۔ ان کی طرف سے اجازت ہے۔"

یہ رومی...... کے خیالات تھے۔ گڑیا کو اس بات کا بہت دکھ ہوتا خواہ ابا کسی سے بھی شادی کرتے وہ ابا کے ساتھ صرف اماں کو دیکھنا چاہتی تھی، خوش اور مطمئن ...... اور اس کے لیے اب بھی اللہ میاں سے دعائیں مانگتی تھی، کہانیوں کی طرح کوئی جادو کی چھڑی ہو جسے وہ گھمائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ ابا ایک ظالم حکمران سے نرم دل اور رحم کرنے والے ہمدرد انسان بن جائیں اور ان کا گھر امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔
لیکن زندگی کہانی نہیں ہے۔ رومی سچ کہتا تھا۔ جہاں انسان اپنی مرضی سے حالات و واقعات کو بدل لے۔ اس روز سونے کے بعد بھی خواب میں وہ ابا اور نازو کو دیکھتی رہی تھی۔ صبح جب وہ اٹھی تو اماں اپنے بستر پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔
"اماں جی۔" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی پیشانی کو چوم لیا۔ "اماں جی آپ نماز پڑھیں گی؟"
"ہاں۔" وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔
"تم بھی پڑھ لو۔"
"جی اماں۔" وہ خوشی سے رومی کے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ "رومی، رومی بھائی اماں نے مجھے نماز پڑھنے کے لیے کہا اور وہ خود بھی نماز پڑھنے لگی ہیں۔"
اس روز وہ کالج میں بھی بہت خوش رہی تھی لیکن کبھی کبھی خوشی کتنی مختصر ہوتی ہے۔ وہ کالج سے آئی تھی اور ابھی کھانے کے لیے ٹیبل پر بیٹھی تھی کہ باہر گیٹ پر بیل بجی۔
رومی آج جلدی آ گیا تھا۔ وہ اماں اور اس کے ساتھ ابھی ٹیبل پر آ کر بیٹھا تھا۔ خالہ جی بھی کھانا لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ رومی کا حکم تھا کہ خالہ جی بھی ان کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھائیں گی۔
"آپ ہمارے گھر کی ہی ایک فرد ہیں۔ آپ کو کیا پتا خالہ جی ہم کسی بزرگ کے لیے کتنا ترسے ہیں۔" بیل کی آواز پر خالہ جی کھڑی ہو گئیں۔
"میں دیکھتی ہوں۔"
"آپ بیٹھیں خالہ جی میں دیکھتا ہوں۔" رومی اٹھ کر باہر گیا۔ جب وہ کچھ دیر تک واپس نہیں آیا تو اماں نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔
"رومی۔" ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے پہلی بار اماں نے رومی کا نام لیا تھا۔ ڈاکٹر عمر صحیح کہتے تھے اماں بہت جلد نارمل ہو جائیں گی۔
"میں دیکھتی ہوں اماں۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی، پھر جب وہ اندرونی گیٹ کھول کر باہر آئی تو گیٹ کے پاس ابا اور رومی کھڑے تھے اور رومی کہہ رہا تھا۔
"ابا میں نے آپ سے کہہ دیا ہے نا کہ گڑیا آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔"
"کیسے نہیں جائے گی۔" رومی کی آواز آہستہ تھی لیکن ابا کی آواز بہت بلند...... وہ وہیں دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ابا کی نظر اس پر پڑی تھی۔
"میں اسے زبردستی لے جاؤں گا رومی۔ میں اسے تمہارے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ تم جس طرح اپنی ماں......"
"اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہیے گا ابا ورنہ......"
"ورنہ کیا......" ابا اس بار اپنے پرانے انداز میں دہاڑے تھے اور گڑیا کو لگا تھا وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔
"میں نے خود دیکھا ہے تمہارے ساتھ ایک اجنبی مرد کو جو ہنس ہنس کر گڑیا سے باتیں کر رہا تھا اور تم......"
"ابا پلیز اتنا مت گریں کہ آپ سے نفرت ہو جائے۔ وہ میری یونٹ کا ہی ایک کیپٹن ہے اتفاقاً مل گیا تھا۔"

"جو بھی ہو میں گڑیا کو یہاں چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ گڑیا۔" انہوں نے اسے پکارا اور ایک قدم آگے بڑھایا لیکن رومی نے بازو آگے کر کے انہیں روک دیا۔

"آپ یہاں سے چلے جائیں ابا...... ورنہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں گا۔" اور گڑیا یکدم بھاگ کر اندر چلی گئی تھی۔ پھر پتا نہیں رومی نے کیسے انہیں واپس کیا تھا۔ وہ تو اندر جا کر اماں کے گلے لگ کر رونے لگی تھی۔ اماں حیران سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ رومی نے اندر آ کر اماں کو تسلی دی۔

"بالکل پاگل ہے اماں جی، ذرا سی آہٹ پر بھی ڈر جاتی ہے۔" اماں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومی تھی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"پریشان مت ہونا گڑیا...... ابا تمہیں یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔" رات کو اپنے کمرے میں جانے سے پہلے رومی نے اسے تسلی دی تھی لیکن پھر بھی اگلے تین چار دن تک وہ بہت پریشان سی رہی۔ گیٹ پر بیل ہوتی تو اس کا رنگ زرد ہو جاتا۔ دو دن وہ کالج بھی نہیں گئی۔ پتا نہیں ابا کو گھر کا ایڈریس کہاں سے ملا تھا۔ وہ سوچتی۔ رومی کو پتا چلا تو وہ حیران ہوا۔

"گڑیا تم کالج کیوں نہیں جا رہی ہو؟"

"ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے؟"

"ابا سے...... کہیں وہ مجھے۔"

"پگلی ایک فوجی کی بہن ہو کر ڈرتی ہو اور ابا کچھ نہیں کر سکتے نہ وہ تمہیں زبردستی لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی عدالت کے ذریعے۔" رومی کے بے حد تسلی دینے پر کہیں اس کا دل ٹھہرا تھا اور وہ معمول کے مطابق کالج جانے لگی تھی۔

صبح تو ہمیشہ وہ رومی کے ساتھ جاتی تھی لیکن واپس اکیلے ہی پیدل آ جاتی تھی۔ کالج ان کے گھر سے نزدیک ہی تھا۔ اگرچہ اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے کسی بھی بہترین کالج میں ایڈمیشن مل سکتا تھا لیکن رومی نے اس خیال سے اسے وہاں ایڈمیشن نہیں دلوایا تھا کہ اس کی پوسٹنگ ایسی جگہ ہو گئی جہاں وہ انہیں نہ لے جا سکتا ہو تو پھر گڑیا کے لیے کسی دور کے کالج میں اکیلے جانا مشکل ہو گا۔ سو یہ گلبرگ انٹر کالج اس کے گھر کے نزدیک ہی تھا یہاں وہ پیدل بھی جا سکتی تھی۔ ایف۔ ایس۔ سی کے بعد اس میں ذرا کانفیڈنس پیدا ہو جائے تو پھر بی ایس سی وغیرہ کسی اچھے کالج سے کر لے گی۔ یہ رومی نے سوچ رکھا تھا اور گڑیا کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا۔ ابا کی طرف سے بے حد مطمئن ہو کر وہ پھر سے کالج جانے لگی تھی۔ اس روز واپسی پر وہ روڈ کراس کر کے اپنے گھر والی گلی کی طرف مڑی تھی۔ ان کا گھر روڈ پر نہیں تھا بلکہ اندر ایک گلی میں تھا۔ وہ اپنے دھیان میں مگن جا رہی تھی کہ یکدم ابا نے پیچھے سے آ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"چلو میرے ساتھ۔"

"نہیں۔" وہ مچلی۔

"میں کہہ رہا ہوں سیدھی طرح چلو ورنہ کھینچتا ہوا لے جاؤں گا۔"

"نہیں...... خدا کے لیے نہیں۔" وہ رونے لگی تھی۔ گلی میں آس پاس کوئی نہیں تھا سوائے دو بچوں کے جن کا دھیان اس بال کی طرف تھا جسے وہ اچھالتے ہوئے جا رہے تھے۔

"ہنگامہ مت کرو ورنہ بدنامی ہو گی تمہاری۔" وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بے آواز روئے جا رہی تھی اور وہ تقریباً اس کے بازو کو دبوچے اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ ان کی نئی گاڑی گلی کے کنارے پر کھڑی تھی۔ انہوں نے ڈرائیور کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا اور خود اسے اندر دھکیلتے ہوئے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی فراٹے سے گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی اور وہ شدید خوفزدہ ہو کر اونچا اونچا رونے لگی تھی۔

باقی آئندہ

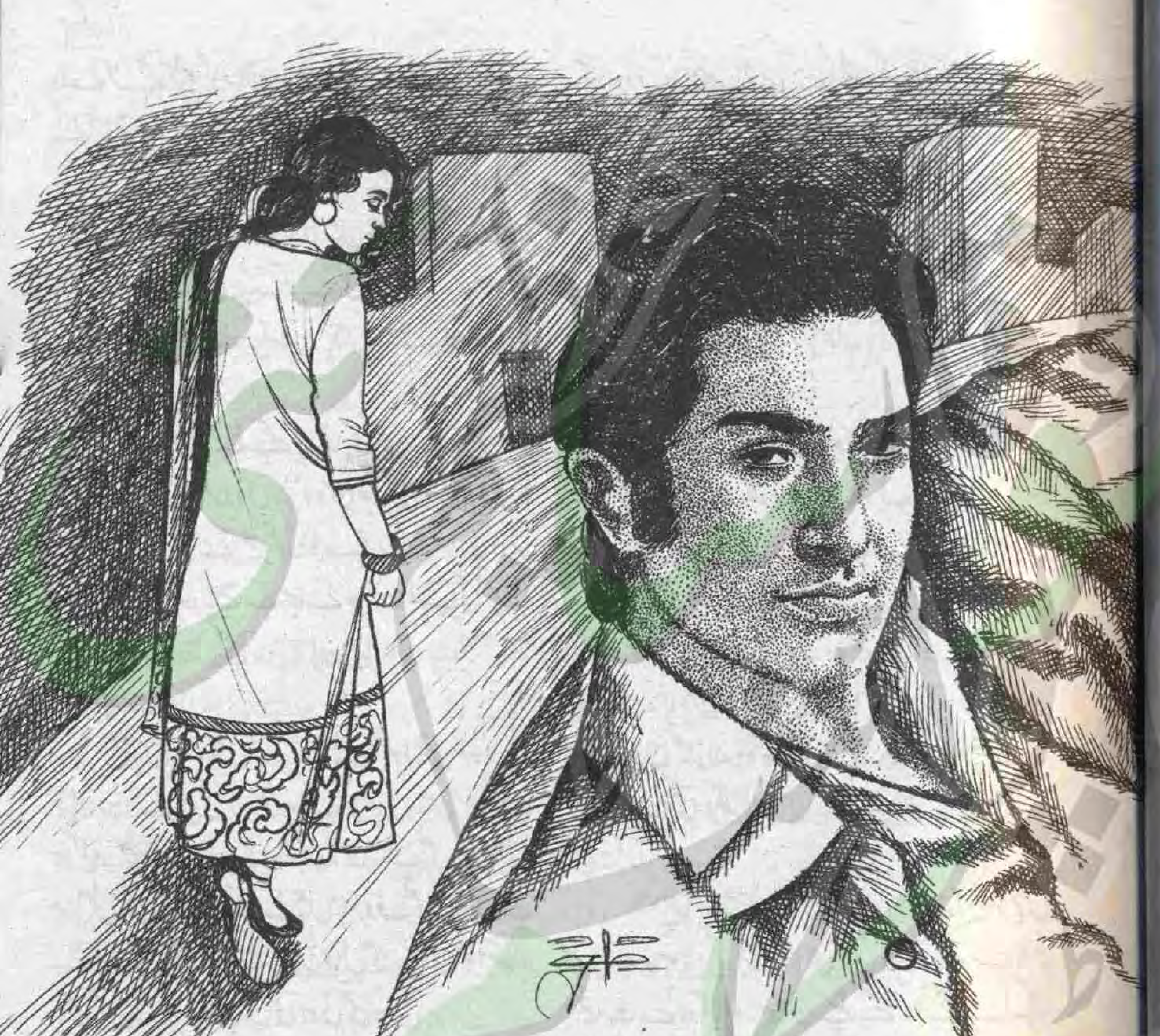

صلہ

شبانہ شوکت

آج تو وہ بہت بری طرح گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ نمرہ کی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے اس کے سسرال والوں نے آنا تھا۔ دس طرح کے کھانے تیار کرنے تھے۔ گھر کی ساری صفائی اپنی نگرانی میں کروانی تھی۔ وہ جنت کو پیاز، ٹماٹر وغیرہ کاٹنے کا کہہ کر خود صفائی کروانے لگی۔ پردے نئے لگوانے تھے، کارپٹ ویکیوم کروانے، کشن کورز چینج کروانے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ معاذ سے چھوٹا فاز اوپر کے کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

والے لڑکے سلیم کو ساتھ لے جا کر سارا سودا سامان لے آیا تھا۔

''پلیز ماہا! یہ سب چیک کر کے بتا دیں اور کیا لانا ہے؟'' وہ گرنے کے انداز میں چیئر پر بیٹھ گیا۔ ماہا آگے بڑھ کر سامان چیک کرنے لگی۔

''یہ نیڈو کے پیکٹ تو نہیں لکھے تھے سامان میں۔''

''یہ تو معاذ نے مجھے کہا تھا کہ معیز کے لیے لا کر آپ کے حوالے کر دوں۔'' وہ سن کھڑی رہ گئی۔ اس کا مطلب ہے اس نے معیز کو دودھ کے لیے روتا ہوا دیکھ کر ہی خود دودھ پینے کے بجائے چائے طلب کی تھی۔

''اب بتا بھی دیں اور کیا لانا ہے؟'' فاز بیزاری سے بولا۔

''ہاں...... نہیں، اور کچھ نہیں منگوانا۔'' وہ اپنے خیالات سے چونکی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ شام سات بجے وہ لوگ آئے تب بھی وہ فائنل مراحل میں کھانا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ تھکاوٹ سے برا حال تھا مگر اس کی کیا مجال کہ وہ اس کا اظہار بھی کر سکے سو وہ کام میں لگی ہوئی تھی۔

''ماہا، گلاس نکالو اور کولڈ ڈرنک ڈال کر دو، ہری اپ۔'' ثمرہ آپی کچن میں داخل ہوئیں اور اسے حکم دیا۔ اُن کے لہجے میں ماں کی طرح قدرتی سختی تھی یا پھر ماہا سے بات کرتے ہوئے اتنی حقارت آ جاتی تھی۔ ماہا نے فوراً حکم کی تعمیل کی تھی۔

''جا کر اپنا حلیہ بھی درست کر لو۔'' باہر جاتے ہوئے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی پھر جنت کو کھانے کا دھیان رکھنے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ معیز تو آج رُل ہی گیا تھا۔ جب تک وہ اور جنت کام کرتی رہیں اسے حشمت بوا نے سنبھالے رکھا اور اب اسے سلا کر باہر جا رہی تھیں۔ ماہا نے نہا کر ڈریس چینج کیا اور اپنے لمبے بالوں سے الجھنے لگی جن کو سلجھانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ بال سلجھا کر انہیں سکھانے کے لیے وہ معیز کے ساتھ ہی لیٹ گئی اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ تھکے ہوئے جسم و جاں کو جو سکون کے طلبگار تھے کب نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی آنکھ معیز کے رونے پر کھلی جو اسے پکار رہا تھا۔

''ممادو، دو، کھانا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھی، حواس ٹھکانے آئے تو اس نے بے اختیار وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ''سوا بارہ......!'' وہ کانپ سی گئی۔ وہاں سارے کام اس کے منتظر تھے اور یہاں وہ مزے سے سو گئی۔ اب اس نیند کا مزہ اسے چکھنا ہی تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی معیز کو لیے باہر آئی۔ لاؤنج سے ہنسی اور باتوں کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ وہ کچن کی طرف بڑھی کہ حشمت بوا کچن سے نکلتی دکھائی دیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ لپک کر آئیں۔

''اچھا سوئیں بیٹا، میں تمہیں دیکھنے آئی تو یوں بے سدھ سوتا دیکھ کر جگایا ہی نہیں۔ شکر ہے سب کام خیریت سے ہو گیا اور مہمان چلے گئے۔ اگلے سے اگلے مہینے کی دو تاریخ پکی کر گئے ہیں۔ بڑی بیگم تو خوب غصہ ہوئیں لیکن میں نے بتا دیا کہ سب کام کر کے گئی ہے۔ پھر ثمرہ بیٹا اور جنت نے مل کر کھانا لگا لیا۔ میں نے بھی مدد کر دی۔ اب تم پریشان نہیں ہونا۔'' وہ اس کی پریشانی سے آگاہ تھیں اس لیے تیزی سے اسے ساری صورتِ حال سے مطلع کر رہی تھیں۔

''بوا آپ معیز کو کھانا کھلا دیں میں اندر دیکھ آؤں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔'' وہ اندر لاؤنج میں چلی آئی جہاں سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ نمرہ کے چہرے پر رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی شاہین بیگم کا موڈ تبدیل ہو گیا تھا۔

''ہو گیا آرام...... نیند پوری ہو گئی میڈم کی، اب کس لیے یہاں تشریف لائی ہو؟''

''وہ...... میں چائے کا پوچھنے آئی تھی۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''ہاں، ظاہر ہے تمہارے بغیر ہم محتاج ہیں۔ چائے پانی بھی نہیں پی سکتے۔ مہمانوں کی چائے کی تو فکر نہیں کی اور ہماری چائے کے لیے اٹھ کر آ گئیں۔ اس طرح تم کس کے سامنے نمبر بنانے کی کوشش کرتی ہو؟'' ان کا لہجہ بہت کڑوا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''جانے بھی دیں مام، کیا اس کے بغیر کام رک گئے تھے۔'' ثمرہ آپی نے حقارت بھری نظر اس پر ڈال کر ماں کو تسلی دی۔

''نہیں...... غصہ مجھے اس کی حرکتوں پر......''

''پلیز مام......'' فاز نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا اور ماہا سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے تو چائے پلا دیں، بہت طلب ہو رہی ہے۔''

''میں بھی پیوں گی۔'' نمرہ تو اب ویسے بھی وی آئی پی بن چکی تھی سو بہت ہی نزاکت سے ہاتھ اٹھا کر اپنا حصہ ڈالا۔

''دل تو میرا ابھی چاہ رہا ہے، معاذ تم پیو گے؟'' ثمرہ آپی نے کب سے چپ بیٹھے معاذ سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماہا فوراً باہر نکل آئی۔ ''شکر ہے کم پر بات ٹل گئی۔'' وہ شکر مناتی کچن میں آئی اور چائے بنانے میں لگ گئی۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ شاہین بیگم نمرہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف، اس وقت بھی شاید جیولرز کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔

''آؤ نمرہ، اب چلیں۔'' انہوں نے آواز دی۔

''آ رہی ہوں، بس دو منٹ۔''

''اس کے دو منٹ بھی نہ جانے کتنی دیر میں

ہوں گے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھیں۔

''دادو۔'' معیز اُن کے پاس آیا۔

''خبر دار جو میرے پاس آئے، جاؤ یہاں سے۔'' انہوں نے جھڑکا۔ وہ پھر بھی پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

''کیسا ڈھیٹ بچہ ہے۔ منہ نہ لگاؤ تو بھی جان نہیں چھوڑتا۔'' انہوں نے کوفت سے اسے ایک طرف ہٹایا اور نمرہ کو آواز دینے ہی لگی تھیں کہ وہ آتی نظر آئی۔

''چلو آؤ بیٹا......'' وہ آگے بڑھیں تو معیز نے ان کا دوپٹا پکڑ لیا۔

''کیا مصیبت ہے؟'' وہ غصے سے مڑیں تو اس نے بازو ان کی طرف بڑھائے کہ وہ اسے اٹھا لیں۔

''لاحول ولاقوۃ! میں نے پہلے کب اسے اٹھایا ہے، خواہ مخواہ چپک رہا ہے۔'' انہوں نے غصے سے اسے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس کی چیخ پر ماہا دوڑتے ہوئے کچن سے باہر آئی اور اس سے پہلے کہ وہ اسے اٹھاتی دو مردانہ ہاتھوں نے اسے کھینچ کر اوپر اٹھا لیا۔

''مائی گاڈ، اتنا خون۔'' خون پتا نہیں کہاں سے نکل رہا تھا۔ ماتھے سے، ناک سے، منہ سے، ماہا نے اپنی چیخیں روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ معاذ نے بری طرح روتے ہوئے معیز کو اپنے ساتھ لپٹایا تو اس کی سفید شرٹ خون سے رنگین ہو گئی۔

''جلدی کرو معاذ، اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلیں۔'' فاز اس کے پیچھے سے چیخا اور دوڑتا ہوا گاڑی کی طرف گیا اسے اسٹارٹ کر کے روش پر لے آیا۔ جب تک معاذ تیز قدموں سے چلتا ہوا فرنٹ سیٹ پر بیٹھا، تب تک معیز نڈھال ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ گاڑی بہت تیزی سے گیٹ سے نکلی تھی۔

چوکیدار بھی حواس باختہ سا تھا جس نے ابھی ان کے آنے پر گیٹ کھولا تھا اور اب فوراً ہی دوبارہ واپسی پر۔ ماہا وہیں بیٹھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے بھی اس کا خون پڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ شاہین بیگم اس صورتِ حال سے کنفیوز ہو کر کچھ دیر وہیں کھڑی رہیں پھر واپس پلٹ گئیں۔ نمرہ البتہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''چپ ہو جاؤ ماہا، معیز ٹھیک ہو جائے گا معمولی چوٹیں ہیں۔'' وہ اسی طرح روتی رہی۔ ''اٹھو اب یہاں سے، برا لگ رہا ہے۔ میں فون کر کے پوچھتی ہوں اس کے بارے میں۔''

وہ ماہا کو ساتھ لیے اندر چلی آئی۔ فاز کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ معیز کا ہونٹ دانتوں میں دب کر پھٹ گیا ہے اور ماتھے پر زخم گہرا ہے چار ٹانکے آئے ہیں۔ ابھی اسٹیچز لگ رہے ہیں، جیسے ہی ٹریٹمنٹ ہو جاتا ہے ہم گھر آ رہے ہیں۔''

ماہا بت بنی بیٹھی تھی اسے لگتا تھا اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ شاہین بیگم اور نمرہ بھی خاموشی سے بیٹھی تھیں۔ جب گاڑی کی آواز آئی تو وہ تینوں بے ساختہ ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جیسے ہی معاذ اندر داخل ہوا، ماہا نے جلدی سے آگے بڑھ کر معیز کو لے لیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ رخساروں پر کھرونچیں اور ناک اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ ماہا کے رکے ہوئے آنسو پھر بہنے لگے۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے کر جانے لگی کہ فاز نے پکارا۔

''یہ اس کی دوائیں لے لیں، یہ اٹھے گا تو اسے کچھ کھلا پلا کر یہ دے دیجیے گا، پین کلرز ہیں۔'' فاز نے شاپر اس کی طرف بڑھایا تو معاذ نے شاپر پکڑ لیا۔

''چلو، میں بتاتا ہوں کب دینی ہیں۔'' وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ معاذ نے دواؤں کا شاپر سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ حشمت بوا افتاں و خیزاں کمرے میں داخل ہوئیں۔

''کیسا ہے اب بچہ؟'' ماہا انہیں معیز کے متعلق بتانے لگی۔ معاذ باہر چلا گیا پھر تھوڑی ہی دیر میں کپڑے چینج کر کے واپس آ گیا۔ معیز نے ہلکی سی آواز میں دودھ مانگا اور پھر غفلت میں چلا گیا۔

''میں اس کا فیڈر بنا لاتی ہوں۔'' بوا اٹھیں۔

''یہ فیڈر تو نہیں لے سکے گا کیونکہ اس کے ہونٹ زخمی ہیں آپ کپ میں دودھ لے آئیں اور ساتھ میں چمچ بھی۔ اسی سے دودھ پی سکے گا۔'' معاذ کی آواز میں کرب جھلک رہا تھا۔ ماہا نے تڑپ کر معیز کو سینے سے بھینچ لیا۔ حشمت بوا تاسف سے سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

''تم چاہو تو اسے لٹا کر خود بھی تھوڑا سا آرام کر لو کیونکہ ہو سکتا ہے یہ رات میں تنگ کرے۔ ابھی تو انجکشن کی وجہ سے یہ سویا ہوا ہے۔ میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔'' ماہا حیران پریشان بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔ یہ معاذ تھا جو کبھی انتہائی ضرورت کے سوا اس سے مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ معیز کی طرف تو اس نے کبھی اسے توجہ دیتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کمرے میں وہ جب سے آئی تھی آج شاید وہ پہلی بار آیا تھا۔ اتنی اپنائیت، اتنی ہمدردی، آج تو اس نے کھانا نہیں لگایا ٹیبل پر تو کوئی اسے اس کی غلطی کے متعلق بتانے یا تنبیہہ کرنے نہیں آیا۔ کسی کام کے لیے آواز نہیں لگائی گئی۔ کیا صرف فاز اور معاذ کے معیز پر تھوڑی سی توجہ دینے کی وجہ سے یا اس کے بچے کو لگائی گئی چوٹ کے ازالے کے لیے، چلو جیسے بھی سہی اسے کچھ آرام تو میسر آیا تھا۔ اپنے بچے کے ساتھ گزارنے کے لیے تھوڑا سا ٹائم ہی مل گیا تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگانے ہی لگی تھی کہ لاؤنج سے آتی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ معاذ کی آواز واضح تھی۔ وہ معیز کو بیڈ پر لٹا کر کمرے کے دروازے کے پاس رک گئی۔

''مما پلیز! جب میں نے کچھ نہیں کہا تو آپ بھی کوئی وضاحت مت دیں۔''

''وضاحت کی تو بات ہی نہیں ہے، ماہا بھی یہیں تھی۔ نمرہ تو میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ ہم جیولر کے پاس کہاں اتنے سے بچے کو لے کر جاتے۔ میں نے پہلے منع کیا پھر ہاتھ سے یوں ہٹانا چاہا تو پتا نہیں کیسے گر گیا۔''

''وہ ویسے ہی گرا جیسے اتنے سے بچے کو گرنا چاہیے۔ آپ نے صرف اسے ہٹایا نہیں تھا مام، آپ نے اسے جھٹکا جیسے کسی غلیظ کپڑے کو جھٹکا جاتا ہے۔''

''معاذ، غلط بات نہیں کرو۔''

''میں ہمیشہ غلط ہی کرتا ہوں تبھی تو آپ کی گڈ بکس میں سے نکل چکا ہوں۔ حالانکہ صرف ایک قدم میں نے ڈیڈ کے کہنے پر اٹھایا اس کے علاوہ تو کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی لیکن آپ پھر بھی اسی ایک فیصلے کی وجہ سے مجھ سے کبھی راضی ہو ہی نہیں سکیں۔''

''معاذ......'' انہوں نے تڑپ کر اسے پکارا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے معاذ، تم تو میری جان ہو، میرے بیٹے، میرے جگر کے ٹکڑے۔ ایسا مت کہو میری جان مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

''آپ کو میری باتیں سن کر تکلیف ہو رہی ہے اور مجھے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی جب اس معصوم کا اتنا خون بہا۔ میں آپ کا بیٹا ہوں مام تو وہ میرا بیٹا ہے، جسے میں نے کبھی باپ کا پیار نہیں دیا، اسے کبھی اپنے نزدیک آنے ہی نہیں دیا لیکن مجھے آپ پر بھروسا تھا کہ آپ اسے میرا بیٹا سمجھ کر اپنا پوتا سمجھ کر کچھ تو پیار کرتی ہی ہوں گی۔ میں نے کبھی ماہا کو نہیں بلایا، کبھی معیز سے بات نہیں کی کہ آپ کو برا نہ لگے، آپ کا دل نہ دکھے اور آج آپ نے میرا دل بہت بری طرح دکھایا ہے۔'' شاہین بیگم تڑپ کر آگے بڑھیں اور معاذ

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
اگست 2012ء کی جھلکیاں
ماہنامہ سرگزشت
عشقِ ناکام نمبر
مجذوبِ عشق
ایک نامور فلاسفر کا احوالِ زیست جس نے عشقِ ناکام کا جام پیا
عشقِ رنگیں
برصغیر کے اس معروف مصور کی داستان جس نے پیرانہ سالی میں عشق کیا
سوزِ عشق
عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے ناکام عشق کی کتھا
سرابِ عشق
بولی ووڈ کی ایک مسلمان اداکارہ کے عشقِ ناکام کا قصہ
عشقِ مسلسل
پاکستانی ڈاکٹر اور ایک یورپی شہزادی کے ناکام عشق کی روداد
اس کے علاوہ
مدھوبالا، ابراہام لنکن، ملکہ جوزفن، ہٹلر، مرزا صاحباں اور ایک مرید وارث علی کے عشقِ ناکام کا قصہ ساتھ میں بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات
ایک ایسا خاص نمبر جسے آپ مجلد کرا کر محفوظ رکھیں گے

کے ساتھ لپٹ گئیں۔

''ایسا مت کہو معاذ، ایسا مت کہو۔''

ماہا کی برداشت جواب دے گئی، وہ وہاں سے ہٹ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔ اس کے آنسو بے طرح بہہ رہے تھے۔ اسے ساری پچھلی زندگی یاد آنے لگی جب وہ اپنے بابا کے ساتھ چھوٹے سے گھر میں خوش و خرم رہتی تھی۔ بابا کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تو انہوں نے اس سے چھپ کر اپنے ٹیسٹ وغیرہ کروائے تو وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ اس خوفناک بیماری کے انکشاف نے انہیں مجبور کیا تو انہوں نے اسے اپنے ماضی کے متعلق بتایا۔ ان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے جو شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ بھابی اُن کی شادی اپنی بہن سے کروانا چاہتی تھیں جبکہ وہ اپنی کلاس فیلو صبا سے محبت کرتے تھے۔ جب انہوں نے بھائی، بھابی کو اپنی خواہش بتا کر انہیں رشتہ لے جانے کے لیے کہا تو بھابی نے تو صاف جواب دے دیا۔ بھائی البتہ صرف شادی کروانے کے لیے راضی ہوئے۔ پھر گھر کے ماحول کو دیکھ کر انہوں نے خود ہی الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا اور آہستہ آہستہ بھابی نے بھائی کا آنا جانا بھی بند کروادیا۔ خود وہ جاتے تو ان کا رویہ اتنا خشک ہوتا کہ انہوں نے جانا ہی چھوڑ دیا۔ پھر ایکسیڈنٹ میں صبا کے انتقال کے بعد تو وہ گھر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ اب انہیں اپنی حالت کی وجہ سے بڑے بھائی سے رابطہ کرنا پڑا۔ وہ آئے اور انہیں مختلف ڈاکٹروں کو دکھایا بھی لیکن ان کی عمر کی نقدی ختم ہو چکی تھی سو انہوں نے بڑے بھائی کی منت کی کہ وہ ماہا کو اپنی بہو بنا کر گھر لے جائیں ان کے بعد وہ اکیلی رہ جائے گی۔ ماہا کے تایا فراز صاحب نے اپنی بیوی کی مخالفت کے باوجود معاذ کو ساتھ لیا اور ماہا سے نکاح پڑھوا کر اسے وہیں چچا کے گھر میں ٹھہرا دیا۔ وہ ڈیڑھ ماہ وہیں رہا اور پھر چچا کے انتقال کے بعد جب فراز صاحب ماہا کو اپنے گھر لے جانے کے لیے آنے لگے تو اسی رات انہیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ پھر معاذ وہاں سے ماہا سمیت آیا تو گھر میں قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔

''دفع کرو اس منحوس کو میرے سامنے سے۔ اپنے باپ کو مار کر یہاں آنے سے پہلے تمہارے باپ کو بھی مار ڈالا۔'' شاہین بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ماہا کو کچا چبا ڈالتیں۔

☆☆☆

''میں معاذ کی شادی اپنی پسند کی لڑکی سے کروا کر رہوں گی۔'' وہ بانگِ دہل اعلان کرتیں۔

گھر کا سب سے چھوٹا کمرا اسے رہائش کے لیے دیا گیا بجائے معاذ کے کمرے میں ٹھہرانے کے۔ معاذ کو انہوں نے سختی سے تنبیہہ کردی تھی کہ وہ ماہا سے کوئی واسطہ نہیں رکھے۔ وہ اتنی ہسٹریک ہورہی تھیں کہ معاذ کو خوف ہوا کہ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔

''اوکے مام اوکے! جیسے آپ کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔'' وہ انہیں تسلی دیتا رہا۔ انہوں نے اپنے کہے پر عمل کر دکھایا اسے کبھی ماہا کے نزدیک پھٹکنے بھی نہیں دیا۔ البتہ اس کی نظروں پر تو پابندی نہیں لگا سکتی تھیں جو باوجود خود کو ہزار ہا کنٹرول میں رکھنے کے، کئی بار ماہا کی طرف اٹھتی تھیں اور جب ماہا کی پریگننسی کا پتا چلا تو وہ سر تھام کر رہ گئیں۔ پھر اسے ڈلیوری کے لیے اسپتال بھی لے جانا پڑا۔ آئے گئے کو اس کے بارے میں بتانا ہی پڑا۔ معیز کی پیدائش کے بعد انہیں لگتا تھا کہ شاید اب معاذ ماہا کی طرف پلٹ جائے یا ان پر اسے قبول کرنے کے لیے دباؤ ڈالے مگر اس کی روٹین چینج نہیں ہوئی تو پھر اب......؟

ہلکا سا دروازہ ناک کر کے معاذ اور پیچھے شاہین بیگم اندر داخل ہوئیں تو مارے حیرت کے ماہا کھڑی ہوگئی۔

''آپ؟'' وہ شاہین بیگم کو مام آنٹی، یا تائی کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ اس طرح مخاطب ہوتی کہ کسی رشتے سے پکارنا ہی نہ پڑتا۔ جب وہ یہاں اپنی حیثیت کا ہی تعین نہیں کرپائی تھی تو رشتوں کا تعین کیسے کرتی۔

معاذ نے ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بیڈ پر معیز کے قریب بٹھا دیا۔ معیز پر نگاہ پڑتے ہی اُن کے لب بھنچ گئے۔ اس کی ناک اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے، ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی کپڑوں پر خون کے دھبے تھے، انہوں نے نرمی سے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ انہیں دیکھ کر مسکرایا تو پھٹے ہوئے ہونٹ میں تکلیف کے احساس نے رُلا دیا۔ ماہا نے جلدی سے آگے بڑھ کر چمچ سے دودھ اس کے منہ میں ڈالا۔

''دودو'' وہ فیڈر مانگ رہا تھا۔

''وہ دودھ گندا ہوگیا تھا، میں نے پھینک دیا آپ ایسے ہی پی لو۔''

''نہیں، نہیں۔'' وہ زور زور سے رونے لگا۔ معاذ اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ اس سے پہلے شاہین بیگم نے اٹھا لیا۔

''آؤ میں دودھ پلاؤں اپنے بیٹے کو، مجھ سے پیے گا نا، ہوں۔'' وہ حیرت انگیز طور پر چپ ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے چمچ سے دودھ اس کے منہ میں ڈالا۔ وہ پی گیا۔ آدھ کپ پی لینے کے بعد اس نے منہ ہٹا لیا۔ پھر وہ ٹکر ٹکر اُن کا منہ دیکھنے لگا۔ اسے یوں اپنی طرف دیکھتے پاکر ان کا دل بھر آیا۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''دادو بہت بری ہیں نا، آپ کو گرا دیا، اٹھایا نہیں۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔ معاذ نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

''مام پلیز، اسے دیکھیں وہ آپ کے پاس آکر ساری تکلیفیں بھول گیا ہے۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں اسے میڈیسن دے دوں۔'' معاذ نے اسے دوائیں پلائیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ پھر سو گیا۔

''تم بھی سو جاؤ، صبح آفس بھی جانا ہے۔''

''نہیں مام، صبح چھٹی کرلوں گا، ابھی تو اس کے پاس ہوں۔''

''یہاں کہاں بیٹھو گے، سنگل بیڈ ہے یہ، ایسا کرو ان دونوں کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔'' چھت گر پڑتی تو شاید معاذ اور ماہا کی یہ حالت نہیں ہوتی جو ان کی اس انتہائی غیر متوقع بات نے کی تھی۔

''جی مام؟'' معاذ نے اچنبھے سے انہیں دیکھا تو وہ نظریں چرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''دیر سے سہی، میری آنکھیں کھل تو گئی ہیں نا، اب اور شرمندہ نہ کرو۔'' وہ تیزی سے باہر چلی گئیں۔ ماہا گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ معاذ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''جو کام تمہاری خدمتوں اور میری قربانیوں نے نہیں کیا، میرے بیٹے کی محبت نے کردیا، مجھے تو لگتا تھا کہ فاز کی شادی تک یہ سب یونہی چلے گا۔ مما کا دل نرم کرنے کے لیے مجھ سے جو بن پڑا میں نے کیا لیکن آج تو واقعی کمال ہوگیا۔'' اس نے ماہا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے تو وہ بھی نم آنکھوں سے مسکرادی۔ ''چلو آؤ اپنے کمرے میں چلیں۔''

''آپ معیز کو لے جائیں، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

''اٹس اوکے...... آتے ہوئے چائے بنالانا۔''

وہ معیز کو لے کر چلا گیا اور ماہا وضو کرنے واش روم کی طرف، آخر اسے اپنے رب کا شکر بھی تو ادا کرنا تھا جس نے آج ساری ریاضتوں کا صلہ دے دیا تھا۔

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں
...وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی
خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ
رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے
لوگ، بہت سے مواقع ایسے
ضرور ملتے ہیں... جب
محبت دستک دیتی ہے
...اور اس کی خوشبو
میں روشنی کی تابناکی
بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ... مکر و فریب
... سفاکی اور تنگ نظری کے
سائے ...ازل سے محبت کرنے والوں
کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی
کبھی تڑپ کی دگی بھی حکم کے آگے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی

زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

قسط 8

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری...... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آگئے اور آٹھ نو سال ایک پلمبرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جارہی تھی۔ نایاب کے دو بیٹے تھے اور بہجت کی ایک بیٹی تھی انعم۔ ماہتاب اب چاہتی تھیں کہ حجاب کی شادی ہوجائے۔ تقدیم کی اماں سولہ سال سے معذور تھیں اور ابا کینٹ بورڈ میں ملازم تھے۔ تقدیم، تمہید، تسنیم، تعظیم اور تقدیس پانچ بہنیں اور ایک بھائی مونس تھا۔ اماں کی معذوری کی وجہ سے تمہید نے پڑھائی چھوڑ دی اور ان کے ساتھ گھر میں رہتی۔ تقدیم ابلاغ عامہ میں ماسٹر کرنے کے بعد ایک این جی او سے وابستہ تھی۔ تسنیم یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کی طالبہ تھی مونس فوج میں تھا۔ عبادالرحمٰن کے سٹیل ہونے کے بعد ننھیال ددھیال والے اپنی بیٹیوں کے لیے عباد کی آس لگارہے تھے لیکن عباد خاندان میں کسی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حجاب اپنے لیے آنے رشتے کے لیے استخارہ کرتی لیکن اس کے خواب سے امی مطمئن نہیں ہوتیں اور رشتہ طے کردیتی ہیں۔ مدثر، تسنیم کو کورٹ میرج کے لیے زور دیتا ہے، عقیل چھوٹی پر جاتا ہے تو صبور احمد مونس کو عائزہ کی برتھ ڈے کے لیے بلاتے ہیں، تقدیم، تسنیم کے موبائل پر مدثر کے میسج پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتادیتی ہے، تسنیم یونیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جاکر کورٹ میرج کرلیتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تسنیم نے کورٹ میرج کرلی ہے۔ مدثر یونیورسٹی جانے سے پہلے تسنیم سے مل کر جاتا ہے تو یونیورسٹی میں تقدیم کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ تقدیم، مدثر سے کہتی ہے کہ اگر وہ تسنیم کو بھیج دے تو وہ لوگ اپنی عزت بچانے کی خاطر کچھ لوگوں کو بلا کر اس کی رخصتی کردیں گے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔ تقدیم آنے سے معذرت کرلیتی ہے۔ مدثر، تسنیم سے گھر جانے کی کہتا ہے تو وہ انکار کردیتی ہے۔ الطاف نکاح کی تصویریں لے کر آتا ہے تو حجاب یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ کچھ تصویروں میں الطاف کا سر غائب تھا جیسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ نکاح کے بعد الطاف دبئی جانے سے پہلے حجاب سے کہتا ہے کہ اس کے جانے کے بعد اگر لوگ کچھ الٹی سیدھی اڑانے کی کوشش کریں تو اس پر یقین نہ کرنا حجاب اس بات پر پریشان ہوجاتی ہے۔ تقدیم کے گھر میں مدثر کی کال کا انتظار ہوتا ہے۔ مدثر، تسنیم کو بھیجنے کی حامی بھر لیتا ہے اور پھر اپنی والدہ کو اپنی کورٹ میرج کے بارے میں بتاتا ہے۔ زیتون نے تقدیم کے لیے عباد کا رشتہ بتایا تو اماں رضامند ہوگئیں کہ وہ لوگ لڑکی کو دیکھنے آجائیں۔ حجاب اسکول سے واپس آتی ہے تو بیل بجتی ہے اور دو عورتیں ایک بچے کے ساتھ آتی ہیں جن میں سے ایک خود کو الطاف کی بیوی بتاتی ہے۔ حجاب سیمہ سے کہتی ہے کہ وہ الطاف سے اپنا رشتہ ختم کردے گی، گھر والے حجاب کو سمجھاتے ہیں لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہتی ہے۔ تسنیم گھر واپس آکر اپنے کمرے میں رہ رہی ہے لیکن کوئی اس سے بات چیت نہیں کرتا بس اس کو کھانا دے دیتے ہیں، رات میں اسے پیاس لگتی ہے تو وہ دروازہ کھولنا چاہتی ہے لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ حجاب کا فون بند ہونے پر الطاف امی کے فون پر کال کرتا ہے لیکن حجاب بات نہیں کرتی۔ تسنیم مدثر سے کہتی ہے کہ وہ اپنی امی کو بھیجے۔ حجاب کی امی الطاف کی بہن سے بات کرتی ہیں تو وہ سب لوگ ان کے گھر آجاتے ہیں اور بسمہ کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ اکیڈمی میں پاسنگ آؤٹ کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ مونس کو آؤٹ پاس نہیں ملتا تو صبور احمد پوری فیملی کے ساتھ کاکول آگئے۔ زیتون ان کو عباد کے لیے جو لڑکی دکھاتی ہے وہ انہیں بہت پسند آتی ہے لیکن عباد کو ان کی غربت پر اعتراض ہوتا ہے۔ امی اسے منع کرنے سے انکار کرتی ہیں تو عباد جہیز کی لسٹ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ الطاف، حجاب کو راستے میں روک کر اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے مگر حجاب رکشے میں اسکول چلی جاتی ہے۔ زیتون بیگم عباد کی امی کو آکر بتاتی ہیں کہ عباد نے جہیز کی لسٹ بنا کر بھیجی تو ان لوگوں نے رشتے سے انکار کردیا۔ ابا پریشان ہوتے ہیں کہ مدثر نے ابھی تک کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔ مدثر پریشان تھا کہ ڈیڈی نے وہاں جانے سے منع کردیا تھا۔ تسنیم، مدثر سے بات کرتی ہے تو مدثر کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہوتا ہے۔ الطاف، حجاب کے اسکول پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈراتا ہے کہ اسٹاف کے لوگوں کو بلا کر وہ سب کو بتادے گا۔ تقدیم اور ابا مونس کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب میں جاتے ہیں تو صبور احمد اور ان کی فیملی کا بہت اچھی طرح خیال رکھتے ہیں اور واپسی پر ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ مونس گھر آتا ہے تو اماں چاہتی ہیں کہ خوش بخت سے اس کا رشتہ طے کردیں لیکن مونس انہیں ٹال دیتا ہے۔

اب آگے پڑھیں

”مجھے پتا ہونے یا نہ ہونے سے زیادہ اہم بات یہ ہے مونس کہ اماں ابا دونوں کو اس بات کا بہت دکھ ہوگا۔“ تقدیم نے مونس سے کہا۔

”خوش بخت میرے ساتھ نہیں چل سکتی آپی۔“ وہ بولا۔

”کیوں! اس کے پاؤں میں کوئی عیب ہے کیا؟“

”اوہ نو...... میرا یہ مطلب نہیں۔“

”تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں میں لیکن آج سے پہلے تو تم نے کبھی یہ بات نہیں کی حالانکہ تمہارے لیے خوش بخت کا نام اس گھر میں بڑے تواتر کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے۔ اماں نے ایک مرتبہ نہیں لاتعداد مرتبہ تمہارے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ خوش بخت سے تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں، تم نے کبھی اعتراض نہیں کیا کبھی یہ نہیں کہا کہ خوش بخت تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔“

”اس وقت میں ناسمجھ تھا...... میرا اسٹیٹس کچھ اور تھا آپی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ تقدیم نے مونس کو معترض نگاہوں سے دیکھا۔ ”ہوسکتا ہے تمہیں تمہارا موجودہ اسٹیٹس خوش بخت کی قسمت سے ہی ملا ہو اور بائی دی وے لاسٹ ٹائم جب تم چھٹی پر گھر آئے تھے اور چھوٹی پھپھو خوش بخت کو ساتھ لے کر تم سے ملنے آئی تھیں، تعظیم اور تقدیس تمہیں خوش بخت کا نام لے لے کر چھیڑتی رہیں تب تو تم بہت ہنس ہنس کر ان کے ریمارکس لیتے رہے تھے۔ چند مہینوں میں تمہارے خیالات میں اچانک اتنی بڑی تبدیلی کہ اچھی بھلی لڑکی تمہیں اپنے اسٹیٹس سے کمتر دکھائی دینے لگی۔ اسٹیٹس کیا ہوگیا ہے تمہارا؟ کیا جنرل ہوگئے ہو؟“

مونس جھینپا جھینپا، شرمندہ سا دکھائی دینے لگا۔

”کیا انسان کا اسٹیٹس اسے خون کے رشتوں کو بھلا دیتا ہے۔“ تقدیم کے لہجے میں نشتر کی سی کاٹ تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ مونس کی شرمندگی گہری ہوگئی۔

”تو پھر کیا تھا تمہارا مطلب میرے اچھے، سوہنے، پیارے بھائی؟“ تقدیم نے بہت پیار سے مگر کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”فوجی افسر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی بیوی اور گاڑی دونوں شاندار ہونی چاہئیں۔“

”گاڑی تو تمہارے پاس ابھی ہے نہیں۔“

”نہیں ہے تو کیا آجائے گی۔“

”انشاءاللہ!“ تقدیم نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر بولی۔ ”خوش بخت میں کس بات کی کمی ہے۔ ماشاءاللہ خوب صورت ہے، اسمارٹ ہے، پڑھی لکھی ہے۔“

مونس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ”پڑھی لکھی!“ اس نے تقدیم کے الفاظ مذاق اڑانے والے انداز میں دُہرائے پھر بولا۔ ”انٹر پاس! تھرڈ ائیر میں داخلہ لیا یا نہیں؟“

”اپنے بارے میں کیا خیال ہے! تم بھی تو انٹر ہی پاس ہو۔“

مونس کا چہرہ یک لخت تمتمانے لگا لیکن لمحوں میں اس نے اپنی خفت پر قابو پالیا اور قدرے متکبر لہجے میں بولا۔ ”اب آپ یہ نہیں کہہ سکتیں۔“

"خوش بخت گھر کی لڑکی ہے مونس۔" تقدیم نے مونس کو بڑی دلسوزی سے سمجھانا شروع کیا۔ "اپنی ہے، ہمارے تمام حالات سے واقف ہے۔ اپنے گھر سے رخصت ہو کر ہمارے گھر آئے گی تو بہت زیادہ توقعات باندھ کر نہیں۔ اسے معلوم ہوگا کہ کن حالات میں گزارہ کرنا ہے۔ جب توقعات زیادہ نہیں ہوتیں تو صدمات بھی کم ہوتے ہیں ایک دوسرے کے خلاف شکوے شکایات بھی کم ہوتے ہیں۔"

"ارے آپی جب فاصلے ہوں دوریاں ہوں تو کیسے شکوے اور کہاں کی شکایات۔" مونس نے کہا۔

"کیا مطلب؟" تقدیم نے چونک کر پوچھا۔

"ہمارا کیا پتا کہاں کہاں پوسٹنگ ہو۔"

"کہیں بھی ہو تعلق تو رہے گا نا!"

مونس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور انتہائی سنجیدہ دکھائی دینے لگا جیسے کوئی اہم اور غیر معمولی بات کرنے جا رہا ہو۔ "آپی عائزہ جلد ہی انجینئرنگ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کرلے گی۔ بڑی ذہین اور ٹیلینٹڈ لڑکی ہے اس کا ارادہ آرمی جوائن کرنے کا ہے۔ وہ اتنی ذہین ہے کہ پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کے پیرنٹس بھی تعلیم یافتہ اور بہت سمجھدار ہیں۔ انہیں لوگوں سے تعلقات بنانے بھی آتے ہیں نبھانے بھی۔ اتنے دنوں سے میں ان کے گھر جا آرہا ہوں اتنی محبت اور اپنائیت سے پیش آتے ہیں کہ لگتا ہے مجھ سے زیادہ کسی اور پر مہربان ہی نہیں۔ عائزہ کی ممی ہماری چھوٹی پھپو کی طرح زبان نہیں چلاتیں نہ ہی اس کے والد چھوٹے پھوپا کی طرح دکان دار آدمی ہیں۔ سرکاری افسر ہیں اور تعلقات والے آدمی ہیں۔ چھوٹی سی فیملی ہے ایک بیٹی دو بیٹے۔ دونوں بھائی بہت تمیز دار ہیں۔ مجھے تو ہر ویک اینڈ پر اصرار کر کر کے اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔ عائزہ کے پیرنٹس اپنے بھانجے عقیل سے زیادہ میرا خیال رکھتے تھے۔ ایسی فیملی میں جا کر بندہ خوشی محسوس کرتا ہے، دیکھا نہیں آپ نے ابا کی اور آپ کی کتنی آؤ بھگت کی ان لوگوں نے۔"

"تمہاری تمام باتیں ٹھیک مگر اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں میرے بھائی۔" تقدیم نے اسی دلسوزی سے کہا۔

"کم آن آپی...... یہ دقیانوسی باتیں ہیں، آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میڈیکل سائنس کیا کہتی ہے۔"

"کیا کہتی ہے؟" تقدیم نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔

"فرسٹ کزنز میں شادیوں سے اگلی نسل میں ابنارملٹیز کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

تقدیم اس کا منہ دیکھنے لگی۔ کتنی دور کی سوچ رہا تھا وہ۔ تقدیم اس سے اختلاف رائے کی گنجائش نہیں پا رہی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھی کہ مونس کو اس کی سوچ میں یہ وسعت اس کے علم نے دی تھی یا عائزہ اور اس کے گھر والوں کی جانب سے غیر معمولی پذیرائی نے! اماں، ابا کو بتائے بنا چارہ نہیں تھا کہ وہ تو خوش بخت سے مونس کی بات پکی کرنے کو ہمہ تن تیار بیٹھے تھے۔

☆☆☆

کیسا وقت آپڑا تھا کہ اپنے ماں جائے مونس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے تسنیم کو اپنے کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کی درزوں سے گھات لگانی پڑ رہی تھی۔ پاسنگ آؤٹ تقریب کے بعد جب وہ گھر آیا تو تقدیم چینی کی ایک پلیٹ میں تھوڑے سے ملے جلے خشک میوہ جات اور دوسری پلیٹ میں مٹھائی اس کے کمرے میں یہ کہتے ہوئے رکھ گئی تھی۔ "مونس لایا ہے۔"

پاسنگ آؤٹ تقریب میں شرکت کے لیے ایبٹ آباد جانے سے قبل تقدیم نے ایک روز ناشتے کی ٹرے

اس کے کمرے میں پہنچانے کے بعد اطلاعاً کہا تھا۔ "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ابا اور میں مونس کی پاسنگ آؤٹ میں جا رہے ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دینا ہی کافی سمجھا تھا۔ چار پانچ دن گھر سناٹوں میں ڈوبا رہا۔ وہ دیواروں، کھڑکیوں اور دروازے سے کان لگا لگا کر گھر والوں کی آوازیں سننے اور درزوں سے جھانک جھانک کر کمرے سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اماں نے تو جیسے کمرے سے باہر نہ نکلنے کی قسم اٹھا رکھی تھی۔ تعظیم اور تقدیس آتی جاتی یا گھر کے کام کاج کرتی نظر آتی رہیں۔ تمہید البتہ باقاعدگی سے تینوں وقت اس کے کمرے میں ناشتا اور دونوں وقت کا کھانا پہنچانے آتی رہی۔ خاموشی سے ٹرے رکھتی اور جھوٹے برتن اسی خاموشی سے لے جاتی۔ تسنیم کمرے کی صفائی کرتی اور آہستگی سے دروازہ کھول کر کوڑا جو برائے نام ہی ہوتا باہر دیوار کے ساتھ لگا دیتی۔ تعظیم یا تقدیس صفائی کرتیں تو دیوار کے ساتھ لگا کوڑا بھی جھاڑو سے سمیٹ لیتیں۔

کمرے سے باہر کی دنیا دیکھنے کو ترس گئی تھی وہ۔! مدثر کا نمبر بار بار ملاتے ملاتے وہ زچ ہو جاتی۔ کبھی فون بند ملتا کبھی بزی اور کبھی بیل بجے جاتی مگر کال ریسیو نہ کی جاتی۔ اس مرتبہ بیلنس ختم ہوا تو مدثر کی جانب سے کریڈٹ موصول ہونے کے لیے اسے دو دن انتظار کرنا پڑا۔ اسے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ بات بے بات بھڑک اٹھتا۔ تسنیم کو اب اس سے بہت سنبھل کر بات کرنی پڑتی۔ ذرا سی بات پر وہ اس کی گرفت کر لیتا۔ گلے شکوے، بحث مباحثے پر اتر آتا۔ یکایک کسی بات کو بہانہ بنا کر ناراض ہو جاتا اور فون بند کر دیتا۔ پھر بار بار نمبر ملانے پر یا تو کال ریسیو نہ کرتا یا ریسیور کے ڈراپ کر دیتا تھا پھر سرے سے فون ہی بند کر دیتا تھا۔ اب تو وہ اس سے کوئی گلہ شکوہ کرتے بھی ڈرنے لگی تھی۔

مونس گھر آیا تو اس نے دروازے، کھڑکیوں کی آڑ اور درزوں سے اسے دیکھا۔ پچھلے دو سالوں میں وہ چار پانچ مرتبہ چھٹی پر گھر آیا تھا۔ آخری مرتبہ تقریباً پانچ چھ ماہ قبل صرف ہفتے بھر کے لیے۔ ان پانچ چھ مہینوں میں تو اس کی شخصیت کافی بدل گئی تھی۔ جسم پہلے سے فربہ ہو گیا تھا۔ اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں اور ہلکی ہلکی داڑھی بھی۔ فربہی داڑھی مونچھوں نے اسے پہلے کے مقابلے میں کافی اٹھان دی تھی۔ مرد مرد سا لگنے لگا تھا۔ خوش پوش بھی ہو گیا تھا۔ تسنیم مزاجاً کتنی ہی اکل کھری اور خودغرض سہی مونس اس کا ماں جایا تھا اور وہ بھی اکلوتا...... گو مونس کے معاملے میں بھی اس کے رویے کی تاریخ خود غرضی پر مبنی رہی تھی مگر اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر ایک کمرے میں محصور رہتے ہوئے وہ خود احتسابی کی منزل سے گزر رہی تھی۔ بھائی بہنوں کے ساتھ اس کا رویہ محبت کا رہا ہوتا تو شاید آج اتنا پچھتاوا نہ ہوتا۔

محبت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے یہ کوئی مونس سے پوچھتا۔ اس راز سے خود اس کے سوا کوئی واقف نہیں تھا کہ عمر میں خود سے کچھ بڑی محبوبہ سے بڑا دکھائی دینے کی خاطر اس نے گزشتہ چند ماہ کے دوران اپنی جسمانی اور ظاہری وضع قطع پر خصوصی توجہ دی تھی، داڑھی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں۔ اس کی شخصیت کی اٹھان، چال میں تمکنت اور اگر کوئی اس کی آنکھوں میں دیکھ پاتا تو اس کی آنکھوں میں ڈولتا دھیما سا خمار سب اسی عشق کی دین تھے جس کا نشہ اسلام آباد سے کراچی تک بنا ٹکٹ اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ عائزہ سے اس کی بلاناغہ بار ہا بات ہوتی۔ گھر چھوٹا تھا گھر میں تو پرائیوسی محال تھی۔ مونس کو اسے فون کرنا ہوتا یا وہ بیل دیتی تو اس سے بات کرنے کو وہ گھر سے باہر نکل جاتا۔ صد شکر کہ وہ جو گھر آنے کے بعد سے تذبذب میں تھا کہ گھر

والوں کو عائزہ کے بارے میں کیونکر بتائے گا۔ تقدیم نے آپ ہی عقدہ کشائی کر کے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ گھر میں تقدیم کی جو اہمیت تھی اس کے پیشِ نظر اسے یقین تھا کہ اب اگر اماں ابا کی جانب سے کوئی مزاحمت ہوئی بھی تو اس کی سمجھدار اور اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ معاملہ فہم اور دور اندیش بہن معاملہ سنبھال لے گی۔

☆☆☆

اماں، خوش بخت کو مونس کے نام کی انگوٹھی پہنانے کی خواہش لیے نہ بیٹھی ہوتیں تو شاید تقدیم انہیں بتانے میں جلدی نہ کرتی یا کوئی بہانہ بنا کر اماں کو اپنا پروگرام موخر کر دینے کا مشورہ دیتی لیکن موخر الذکر صورت میں اماں چھوٹی پھپھو کو کوئی آسرا دے کر ان سے کوئی زبانی کلامی وعدہ کر کے بیٹھ جاتیں تو وہ بھی غلط تھا۔ چنانچہ تقدیم نے انہیں اصل بات بتانا ہی بہتر سمجھا۔

''تو کیا کہہ رہی ہے تقدیم؟'' اماں نے صدمے کی کیفیت میں تقدیم سے کہا۔

''ہاں اماں، مونس، خوش بخت میں بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہے۔'' اس نے اماں کے دونوں کندھوں کو دھیرے دھیرے دباتے ہوئے کہا۔

''اور وہ کون ہے جس سے وہ چاہتا ہے؟'' اماں کی آواز تقدیم کو تھکی تھکی سی لگی۔

''اس کے دوست کی ماموں زاد...... وہی نا اماں جو پاسنگ آؤٹ کے بعد ہمیں اسلام آباد اپنے گھر لے گئے تھے۔ جنہوں نے مٹھائی اور ڈرائی فروٹ بھجوائے...... مجھے، مونس اور ابا کو تحفے دیے اور آپ کے لیے یہ گرم شال بھجوائی۔'' اماں جو ٹھنڈ نہ ہونے کے باوجود اپنے کندھوں میں درد کے باعث تقدیم کے اصرار پر یہ شال دو دن سے اوڑھے ہوئے تھیں گردن گھما کر تقدیم کو دیکھنے لگیں پھر یک لخت انہوں نے اپنے شانوں پر سے شال کھینچی اور اسے دور پھینکتے ہوئے گھائل لہجے میں بولیں۔

''تو اس لیے بھجوائی تھی انہوں نے یہ شال...... تو کیوں لائی تقدیم، مار آئی ہوتی ان کے منہ پر۔''

''مجھے کیا پتا تھا اماں کہ...... یہ بات ہوگی، ویسے مجھے شبہ ضرور ہوا تھا ان سب کو مونس پر حد سے زیادہ مہربان دیکھ کر اور میں نے واپسی پر آپ سے ذکر بھی کیا تھا۔ آپ شاید بھول گئیں۔''

''نہیں، مجھے یاد ہے مگر میں نے اس لیے اہمیت نہیں دی تھی کہ مونس کے سامنے خوش بخت کے بارے میں اپنی اس خواہش کا میں نے اور تمہارے ابا نے بھی ایک نہیں بیسیوں مرتبہ تذکرہ کیا اور اس نے کبھی نہ نہیں کی۔ سعادت مندی سے سر جھکائے رہا جس سے ہم بھی یہی سمجھے کہ اس کی مرضی بھی ہے۔''

''اس کی مرضی تھی اماں تبھی تو اس نے پہلے کبھی منع نہیں کیا نا، ہم بہنیں بھی اسے اکثر چھیڑا کرتی تھیں خوش بخت کا نام لے لے کر۔''

''ان کم بختوں نے پھنسا لیا میرے بچے کو۔'' اماں روہانسی ہو گئیں۔

''لگتا تو یہی ہے۔'' تقدیم نے توقف کیا۔ ''میں نے پوچھا تھا مونس سے وہ بتا رہا تھا کہ کوئی چھ سات ماہ سے وہ ان کے ہاں جا آ رہا ہے۔ اسے پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے ان لوگوں نے۔ خوش بخت کا تو وہ اب نام بھی نہیں سننا چاہتا۔ چھوٹی پھپھو جن سے وہ اتنا پیار کیا کرتا تھا اب اسے جاہل اجڈ دکھائی دینے لگی ہیں اور پھوپا کو وہ بے شعور سمجھنے لگا ہے۔'' تقدیم نے مونس سے ہونے والی گفتگو کا لب لباب اماں کے گوش گزار کر

کی کوشش کی۔

''میں خود بات کروں گی مونس سے۔'' اماں نے جارحانہ تیوروں سے کہا۔

''آپ کی مرضی ہے لیکن میں آپ کو بتا دوں وہ ایک لفظ نہیں سننا چاہتا ان لوگوں کے خلاف۔''

''بات تو کروں گی اس سے۔''

''پہلے ابا کو بتا کر ان سے مشورہ کر لیں۔''

''ارے رہنے دو، ذرا سی بات پر تو وہ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔''

''اعصابی کمزوری کی وجہ سے اماں۔''

''جو بھی وجہ ہو، ان سے اچھی تو عورت ہونے کے باوجود اس معذوری میں بھی میں ہوں۔''

''خدا آپ کو اور ہمت دے۔''

''ہاں تاکہ اور آزمائشیں پڑیں مجھ پر۔''

''خدا نہ کرے۔''

''تسنیم کا دکھ ہی کچھ کم تھا کیا جو یہ نئی مصیبت بیٹھے بٹھائے سر آ پڑی۔ دیکھو کس کروٹ بیٹھتا ہے یہ اونٹ۔''

''جس کروٹ بھی بیٹھے اماں، آپ ابا کو ضرور بتا دیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ چھوٹی پھپھو کو کوئی آسرا دے بیٹھیں۔''

تقدیم کی بات اماں کے دل کو لگی۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ ابا تو بہت نہال تھے اس خیال سے کہ ان کی اپنی بھانجی بہو بن کر ان کے گھر آئے گی۔ انہیں اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کرنا نہایت ضروری تھا۔

ابا نے سنا تو دم بخود رہ گئے۔ ''تم نے بیٹے سے بات کی؟'' انہوں نے اماں سے پوچھا۔

''کی نہیں کروں گی لیکن تقدیم کہتی ہے وہ لڑکی اور اس کے گھر والوں کے خلاف ایک لفظ سننے کا روادار نہیں۔''

''تم ان کا ذکر کیوں کرو گی، اپنی بات کرنا، میرا مطلب ہے خوش بخت کی بات۔''

''آ جائے آپ کے سامنے ہی کر لیتی ہوں۔''

مونس جو گھر سے باہر گیا ہوا تھا لوٹا تو اماں نے ابا کی موجودگی ہی میں اس سے بات کی۔ وہ پہلے بات کرنے میں متردد ہوا پھر اس نے ہنس کر کہا۔ ''خاندان سے باہر نکلیں اماں، دنیا بہت بڑی ہے۔''

''دنیا تو تمہارے اندازے سے بھی بڑی ہے بیٹا۔'' اماں کے بجائے ابا اس کی بات پر بولے۔ ''لیکن میں نے اور تمہاری ماں نے تم لوگوں کے لیے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے خواب دیکھے...... اپنی حیثیت کے مطابق...... اپنی چادر کے پھیلاؤ جتنے...... ہمارے وہی خواب پورے ہو جاتے تو ہم سمجھتے زندگی ٹھکانے لگ گئی۔''

''چھوٹے چھوٹے خواب کیوں ابا...... انسان کو آگے بڑھنے اور بہتر سے بہتر کی جستجو تو ضرور کرنی چاہیے۔'' مونس بولا۔

اماں اور ابا کی نگاہیں باہم ملیں۔ ''خوش بخت گھر کی لڑکی ہے، مجھے اور تمہارے ابا دونوں کو پسند ہے۔''

”زندگی مجھے گزارنی ہے اماں۔“

”واہ بیٹا واہ...... پالا پوسا ہم نے، دکھ سہے ہم نے، مصیبتیں اٹھائیں ہم نے، تنگی ترشی کاٹی ہم نے اور تم کہتے ہو زندگی تمہیں گزارنی ہے۔“ اماں نے شاکی لہجے میں کہا۔

”ہاں تو غلط تھوڑی کہہ رہا ہوں، ہر شخص کو اپنی زندگی آپ ہی گزارنی ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا ہماری زندگی کیسے گزار سکتا ہے۔“

اماں کچھ کہنے کے درپے ہوئیں مگر ابا نے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کر دیا اور مونس سے بولے۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔ تمہاری زندگی تمہی کو گزارنی چاہیے۔“

اماں نے چونک کر ابا کی طرف دیکھا۔

”تقدیم کی ماں۔“ ابا دھیمے لہجے میں بولے۔ ”افسر ہے ہمارا بیٹا، لڑکی اس کی پسند کی ہونی چاہیے۔ جس بات میں ہمارا بیٹا خوش اس میں ہم بھی خوش۔“ ابا اعصابی کمزوری کا شکار سہی مگر مفاہمت پسند آدمی تھے۔

”بہن کو کیا جواب دیں گے؟“ اماں نے ابا سے کہا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو سمجھا لوں گا اسے۔“

”تھینک یو ابا۔“ مونس نے کہا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اماں ابا اتنی جلدی اور اس قدر آسانی سے سپر ڈال دیں گے۔ شاید اماں تو نہ ڈالتیں اگر تسنیم کے صدمے نے انہیں اندر ہی اندر کچھ ہی دنوں میں کمزور نہ کر دیا ہوتا۔ پہلے بڑی کی رٹ میں وہ ایک بیٹی سے ہاتھ دھو چکی تھیں۔ اب کوئی اور شرط لگا کر وہ سب اکلوتے بیٹے کو نہیں کھونا چاہتی تھیں۔ ملال اور صدمہ جو اس کی طرف سے ملا تھا اسے چپ چاپ سہہ لینے ہی میں عافیت تھی۔ بیٹے سے تعلق قائم رہنا از بسکہ ضروری تھا۔ مگر مصلحت کیسی ہی سہی دل تو دل ہی تھا۔ ضرب پڑی تو اماں ایک سرد آہ بھر کر یہ کہے بنا نہ رہ سکیں۔

”اپنے مطلب کے لیے دوسروں کی اولاد کو اپنے داؤ پیچ میں گھیر لینے والے لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ان کے ماں باپ نے بھی ان کے لیے کچھ خواب دیکھ رکھے ہوں گے۔“

ابا نے اماں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ملال اور چہرے پر شکستگی کا احساس تھا۔ خواب ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

زندگی جیسے تھم ہی تو گئی تھی اور چہار اور بس ایک ہی سوال نقش تھا کہ وہ پیا گھر کب جا رہی تھی۔ اسٹاف، ہم منصب ساتھی، احباب و اقارب ہر ایک یہی پوچھتا۔ ”رخصتی کب ہو رہی ہے؟“

تقدیم سے کم کم ملنا ہوتا مگر اس کے باوجود حجاب اسے اور وہ حجاب کو اپنی بہترین دوست سمجھتی تھی۔ فون پر اکثر رابطہ رہتا۔ ملتیں تو دل کھول کر ملتیں۔ دونوں ایک دوسرے کے گھریلو حالات سے بھی بخوبی آگاہ تھیں مگر کچھ باتیں تو انسان اپنے آپ سے بھی کہتے ڈرتا ہے سو تسنیم کی کورٹ میرج کا واقعہ بھی ایسی ہی بات تھی جس کا تقدیم نے حجاب سے قطعاً ذکر نہیں کیا تھا۔ حجاب نے البتہ تقدیم کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو وہ گھر سے باہر اب تک کسی اور کو نہیں بتا پائی تھی۔ اس روز ان دونوں کی بہت دنوں بعد روبرو ملاقات ہوئی تھی۔ قلب میں اتری اداسی اور روح پر چھائے سناٹے سے گھبرا کر حجاب اس روز اسکول سے حسبِ معمول گھر واپس جانے کے بجائے

تقدیم کے آفس چلی آئی تھی۔

”ارے! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ تقدیم نے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ اور گہنائی رنگت دیکھ کر تشویش سے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے!“ حجاب نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

”کمزور ہو گئی ہو۔“

”زندگی کبھی کبھی اتنی دشوار کیوں ہو جاتی ہے تقدیم...... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ ہو گا۔“ حجاب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”کسی کو نہیں پتا ہوتا حجاب کہ زندگی اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہی ہے۔“

حجاب کے لبوں پر کرب انگیز مسکراہٹ ابھری۔ ”دکھ مجھے اس بات کا بھی ہے تقدیم کہ میری زندگی کو ایک داغ لگ گیا۔ چاہے کچھ بھی ہو مجھے اس شخص سے اپنا رشتہ ختم کرنا ہے۔ آئندہ زندگی میں مطلقہ یا خلع یافتہ ہی کہلاؤں گی نا...... مگر اس دکھ سے بڑا دکھ یہ ہے کہ امی، بھائی، بہنیں میرے اپنے لوگ میرے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں۔ سب نے بائیکاٹ کر رکھا ہے...... اور یہ دکھ میں برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔ ہر وقت کی ٹینشن، جلن اور کڑھن...... یار مار دیتی ہے آپ کو اپنوں کی ناراضی اور امی کی ناراضی وہ تو اگر کبھی پانچ منٹ کو بھی میری طرف سے اپنا موڈ آف کر لیتی تھیں کسی بات پر تو میرے لیے سوہانِ روح ہو جاتی تھی ان کی ناراضی اور اب یہ عالم کے مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا انہیں مجھ سے بات کیے۔ نایاب باجی ہیں تو ان کا منہ پھولا ہوا ہے، بہجت بھائی میری طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے اور تو اور چھوٹی رباب جو ہر وقت میرے گلے کا ہار بنی رہتی تھی بالکل لاتعلق رہتی ہے مجھ سے۔ میں ایک اصولی بات پر ڈٹی ہوں تقدیم...... چاہیے تو یہ تھا کہ میرے اپنے میرا ساتھ دیتے مگر......“ حجاب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ان کی اپنی مجبوریاں ہوں گی حجاب۔“ تقدیم نے کہا۔

”مجبوریاں ان کی نہیں میری ہیں تقدیم، اس شخص سے اپنا رشتہ ختم کر دینے کے بعد میری حیثیت کیا ہو گی ایک طلاق یافتہ عورت اور اس معاشرے میں ایک مطلقہ کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن میں...... یہ بات جانتے ہوئے بھی اس سے علیحدگی کے فیصلے پر قائم ہوں۔ اسے یہ بتانے کے لیے کہ میں کوئی زر خرید نہیں جسے اس نے اپنی دولت کے زور پر خرید لیا اور اس لیے بھی کہ میں اس عورت کا ساتھ دینا چاہتی ہوں جو اس کے بچے کی ماں بھی ہے۔ میں اس شخص کو اور اس جیسے تمام مردوں کو یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ عورت کوئی کھلونا نہیں کہ ایک سے کھیلے جی بھر گیا تو دوسرا خرید لائے۔ میں ایک مقصد کی خاطر لڑ رہی ہوں تقدیم۔“

”لیکن جب تمہارے گھر والے ہی نہیں چاہ رہے تو؟“

”تو بھی میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گی...... اچھا خیر تم سناؤ، گھر میں سب خیریت ہے؟“ حجاب نے اچانک موضوع بدل دیا۔

”ہاں، خدا کا شکر ہے۔“ تسنیم کے خیال سے تقدیم کے دل میں کسک پیدا ہوئی۔ ”مونس کے آنے سے گھر میں رونق ہو گئی ہے۔ اماں بہت خوش ہیں۔“

”ظاہر ہے ایک ہی بیٹا ہے، میں اپنے گھر میں دیکھتی ہوں بہجت بھائی آتے ہیں تو انہیں دیکھتے ہی امی

کے چہرے کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔''

''سچ کہتی ہو، یہی حال اماں کا ہے، مونس میں تو ان کی جان ہے۔''

''کافی دنوں سے جی چاہ رہا تھا تم سے ملنے کو۔ پہلے یہی سوچتی رہی کسی دن گھر جاؤں گی بیٹھ کر اطمینان سے بات کروں گی لیکن تمہاری مصروفیت کا خیال آڑے آتا رہا، آج اللہ کا نام لے کر یہیں آ گئی۔''

''اچھا کیا۔''

''میرا خیال ہے اب مجھے اٹھنا چاہیے۔ تمہاری باس آ گئیں تو......''

''کوئی مسئلہ نہیں، وہ اصول پرست خاتون ہیں، نکمے اور دوستوں کو دفتر میں بلا کر چائے پینے اور گپ شپ کرنے والے لوگ انہیں سخت ناپسند ہیں۔ کام کرنے والے لوگوں کی وہ قدر کرتی ہیں۔''

''اور تم ان کی فیورٹ ہو۔''

''کہہ سکتے ہیں۔'' تقدیم مسکرائی۔ ''چائے پیو گی یا......؟''

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔'' حجاب اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تم سے مل کر دل ہلکا ہو گیا۔''

تقدیم نے ایک سرد آہ اپنے سینے میں گھونٹی، وہ اپنے دل کا بوجھ کس سے کہہ سن کر ہلکا کرتی۔ ایک طرف تسنیم کا مسئلہ تھا تو دوسری جانب اماں، ابا کی دیرینہ خواہش کے احترام سے مونس کے انکار نے گھر کی فضا کو محزون کر رکھا تھا۔ حالات کے مارے اماں اور ابا نے چپ چاپ مفاہمت تو کر لی تھی مگر دل گرفتہ تھے۔

☆☆☆

کسی اونچے گھرانے کا داماد بننے کے لیے عباد ان دنوں باقاعدگی سے ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات تو دیکھ ہی رہا تھا شادی دفاتر کے چکر بھی لگا رہا تھا۔ آج ایک دفتر میں تو کل دوسرے میں۔ اخبار میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات کے ذریعے چند ایسے گھرانوں سے رابطہ بھی ہوا تھا جنہوں نے اپنی لڑکیوں کے لیے اخبار میں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار دیا تھا مگر اب تک کہیں بات نہیں بن پائی تھی یا تو فیملی بہت ہائی فائی تھی جہاں پہنچ کر عباد بونا بن گیا تھا یا پھر کوئی اور پرابلم ہو جاتی۔ آسانی کی خاطر اس نے ایک میرج بیورو میں بھی رجسٹریشن کروالی تھی۔ میرج بیورو کے مالک زاہد تونیو اور ان کی معاون خاتون مسز جمالی نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ بہت جلد وہ اسے اس کے مطلب کا رشتہ دلوا دیں گے۔ عباد نے ان سے بڑی امید لگا رکھی تھی۔ امی خاموش تماشائی بنی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن عباد بن ٹھن کر کسی لڑکی کو دیکھنے، کسی فیملی سے ملنے، کسی میرج بیورو سے رابطہ قائم کرنے جاتا اور منہ لٹکائے واپس آ جاتا۔

''کیا ہوا؟'' امی پوچھتیں۔

''ہو جائے گا امی ہو جائے گا۔'' وہ مسکرا کر اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کرتا۔

''وہ جو تم نے شادی دفتر میں رجسٹریشن کروائی تھی؟''

کیا بتاتا امی کو کہ رجسٹریشن کے دو ہزار روپے کس بری طرح ڈوبے تھے۔ مسز جمالی نے اسے چار پانچ اینڈی بینڈی لڑکیوں کی تصویریں دکھائیں، لالو کھیت اور دستگیر کے دو چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والی لڑکیوں اور ان کے اہلِ خانہ سے ملاقات کروائی اور جب اس نے مسز جمالی سے دبی زبان سے کہا کہ وہ تو کسی اونچے گھرانے میں شادی کا خواہشمند تھا تو مسز جمالی نے کہا۔

''مسٹر عباد اونچے گھرانے والے اپنے ہم پلہ رشتے کی ڈیمانڈ کرتے ہیں اگر ہمارے پاس کوئی ایسا رشتہ آیا جن کی یہ شرط نہیں ہو گی تو ہم آپ کو ضرور بتائیں گے۔''

''لیکن آپ نے تو کہا تھا صرف ایک ہفتے کے اندر اندر آپ مجھے میری پسند کا رشتہ دلوا دیں گی۔'' عباد نے مسز جمالی کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔

''ہمیں ایک پارٹی کی پسند کے رشتے کی پسند کا بھی تو خیال رکھنا پڑتا ہے عباد صاحب۔'' مسز جمالی مسکرائیں۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ دوسری پارٹی کی بھی تو کچھ ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔'' مسز جمالی نے نخوت سے کہا پھر استہزائیہ لہجے میں بولیں۔ ''بائی دی وے آپ کے پاس گاڑی کس ماڈل کی ہے؟''

''جی...... میرے...... میرے پاس...... گاڑی نہیں ہے۔'' عباد نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اوہ!'' مسز جمالی نے اپنی دائیں ابرو چڑھائی اور حیرت سے کہا۔ ''تو پھر آپ آتے جاتے کیسے ہیں؟ پبلک ٹرانسپورٹ پر۔''

''جی نہیں موٹر سائیکل پر۔''

''عباد صاحب، موٹر سائیکل تو ہمارے آفس کے سوئیپر کے پاس بھی ہے۔'' مسز جمالی نے قدرے تحقیر سے اسے دیکھا۔

عباد کا جی تو چاہا مسز جمالی کو شوٹ کر دے مگر جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ادارے کے مالک زاہد تونیو سے ملا اور ان سے مسز جمالی کے رویّے کی شکایت کی تو انہوں نے کہا۔

''سائیں! میں آپ سے سوری بولتا ہوں، آپ بھروسا رکھو آپ کی رجسٹریشن ہے ہمارے پاس، آج نہیں دو سال بعد بھی آپ کے معیار کا رشتہ ہمارے پاس آیا نا سائیں تو ہم آپ سے شیور لی کانٹیکٹ کریں گے۔''

دو سال بعد! یہاں اس نے گھوڑے دوڑا رکھے تھے اپنے معیار کے رشتے کی تلاش میں اور وہ دو سال کی بات کر رہے تھے۔ وہ اس عزم کے ساتھ اس شادی دفتر سے نکل آیا کہ اب کبھی پلٹ کر مسز جمالی اور زاہد تونیو کے بوتھے نہیں دیکھے گا۔ اس تحقیر اور لارے لپے سے دو ہزار پر مسز جمالی اور زاہد تونیو کی فاتحہ پڑھ لینا بہتر تھا۔ نہ ملکِ خدا تنگ تھی نہ اس کے پاؤں میں لنگ۔ ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات اور دوسرے بہت سے شادی دفاتر سے اس کی امید پوری طرح جڑی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو گوہرِ مقصود ہاتھ لگنا ہی تھا۔ جذبہ جواں اور عزم راسخ ہونا چاہیے۔

☆☆☆

ڈاکیا کبھی کبھار ہی اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ بجلی، گیس اور ٹیلیفون کے بل تو دہلیز پر پڑے مل جاتے تھے۔ مونس منگلا جانے کے لیے اپنے سامان کی پیکنگ میں لگا ہوا تھا۔ گھر پر اس وقت وہ اماں، تمہید اور اپنے کمرے میں محصور تسنیم ہی تھی۔ ڈاکیے نے دروازہ زور سے کھٹکھٹا کر آواز لگائی۔ ''پوسٹ مین۔''

مونس دروازے پر گیا۔ رجسٹری آئی تھی تسنیم کے نام! مونس نے رسید پر دستخط کیے اور رجسٹری وصول کر لی۔ الٹ پلٹ کر لفافہ دیکھتے ہوئے وہ اماں کے کمرے میں آ گیا۔

''کس کا خط ہے؟'' اماں نے اس کے ہاتھ میں لفافہ دیکھ کر پوچھا۔

''تسنیم باجی کے نام رجسٹری آئی ہے۔''

''کہاں سے؟'' اماں نے سوال کیا پھر خود ہی قیاس ظاہر کیا۔ ''یونیورسٹی سے آئی ہوگی۔''

''نہیں، یہ کسی بندے کی طرف سے آئی ہے کسی وکیل کی معرفت۔''

''وکیل کی معرفت!'' اماں ہڑبڑائیں۔

''ہاں ایڈووکیٹ نصیر احمد رانا۔''

''اور بھیجنے والے کا نام کیا ہے؟''

''مدثر معین۔''

''کھولنا مت، کھولنا مت۔'' اماں نے لفافہ مونس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔

''کیا ہو گیا ہے اماں، کھول کب رہا ہوں۔'' مونس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''تقدیم آئے گی تو اس سے بھجوادیں گے اسے۔'' اماں نے لفافہ اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ مونس کو اماں کا ہڑبڑانا اور متوحش ہونا معنی خیز محسوس ہوا۔ رجسٹری ہی تو تھی مگر تسنیم کے نام وکیل کی معرفت کس قسم کی رجسٹری آسکتی تھی۔

مونس دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ اماں نے تکیے کے نیچے سے لفافہ نکالا الٹ پلٹ کر دیکھا پھر واپس رکھ دیا۔ ''شاید نکاح نامے کی نقل ہو۔'' اماں نے آپ ہی آپ سوچا پھر اس خیال میں غلطاں ہوگئیں کہ کچہری میں نکاح کیونکر پڑھاتے ہوں گے۔ گواہ، وکیل کون بنتے ہوں گے۔ دلہن کا ولی کسے بناتے ہوں گے۔ خیال تھا کہ ابا آئیں گے تو ان سے صلاح کر کے تسنیم کو لفافہ بھجوانے سے پہلے خود احتیاط سے کھول کر دیکھ لیں گی کہ اس میں کیا تھا اور دوبارہ اسے بند کر کے تقدیم کے ہاتھ تسنیم کو بھجوادیں گی لیکن مونس کچھ دیر بعد گھر سے باہر گیا تو اماں کو خلجان ہونے لگا کہ دیکھیں تو لفافے میں تھا کیا۔ انگریزی میں کوئی کاغذ ہوا تو ابا کا انتظار کرنا پڑے گا اردو میں ہوا تو خود پڑھ لیں گی۔ تکیے کے نیچے سے لفافہ دوبارہ نکالا، پانی کے گلاس میں انگلی کی اگلی پور ڈبوئی اور اسے نہایت احتیاط سے دو تین مرتبہ لفافے کے منہ پر پھیرا اور دھیرے دھیرے لفافے کا منہ کھول کر اس میں سے تہ شدہ دبیز کاغذ کو بصد احتیاط باہر نکالا تہ کھولی اور پکے کاغذ پر اردو عبارت کا سرنامہ دیکھتے ہی دھک رہ گئیں۔ ''طلاق نامہ'' دم بخود کیفیت میں عبارت پڑھنا شروع کی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ طلاق نامہ تھا مدثر کی طرف سے تسنیم کے نام۔

اماں بے اختیار زور سے کراہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ کس بات کی سزا ملی تھی؟ اور کسے؟ اماں کے کراہنے کی آواز سن کر تمہید لپکی ہوئی آئی۔

''کیا ہوا اماں؟'' اماں کیا بتاتیں اسے!

''پانی دو۔'' انہوں نے مردہ سی آواز میں تمہید سے کہا۔

پانی کا جگ اور گلاس ہمہ وقت اماں کے کمرے میں ان کے سرہانے موجود رہتے تھے۔ تمہید نے گلاس کا پانی کھڑکی سے باہر پھینکا اور جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اماں کو دیا۔ انہوں نے دو گھونٹ بھرے اور نیم جاں سی ہو کر وہیل چیئر کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا۔

''کندھے دباؤں اماں۔'' تمہید کو اماں کا بلڈ پریشر ہائی ہونے کا گمان ہوا۔

''نہیں...... جاؤ تم اپنا کام کرو، بہن آتی ہوگی کالج سے، بھائی کو بھی کھانا دینا ہے۔ میرا بچہ تین چار دن کا مہمان اور ہے۔'' ہمت نہ ہونے کے باوجود اماں اتنا کچھ بول گئیں۔ تمہید چلی گئی۔

لفافہ اور کاغذ اماں نے دوبارہ تکیے کے نیچے رکھنے کے بجائے مسہری کے بھاری گدے کے نیچے اڑس دیے۔ شدتِ غم سے ان کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں برسنے لگیں...... پہلے جو ہوا تھا وہ کم تھا جو مرے پر سو درے کے مصداق اب یہ طلاق نامہ آگیا تھا۔ پچھتاوے ڈس رہے تھے کہ جو ہو گیا تھا سو ہو گیا تھا۔ کیوں یہ چاہا کہ دنیا دکھاوے کو تسنیم ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو کر جائے۔ شاید وہ مدثر کے ساتھ ہی رہی ہوتی تو وہ اسے اپنی زندگی سے یوں دودھ سے مکھی کی طرح نہ نکال پھینکتا اور اگر وہ اسے دوبارہ چھوڑ بھی گیا تھا تو کوئی فوری اقدام کیوں نہ کیا۔ بجائے اس انتظار میں رہنے کے کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھیجے خود کیوں نہ پیش قدمی کی۔ ڈھونڈنے آؤ تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ مدثر کے گھر کا پتا معلوم کرنا کون سا کوئی کار گراں تھا۔ اس کے گھر جا کر اس کے والدین سے بات کی جاتی۔ وہاں تو تم روٹھے ہم چھوٹے والا حساب ہوا نہ یہاں سے کوئی گیا نہ ان پر کوئی معاشرتی اور اخلاقی دباؤ پڑا۔ نہ انہوں نے آنے کی ضرورت محسوس کی۔ مدثر سے براہِ راست رابطہ ہوتا تو اس کی نیت بھانپ کر بروقت اس کی ناک میں نکیل ڈالی جاسکتی تھی۔ رابطہ رکھ کر اور باخبر رہ کر بہت کچھ کیا جاسکتا تھا۔ اب تو کچھ بھی نہیں، کمان سے ہر تیر نکل چکا تھا۔ اس بدبخت، بے کردار اور کم نسب کے نزدیک تو جیسے نکاح بھی کھیل تھا اور رشتہ توڑ دینا بھی کھیل! مہر شرعی تھا جو طلاق نامے کے اندراج کے مطابق وہ کورٹ میرج کے فوراً بعد ادا کر چکا تھا۔ اماں کا سینہ غم سے بوجھل ہوا جا رہا تھا۔ عجب افتاد آپڑی تھی۔ تسنیم پر انہیں غصہ بھی آرہا تھا اس سے ہمدردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی قسمت پر رونا بھی آرہا تھا اس کے مستقبل کی فکر بھی ستا رہی تھی۔ مدثر نے بہت ظلم کیا تھا۔ دوسروں کی بیٹیاں کوئی یوں اجاڑی جاتی ہیں۔ اماں کو تسنیم کے بارے میں طرح طرح کے خدشات اور سوالات ستا رہے تھے۔

''مدثر نے بلا سبب تو نہیں بھجوایا ہوگا طلاق نامہ۔''

''کیا سبب تھا؟ تسنیم ضرور جانتی ہوگی۔ کیا مدثر نے تسنیم سے بات کی ہوگی اس سلسلے میں۔''

''تسنیم کا ردِعمل؟ کون عورت خوش ہوتی ہے مرد سے اپنا رشتہ ٹوٹنے پر، تسنیم نے رنج و ملال میں کوئی ایسا ویسا قدم اٹھالیا۔ خود کو کوئی نقصان پہنچالیا تو؟ خودکشی لوگ ایسی ہی جذباتی کیفیت میں تو کیا کرتے ہیں۔'' اماں کی اپنی جذباتی کیفیت کسی مضبوط سہارے کی متقاضی ہو رہی تھی۔ کوئی ہو جو دلاسا دے، ابا تو خود اعصابی کمزوری کے عارضے کا شکار تھے۔ تقدیم بیٹی تھی، اس کے تسلی دینے سے کیا بنتا۔ عورت کو حوصلہ تو مرد سے ملتا ہے خواہ باپ ہو، بھائی ہو، شوہر ہو یا بیٹا۔

مونس باہر سے گھر واپس آیا تو اماں کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ اپنے پاس بٹھا کر انہوں نے اپنے بستر کے گدے کے نیچے سے طلاق نامہ نکالا اور مونس کو تھما دیا۔ اس نے دیکھا، پڑھا اور ہکا بکا اماں کو دیکھنے لگا۔ اماں کی نظریں جھک گئیں۔

''یونیورسٹی کا کوئی لڑکا تھا جس سے تمہاری بہن نے کچہری جا کر نکاح پڑھا لیا تھا۔''

''آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' مونس مجسم شکایت بن گیا۔

''خوشی کی بات ہوتی تو بتاتی، شرم کی بات تھی۔'' اماں دھیرے سے بولیں اور سسکنے لگیں۔

''یہ خوشی کی بات ہے کیا؟'' وہ طلاق نامہ کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے؟ شوٹ کر دوں گا میں اسے۔'' مونس بپھرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''گندا خون ہے بیٹے...... گندے خون میں ہاتھ رنگنے سے فائدہ......'' بیٹے کے تیور دیکھ کر اماں اپنا صدمہ بھول گئیں۔ ''غلطی ہماری لڑکی کی بھی ہے اس نے موقع دیا ہوگا تو اتنی بڑی بات ہوئی۔''

''کیا موقع دیا ہوگا، یہ کہا ہوگا اس سے کہ مجھے طلاق دو۔'' مونس نے غصے سے کہا۔

''میں طلاق کی نہیں کورٹ جا کر شادی کرنے کی بات کر رہی ہوں۔''

''اتنی بڑی بات ہوگئی اور آپ نے مجھے بے خبر رکھا۔'' اس نے پھر گلہ کیا۔

''کیا کر لیتے تم؟''

بات تو ٹھیک تھی کیا کر لیتا وہ! کیا کر لیتے ہیں گھروں سے بھاگ کر، کورٹ کچہری جا کر اپنی مرضی سے شادی کر لینے والی لڑکیوں کے باپ بھائی، زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ بھاگنے والی لڑکی کو مار دیا، بھگا لے جانے والے کو اڑا دیا پھر نتیجہ! جیل کی سلاخیں۔ داؤ پر لگ جانے والی بھائی کی جوانی یا باپ کا بڑھاپا...... رسوائی آگ کی طرح پھیلتی ہے، نسلوں کی نسلیں لپیٹ میں آجاتی ہیں۔ کسی شاعر کا یہ شعر کس قدر برمحل معلوم ہوتا ہے ایسے موقعوں کے لیے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
لمحوں نے خطا کی ہے صدیوں نے سزا پائی

مونس نے طلاق نامہ اماں کے بستر پر ڈالا اور کرسی کے ہتھے پر اپنی کہنی ٹیکتے ہوئے انگوٹھے سے دائیں اور پہلی انگلی سے بائیں آنکھ دبا کر بیٹھ گیا۔ اماں کو شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ کیا سوچتا ہوگا بیٹا کہ گھر میں اتنی بڑی بات ہوگئی، بہن اتنا بڑا گل کھلا کر بیٹھ گئی اور ماں نے چھپا لیا۔ طلاق نامہ نہ ملتا تو شاید اب بھی نہ بتاتیں۔ تسنیم کی بہنوں سے لڑائی اور ناراضی کا ڈراما رچائے بیٹھی رہتیں۔

کچھ دیر اماں اور مونس ایک دوسرے کے روبرو اپنی اپنی کیفیت پر مستحکم خاموش بیٹھے رہے پھر مونس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور اماں کی جانب دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''اکیڈمی میں ہمارا ایک سینئر کہا کرتا تھا جن گھروں میں گھر کے مردوں سے باتیں چھپائی جاتی ہیں وہاں بڑے بڑے حادثات ہو جاتے ہیں۔'' اماں کو یوں لگا جیسے مونس نے دہاڑ سے طمانچہ دے مارا تھا ان کے منہ پر۔

''نہیں بیٹا!'' اماں رنج کی شدت سے روہانسی ہوگئیں۔ ''تم سے چھپا کر کیا کرنا تھا مجھے...... تمہیں اس لیے نہیں بتا پایا کہ ہم اس کے گھر والوں کے انتظار میں تھے۔ میں نے تو اس بدبخت سے یہ کہا تھا کہ اپنے ماں باپ کو لائے اور تسنیم کو عزت سے اس گھر سے لے جائے۔''

''اماں! اماں۔'' مونس نے زچ ہو کر اپنا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی دور اندیشی زبردست مگر بہت معذرت کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میرا ایک ٹھڈا وہ کام کر سکتا تھا جو آپ کی دور اندیشی نہیں کر سکی...... اس کا گریبان پکڑ لیتا میں۔'' مونس نے دانت پیسے۔ ''بھاگنے نہ دیتا اسے...... خیر جائے گا کہاں۔'' مونس نے

اپنے ہاتھ میں پکڑا موبائل فرش پر دے مارا۔

اماں نے متوحش ہو کر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے انتہائی لجاجت سے بولیں۔ ''نہیں بیٹا نہیں، ایسا ویسا کچھ مت سوچنا تمہارے آگے چار بہنیں اور بھی ہیں۔''

مونس ایک تشنجی کیفیت سے دوچار دکھائی دینے لگا۔ ''اس سے تو اچھا تھا آپ مجھے بتاتیں ہی نہیں، بے خبر رہنے دیتیں۔'' وہ بولا۔

اماں کے ہونٹ کانپنے لگے، دل بری طرح بھر آیا۔ ''تمہیں نہ بتاتی تو مجھے تسلی کون دیتا...... جب پتا چلا کہ اس نے کورٹ جا کر کسی سے شادی کر لی ہے تو تمہارے باپ ٹھنڈے پڑ گئے تھے انہیں میں نے تسلی دی...... حوصلہ دیا مگر اب...... اب مجھے خود تسلی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے بیٹا، مجھے دلاسا دو، مجھے تسلی دو میرے بچے ورنہ میرا سینہ دکھ سے پھٹ جائے گا۔'' یک بیک اماں رونے لگیں۔ مونس آگے بڑھا اور اس نے اماں کے گرد اپنے دونوں بازوؤں کا حصار باندھا اور ان کے ناتواں وجود کو دھیرے دھیرے تھپکنے لگا۔

☆☆☆

گھر میں پھر مرگ کا سماں ہوگیا۔ یہ تکلیف سابقہ دکھ سے سوا تھی۔ سابقہ دکھ نے گھر والوں کے دل میں تسنیم کے خلاف شدید ناراضی کو ہوا دے کر ان کے مابین ایک خلیج حائل کر دی تھی مگر یہ نیا دکھ تسنیم سے ہمدردی کا متقاضی ہو رہا تھا۔ عورت ہونے کے ناتے اماں اس نئے دکھ کی تپش محسوس کر سکتی تھیں۔ ماں تھیں اور ماں کے لیے اولاد کی بربادی سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مدثر نے ایسا کیوں کیا تھا اس سوال کا جواب ملنا ضروری تھا اور یہ جواب اماں ابا اور دیگر اہلِ خانہ کے خیال میں یا تو تسنیم دے سکتی تھی یا مدثر اور اس کے گھر والے۔

تسنیم کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ وہ تو پچھلے کئی روز سے مدثر کا نمبر ملا ملا کر تھک چکی تھی۔ ہر مرتبہ ایک ہی ریکارڈ جواب سننے کو ملتا۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔''

اماں نے تقدیم کو تسنیم سے بات کرنے کی ذمے داری سونپی، معاملہ ایسا تھا کہ تقدیم بھی خائف ہوگئی۔ ''کیا کہوں اس سے؟''

''پوچھنا ایسی کیا بات ہوئی جو اس مردود نے......''

بہت کڑا مرحلہ تھا مگر بہرحال اس سے گزرنا تو تھا۔ تقدیم اس کی اہل نہ سمجھی جاتی تو گھر میں کسی اور کو ہمت کرنا پڑتی۔ تقدیم کو بے وقت اپنے کمرے میں دیکھ کر تسنیم کھٹک گئی۔

''کیا حال ہے تسنیم؟'' تقدیم نے ہمت کر کے اتنے دنوں سے حائل خلیج پاٹنے کو تمہید باندھی۔

تسنیم چونکی کہ اتنے دن بعد آج گھر میں کسی کو اس کا حال پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ اس نے تقدیم کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تقدیم بیٹھ گئی۔ اس کا بیٹھنا تسنیم کو اور پُراسرار محسوس ہوا۔ وہ تو اس گھر میں شجرِ ممنوعہ بن چکی تھی اور شجرِ ممنوعہ کے نزدیک جانا عین گناہ! تقدیم اس گناہ کا ارتکاب کیوں کر رہی تھی۔

کچھ دیر دونوں کے مابین خاموشی حائل رہی پھر تقدیم نے حزم سے پوچھا۔ ''مدثر سے کوئی بات ہوگئی تھی کیا؟''

تسنیم نے بے ساختہ چونک کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کی زبان سے مدثر کا نام سن کر اسے اچنبھا ہوا ہو۔

''کیا بات ہوئی تھی؟'' تقدیم کے لہجے میں کسی خیر خواہ کی سی دلسوزی تھی۔ وہ مسلسل چپ تھی۔

''بتاؤ۔'' تقدیم نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھر دیا۔ تسنیم کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے کیا کیا تھا اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

تقدیم کیا کر رہی تھی۔

لیکن مدثر سے تو اس کی بہت ساری باتیں ہوتی رہی تھیں۔ تقدیم کس خاص بات کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔ وہ پھر چپ رہی۔

تقدیم نے ایک گہری سانس کھینچی۔ ''کیا ہوا تھا؟'' اس نے تسنیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''کب کیا ہوا تھا؟'' تسنیم نے سوچا۔

''کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟ میرا مطلب ہے کسی بات پر آرگیومنٹ؟''

تسنیم پھر چونکی اور سوچ میں پڑ گئی۔ تشویش طلب تھا تقدیم کا یہ پوچھنا۔ مدثر سے اس کے لڑائی جھگڑے یا آرگیومنٹ پر تقدیم کا اظہارِ تفکر ... چہ معنی دارد! بحساب وکتاب تو اسے کیا سارے گھر والوں کو اگر مدثر سے اس کا کوئی جھگڑا ہوا ہوتا بھی تو خوش ہونا چاہیے تھا بغلیں بجانی چاہئیں تھیں۔ مدثر تو دشمنِ خانہ تھا۔

''ہوئی تھی کوئی ایسی ویسی بات؟'' تقدیم نے پھر پوچھا۔

تسنیم پتھر تو نہ تھی کہ بہن اتنی دلسوزی کا اظہار کر رہی تھی اور وہ جواب نہ دیتی۔ اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

''کوئی بات نہیں ہوئی۔'' اب تسنیم کے لہجے میں تعجب تھا۔ اس نے تقدیم کی طرف دیکھنے کی ہمت کی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟'' تقدیم بڑبڑائی۔

''کیسا......؟'' تسنیم نے چونک کر سوچا۔

تقدیم سوچ میں پڑ گئی۔ ''باسٹرڈ!'' وہ زیرِلب بڑبڑائی۔

تسنیم نے سر جھکا لیا، تقدیم، مدثر کو گالی دینے میں حق بجانب تھی۔ اس نے پورے گھر کو آزار پہنچایا تھا لیکن شریکِ جرم تو وہ خود بھی تھی۔

''تمہیں پتا ہے اس نے کیا کیا؟'' تقدیم نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' وہ فقط اتنا ہی پوچھ سکی۔

''تمہیں نہیں معلوم۔'' تقدیم نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' تسنیم کے لہجے میں بے تابی تھی۔ ''میری تو کئی دن سے بات نہیں ہوئی، فون بند مل رہا ہے۔'' اب وہ کھل کر بولی۔

''میں آتی ہوں۔'' تقدیم اٹھ کھڑی ہوئی۔

تسنیم اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھے۔ اضطراب تھا، تشویش تھی۔

''ابھی آتی ہوں۔'' تقدیم نے بعجلت کہا اور دروازے کی جانب رخ کیا۔ اماں کے پاس جا کر تقدیم نے انہیں رپوٹ دی۔ ''لگتا ہے اسے کچھ معلوم نہیں، بتا رہی تھی مدثر سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی نہ کوئی زبانی کلامی جھگڑا، بتا رہی تھی کہ کئی دن سے اسے فون کر رہی ہوں مگر فون بند مل رہا ہے۔''

''تم نے بتایا؟'' اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''نہیں۔''

"ہوسکتا ہے معلوم ہو مگر ظاہر نہ کررہی ہو چھپا رہی ہو۔" اماں نے قیاساً کہا۔

"لگتا تو نہیں کہ ایسا ہوگا۔" تقدیم نے کہا۔

اماں نے سائڈ بورڈ پر دھرا لفافہ اٹھایا اور بغیر کچھ کہے سنے تقدیم کی طرف بڑھا دیا۔

"نہیں اماں...... میں نہیں دے سکتی۔" تقدیم نے صاف انکار کردیا۔

"لائیں مجھے دیں۔" مونس بولا۔

اماں اور تقدیم دونوں نے ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مونس نے اماں کے ہاتھ سے لفافہ لیا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

تسنیم دیکھتی رہ گئی، بھائی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیسی ہو تسنیم؟" مونس تھا تو اس سے چھوٹا مگر ہمیشہ نام لے کر اسے مخاطب کرتا تھا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ آج کیا ہوگیا تھا سب کو۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ اپنے کیے پر ایسی ندامت تھی کہ وہ مونس سے نظریں ملانے، اس کی خیریت دریافت کرنے اور اسے افسر بن جانے کی مبارک باد دینے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ بیٹھ گیا۔ لفافہ آدھا اس کی قمیص کی جیب میں تھا اور آدھا جیب سے باہر، اس نے لمبی سانس کھینچی پھر متحمل لہجے میں بولا۔ "سوری! تم سے ملاقات ہونے میں کچھ دیر ہوگئی۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"ناراض ہو؟"

اس کا سر اور جھک گیا۔

"آئی رئیلی فیل سوری۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

"واپسی کی تیاری کررہا ہوں، منگلا میں پوسٹنگ ہوئی ہے، بلاؤں گا کسی وقت سب گھر والوں کو وہاں۔" اس نے توقف کیا چہار اطراف طائرانہ نظر دوڑائی پھر بولا۔ "زندگی بہت ان پری ڈکٹیبل ہے۔ آپ سوچتے کچھ ہیں ہو کچھ جاتا ہے۔ چاہتے کچھ ہیں ملتا کچھ اور ہے۔ کرتے کچھ ہیں نتیجہ کچھ نکلتا ہے۔"

وہ نظریں نیچے کیے مونس کے جملوں کو حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

مونس اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آبیٹھا۔ اور کچھ دیر یوں خاموش بیٹھا رہا جیسے پُرسا دے رہا ہو پھر اس نے اپنی جیب سے لفافہ نکالا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ "اماں نے مجھے آج ہی سب کچھ بتایا ہے، جو ہوگیا اس کا ماتم کرنا بیکار ہے، بہرحال ہوا برا۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر اس نے کہا۔ "مگر اب جو ہوا ہے وہ اس بھی برا ہے۔"

تسنیم نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوچا اب کیا ہوا تھا۔

مونس نے ایک گہری سانس کھینچی اور ایک ہاتھ سے لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بولا۔ "زندگی میں کبھی کبھی بڑے سخت مقام آتے ہیں، ان سے حوصلے سے گزرنا چاہیے۔"

تسنیم نے مذبذب سی کیفیت میں لفافہ پکڑ لیا۔

"تھا تو تمہارے نام مگر اماں نے کھول لیا تھا۔" مونس نے بتایا۔

تسنیم نے لفافے سے تہ شدہ کاغذ نکالا اور اس پر درج عبارت کی سرخی دیکھتے ہی دم بخود رہ گئی۔ بہت سخت مقام تھا۔ اسے لگا وہ جسمانی اور ذہنی ہر دو اعتبار سے مفلوج ہوئی جا رہی تھی۔ طلاق نامے کا متن یہ تھا کہ مدثر اسے بعض نجی وجوہات کی بنا پر جن کی تفصیل میں جانا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا اسے طلاق دینے پر مجبور ہوگیا تھا۔ طلاق نامے پر مدثر کے دستخط تھے جنہیں وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ دستخط کے نیچے یکے بعد دیگرے تین چھوٹے چھوٹے ترچھے خط کھینچ کر درمیانی خط کے اختتام پر ایک موٹا سا نقطہ ڈال دینا مدثر کی عادت تھی۔ تسنیم یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اسے طلاق دے کر مدثر نے اس سے کس بات کی دشمنی نکالی تھی۔ کس جرم کی سزا دی تھی اسے۔ آخری دنوں میں فون پر اس سے ہونے والی گفتگو سے وہ اتنا تو بخوبی اندازہ کررہی تھی کہ مدثر اپنے ڈیڈی کی ناراضی کے باعث سخت ذہنی دباؤ میں تھا۔ کئی دن سے تو اس نے اپنا فون ہی بند کر رکھا تھا۔

مونس خاموشی سے اس کے ردِعمل کا انتظار کرتا رہا۔ دفعتاً تسنیم نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ مونس کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ شدید جذباتی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ شاید رونا چاہتی تھی مگر رو نہیں پا رہی تھی۔ مونس نے اپنا ہاتھ دوبارہ اس کے سر پر رکھ دیا۔ "کہتے ہیں رونا کسی بھی صدمے کے لیے عمدہ تھراپی ہے۔" مونس نے آہستگی سے کہا۔ "رولو...... اچھی طرح رولو۔"

تسنیم کا سارا وجود بری طرح لرزنے لگا۔ اچانک اس نے زور سے سسکاری لی اور شدید ہیجان کے عالم میں چاروں شانے چت ہوگئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ پاؤں ایڑیوں پر عموداً کھڑے تھے۔ جسم اکڑا ہوا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بند پپوٹوں پر ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ...... وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ مونس گھبرا کر کمرے سے باہر لپکا۔

☆☆☆

اماں، ابا، بہنیں، بھائی سب اس کے کمرے میں اس کے بیڈ کے گرد جمع تھے سب تشویش میں تھے۔ اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں۔ کبھی سر پر پانی انڈیلا جاتا کبھی چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے جاتے۔ کبھی جوتا گیلا کر کے سنگھایا جاتا، کبھی ثابت پیاز کو درمیان سے چیر کر اس کا نصف حصہ ناک کے قریب رکھا جاتا۔ اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ اماں وہیل چیئر پر بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں اور بار بار اس پر دم کیے جا رہی تھیں۔ ساتھ ہی تمہید اور تقدیم کو مختلف ٹوٹکے بھی بتائے جا رہی تھیں۔ گیلا جوتا اور پیاز کاٹ کر سونگھانے کا ٹوٹکا انہوں نے ہی بتانا تھا۔

بالآخر تسنیم کو ہوش آگیا۔ آنکھیں کھول کر لیٹے ہی لیٹے اس نے نقاہت بھری آنکھوں سے دائیں بائیں اور سامنے دیکھا۔ منظر ہی بدل چکا تھا۔ اماں، ابا، چاروں بہنیں اور بھائی اس کے دائیں بائیں اور سامنے موجود تھے۔ اس نے اٹھنا چاہا۔

"لیٹی رہو۔" تقدیم نے اس کے گیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلسوز لہجے میں کہا مگر وہ اپنا دوپٹا سنبھالتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

ابا نے ایک نظر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اماں نے بسنے سے پہلے ہی اجڑ جانے والی بیٹی کا درد اپنے سینے

میں محسوس کیا۔ تقدیم کا دل دکھی ہو رہا تھا۔ باقی بہنیں بھی تسنیم کو دل گرفتگی سے دیکھتی رہیں۔ مونس نے اماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تسنیم کو دلاسا دینے کا اشارہ کیا۔ اماں متامل ہوئیں۔ مونس مصر رہا۔ کارِ آخر اماں نے وہیل چیئر کو حرکت دی اور تسنیم کے نزدیک آٹھہریں۔ دل کی دھڑکنیں جیسے تھمنے لگیں۔ تسنیم کا جھکا ہوا سر اور جھک گیا۔ اماں نے اپنا بازو بڑھایا، تسنیم کا سر اُن کے شانے پر آٹھہرا اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''آہستہ...... آہستہ...... محلے والے سنیں گے۔'' اماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

تسنیم اپنی سسکیاں سینے میں گھونٹنے کی کوشش کرنے لگی اور اماں ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ مونس نے ابا کا ہاتھ پکڑا اور انہیں تسنیم کے نزدیک لا کر ان کا ہاتھ اس کے سر پر دھر دیا۔ ابا نے مزاحمت نہ کی۔ کوئی اور راستہ بھی تو نہیں تھا۔

''اس کمینے سے پوچھو تو اس نے ایسا کیوں کیا؟'' اماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''پوچھ لیں گے اماں پوچھ لیں گے۔'' مونس نے اماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مدثر سے پوچھ گچھ کے لیے تعجیل کی ضرورت نہیں تھی۔ تسنیم کی حالت بہتر ہونے کا انتظار کرنا ضروری تھا۔

''ایک گلاس پانی میں گلوکوز گھول کر دو اسے۔'' اماں نے تعظیم اور تقدیس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

دونوں ایک ساتھ باہر لپکیں۔ اماں تسنیم کے سر پر انتہائی دلسوزی سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ یہ سانحہ اپنے پیش رو سانحے سے شدید تر تھا مگر اس پہلے سانحے کے نتیجے میں تسنیم اور گھر والوں کے مابین پیدا ہو جانے والی خلیج پاٹ رہا تھا۔

☆☆☆

الطاف کی خاموشی امی کو اس کی اور اس کی بہنوں اور بہنوئیوں کی گویائی سے زیادہ ڈرا رہی تھی۔ کہاں تو وہ لوگ دن میں کئی کئی مرتبہ فون پر فون کر رہے تھے کہ رخصتی کی تاریخ دیں اور کہاں یہ خاموشی۔

امی کا دل دن بھر واہموں میں الجھا رہتا۔ حجاب جب تک اسکول سے گھر واپس نہ لوٹ آتی انہیں خدشات ڈراتے رہتے۔ کچھ ایسا ویسا ہو جانے کا اندیشہ انہیں سہمائے جاتا۔ بظاہر حجاب سے خفا تھیں مگر ماں تھیں دن میں بارہا آیت الکرسی پڑھ کر حجاب کا تصور کر کے اس کے گرد حصار باندھتیں مگر جب وہ سامنے آتی تو لاتعلقی کا مظاہرہ کرتیں۔

امی کو الطاف کی خاموشی اس لیے بھی ڈراتی کہ نکاح کے موقع پر حجاب کو چڑھایا جانے والا قیمتی عروسی جوڑا، پچاس تولہ طلائی زیورات اور حجاب کے نام کی جانے والی ایک مربع اراضی کی دستاویز سے اس کے اصل مالک کا اغماض برتنا بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ امی کا دل چغلی کھاتا کہ الطاف کا خاموش بیٹھ جانا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور دکھائے گا۔

☆☆☆

مدثر کا نمبر ملا ملا کر وہ زچ ہو گئی۔ نمبر مسلسل بند ملتا رہا۔ طلاق نامے پر ثبت مدثر کے دستخط اصل ہونے کا یقین کر لینے کے باوجود وہ اس گمان میں تھی کہ شاید کوئی جواز اس کی تقدیر بدل دے گا۔ مدثر کا نمبر مسلسل بند ملنے پر اس نے اپنا موبائل بستر پر دے مارا۔ فتنہ گر یہ ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے درمیان سما جانے والی مستطیل ہی تو تھی۔ رات رات بھر نہیں سونے دیتی تھی مدثر کی طرف سے آنے والے پیغامات کی بیپ اسے۔ ایک کے بعد

دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ جوابی پیغامات بھیج بھیج کر اس کی اپنی انگلیاں بھی تھک جایا کرتی تھیں۔ نہیں...... غلط...... انگلیوں کے تھکنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ عجیب نشہ تھا، اُدھر سے پیغام اِدھر سے جوابی پیغام...... انگلیاں کھٹا کھٹ چلتی تھیں۔ بٹن پیڈ پر اس دو طرفہ کھیل میں ساری ساری رات جاگتے گزر جاتی تھی۔ یونیورسٹی جاتی تو کلاس میں اونگھتے گزرتی۔ اور یونیورسٹی میں بھی کلاس روم سے نکلتے ہی یہ مستطیل ڈبیا پھر بیگ سے نکل آتی۔ پھر پیغام اور جوابی پیغام ''کہاں ہو؟ لابی میں ملتے ہیں، کہیں چلتے ہیں۔'' مدثر کیسے کیسے رومانی پیغامات بھیجا کرتا تھا اور اشعار...... خدا جانے کہاں سے چھانٹ چھانٹ کر نکالا کرتا تھا۔ کبھی اس کی زلفِ گرہ گیر کی تعریف کبھی کاجل بھری آنکھوں کا قصیدہ۔ کبھی نزاکتِ لب کو بہ زبانِ شاعر گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ تو کبھی جامہ زیبی کی مدح میں زمین آسمان کے قلابے......! مدثر کی مدح سرائی اور مبالغہ آرائی نے اس کا نخرہ دو چند کر دیا تھا۔ گھر تو گھر باہر بھی وہ لوگوں کو جوتے کی نوک پر رکھنے لگی تھی مگر مدثر کے لگائے ہوئے ایک ہی چرکے نے اس کے سارے نخرے کا جنازہ نکال دیا تھا۔ وہی روپہلے کناروں والا سیاہ مستطیل موبائل جو اپنی حشر سامانیوں کے باعث کبھی اسے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے بڑھ کر عزیز ہوا کرتا تھا۔ اس وقت ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تفسیر بنا بستر پر اس کے پیروں کے نزدیک پڑا بہ زبانِ شاعر گلہ کر رہا تھا۔

یہ تیرا شہر، ترے شہر کی یہ ریت ہے کیا
کسی انجان کو خود اپنا بنانا اے دوست
اور پھر خود ہی گرا الطاف و عنایت کر کے
اک سلوکِ ستم آگیں سے مٹانا اے دوست

سلوکِ ستم آگیں تو مدثر نے کیا تھا اس کے ساتھ! موبائل کا دل تو نہیں تھا جو ٹوٹ گیا ہوگا۔ مدثر کے سلوک نے تو اس کا دل پارہ پارہ کر دیا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی اور اس نے اپنا موبائل آف کر رکھا تھا۔ بے مروت! بے وفا!

دو دن بعد اس کا پیغام موصول ہوا۔ ''پیپرز مل گئے؟''

اس نے جوابی کارروائی کے بجائے بے تابانہ اس کا نمبر ملایا۔ فون آن تھا مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی...... دغا باز! کال ریسیو کرنے کا روادار بھی نہ رہا تھا۔

''کون سے پیپرز؟'' اس نے کال کا جواب نہ ملنے پر جوابی پیغام بھیجا اور تجاہل سے کام لینے کی کوشش کی۔

''ڈیوورس کے۔''

بے رحم! اسے مدثر کی سفاکی پر غصہ بھی آیا رنج بھی ہوا۔ اب تجاہل سے کام چلانے کی کوشش گویا خود کو دھوکا دینے کے مترادف تھی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا مدثر؟'' یہ ٹیکسٹ میسج لکھتے ہوئے اس کی آنکھیں ہی نہیں دل بھی رو دیا۔ جن دنوں مدثر سے اس کا افیئر چل رہا تھا اپنی ایک کال ریسیو نہ کیے جانے پر وہ دیوانگی سی ناراضی دکھانے لگتا تھا۔۔ اور اب ایسی بے اعتنائی۔

''ڈیڈی راضی نہیں ہوئے۔'' جوابی پیغام آیا۔ اس کے جواب نے تسنیم کو تپا دیا۔

''تو پہلے ڈیڈی سے مشورہ کرلیتے نا۔''

''میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

'' کچھ احساس ہے تمہیں کہ کیا کیا ہے تم نے...... میری زندگی برباد کرکے رکھ دی۔''

''نو آرگیومنٹ پلیز۔'' تمہارا اور میرا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔''

وہ سامنے ہوتا تو شاید وہ اس کا گریبان تار تار کردیتی۔ کیسا دغاباز انسان تھا۔ اور منافق بھی۔ کورٹ میرج کے بعد تقدیم کے یونیورسٹی آنے پر اس نے نادر کے گھر میں اس کے سامنے جس طرح اعتراف خطا کیا تھا اس سے تو یوں لگتا تھا جیسے بباطن وہ ایک باضمیر انسان ہوگا لیکن وقت نے ثابت کردیا تھا کہ غلط کار کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا وہ صرف اپنی خواہش کا غلام ہوتا ہے، وقتی طور پر اپنے اوپر ملمع چڑھا بھی لے تو جلد یا بدیر اپنی اصلیت ظاہر کرکے رہتا ہے۔ مدثر نے اپنی اصلیت ظاہر کرنے میں کچھ زیادہ ہی عجلت دکھائی تھی۔

☆☆☆

عجلت مونس کو بھی تھی۔ اسے اپنے مقامِ تعیناتی پر پہنچ کر فرائض منصبی سنبھالنا تھے، وقت کم تھا۔ جانے سے پہلے وہ گھر کے معاملات کو ممکنہ حد تک بہتر کرجانا چاہتا تھا۔ منگلا سے جلدی جلدی کراچی آنا جانا آسان تھوڑی تھا۔ چنانچہ وقت ضائع کیے بغیر اس نے اگلے ہی روز تسنیم سے مدثر کے گھر کا پتا معلوم کرنا چاہا۔ تسنیم اس کے استفسار پر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''اس کا ایڈریس دو مجھے۔'' مونس نے کہا۔

''کیوں بیٹا؟'' ابا کا ماتھا اس کے پہلی بار استفسار پر ہی ٹھنک چکا تھا۔

''ملنا چاہتا ہوں اس سے اور اس کے گھر والوں سے۔''

''لیکن کیوں؟''

''ابا بزدلوں کی طرح چپ چاپ تو ہو کر نہیں بیٹھنا۔''

''کیا کروگے؟'' اماں کے لہجے میں تشویش تھی۔

''پوچھنا تو چاہیے اتنی بڑی خباثت کیوں دکھائی گئی۔''

''فائدہ......؟''

''جسے زخم لگتا ہے نا ابا وہ جوابی حملہ کرتے ہوئے دشمن کو اڑا دینے کی نیت تو رکھتا ہی ہے اپنی بقا یا فنا کی پروا بھی نہیں کرتا۔'' اس کا لہجہ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہن کی بربادی کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

''نہیں بیٹا نہیں...... میں تمہیں کسی خطرے میں پڑنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔''

''فوجی ہوں ابا...... خطروں سے نمٹنا سکھایا گیا ہے مجھے۔''

ابا پریشان دکھائی دینے لگے۔ وہ مسکرا دیا۔

''پریشان نہ ہوں، شیر مردار کو صرف کراہیت کے اظہار کے لیے سونگھتا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''ابا ایسے مرداروں کو کراہیت ظاہر کیے بغیر چھوڑ دینا ان کی بے ضمیری کو بڑھاتا ہے۔ انہیں آئینہ دکھانا ضروری ہوتا ہے ورنہ آج انہوں نے ہمارے ساتھ دو ہاتھ کیے ہیں کل کسی اور شریف گھرانے کا دل دکھائیں

گے۔ یہ ایسے ہی ہوتے ہیں ابا...... ننگِ انسانیت۔''

''چھوڑو بیٹا...... کیچڑ میں پتھر پھینکو تو اپنا ہی دامن آلودہ ہوتا ہے۔''

''اپنا دامن آلودہ ہونے کے ڈر سے خاموش تماشائی بن کر کھڑے رہنا بھی تو درست نہیں ابا۔''

''کیا کروگے؟''

''اس کا گریبان پکڑ کر ایک مرتبہ جھنجوڑ کر اس کے منہ پر تھوکنے کو جی چاہتا ہے میرا...... اس نے میری بہن کو برباد کیا ہے، میرے خاندان کو ذلیل کیا ہے۔'' تسنیم کا جی بھر آیا۔

''بیٹا اپنا سکہ کھوٹا تو پرائے کو کیا دوش۔'' اماں نے کہا۔

تسنیم کو دکھ ہوا، شرمندگی محسوس کی مگر اماں غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں، جو ہوا اس میں وہ بھی تو برابر کی شریک تھی۔ رہا انجام تو ایسی باتوں کا نتیجہ بالعموم دل فگار ہی ہوتا ہے۔

''ہاں بھئی کہاں رہتا ہے وہ؟'' مونس نے ایک مرتبہ پھر تسنیم سے پوچھا۔

اماں دھیرے سے کھنکھاریں اور انہوں نے آہستہ سے تسنیم کا ہاتھ دبایا۔ اس نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تنبیہہ کی کہ نہ بتائے۔

''پتا نہیں۔'' اس نے مردہ سی آواز میں مونس کو جواب دیا۔

اسے یقین نہ آیا، یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ وہ مدثر کے بارے میں یہ نہ جانتی ہو.... کہ وہ کہاں رہتا تھا مگر یہ کسی حد تک سچ بھی تھا۔ مدثر اسے اپنے گھر لے ہی کب گیا تھا۔ کورٹ میرج سے قبل اسے اپنے ساتھ گاڑی میں گھماتے پھراتے ہوئے دو تین مرتبہ اس نے دور ہی دور سے اس کوٹھی کا نظارہ کرایا تھا جس میں وہ اپنے والدین، اور بھائیوں کے ساتھ رہا کرتا تھا اور جس میں بقول اس کے منعم اور اس کی بھگوڑی بیوی عیش کیا کرتے تھے۔ اس کوٹھی کی مکین بنانے کے خواب دکھاتے دکھاتے مدثر اسے بھی کتنی دور لے گیا تھا۔ اتنی دور جہاں وہ اپنا آپ کھو بیٹھی تھی۔ کتنی عاقبت نا اندیش ہوتی ہیں تسنیم جیسی لڑکیاں جو اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو تسکین دینے کے لیے غیر اخلاقی سودے کر بیٹھتی ہیں۔ اور کبھی کبھی تو پوری زندگی کا سودا...... اور انجامِ کار خالی ہاتھ رہ جاتی ہیں...... تسنیم کی طرح...... جس کی آنکھوں میں اب خوابوں کی جگہ آنسو تھے اور دل میں خواہشوں کی جگہ پچھتاوا...... مونس کو خدا نے اس کڑے وقت میں اس کی ڈھال بنا کر بھیج دیا تھا۔ وہ منجدھار میں اس کا کھیون ہار بن گیا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ اپنی خود غرضی اور تنک مزاجی کے باعث اس نے مونس کو کبھی وہ محبت، عزت اور اہمیت دی ہی نہیں تھی جو اسے باقی چاروں بہنوں کی طرف سے ملا کرتی تھی بلکہ وہ تو اماں، ابا اور اپنے علاوہ باقی بہنوں کو مونس کی ناز برداریاں کرتے دیکھ کر ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ کوئی آسمان سے اتری مخلوق تھا جو وہ صبح ناشتے میں اس کے لیے فرنچ توس بنانا، اس کے کپڑوں پر کلف لگانا پھر دھوبیوں کی سی بے شکن استری کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ سرخاب کے پر تو نہیں لگے تھے اس کے کہ اس کے بستر کی چادر بھی ہر دوسرے دن تبدیل ہونا لازم تھی۔ تسنیم کو لگ رہا تھا کہ مونس تو اس سے بھی زیادہ کا حقدار تھا۔ کتنی لاچار ہوتی ہوں گی وہ بہنیں جن کے مونس کی طرح کے بھائی نہیں ہوتے۔ مونس نے صرف اسی کو نہیں گھر کے تمام افراد کو جذباتی سہارا دے کر احساس دلایا تھا کہ ماں باپ بیٹوں کی اور بہنیں، بھائیوں کی تمنا کیوں کرتی ہیں۔ محبت کے نام پر تسنیم نے جو ٹھوکر کھائی تھی اس کے گھاؤ نے اسے خود احتسابی کی منزل پر لے جا کھڑا کیا تھا۔ اس منزل سے گزرتے ہوئے

اوراس منزل سے گزرنے کے بعد بھی اسے ہر قدم نہایت احتیاط سے اٹھانا تھا۔ وہ مونس کی شکر گزار تھی کہ اس کڑے وقت میں گھر میں اس کی موجودگی نے اس کے لیے دمِ عیسیٰ کا سا کام کیا تھا۔ طیش، نفرت اور طعن و تشنیع کے بجائے اس نے انسانی کمزوریوں سے تحمل، نرمی اور درگزر سے کام لیتے ہوئے سمجھوتا کر کے اسے راندۂ درگاہ بننے سے بچا لیا تھا۔ اماں اور ابا تو اسے ایک بار اپنے گھر سے رخصت کر دینے کے بعد پھر کبھی اس کا منہ نہ دیکھنے کا فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔ شاید مدثر کا طلاق دینا انہیں اس سے اور بھی دور کر دیتا۔ مونس نے اسے دوبارہ اپنوں کے سینے سے لگا دیا تھا۔

''جیتے رہو بھائی...... سدا خوش رہو۔'' مدثر کی دغابازی کا اسے ملال تھا مگر اپنی دل شکستگی کا بدلہ لینے کے لیے وہ مونس کو مدثر کے گھر کا راستہ دکھا کر اسے کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ نہ بھی کیا ہوتا تو وہ مونس کو مدثر کے گھر کا پتا نہ بتاتی۔

''حیرت ہے۔'' مونس نے مدثر کے گھر کے بارے میں اپنے استفسار پر تسنیم کی عدم واقفیت سے تعجب کا اظہار کیا۔ اس کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات چغلی کھا رہے تھے کہ تسنیم کے جواب پر اسے یقین نہیں آیا تھا۔

بھائی ہونے کے ناتے مونس کو تسنیم سے اگلا سوال کرنا دشوار محسوس ہوا مگر کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

''تو...... پھر اس نے...... کہاں...... رکھا تمہیں؟''

''دوست کے گھر......؟'' تسنیم نے سر جھکا کر نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔

مونس دم بخود رہ گیا۔ تسنیم کو ملامت کرنے کو جی چاہا کہ کیسی بے وقوف تھی وہ، آنکھ بند کر کے اپنی زندگی اور گھر کی عزت داؤ پر لگا آئی تھی۔ مگر وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ یہ ملامت کا موقع نہیں تھا۔ لغزش کھائی بہن کو قعرِ مذلت سے نکال کر اصلاحِ احوال کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی مونس کے پاس وقت کم تھا۔ پہلی پوسٹنگ تھی، مقامِ تعیناتی پر وقت سے پہلے پہنچنا اور بروقت اپنے فرائضِ منصبی سنبھالنا ضروری تھا۔ کارِ جہاں دراز ہے...... بشرطِ زندگی مدثر سے دو ہاتھ پھر کبھی سہی۔

فی الحال یہی بہت تھا کہ زندگی پھر سے چل پڑی تھی۔ گو پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ حادثہ بہت شدید تھا۔ دلوں کے آئینے گرد ہو گئے تھے لیکن صد شکر کہ زندگی نظر چراتی، لڑکھڑاتی ہوئی سہی پھر سے پا بہ رکاب تو ہوئی تھی۔ مونس وسیع النظری سے کام نہ لیتا اور اتنی کشادہ دلی سے انسانی خطا کو درگزر نہ کرتا۔ بہن کی لغزش کو اپنی عزت کا اور انا کا مسئلہ بنا کر ردِعمل میں مزید بگاڑ اور مسائل پیدا کرنے کے بجائے معاملہ فہمی سے حالات کو سنوارنے کی کوشش نہ کرتا تو شاید تسنیم کمرے ہی میں محصور رہتی اور باقی گھر والوں کو روگ لگ جاتا۔ مونس نے جوش سے نہیں ہوش سے کام لیا تھا۔ اکیڈمی میں اس کی جذباتی تربیت زندگی کے اس غالباً تلخ ترین معرکے میں بھی بہت کام آئی تھی۔ چوٹ کھا کر بکھر جانا تو مردانگی نہیں، زخم کھا کر خندہ پیشانی اور استقامت کا مظاہرہ کرنا اصل بہادری ہے۔

☆☆☆

گھر کے حالات مزید بہتر کرنے کے لیے مونس نے اپنی منگلا روانگی سے ایک روز قبل گھر والوں کو اپنی کامیابی کے سلسلے میں ٹریٹ دی۔ برنس روڈ کے سیخ کباب، دہی بلے، شیر مال اور ربڑی...... بہنوں نے مل جل کر

رمضان اور تیاریاں

رمضان شروع ہونے سے پہلے ہی اس کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں لیکن اس استقبال کی کئی قسمیں ہیں اور استقبال کرنے والوں کی بھی۔ کچھ لوگ صرف عبادتوں اور نیکیوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور کچھ لوگ یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ اس سال افطار پارٹی میں کن کن دوستوں کو مدعو کیا جائے۔ پارٹی میں لوازمات کیا کیا رکھے جائیں۔ روزانہ افطار میں کیا کیا پکے گا کیونکہ بھئی ظاہر ہے روزہ رکھیں چاہے نہ رکھیں افطاری تو بنے گی نا ورنہ لوگ کیا کہیں گے ان کے گھر تو افطاری ہی نہیں بنتی۔ کچھ خواتین ایسی بھی ہوں گی جن کو صرف اور صرف کپڑوں کی فکر ہوگی کہ کپڑے رمضان شروع ہونے کے بعد ہی سلوائیں تاکہ کپڑا اور سلائی کا ڈیزائن بالکل نیا ہو۔ کچھ لوگ جو اللہ کے نیک بندے اور بندیاں ہیں وہ اس مقدس مہینے کو زیادہ سے زیادہ عبادت میں گزارنے کی فکر میں ہوں گے اور خدا سے دعا کر رہے ہوں گے کہ خدا ہمیں ہمت، طاقت اور توفیق عطا کرے کہ ہم اس فرض کو خوش اسلوبی سے ادا کر سکیں۔

مرسلہ: مسز شمع حسین، ٹورنٹو

بڑے چاؤ سے دسترخوان سجایا۔ ٹریٹ محض بہانہ تھی مل بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا۔

''تم بتا دیتے تو ہم گھر میں بھی کچھ بنا لیتے۔'' تمہید نے کہا۔

''کیوں یہ کم ہے کیا؟'' مونس نے اپنی لائی ہوئی چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔

''نہیں، نہیں...... بہت ہے۔'' تمہید گھبرا کر بولی۔ تقدیم مسکرائی اور اس نے موقع پر موجود ہوتے ہوئے حسبِ عادت تمہید کی اعانت کرنی چاہی۔

''بھئی سمجھا کرو تمہید کا مطلب ہے تمہاری ٹریٹ کے مینیو میں ان کی طرف سے بھی بریانی، کباب، کھیر وغیرہ کا اہتمام ہو جاتا۔''

''آج آپ کی چھٹی ہے۔'' مونس نے تمہید کو دیکھا پھر دلسوزی سے بولا۔ ''بندے کو کبھی آرام بھی کرنا چاہیے۔''

تمہید کا دل بھر آیا۔ دن رات کام کر کے وہ واقعی تھک چکی تھی۔ جب سے اماں بیمار ہوئی تھیں سارا گھر ہی اس پر آ گیا تھا۔ اب تو برسوں ہو گئے تھے کولھو کے بیل کی طرح وہ دن بھر محوِ کار رہتی۔ کبھی ایک کام کبھی دوسرا۔ رات کو آخری کام اماں کو دودھ کا گلاس دینے کے بعد وہ بستر پر لیٹتی تو اس کی آنکھوں میں نیند سے پہلے اک سیل رواں اتر آتا۔ کتنی بے رنگ اور بے مزہ تھی اس کی زندگی۔ بے مقصد یوں نہیں کہ وہ گھر کے ہر فرد کے لیے راحت رساں بنی ہوئی تھی۔ تسنیم کے واقعے نے اسے بہت سہما دیا تھا۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے تسنیم نے اٹھنا چاہا۔ مونس بولا۔ ''بیٹھو بیٹھو کل تو میں چلا ہی جاؤں گا۔''

اماں کا دل دکھنے لگا۔ ''اب کب آئے گا میرا بچہ؟'' انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"جب چھٹی ملی۔"
"اور چھٹی کب ملے گی بھائی؟" تقدیس کے لہجے میں پیاس تھی۔
"جب تم نے یاد کیا۔"
"پھر تو میں روز یاد کیا کروں گی۔"
"یار لمبی چھٹی ہی نہ کرا دینا کہیں۔" مونس مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر تقدیس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولا۔
"بہنوں کی دعائیں ہونی چاہئیں...... انشاءاللہ آتا رہوں گا۔"
اماں اپنے سوتی دوپٹے سے اپنی آنکھیں تھپتھپانے لگیں۔
"آتا رہوں گا...... آتا رہوں گا۔" مونس نے اماں کو تسلی دینی چاہی۔
"جہاں رہو خوش رہو...... کبھی گرم ہوا کا جھونکا بھی نہ چھوئے تمہیں۔"
"جس کے ساتھ ماں کی دعائیں ہوں اسے گرم ہوا کا جھونکا کیسے چھو سکتا ہے اماں......" مونس نے اپنا بازو اماں کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے کہا۔
"دن رات جھولی پھیلائے اپنے اللہ سے دعائیں مانگتی رہتی ہوں، تمہارے لیے۔" اماں نے بہت پیار سے اپنا ہاتھ مونس کے چہرے پر پھیرا۔ دفعتاً مونس نے اپنا روئے سخن تسنیم کی جانب کر کے ایک ایسا سوال کیا جس نے سبھی کو چونکا دیا۔
"یونیورسٹی کب سے جا رہی ہو؟"
تسنیم سن رہ گئی۔ یہ کیا سوال کر دیا تھا مونس نے...... دل دکھانے...... اور اہلِ خانہ کے سامنے شرمندگی سے دوچار کرنے والا...... اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری تھی اس نے۔ اس کی خطا پہاڑ جیسی تھی مگر زخم بہت گہرا' اندمال ممکن ہی نہ تھا۔ یونیورسٹی جانے کے لیے حوصلہ کہاں سے لاتی...... وہاں دشمنِ جان کا گزر بھی تو تھا۔ کیا عجب کہ اس نے اپنے دوستوں میں سے کسی کو بتا ہی دیا ہو۔ بات پھیل گئی ہوگی۔ کیونکر سامنا کر پائے گی وہ لوگوں کا۔ اس کی اپنی دوستوں نے تو اس کا فون بند ملنے یا پھر کھلا ہونے کی صورت میں کال ریسیو نہ کیے جانے سے گویا یہ باور کر لیا تھا کہ وہ اس دنیا ہی میں نہیں رہی تھی۔ توفیق ہوئی کسی کو خیر خبر لینے دینے کے لیے گھر آنے کی...... ویسے اچھا ہی ہوا جو نہیں آئیں...... دو دن پہلے تک تو گھر کا منظر ہی اور تھا۔ وہ خود کمرے میں محصور اور گھر والے اس سے کچھ کھنچے کھنچے...... خدا خوش رکھے مونس کو جس نے دیوارِ قفس میں ایک روزن وا کر کے ڈری، سہمی اور ایک مقام پر ٹھہری زندگی کو دوبارہ چل پڑنے کی تحریک دلائی تھی۔
"یونیورسٹی میں تو وہ منحوس بھی ہوگا۔" اماں بولیں۔
مونس یوں چونکا جیسے کسی فاش غلطی کا احساس ہوا ہو۔ "ارے میں اسے یونیورسٹی جا کر بھی تو پکڑ سکتا تھا۔"
"دفع کرو...... اس کمبخت کی تو کبھی صورت بھی نہ دکھائے تمہیں اللہ۔" اماں نے فوراً کہا۔
"صبح روانگی نہ ہوتی تو میں کل ہی تسنیم کے ساتھ یونیورسٹی جاتا اور اسے یہ بتانے کے لیے کہ وہ تسنیم کو اکیلا اور ہمیں مردہ نہ سمجھے۔"
"اللہ پر چھوڑ دو بیٹا۔" ابا بولے۔ "تم دیکھنا تو اس کا کیا انجام ہوگا۔"
"انشاءاللہ!" اماں نے تائید کی۔

مونس نے تسنیم کی جانب دیکھا۔ "اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کرو۔"
"گھر بیٹھ کر پڑھے۔" اماں نے کہا۔
"کیوں!" مونس چونکا۔ "گھر بیٹھ کر کیوں؟"
"کہا تو ہے وہ بھی ہوگا وہاں۔"
"ہونے دیں...... کیا فرق پڑتا ہے، یونیورسٹی اس کے باپ کی جاگیر تو نہیں۔"
"تنگ کرے گا اسے۔"
"سامنا بھی نہیں کر سکے گا...... منہ چھپاتا پھرے گا۔"
"ارے بیٹا مرد ہے...... اسے بھلا کس بات کی شرم، اس کا بگڑا ہی کیا ہے، بگڑا تو ہمارا ہے۔" اماں کے لہجے میں تلخی تھی۔ مرد اور عورت میں عدم مساوات رکھنے والی دنیا کے خلاف احتجاج تھا۔ تسنیم کا سر جھک گیا۔
"گھر سے باہر بات نکل جائے تو کسی کو منہ دکھانے جوگے نہیں رہیں گے ہم۔"
"اماں! آپ پریشان نہ ہوں۔" مونس نے اماں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔
"پریشان کیوں نہ ہوں بیٹا۔ ایک دو نہیں پانچ بیٹیوں کا وزن دھرا ہے سر پر۔ اللہ نہ کرے کسی کو سن گن بھی مل گئی تو لوگ بھولے سے اس گھر کی بیٹی لے جانے کا نہیں سوچیں گے۔"
تسنیم کا سر جھک گیا۔
"اماں خاندانوں.... میں اس سے کہیں بڑے حادثات ہو جاتے ہیں، لوگ زندہ بھی رہتے ہیں اور زندگی کے تمام معاملات بھی چلتے ہیں۔" مونس نے کہا۔
"بات یہ ہے کہ حادثات سے بچا کیوں نہ جائے۔" ابا بولے۔
تسنیم کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔
"آج جو بھی رویا اسے جرمانہ دینا ہوگا۔" مونس نے تسنیم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر روئے سخن ابا کی طرف کیا اور بہنوں کو ایک طائرانہ نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابا یہ ہم بھائی بہنوں کا وعدہ ہے آپ سے اور اماں سے کہ آئندہ کبھی آپ دونوں کو ہم میں سے کسی سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"
"دل تو تم نے بھی دکھایا ہے بیٹا۔" اماں کی اس بات پر مونس سمیت تمام اہلِ خانہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔
"کیسے کیسے خواب دیکھے تھے میں نے تمہارے اور خوش بخت کے لیے...... تم نے میرے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میرے ماں باپ کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔" مونس شرمندہ دکھائی دینے لگا۔

☆☆☆

امی کو الطاف کی خاموشی سے جو خدشہ تھا وہ عریاں ہو کر سامنے آ ہی گیا۔ اس نے فون پر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "بس آنٹی بہت ہو گیا۔ آپ کی وجہ سے اتنے دن چپ رہا اب میں جانوں اور حجاب۔"
"بیٹے ہم سب کوشش کر رہے ہیں اسے سمجھانے کی۔" امی نے نرمی سے کہا۔
"چھوڑیں آنٹی۔" اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ "یہ کوئی تیسری جنگِ عظیم روکنے کا معاملہ ہے جو آپ

لوگوں کو اس مسئلے کو حل کرنے میں اتنا وقت لگ رہا ہے۔ کب سے یہی ایک بات سن رہا ہوں کہ سمجھا رہے ہیں، سمجھا رہے ہیں۔"

"بیٹا! تھوڑا سا ٹائم اور دو۔" امی نے موقع کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے لہجے میں حد درجہ لجاجت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ چپ رہا۔

"بس تھوڑی سی مہلت اور......؟" امی گڑبڑا ہی تو گئیں۔

"صرف ایک ہفتہ......" اس نے مشروط انداز میں کہا۔ "اگر وہ سمجھ جاتی ہے تو ٹھیک ورنہ میں اس کا نخرہ مزید برداشت نہیں کروں گا۔ مجھے نمٹنا آتا ہے۔ مشکل ہوجائے گا اسے پولیس اور عدالت کو جواب دینا کہ بھاری حق مہر، پچاس تولہ زیور اور مربع اراضی اپنے نام لکھوانے کے بعد وہ حقِ زوجیت ادا کرنے سے کیوں انکاری ہے۔"

"بیٹا تمہاری ایک، ایک چیز امانت ہے۔"

"حجاب کی نیت میں خیانت ہے۔ مجھے چیزوں کی نہیں اپنی عزت کی فکر ہے۔ میری عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے اپنے بہن بھائیوں کے سامنے بھی اور دوسرے لوگوں کے سامنے بھی۔ جب آدمی کی اپنی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہونا آنٹی تو پھر آدمی کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔"

حجاب سے اپنی خاموشی توڑ کر امی کو اس سے بات کرنا پڑی۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی اور امی کے چپ ہونے پر بولی۔

"وہ کیا سمجھتا ہے، اس کی دھمکیوں سے ڈر جاؤں گی میں۔" امی کو اس کی ہٹ دھرمی پر تاؤ آگیا۔

"پیسہ ہے اس کے پاس سب کچھ کرسکتا ہے۔ دھمکی مت سمجھو، وہ تھانہ کچہری کرنے پر آگیا نا تو ہمیں اپنی عزت بچانی مشکل ہوجائے گی۔"

"وہ کیا جائے گا تھانہ کچہری...... میں اس سے پہلے کچہری جاؤں گی۔" اس نے توقف کیا پھر بولی۔ "اس سے پہلے کہ وہ مجھے تھانہ کچہری میں گھسیٹے میں خود مدعی بن جاؤں گی۔"

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔" امی نے غصے سے کہا۔

"بتا رہی ہوں آپ کو تاکہ آپ بعد میں گلہ نہ کریں۔ کل میں کورٹ جاؤں گی اور اس سے خلع کا مقدمہ دائر کروں گی۔"

امی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ "تم مجھے زندہ رہنے دو گی یا نہیں۔"

"اوہو امی، اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو افراد کا کوئی تنازعہ کوئی جھگڑا ہو تو جو پہلے تھانہ کچہری پہنچ جائے وہ مدعی ہوتا ہے دوسرا ملزم۔ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں گھر بیٹھ کر اس کے مدعی اور اپنے ملزم بننے کا انتظار کروں۔ جب میں کورٹ میں اپنا یہ بیان جمع کراؤں گی کہ ہم اس کا پچاس تولہ سونا اور مربع اراضی واپس کرنے کو تیار ہیں تو پھر اس کے ہاتھ میں کون سا پتا رہ جائے گا ہمارے خلاف۔"

"پہلے کوئی عورت ہمارے خاندان کی گئی ہے کورٹ۔" امی نے اسے گھورا۔

"مجھے اس سے غرض نہیں۔ میں جاؤں گی۔"

"نایاب کو بلاتی ہوں، بتاتی ہوں اسے۔"

"کسی کو بلانے اور کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے سب کو۔ ہر ایک کو بس اپنی عزت کی پڑی ہے، کسی نے مجھے تسلی دینے میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ کسی نے ایک مرتبہ بھی یہ کہا کہ اس شخص نے غلط کیا، مکاری دکھائی، دھوکا دیا۔ دوسروں کے جھنڈے اونچے رکھنے کی خاطر میں گمنام سپاہی کی موت کیوں مروں۔ اور نہ ہی میں کسی کی سنوں گی۔"

"جاؤ ابھی جاؤ۔ کل کا انتظار کیوں کرتی ہو۔" امی نے چلا کر کہا۔

"مجبوری ہے۔ وقت نہیں رہا ورنہ ابھی جاتی۔" حجاب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"پتا چل جائے گا کہ کتنا دم خم ہے تم میں...... انسان حق پر بھی ہو تو یہاں انصاف بکتا ہے۔ الطاف میں اتنا دم خم ہے وہ انصاف خرید سکتا ہے۔"

اس نے امی کو بے یقینی سے دیکھا۔ "یہ آپ کہہ رہی ہیں، آپ... جو ہمیں ساری زندگی حق کے لیے لڑنا اور کسی بھی حال میں حوصلہ نہ ہارنا سکھاتی رہیں۔ آپ تو ایسا نہ کہیں۔"

"زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔" امی بولیں۔

"جانتی ہوں۔"

"کانٹوں سے دامن بچا کر گزرنا چاہیے۔"

"اسی کوشش میں ہوں۔"

امی اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہ دھیرے سے مسکرادی۔ امی کی ابروئیں تن گئیں۔ اس نے ان کے نزدیک جا کر اپنی بانہیں بہت پیار سے ان کے گلے میں حمائل کردیں۔ چند لمحے انہیں بھرپور محبت سے دیکھتی رہی پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ "ایسا کیوں ہے امی؟" وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔ "تھیوری آپ نے سمجھائی اور جب اسے عملاً آزمانے کا موقع آیا تو آپ کہتی ہیں چھونا مت پتھر کے بن جاؤ گے، کیوں امی؟ ایسا کیوں! ہمیں کمزور ہی رکھنا تھا تو مضبوط کیوں بنایا؟" اس نے توقف کیا پھر سر جھکا کر بے حد دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "کسی اور کی خاطر نہیں صرف آپ کی خوشی کے لیے میں...... میں بسمہ سے کیا ہوا وعدہ توڑنے اور وعدہ وفا نہ کرسکنے کے کفارے میں اس پل صراط سے گزرنے کو تیار ہوں لیکن...... میرے لیے زندگی وہ نہیں رہے گی جو مجھے آپ سے ملی تھی۔" دفعتاً اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

امی نے اسے یونہی اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ جیسے کبھی کھیلتے کھیلتے چوٹ لگ جانے پر وہ امی کے پاس آتی تو وہ اس کی تکلیف میں افاقہ دینے کی خاطر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا کرتی تھیں۔ اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے اسے بچوں کی طرح چمکارا اور بولیں۔ "رو مت میرے بچے...... میں تیرے ساتھ ہوں۔"

اس نے امی کے سینے میں دبکا اپنا سر نکالا اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے امی کو بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ امی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اطمینان دلایا۔ ان کے نرم و گداز ممتا بھرے سینے میں دوبارہ اپنا سر دبکا کر وہ پہلے سے بھی زیادہ بلک بلک کر رونے لگی۔

(باقی آئندہ)

مکمل ناول

روشن جگنو اور جل پریاں

عنیزہ سید

انہوں نے اس لڑکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا جو ایک بڑے سے پتھر پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی تھی۔ اس نے سیاہ جینز پر کھدر کی نیلی قمیص پہن رکھی تھی جو اس کے گھٹنوں سے نیچے تک ڈھلک رہی تھی۔ سرخ موٹی جیکٹ اور سرخ اسکارف کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ شاید سرخ رنگ ڈھلتے سورج کی روشنی سے منعکس ہو کر اس کے چہرے پر اپنا عکس ڈال رہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے

بے اختیار مسکرائے تھے۔ ان کے ارد گرد چہل پہل اور شور وغل تھا اور اس چہل پہل کے درمیان اکیلی بیٹھی یہ لڑکی جو قدرے خفا سی معلوم ہو رہی تھی انہیں بہت دلچسپ لگی۔ لڑکی نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی جو یوں غور سے دیکھے جانے کا اسے ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ لڑکی کی بے نیازی پر مسکرائے اور پھر انہوں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ اس کیمپنگ ویلیج میں دور دور تک چھوٹے چھوٹے ٹینٹ نصب تھے جو اب ڈھلتی سہ پہر کی ہواؤں کے سنگ ہولے ہولے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ یہ جگہ دنیا کی چھت کہلاتی تھی جہاں جولائی کے دوسرے ہفتے کا آغاز انتہائی جوش وخروش اور ہلے گلے کے ساتھ ہوتا تھا۔ بابر کمال ہر سال جولائی میں یہاں موجود ہوتے تھے۔ ان کے ہر سال یہاں آنے کی دو ٹھوس وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ ہارس پولو کے جنونی شیدائیوں کی فہرست میں شامل تھے، دوسرے سال کے اس مخصوص حصے میں اپنی زندگی کے معمول کی روٹین سے ہٹ کر کچھ دن اس خوب صورت جگہ پر گزارنا ان کے نزدیک سال بھر کی واحد عیاشی تھی۔ انہیں گلگت، چترال اور شندور سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، وہ ان علاقوں کے چپے چپے سے واقف تھے۔ اس جگہ پر ہر سال گزرے آٹھ دن اور سات راتیں ان کے لیے اچھی یادوں کے ایک خزانے کی ایسی کتاب چھوڑ جاتی تھیں جس کے صفحات وہ سال بھر پلٹتے اور پڑھتے رہتے تھے۔ ان کی لائبریری دنیا بھر کے موضوعات پر لکھی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ لائبریری میں کارنر کی ایک الماری زندگی کے مختلف حصوں میں کھینچے گئے فوٹو گرافس کے البمز سے سجی تھی۔ لائبریری کی اکثر کتابیں وہ کئی کئی بار پڑھ چکے تھے اور فوٹو گرافس کے البمز تو ان گنت مرتبہ دیکھ چکے تھے۔

جب سے وہ شندور پولو فیسٹول کے لیے دنیا کی اس چھت کی طرف آنا شروع ہوئے تھے انہیں ایسا لگتا کہ یادوں کی وہ کتاب جو وہ یہاں سے لے کر جاتے تھے اور فوٹو گرافس جو یہاں قیام کے دوران کھینچے جاتے ان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہیں۔ ہر سال کچھ نئے کچھ پرانے لوگوں سے ملاقاتیں، پولو فیسٹول کی گہما گہمی، ڈھول، تال، رقص، رنگ، خوشی اور جوش سے تمتماتے چہرے، یہ خوب صورت نظارے، برف پوش راکاپوشی کے پیش منظر میں یہ گہما گہمی زندگی جیسے اپنے جوبن پر ہوتی۔ انہیں اپنی روٹین کی زندگی کے سارے تفکرات، ذمے داریاں، بھاگ دوڑ سب بھلا دیتی۔ وہ یہاں آ کر بچوں کی سی خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کی سال بھر کی تھکن دور ہو جاتی اور یہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ خود کو ہلکا پھلکا اور تروتازہ محسوس کرتے، زندگی کے نئے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ایک دم تیار۔

اِدھر اُدھر نصب ٹینٹ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انہوں نے دوبارہ پتھر پر بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ یونہی ٹانگ پر ٹانگ جمائے گھٹنے کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنائے اپنی سوچ میں گم تھی۔ اسی دم دائیں سمت سے چند سیاحوں کا گروپ اِدھر کو آتا دکھائی دیا۔ وہ لوگ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد واپس اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹے تھے۔ ان لوگوں کی آمد نے لڑکی کی گہری سوچ کو توڑا تھا۔ اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا اور پھر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اس نے سامنے دیکھا۔ اسے اپنے سامنے فولڈنگ چیئر پر بیٹھے بابر کمال نظر آئے۔ وہ کچھ دیر یونہی ان کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

”ہیلو! کیا بات ہے بھئی، کیوں گم صم بیٹھی ہو اتنی دیر سے، خیریت تو ہے۔“ بابر کمال نے اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر یوں بے تکلفی سے کہا جیسے عرصے سے اسے جانتے ہوں۔ وہ ایک بار پھر زبردستی مسکراتی محسوس ہوئی۔

”نہیں کچھ نہیں۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔

”تمہاری عمر میں اتنا گہرا گیان سجتا نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ اب کے لڑکی نے آنکھوں کی پتلیاں قدرے سکیڑتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو غور سے دیکھا۔ سلور گرے بالوں اور مونچھوں والے اس شخص کے چہرے پر ایک عجیب سا خوشگوار تاثر تھا۔ اس کی رنگت سرخ وسپید تھی۔ گرے ٹراؤزر اور سیاہ اونی جیکٹ میں ملبوس وہ شخص ایک نظر دیکھنے پر ہی اسے اجنبی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اوپر سے اس کے بے تکلفانہ انداز میں کہے جملوں نے اسے بھی جھجک کے تکلف میں پڑنے سے بچا لیا تھا۔

”آپ کی عمر میں تو سجتا ہے نا۔“ اس نے بے ساختہ کہا تو وہ زور سے ہنس دیے۔

”ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ ہنستے ہوئے ان کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ ”مگر مجھے فی الحال نروان حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوا۔“

”آپ گیان کے ذریعے نروان حاصل کرنے والوں پر نہ جائیں، ان کے تو انتیس سال کی عمر میں ہی تاج اور تخت چھوٹ جاتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اور وہ شہزادہ سدھارتھ سے گوتم بدھ بن جاتے ہیں۔ صرف انچاس دن کا گیان درکار ہوتا ہے انہیں۔“ وہ بھی برجستہ بولے۔

”بس پھر تو نہ میری عمر ہے گیان کی، نہ آپ کی ہم دونوں اس کے معیار سے آؤٹ ہوئے۔“ وہ ہنسی۔

”ہوں۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”پھر تو تم بالکل ہی قابل گرفت مشغلے میں مشغول تھیں یوں گم صم گہری سوچ میں مگن ہو کر۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”اوہ..... آئی ایم رئیلی سوری۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”چلو.....“ انہوں نے چلو کو ذرا سا کھینچ کر ادا کیا۔ ”معاف کیا۔“ وہ بے نیازی سے بولے اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”بابر کمال فرام لاہور، حال مقیم اسلام آباد۔“ انہوں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”روشانے کریم فرام لاہور۔“ جواب میں اس نے کہا اور ان کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ کیا۔ ”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”مجھے بھی۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ شفقت سے تھپکا۔ پھر پوچھا ”تم یہاں کب آئیں دو دن میں نے تمہیں یہاں نہیں دیکھا؟“

”میں کل شام کو پہنچی۔“ اس نے ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو ہاتھ سے قابو کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے ایک میچ مس کر دیا پھر تو۔“ انہوں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

”میں میچ دیکھنے تو آئی بھی نہیں۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔ ”میں یہاں صرف سیاحی کے لیے آئی ہوں۔“

”ارے۔“ وہ تھوڑا مایوس ہو گئے۔ ”مجھے تو بڑا اچھا لگ رہا تھا یہ سوچ کر کہ تم جیسی ینگ اور حسین لڑکی کو پولو میں اتنی دلچسپی ہے۔“

”ہا......“ وہ زور سے ہنسی، اس کی ہنسی میں حد سے زیادہ کھنکھناہٹ تھی، انہیں لگا ارد گرد ہر چیز جیسے بج اٹھی ہو۔ ”حسین“ وہ ایک بار پھر ہنسی۔ ”دل رکھنے کا فن آپ کو خوب آتا ہے۔“

”نہ مانو۔“ وہ منہ بنا کر بولے۔ ”میں الفاظ کا خوامخواہ اور بے جا استعمال کبھی نہیں کرتا یاد رکھنا۔“

”اوہ۔“ اس نے ہونٹ سکیڑے۔ ”بہت اچھا کرتے ہیں، میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں، جو جیسا ہے اس کے لیے ویسے ہی الفاظ استعمال کرتی ہوں اسی لیے اکثر لوگ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔“

”مجھ سے بھی۔“ انہوں نے اعتراف کیا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے افسوس ہوا یہ جان کر حسین لڑکی کہ تم کو پولو میں دلچسپی نہیں ہے۔ پھر اتنا سفر کر کے یہاں آنے کا کیا فائدہ، قدرتی نظاروں کے لیے اور بھی بہت جگہیں ہیں اس ملک میں۔“

”چانس کی بات ہے۔“ وہ ٹانگیں آگے کو

پھیلاتے ہوئے بولی اس کے ہاتھ اس کی گود میں رکھے تھے اور وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ''مجھے ایک گروپ کے ساتھ یہاں آنے کا چانس ملا سو میں نے اس کا فائدہ اٹھالیا۔ اکیلی تو میں شاید کہیں بھی نہ جاؤں۔''

''ہوں۔'' بابر کمال نے اپنی عینک کو انگلی سے سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور باقی لوگ کہاں ہیں تمہارے گروپ کے؟''

''اِدھر ہی ہیں، گھوم رہے ہوں گے۔'' لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تم کیوں نہیں گھوم رہیں ان کے ساتھ؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں تھک گئی تھی۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور شاید اس لیے بھی کہ مجھے آپ سے ملنا تھا۔''

''اوہ۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ''پھر تو اچھا کیا ان کے ساتھ نہ جا کر۔''

وہ پھر مسکرا دی۔

''کون سے ٹینٹ میں قیام ہے تمہارا؟'' انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

''یہ اُدھر۔'' اس نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

''ہیلو، بابر۔'' بائیں سمت سے اُدھر آتی کارا نے بابر کمال کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

''must be enjoying'' (یقیناً آپ لطف اندوز ہو رہے ہوں گے) کارا نے روایتی سا جملہ بولا۔

''as much as you can imagine'' (اتنا زیادہ جتنا تم اندازہ کر سکتی ہو) انہوں نے مسکرا کر کہا۔

کارا مسکراتے ہوئے قریب سے گزر گئی۔

''یہ کارا ہے۔'' بابر کمال نے روشانے کو مخاطب کیا۔ ''کارا اور اس کا شوہر مارک اس میلے کے جنونی شیدائیوں میں سے ہیں اور ہر سال سڈنی سے یہاں تک کا سفر کرتے ہیں۔''

''آپ کی طرح۔'' روشانے نے مسکرا کر کہا۔ ''جنون کے بھی کیا کیا رنگ ہوتے ہیں۔''

''جب تم میری یا کارا اور مارک کی عمر کو پہنچو گی تب تمہیں ٹھیک سے پتا چل جائے گا کہ جنون کے کیا کیا رنگ ہوتے ہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''یہ بتاؤ کافی پیو گی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

''آؤ تمہیں دنیا کی سب سے مزیدار کافی پلاؤں۔'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور اپنی کرسی فولڈ کر کے اٹھائی۔ اب وہ اپنے ٹینٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

شندور پولو فیسٹول نے اس دور افتادہ علاقے میں جشن کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ میلے کے شیدائی تین روزہ مقابلوں کو دیکھنے کے لیے ایک ہفتے کا پیکج لے کر یہاں پہنچ جاتے تھے۔ چترال اور گلگت دونوں علاقوں سے شندور تک کا سفر ایک بہت بڑا ایڈونچر کہلاتا ہے۔ دشوار گزار اور تنگ و پُرپیچ راستوں کا سفر جیپ کے ذریعے کر کے یہاں آنے والوں کی نظروں کے سامنے شندور کے دلفریب نظارے اور جشن کا سا سماں، ان کے سفر کی تھکاوٹ اور دشوار راستے کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ روشانے کریم یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ جس ملٹی نیشنل کمپنی میں وہ جاب کرتی تھی وہاں کے چند کولیگز نے شندور تک کا ٹرپ تجویز کیا تھا۔ روشانے کو پولو فیسٹول میں بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے پولو کا میچ کبھی ٹی وی پر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کولیگز کا جو گروپ شندور جا رہا تھا اس کے کسی ایک ممبر سے بھی اس کی بہت زیادہ بے تکلفی نہیں تھی لیکن جب یہ ٹرپ تجویز کیا جا رہا تھا، ان دنوں وہ سال بھر کے غیر معمولی تھکا دینے والے معمول سے تنگ آ چکی تھی۔ اسے اپنی

روٹین سے چند دن کا آف درکار تھا سو اس نے بلا سوچے سمجھے اپنا نام اس ٹرپ کے لیے دے دیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے مری، ایبٹ آباد اور نتھیا گلی تک کا ہی سفر کیا تھا۔ اس کے خیال میں قدرت کے حسین نظارے پاکستان میں دیکھنے کے لیے یہاں تک ہی محدود تھے۔ مگر جب وہ اسلام آباد سے چترال تک کا سفر سڑک کے ذریعے کر کے چترال پہنچی اس کے خیالات بہت حد تک بدل چکے تھے۔ اس کی سپاٹ اور معمول کی زندگی میں کبھی کوئی ایڈونچر، کوئی نیا پن، کوئی غیر معمولی واقعہ عرصے سے نہیں ہوا تھا مگر اسلام آباد سے دیر اور دیر سے چترال تک کے سفر نے اسے نئے راستوں، نئے نظاروں نئے تجربات سے متعارف کروایا تھا۔ وہ اب تک کہاں زندگی گزارتی رہی تھی، اس نے اس دوران کئی بار سوچا تھا۔ علاقے اتنے حسین اور راستے اتنے پُرخطر بھی ہو سکتے تھے اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ جوں جوں وہ اونچائی کی طرف جا رہے تھے اس کی گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ دل کی دھڑکن کبھی تیز ہوتی تھی اور کبھی آہستہ۔ کسی موڑ کے کاٹے جانے پر ایسا لگتا تھا کہ اس خوب صورت وادی میں تنہا اور خاموش موت اس کا مقدر بننے والی ہے۔ اگر ایک لمحے کسی خوب صورت نظارے کو دیکھ کر دل بے اختیار کھل اٹھتا تھا تو دوسرے ہی لمحے انتہائی کم چوڑی سڑک پر جیپ کے بہ مشکل سمائے پہیے پھسل کر گہری کھائیوں میں گر جانے کا خدشہ دل کو مٹھی میں لے لیتا تھا لیکن وہ اپنے کسی بھی ہم سفر پر اپنے دل کی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے زرد پڑتے چہرے اور سفید ہونٹوں کے ساتھ بھی وہ اپنے تئیں مسکراتے ہوئے ساتھیوں سے گفتگو کر رہی تھی۔

''اِدھر اُدھر مت دیکھو روشانے تو طبیعت ٹھیک رہے گی۔'' کسی نے اسے مشورہ دیا تھا۔

''ارے میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تھا اور باقی کے سفر میں کوشش کرتی رہی تھی کہ وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے میگزین کا مطالعہ کرتی رہے۔ چکدرہ پہنچنے تک اس نے دھیان میگزین سے نہیں ہٹایا اور دیر تک کے سفر میں آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ دل ہی دل میں وہ اس ایڈونچر سے بھرپور سفر کا خطرہ مول لینے پر خود کو کوس رہی تھی۔ وہ رات انہوں نے پناہ کوٹ میں پی ٹی ڈی سی کے موٹل میں گزاری تھی اور رات بھر اسے نیند کے بجائے چکر آتے رہے تھے۔ اگلے روز چترال اور چترال سے شندور تک کا سفر بھی اسی کیفیت میں گزرا تھا۔ اس کے ساتھی اگرچہ رات گزارنے کے بعد تروتازہ اور خوش تھا۔ وہ اب اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر اس کا دل نہ جانے کیوں اداس ہو رہا تھا۔ شندور پچھلی وادیوں کی طرح ہی خوب صورت تھا مگر یہاں گہما گہمی اور چہل پہل زیادہ تھی۔

''شندور ان دنوں پوائنٹ آف اٹریکشن بن جاتا ہے۔'' اس کے کولیگ نے یہاں پہنچنے پر کہا تھا۔

''تو تین پولو میچ دیکھنے کے لیے خود کو اتنے کشٹ میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے۔'' اس نے دل میں کہا تھا اور پھر یہ بھی سوچا تھا کہ شاید وہی قنوطی ہوتی جا رہی تھی جو ایسا سوچ رہی تھی جبکہ اس کے اردگرد موجود سب چہروں پر خوشی، جوش اور تجسس بکھرا نظر آتا تھا۔ وہ لوگ اپنی یہاں موجودگی کے ایک ایک لمحے سے حظ اٹھانا چاہتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ان سب کو شطرنج، لوڈو اور تاش کھیلنے میں مصروف چھوڑ کر اپنے ٹینٹ میں موجود سلیپنگ بیگ میں خود کو سرتاپا چھپا لیا تھا۔

''ارے تم کیوں اتنی بورنگ ہو۔'' اس کی ساتھی رابعہ نے اسے زبردستی اٹھانا بھی چاہا مگر اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔

اگلے دن پولو فیسٹول کا دوسرا میچ دیکھنے میں گزرا اور سارا دن بجتے ڈھول اور علاقائی رقص سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ اس دوران بھی اس پر وہی قنوطیت سوار رہی جو ایک دن پہلے اس پر حاوی

ہوچکی تھی۔ شام کو جب اس کے ساتھی اِدھر اُدھر گھومنے نکل گئے وہ قنوطیوں کی طرح ایک بڑے پتھر پر بیٹھی اپنے اردگرد کے حسین نظاروں سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں گم رہی تھی۔ مگر وہ شخص اسے بے حد دلچسپ لگا جس نے نہ صرف اسے اس کے خیالوں کی دنیا سے نکالا تھا بلکہ دنیا کی سب سے مزیدار کافی بھی پلائی تھی۔ اس ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ گفتگو میں مگن اسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا اور اس کی طبیعت بھی خاصی بشاش ہوگئی تھی۔ اس رات جب اکثر ٹینٹ میں گانا، بجانا، انڈور گیمز گفتگو، قہقہے جاری تھے اسے بابر کمال سے شندور اور اس کے اردگرد کے تمام علاقوں کے بارے میں دلچسپ معلومات مل چکی تھیں اور اس کے علاوہ اسے پولو میچ کے تمام قواعدو ضوابط اور چترال وگلگت کی ٹیموں کے درمیان روایتی میچوں کی اہمیت بھی ازبر ہوچکی تھی۔ اس رات سونے کے لیے لیٹتے ہوئے اسے ایسا لگا جیسے عرصے کے بعد اس کے ذہن پر چھائی یاسیت کی گرد چھٹ رہی ہو۔

☆☆☆

بڑے سالوں بعد اس رات سونے کے لیے لیٹتے ہوئے نہ جانے کیوں انہیں وہ گھر یاد آیا تھا جس سے کسی زمانے میں انہیں شدید لگاؤ تھا۔ جونہی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتیں ان کا دل دنوں کی گنتی شروع کردیتا۔ اگر پہلے بیس دنوں میں گرما کی چھٹیوں کا کام مکمل ہوجائے تو امی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ وہ اکیسویں دن مولسری والی نانی کے گھر چلے جائیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چھٹیوں کا کام مکمل کرلیتے مگر ماسٹر صاحبان بھی ایسا ٹکا کر کام دیتے تھے کہ دن رات ایک کیے رکھنے کے باوجود جلدی ختم نہ ہوتا تھا۔ پچاس مضمون، پچاس درخواستیں، ستر خطوط، پچاس مرتبہ املا، دو سو الفاظ کے جملے، واحد جمع اور مذکر مونث لاتعداد، اردو ہی کا کام کسی طور ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ باقی مضامین کا کام بھی اسی حساب سے ملتا تھا۔

''بابر تم کام کررہے ہو یا کیڑے مکوڑے بنا رہے ہو صفحات پر۔'' اس کی بہن مریم اسے چھیڑتی جو خود سہج سہج کام کرنے کی عادی تھی۔ الفاظ کی نوک پلک سنوار کر بہت اہتمام سے لکھتی بلکہ اس نے کام کرنے کا ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا۔

''افوہ، تم بھی جلدی کام ختم کرو، مرو۔'' وہ چڑ کر مریم سے جھگڑتا۔

''کیوں بھئی کیا جلدی ہے، ابھی تین ماہ باقی ہیں چھٹیاں ختم ہونے میں اور اگر سیلاب آگیا تو چھٹیاں بڑھ بھی جاتی ہیں شرط لگالو جو گیارہ ستمبر سے پہلے اسکول کھل جائے۔ سب سیلاب زدگان اسکولوں میں ہی تو بسائے جاتے ہیں۔'' مریم اپنی فراست کا اظہار کرتی۔

''کوئی خیر کا کلمہ منہ سے نکالو، کاہے کو سیلاب آئے بھئی۔'' امی جو محض نگرانی کرنے پاس بیٹھی ہوتیں مریم کو گھورتیں۔

''میں اس لیے تھوڑی کہہ رہا ہوں کہ چھٹیاں ختم ہوجائیں گی کام کیے بغیر۔'' وہ ناراض سا چہرہ بنا کر کہتا۔ ''میں اس لیے کہتا ہوں جلدی ختم ہوجائے کام تو ہم مولسری والی نانی کے گھر جائیں گے۔''

''دیکھا امی اس کے سر پر آوارہ گردی سوار ہے، شترِ بے مہار بن جاتا ہے۔ نانی مولسری کے گھر جاکر یہ۔'' مریم جان بوجھ کر امی کو سناتی۔

''یہ تو ہے کام ختم ہوگا تو نکلو گے نا کہیں۔'' امی کا جملہ جسم میں نئی بجلی بھر دیتا اور وہ دوبارہ کام مکمل کرنے میں جت جاتا۔

اللہ اللہ کرکے ایک ماہ میں کام ختم ہوتا اور وہ مولسری والی نانی کے گھر سدھارتے۔ کھلے صحن اور محرابی برآمدوں والا یہ گھر اسے نہ جانے کیوں اتنا پسند تھا کہ اس کا دل چاہتا وہ یہیں رہ جائے۔ مولسری والی نانی ان کی سگی نانی کی بہن تھیں اور جس گھر میں رہتی تھیں وہاں کسی زمانے میں مولسری کے تین درخت ہوا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ خاندان بھر میں

مولسری آپا، مولسری والی خالہ، یا مولسری والی نانی کے نام سے مشہور تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ مولسری کے دو درخت تو کٹ گئے صرف ایک باقی تھا جو صحن کے آخری کونے میں لگا تھا اور جس کا کٹورا ہر دم چھوٹے چھوٹے زرد زرد پھولوں سے بھرا رہتا تھا۔ مولسری والی نانی کے گھر میں ان کے بیٹے ماموں عبیداللہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور خالہ زینب جو اللہ جانے نانی مولسری کی اپنی بیٹی تھیں بھی یا نہیں، وہ بھی وہیں رہتی تھیں، ماموں عبیداللہ کے بیٹے اکرم اور اسلم سے بابر کی اتنی دوستی تھی کہ یہی دوستی ہر دم اُدھر آنے کو اس کا دل ہڑکائے رکھتی تھی۔ اکرم اور اسلم کی دو بہنیں آپا رضیہ اور باجی ثریا تو خیر عمر میں اس سے خاصی بڑی تھیں مگر تھیں بہت پیار کرنے والی بہنیں۔ جب وہ لوگ مولسری والی نانی کے گھر جاتے، آپا رضیہ، باجی ثریا اور خالہ زینب کی بیٹی عذرا ہمہ دم مصروف نظر آتیں، نت نئے کھانے بناتے ہوئے، مہمانوں کے کپڑوں کے ڈھیر دھو کر استری کرتے ہوئے، گھر کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش میں مصروف، امی ہر وقت مریم کو ان تینوں کی مثالیں دیتی رہتیں۔

''ان بہنوں کے ساتھ رہا کرو، ان کا ہاتھ بٹایا کرو کچھ تم کو بھی سلیقے کا پتا چلے۔'' وہ مریم سے کہتیں۔ مگر یہ بھی اتفاق تھا کہ مریم کی ان تینوں کے بجائے خالہ زینب کی بیٹی صبیحہ سے خوب بنتی۔ جو بقول نانی مولسری کے خاصی الل ٹپ لڑکی تھی۔ یہ الل ٹپ کیا ہوتا ہے۔ کسی کو نہیں پتا تھا۔ مگر اکرم، اسلم، خود بابر اور نانی مولسری کی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آئی دو اور بیٹیوں کے بچے صبیحہ کو نام سے بلانے کے بجائے الل ٹپ ہی کہا کرتے تھے۔ اس پر وہ فوں فوں کرتی سب سے جھگڑتی پھرتی۔ اپنے سے چھوٹوں کو تو دو چار جھانپڑ رسید کردیتی مگر جو اس سے بڑے تھے انہیں دانت کچکچا کر بدترین نتائج کی دھمکی دیتی۔ وہ ان کی باتوں اور جملے بازیوں سے اتنا چڑتی تھی کہ اسے مزید چڑانے میں سب ہی کو مزہ آتا تھا۔ اسی لیے وہ مریم کو لیے چھت پر بنی برساتی میں دھری ایک پرانی سی چارپائی پر بیٹھی کہانیوں کی کتابیں پڑھتی رہتی۔ دونوں ساتھ میں نمک مرچ میں لتھڑی کیریاں کھاتی رہتیں کبھی جو وہ لڑکے چھت پر پتنگ اڑانے چڑھتے تو وہ ناگواری کے اظہار کے طور پر برساتی کا سالخوردہ ایک پٹ کا دروازہ زور سے بند کردیتی۔ دروازہ ایک دفعہ دہلیز سے لگنے کے بعد دوبارہ اپنی جگہ واپس آجاتا۔ یہ گویا طبلِ جنگ ہوتا، اسلم اور اکرم جان بوجھ کر بار بار برساتی میں گھستے اور باہر نکل کے چھت کی دیوار سے جھانکتے ہوئے نیچے صحن میں بیٹھی خالہ زینب کو اطلاعات فراہم کرتے۔

''پھوپی اماں، صبیحہ پھر کچے آم کھا رہی ہے۔''

''پھوپی اماں، صبیحہ نے ساتھ والوں کے پپو سے لائبریری سے گندی کتابیں منگوا کر اِدھر رکھی ہوئی ہیں۔''

''پھوپی اماں، صبیحہ بنیروں سے گلی میں جھانکتی ہے اور لوگوں پر آوازے کستی ہے۔''

خالہ زینب جواباً بڑبڑاتی اور ہائے ہائے کرتی سیڑھیاں چڑھ کر بہ مشکل اوپر چھت پر پہنچتیں اور بغیر تصدیق کیے صبیحہ کو کئی ہاتھ جڑ دیتیں۔ اس کی کیریاں چھین کر نمک مرچ کی پڑیا گلی میں پھینک دیتیں، اس کی کتابیں اٹھا کر اکرم، اسلم کے حوالے کرتیں کہ لائبریری والوں کو واپس کر آئیں اور پھر صبیحہ کا ہاتھ پکڑے اسے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے لے آتیں۔ نیچے جاکر وہ پیر پٹختی محرابی برآمدوں کے ارد گرد ان گنت کمروں میں سے کسی ایک میں گھس جاتی اور بستروں کے ڈھیروں میں الٹی لیٹی منہ چھپا کر روتی رہتی۔

''سارے جہان کی لڑکیوں کو عقل آجائے گی مگر اس الل ٹپ کو نہ کبھی عقل آئے گی نہ سلیقہ آئے گا۔'' نانی مولسری کی کوئی بیٹی رائے دیتی۔

''اے بس بھی کرو...... تم لوگ تو لڑکی کے پیچھے

ہی پڑ گئے۔'' نانی ایسے موقع پر ہمیشہ اس کی حمایت کرتیں۔

''نہیں اماں، یہ سدھرنے والی چیز نہیں ہے۔'' خالہ زینب حسرت اور دکھ سے کہتیں اور بابر کی امی مریم کو گھور گھور کر آنکھوں کے اشارے سے منع کرتیں کہ آئندہ وہ صبیحہ کی کمپنی میں نہیں بیٹھے گی۔ یہ سارا ہنگامہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا ہی ہوتا۔ اس کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہوجاتا۔ صبیحہ سرخ اور سوجی آنکھوں کے ساتھ سپڑ سپڑ کرتی کہیں سے نکلتی، صحن میں دھرے حمام کے پاس رکھی چوکی پر بیٹھ کر صابن مل مل کر منہ دھوتی۔ اپنے بالوں میں گیلا ہاتھ پھیرتے ہوئے مریم کی طرف دیکھتی۔

''آؤ کھانا کھائیں۔'' وہ کہتی اور مریم جیسے اشارے کی منتظر اس کے ساتھ چل دیتی اور وہ سب لڑکے اپنے کھیل کود کے دوران منصوبے بنانے میں مشغول ہوجاتے کہ اگلی بار صبیحہ کو کیسے نشانہ بنایا جائے۔

مولسری والی نانی کے گھر سے بہت سی اچھی یادیں جڑی تھیں۔ بابر کو اس گھر کے لمبی لمبی کھڑکیوں اور بڑے بڑے روشن دانوں والے کمرے بہت پسند تھے۔ لمبی لمبی کھڑکیاں، جن کے پٹ اندر کی طرف کھلتے تھے اور جن میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی تھیں۔ کبھی کھیلنے کا دل نہ چاہ رہا ہوتا تو وہ اکرم اور اسلم کے ساتھ ان کھڑکیوں کے آگے بنی چوڑی سلوں پر بیٹھ کر باہر گلی میں جھانکتے رہتے اور آنے جانے والوں پر تبصرہ کرتے۔ گلی کا نظارہ ماموں عبید اللہ کے کمرے سے زیادہ بہتر نظر آتا جو اللہ جانے کیا کام کرتے تھے کہ ہر وقت ان کے پاس دو چار آدمی یا بیبیاں بیٹھی رہتیں۔ ماموں عبید اللہ کے قریب رنگ برنگ مرتبانوں میں جو چیزیں بند پڑی رہتی تھیں ان میں سے ہی کسی کو کچھ کسی کو کچھ نکال کر پڑیوں میں بند کر کے پکڑاتے نظر آتے۔ بابر کو ہمیشہ تجسس رہتا کہ ان پڑیوں میں اور ان مرتبانوں میں کیا بند تھا مگر ماموں عبید اللہ کیا مجال تھا جو کسی کو ان قریب پھٹکنے دیتے۔ جونہی ان کے پاس بیٹھے خواتین ایک، ایک کر کے رخصت ہوجاتے وہ ایک مرتبان اٹھا کر دیوار گیر لکڑی کی الماری کے تختے پر جماتے اور الماری کی کنڈی میں موٹا سا تالا لگا کر باہر نکلنے لگتے۔ باہر نکلتے نکلتے انہیں یاد آتا کہ گھر کے لڑکے ان کے کمرے کی کھڑکیوں پر قبضہ جما بیٹھے ہیں۔ وہ بلند آواز میں کہتے۔

''ان لڑکوں کو کوئی شرم کوئی تہذیب بھی سکھ بیبیوں۔ گلی میں آتی جاتی خواتین پر آوازے ہیں۔''

''لڑکوں کے آوازے کسنے خوب سنائی دے ہیں اور جو خود بھانت بھانت کی عورتیں بغل دبائے سارا دن انہیں الو بنانے میں گزار دیتے وہ۔'' مولسری والی نانی جو ماموں عبید اللہ سے نالاں ہی نظر آتیں چمک کر بولتیں۔

''میں تو دھندا کرتا ہوں، روزی کا وسیلہ یہ۔'' ماموں عبید اللہ ماں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ ''میں یہ وسیلہ اجاڑ دوں تو یہ جو خاندان بھر کی خواتین گرما کی چھٹیوں کے نام پر بچوں سمیت ادھر آن دھمکتی ہیں ان کے خرچے بھی نہ پورے ہوں۔'' وہ چمک کر کہتے اور گھر بھر میں موجود مختلف مہمان خواتین کے دلوں پر ان کے الفاظ چوٹ بن کر لگتے۔

''ارے بند کر اپنا وسیلہ اور پھر دیکھ یہ میری بھانجیاں اور بھتیجیاں تیرے وسیلے پر یہاں رہتی ہیں یا اللہ کے کرم سے۔'' مولسری والی نانی غصے میں بپھر اٹھ کر کھڑی ہوجاتیں۔

''میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔'' ماموں عبید اللہ نانی کے تیور دیکھ کر گھبرا جاتے اور بھیگی بلی بنے انہی رشتے دار خواتین کو سلام کرتے سر جھکائے گھر سے باہر نکل جاتے۔

''خبر دار لڑکیو جو کوئی اس احمق کی باتوں سے ناراض ہوئی یا دل میں میل لائی۔'' پھر نانی مولسری

کی کڑک دار آواز صحن میں گونجتی۔

''میر ولایت حسین کی بیوی ہوں میں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر فخر سے کہتیں۔ ''ایسی اور اتنی جائداد چھوڑ گئے ہیں وہ کہ اس کی آمدنی سے گرما کے دو ڈھائی مہینے کیا سال بھر تم سب کو اور تمہاری اولادوں کو یوں رکھ سکتی ہوں یہاں کہ کھاؤ، پیو، پہنو، اوڑھو سب یہیں سے۔'' نانی کی یہ آواز سب خواتین کے لیے بہت بڑا دلاسا ثابت ہوتی۔

''چلو بچو نکلو باہر، کھیلو، کودو، شور مچاؤ۔'' پھر نانی کمرے میں جھانک کر کھڑکیوں کی سلاخوں سے چمٹے لڑکوں کو... ہلا شیری دیتیں۔'' یہ جو ماموں تمہارا ہے نا یہ دماغ سے ذرا کھسکا ہوا ہے۔'' وہ ہاتھ میں پکڑے پنکھے کی ڈنڈی ماموں عبید اللہ کے اس نیچے ڈیسک کی طرف اشارہ کر کے کہتیں جس کے قریب رکھی گدی پر بیٹھ کر ماموں عبید اللہ سارا دن مرد و خواتین کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہتے۔

''ابا جی کریک ہیں، کریک۔'' اسلم قہقہہ لگا کر کہتا۔

''چپ کر بد معاش، شرم نہیں آتی باپ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے۔'' اسلم کی اماں اسے گھر کتیں۔

''میں تو نہیں کہتا، دادی کہتی ہیں۔'' اسلم سر کھجاتا ہوا جواب دیتا اور پھر ان سب لڑکوں کی طرف دیکھ کر ہنس دیتا۔

''مامی عارفہ، اسلم پھر ماموں کو کریک اور پاگل کہہ رہا ہے۔'' صحن سے صبیحہ کی آواز ابھرتی۔ مامی عارفہ کی چپل تاک کر اسلم کی کمر پر آکر لگتی اور ایک نیا طبلِ جنگ بج جاتا۔

''سچ سچ بتاؤ، تم لوگوں کو اس صبیحہ سے کیا خار ہے؟'' ایک بار چھٹیوں کے دوران بابر نے اسلم سے پوچھا۔ اسے اس روز اکرم کی شکایت پر زینب خالہ کے ہاتھوں صبیحہ کی جی بھر کر پٹائی پر پہلی بار دکھ ہوا تھا۔ وہ مار کھانے کے بعد دالان میں رکھے تخت پوش

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

پر سمٹے بستروں پر لیٹی سسک رہی تھی۔

”یہ بڑی میسنی ہے، چپ کر کے ہماری شکایتیں لگاتی ہے اور تم نے دیکھا نہیں تنکا توڑنا بھی عذاب لگتا ہے اسے۔ اپنی کاہلی، سستی، نالائقی اور الل ٹپ حرکتوں کی وجہ سے مار کھاتی ہے۔ ہمارا کیا قصور ہے۔“ اسلم نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”مگر آج تو وہ بے چاری سیاہ روشنائی کی دوات بنا رہی تھی اپنے اسکول کے کام کے لیے، غلیل سے دوات کا نشانہ تم نے باندھا تھا۔ اس کی دوات ٹوٹ کر روشنائی بکھر گئی اور قریب رکھے دھلے ہوئے کپڑے سب غارت ہوئے۔ اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ یہ سب تمہاری شرارت تھی۔“ بابر کو اس روز واقعی صبیحہ کے پٹنے پر دکھ ہو رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے کل شام جو رسالے ہم مجید سے لائے تھے پڑھنے کو وہ دادی کو لے جا کر کس نے دیے تھے، اسی میسنی، گھنی، شکایتی ٹٹو صبیحہ کی بچی نے۔“ اسلم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”اور دادی نے مجید کے گھر جانے یا اس کے اِدھر آنے پر پابندی لگا دی۔“

”ہاں تو وہ فلمی اداکاراؤں کی فحش تصویروں والے رسالے دیکھیں گی تو پابندی تو لگے گی نا۔“ بابر نے کہا۔

”فحش تو تھیں ہی نہیں وہ تصویریں، وہ تو صرف تصویریں تھیں۔“ اسلم نے وضاحت کی۔

”جب تمہیں پتا ہے ہمارے گھروں میں منع ہیں ایسے رسالے تو کیوں لائے تھے۔“ بابر نے جرح کی۔

”لائیں گے اور بھی لائیں گے۔“ اسلم ضد میں آ کر بولا۔ ”اور اس صبیحہ کی بچی کا ابھی اور علاج کریں گے۔“

اس روز بابر کو صبیحہ سے پہلی بار ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ بھی باقی کزنز کے ساتھ مل کر اسے خوب زچ کرتا تھا اور اسے بھی اس میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس دوپہر اس نے سنا، صبیحہ کی بہن عذرا بستروں کے ڈھیر پر لیٹی صبیحہ سے چپکے چپکے باتیں کر رہی تھی۔

”اٹھ جاؤ، صبی، تھوڑا سا کھانا کھا لو، پانی کے دو گھونٹ ہی پی لو۔ پنکھا بھی بند ہے، تمہارا حلق بھی نہیں سوکھا کیا۔“ عذرا کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ”یہ مت سمجھو امی کو تم سے پیار نہیں ہے تمہاری اوٹ پٹانگ حرکتوں پر سب کی باتیں تو انہی کو سننی پڑتی ہیں نا۔“ عذرا کہہ رہی تھی۔

”کیا کریں...... تم جانتی ہو اس گھر کے سوا ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ تم کیوں نہیں باز آتیں اپنی حرکتوں سے۔“ عذرا کی بات کے جواب میں پیٹ کے بل لیٹے وجود نے کوئی حرکت نہیں کی تھی بس سسکیوں کے زور پر ہلکا سا ارتعاش اس میں پیدا ہو رہا تھا۔

”اللہ کا واسطہ ہے صبی اٹھ کر دو گھونٹ پانی پی لو۔“ عذرا کے لہجے میں بڑی بہن کی محبت تھی اور تفکر بھی مگر صبیحہ نے اپنی پوزیشن نہیں بدلی۔ خاصی دیر تک منت سماجت کرنے کے بعد عذرا باہر سے کسی کی آواز آنے پر اٹھ کر باہر چلی گئی تو برتنوں والی بڑی سی الماری کے پیچھے چھپے بابر نے دیکھا صبیحہ سیدھی ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ زینب خالہ کے طمانچوں سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں مسلسل رونے سے۔ اس نے اپنا چہرہ ململ کے دوپٹے سے پونچھا اور اٹھ کر دبے قدموں چلتی دالان کے ساتھ ملحق ماموں عبیداللہ کے کمرے میں درمیانی دروازہ کھول کر داخل ہو گئی۔

ماموں عبیداللہ روزی کے وسیلے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کے دروازے کو باہر سے تالا ڈال کر کہیں جا چکے تھے۔ دونوں کمروں کے درمیان والے کھلے دروازے سے یہ دیکھنے کے لیے کہ صبیحہ، ماموں کے کمرے میں کیا کر رہی ہے بابر تجسس کے مارے الماری کے پیچھے سے باہر نکل آیا اور پھر اس نے دیکھا صبیحہ نے بالوں میں پڑے پراندے کی گروہوں میں چھپی ایک چابی سے ماموں عبیداللہ کی پُراسرار الماری کا تالا کھولا اور تختوں پر جمے مرتبانوں میں سے مختلف چیزیں نکال نکال کر کھانے لگی۔

”کسی نے دیکھ لیا نا!“ الفاظ بے اختیار بابر کے منہ سے پھسل پڑے۔

”صبیحہ نے چونک کر دیکھا اس کا جاسوس اس بار کون تھا اور پھر بغیر گھبرائے بولی۔ ”آؤ تم بھی کھاؤ۔“

”ہے کیا یہ؟“ بابر تجسس کے مارے دونوں کمروں کے درمیان والے دروازے سے ماموں عبیداللہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

”مربے ہیں، سیب کے، گاجر کے، آم کے۔“ اس نے شیرے سے لتھڑی انگلی چاٹتے ہوئے جواب دیا۔

”تم چوری کر رہی ہو۔“ بابر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”جب کوئی کچھ کھانے کو نہ دے تو چوری جائز ہوتی ہے۔“ وہ مطمئن سے انداز میں بولی۔

”بالکل غلط......“ اس سلسلے میں بابر کے نظریات پختہ ہو چکے تھے، اس نے سختی سے تردید کی۔

”جو بھی ہے۔“ اس نے ایک مرتبان سے شیرے میں ڈوبی گاجر نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”اور وہ جو آپا عذرا تمہاری منتیں کر رہی تھی۔ اس کی بات مان لینی تھی نا۔“ بابر نے یاد دلایا۔

”ہا...ہائے تم کتنے کن رس ہو، کہاں چھپ کر سنتے رہے تم۔“ اس نے جواب میں بابر کو اخلاقیات کی مار دینے کی کوشش کی۔

”الماری بند کر دو صبیحہ، یہ غلط حرکت ہے۔“ بابر نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے نرمی سے سمجھایا۔

”اچھا لو یہ لو۔“ اس نے ایک مرتبان کھول کر اس میں سے کچھ نکال کر بابر کی طرف بڑھایا۔

”پکڑو تو سہی بے وقوف، میں نے الماری بند

کرنی ہے۔“ اس نے اتنی جلدی میں کہا کہ بابر نے بے اختیار اس کے ہاتھ سے وہ چیز لے لی۔ یہ گولیوں کی طرح گلابی رنگ کی ٹکیاں تھیں۔

”یہ ہے کیا؟“ بابر نے پھر پوچھا۔

”بتاتی ہوں۔“ اس نے الماری کے پٹ بند کر کے اسے تالا لگایا اور دونوں کمروں کی دہلیز پار کر کے دالان کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ صحن میں آہٹ ہوئی تو وہ تیزی سے بھاگ کر بستروں پر اوندھی لیٹ گئی۔

”تم کتنی مکار ہو صبیحہ۔“ بابر نے کہا۔ ”ٹھیک ہی تو تم کو مار پڑتی ہے۔ لو یہ اپنی چوری کی سوغات اپنے پاس ہی رکھو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہتا اس لیے مجھے اس رشوت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے وہ ٹکیاں اس کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا باپ بھی اگر مر گیا ہوتا اور تمہیں بھی یوں دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے کی پاداش میں چھوٹی چھوٹی بات پر پکڑا جاتا تو میں دیکھتی تم کیا کرتے۔“ جواب میں صبیحہ نے سر اٹھایا اور نیچی آواز میں بولی۔

”کیا ضروری ہے کہ دوسروں کی غلط حرکتوں کے جواب میں غلط ترین حرکتیں کی جائیں۔“ بابر نے پوچھا۔ ”میں واقف ہوں اچھی طرح کہ تم کیا کرتی ہو اور تمہیں کیوں مار پڑتی ہے۔ خوامخواہ مظلوم بننے کی کوشش مت کرو۔“

”اچھا پھر...... ہوں میں غلط......“ جواب میں اس نے سر اٹھا کر سرکشی کے سے انداز میں کہا۔ ”جاؤ بتاؤ سب کو کہ میں نے ماموں کی الماری سے مربے چرائے ہیں اور میں اکثر یہ کرتی ہوں کیونکہ میرے پاس اس الماری کی وہ چابی ہے جو مہترانی کوڑے میں لے گئی تھی۔“

بابر اس کی بات کے جواب میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

”جاؤ۔“ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ بپھر کر

بولی۔ ”جاتے کیوں نہیں، جاؤ لگاؤ شکایت اور ایک بار پھر مجھے مار پڑنے کا تماشا دیکھو بلکہ محلے والوں کو بھی بلالاؤ بغیر ٹکٹ کے تماشا دیکھنے کے لیے۔“

”نہیں۔“ بابر نے کہا۔ ”فکر نہ کرو میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“ اور تیز قدموں سے چلتا دالان سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اگلے روز جب وہ مولسری کے درخت کے قریب رکھے حمام کی چوکی پر بیٹھا مریم کی تختی دھو رہا تھا صبیحہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس وقت وہ بہتر حلیے میں تھی۔ اس کا لباس جو اکثر بے ترتیب اور میلا ہوتا تھا اس روز صاف اور استری شدہ تھا۔ بالوں میں بھی تیل ڈال کر چٹیا بنائی گئی تھی۔ بابر نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”تم نے شکایت کیوں نہیں لگائی میری؟“ اس نے مولسری کا پتا توڑتے ہوئے کہا۔ بابر نے پتا توڑنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذرا سی جنبش سے گرتے مولسری کے پھولوں کی طرف دیکھا اور مختصر جواب دیا۔

”میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔“ اور پھر تختی پر ملتانی مٹی کی ڈلیا ملنے لگا۔

”کیوں نہیں؟“ وہ بدستور وہیں کھڑی اپنا سوال دُہرا رہی تھی۔

”بس یونہی۔“ بابر نے اپنے کام میں مشغول سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

”تمہاری جگہ اکرم، اسلم یا صفدر ہوتے تو پتا ہے کیا کرتے۔“ اس نے کہا۔

”میں نہ اکرم ہوں نہ اسلم نہ ہی صفدر ہوں۔“ بابر نے تختی کے گرد انگلی کی پور سے حاشیہ بناتے ہوئے کہا۔

”مگر تم بابر تو ہو۔“ اس نے پتا مسلتے ہوئے کہا۔ ”اور تم بھی ہمیشہ میری شکایتیں لگایا کرتے ہو۔“

”غلط کرتا تھا۔“ بابر نے تختی سمیت اٹھتے ہوئے کہا اور اسے ہوا میں لہرا لہرا کر خشک کرنے لگا۔

وہ کچھ دیر بابر کو یوں دیکھتی رہی جیسے اسے ا[...] جواب کی توقع نہ ہو۔ ”اب کیا ہوگیا۔“ پھر الفاظ ا[...] کے منہ سے نکلے۔

”بس غلط کرتا تھا۔“ بابر نے ہنوز سنجیدہ [...] میں کہا۔ ”اور تم بھی غلط کرتی ہو۔“ وہ مڑ کر جانے لگی تو با[بر] نے پیچھے سے کہا۔ ”تم چڑنا، جھلانا اور دوسروں کو تنگ کرنا چھوڑ دو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ اس [...] نصیحت کی۔

”میں ماموں کی چابی ان کے کمرے میں پھینک دوں گی۔“ جواب میں اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”بہت اچھا کروگی۔“ بابر نے خشک ہوتی تختی کو نظروں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”پر تم وہ ٹکیاں ایک دفعہ تو کھا کر دیکھتے۔“ وہ اس کے لہجے کی نرمی کو دیکھ کر ایک دفعہ پھر اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ شہتوت کے رُب سے بنی ہیں وہ ٹکیاں، میٹھی کھٹی۔“

”توبہ کرو ان ٹکیوں، مربوں اور شربتوں پر جو تم نے اب تک وہاں سے چرائے ہیں۔“ بابر نے تختی کی سوکھتی سطح کو انگلی سے چیک کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک بار پھر رک کر کچھ دیر بابر کو دیکھتی رہی۔

”میں نے تمہارے کہنے پر توبہ کی۔“ وہ بولی اور تیزی سے اندر چل دی۔

اس واقعے کے چند دن بعد ہی بابر اپنی امی اور مریم کے ساتھ اپنے گھر واپس آگیا۔ ان چند دنوں میں صبیحہ اسے کہیں نظر نہیں آئی، مریم سے پتا چلا تھا کہ اسے سخت بخار نے آگھیرا تھا۔

☆☆☆

اس کے بعد دو سال تک وہ مولسری والی نانی کے گھر نہیں جاسکا تھا۔ اس کو میٹرک کا امتحان دینا تھا اور ابا نے سختی سے منع کر رکھا تھا چھٹیوں میں کہیں بھی جانے سے۔ مریم اور امی البتہ باقاعدگی سے وہاں جاتی رہی تھیں۔ واپسی پر مریم اسے وہاں کے

سارے قصے سناتی۔

”آپا ثریا اور باجی رضیہ کی شادیاں ہونے والی ہیں، اکرم اور اسلم بھائی نے پڑھنے سے انکار کردیا۔ اب نانی مولسری انہیں کسی کام سے لگانے کا سوچ رہی ہیں۔ ماموں عبیداللہ، اب زیادہ وقت مسجد میں گزارتے ہیں، مامی عارفہ کی صحت گرتی جارہی ہے، نانی مولسری البتہ ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ زینب خالہ ہی گھر سنبھالتی ہیں آپا عذرا کے ساتھ مل کر۔“

”اور صبیحہ۔“ ہمیشہ بابر کا دل چاہتا وہ مریم سے صبیحہ کے بارے میں پوچھے مگر نہ جانے کیوں ایک عجیب سی جھجک اسے اس سوال پر آن گھیرتی اور وہ یہ سوال گول کرجاتا۔ عجیب اتفاق تھا کہ خود مریم نے بھی کبھی صبیحہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میٹرک میں شاندار نمبر لے کر کالج میں داخلے تک کے عرصے میں ایک بار اس کا دل نانی مولسری کے گھر جانے کو چاہا۔ امی، ابو نے بالکل بھی منع نہیں کیا اور وہ چند جوڑے بیگ میں ڈالے نانی مولسری کے گھر پہنچ گیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ امی کے بغیر وہاں آیا تھا اور اس بار ہی نانی اور زینب خالہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ گرما کی چھٹیاں شروع نہیں ہوئی تھیں اس لیے گھر میں کوئی خاص مہمان بھی نہیں تھا۔

”رضیہ اور ثریا کی شادی کے بعد تو رونق ہی ختم ہوجائے گی بالکل۔“ نانی مولسری خیال ظاہر کرتیں۔

”اکیلی عذرا یہ ٹبر داری (گھر داری) کیسے سنبھالے گی۔“ وہ اس سے یوں پوچھتیں جیسے اس کے پاس ان مسائل کا حل ہو۔ ان کی باتوں، زینب خالہ اور باجی عذرا کی مداراتوں اور اکرم اسلم کی نالائقیاں اپنی آنکھ سے دیکھنے کے دوران وہ غیر ارادی طور پر اِدھر اُدھر صبیحہ کو تلاش کرتا رہا مگر وہ اسے نظر نہیں آئی۔

”ارے کہیں وہ مر تو نہیں گئی۔“ اسے خیال آیا۔

”مر گئی ہوتی تو پتا تو چلتا ہی۔“ اس نے اپنے خیال کی نفی کی اور پھر ایک دن آپا عذرا سے اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

”وہ......“ صحن میں بچھے کپڑے پر ابال کر پھیلائے لسوڑوں کی ڈنڈیاں توڑتی آپا عذرا نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ”وہ اب یہاں نہیں رہتی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”وہ ہمارے ابا کے پاس چلی گئی ہے۔“ آپا عذرا کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

”مگر کیوں؟“ بابر کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”بس اس نے ضد باندھ لی تھی کہ اسے ابا کے پاس چھوڑ آیا جائے۔ اس نے ابا کو خط لکھ دیا اور وہ اسے لینے کے لیے آگئے۔“

”تو تم اور زینب خالہ کیوں نہیں گئے۔“ بابر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ناسمجھ اور نادان ہے، اسے علم نہیں تھا کہ وہ وہاں کیا کچھ بھگتنے والی ہے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائی اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں اس لیے چلی گئی۔ ہم جانتے تھے اس لیے نہیں گئے۔“

”تو کیا اس کی کچھ خیر خبر ہے؟“ بابر نے پوچھا۔

”نہیں۔“ آپا نے عذرا سے کہا۔ ”نہ یہاں سے وہاں کوئی جاتا ہے نہ وہاں سے کوئی یہاں آتا ہے۔“

یہ خبر سن کر نہ جانے کیوں بابر کا دل بھاری ہوگیا اور پھر وہ مزید ایک دن سے زیادہ وہاں رک نہیں سکا۔ گھر واپس آکر بھی اس کا ذہن صبیحہ کے غیر متوقع فیصلے میں اٹکا رہا لیکن پھر وقت نے اسے مصروفیت کے ایسے بندھن میں باندھ دیا کہ رفتہ رفتہ وہ اس واقعے کو بھول ہی گیا۔

اس کے بعد وہ کئی سال مولسری والی نانی کے گھر نہیں گیا۔ وہاں ہونے والی شادیوں پر بھی امی، ابو اور مریم ہی جاتے رہے۔ وہ وقت نہیں نکال سکا۔

”اکرم اور اسلم بھائی دبئی چلے گئے ہیں۔“ مریم بتاتی۔

”نانی مولسری نے ایک اور بیوہ بھتیجی گھر رکھ لی

ہے۔''

''آپا عذرا کی بھی شادی ہونے والی ہے۔'' وقتاً فوقتاً اسے خبریں ملتی رہتیں۔

''صبیحہ واپس آگئی ہے۔'' پھر ایک دن اسے خبر ملی۔ اس خبر نے اتنے سالوں بعد اسے پھر سے چونکا دیا۔

''وہ تو اپنے ابا کے گھر رہتی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''سوتیلی اماں کب تک رکھتی، نکال دیا ہوگا گھر سے۔'' امی نے دال چنتے ہوئے جواب دیا۔

ان دنوں وہ ایم بی بی ایس میں تھرڈ ائیر کا طالب علم تھا اور بہت سالوں بعد اسے نانی مولسری کے گھر جانے کا خیال آیا تھا۔

''ہاں، اچھا ہے مل آؤ، وہ بھی تم کو بہت یاد کرتی ہیں۔'' امی نے اس کا ارادہ جان کر کہا تھا۔

اگلے روز ہی وہ اس شہر میں تھا جس کے ایک محلے میں نانی مولسری کا گھر تھا۔ گھر کا بیرونی بھاری دروازہ جس میں پیتل کے گولے اور کیلیں نصب تھیں پرانا اور خراب ہو رہا تھا۔ اب شاید اس کو نہ تو کوئی پالش کرتا تھا نہ پیتل کے گولوں اور کیلوں پر براسو لگا کر انہیں چمکایا جاتا تھا۔ دروازے کے اندر صحن اور صحن سے آگے محرابی دروں والا برآمدہ البتہ ویسا ہی تھا اگرچہ اس کی اور کمروں کی سفیدی اب جھڑ رہی تھی۔ نانی مولسری، خالہ زینب اور عارفہ مامی نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ وہ تینوں اسے بیمار اور عمر رسیدہ لگ رہی تھیں۔ زینب خالہ اور عارفہ مامی نانی مولسری کی بھانجی اور بہو تھیں مگر انہی کی عمر کی لگ رہی تھیں۔

''ارے، وقت اتنا زیادہ گزر گیا۔'' وہ حیران ہوا۔

''گھر میں کوئی مہمان بھی نہیں ہے نانی؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بیٹا اب اِدھر کوئی نہیں آتا۔ گھر میں کل ملا کر ہم چار پانچ عورتیں ہی تو ہیں۔ باورچی خانے کا سارا کام اکیلی صبیحہ کے کندھوں پر ہے، نہ پہلے سی چہل پہل ہے نہ پہلی سی ہمت، سو کون آئے اور کس کو بلائیں۔'' نانی نے آہ بھرنے کے بعد کہا تھا۔

''صبیحہ!'' اس نے اپنے لیے ٹھنڈی سکنجبین سے بھرے جگ کے ساتھ سلیقے سے رکھے گلاس اور برف کی ٹکڑیوں کی علیحدہ پلیٹ والی ٹرے پر نظر ڈالی اور آنکھ اٹھا کر مشروب لانے والی کو دیکھا۔ سلیقے سے سر پر دوپٹا اوڑھے نظریں جھکائے بیٹھی وہ صبیحہ تھی۔ اسے ذرا بھی یقین نہیں آیا مگر وہ صبیحہ ہی تھی۔ اسے یقین کرنا پڑا کیونکہ گھر میں اس کے علاوہ کوئی دوسری لڑکی نہیں تھی۔

''مریم کیسی ہے؟'' اس دوپہر کو اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''مریم اچھی ہے، ہوم اکنامکس کالج میں پڑھ رہی ہے۔'' بابر نے کابلی چنوں کے پلاؤ اور گوشت کے قورمے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ کھانے کے ساتھ سلاد اور رائتا بھی تھا۔ ایک کٹوری میں اچار تھا جس میں فالسے کے دانے دیکھ کر اسے اپنا بچپن بری طرح یاد آیا تھا۔ ایسا اچار اس نے صرف نانی مولسری کے گھر ہی کھایا تھا جس میں فالسے کے دانے بھی موجود ہوتے تھے۔

''یہ کھانا تم نے بنایا تھا؟'' کھانے کے بعد جب وہ باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی وہ اُدھر ہی چلا گیا تھا۔

''ہاں، اچھا نہیں لگا ہوگا۔'' وہ نل کے نیچے پلیٹیں دھوتے ہوئے بولی۔ ''میرے ہاتھ میں نانی اور امی والا ذائقہ کہاں۔''

''صبیحہ تم بہت بدل گئی ہو۔'' بابر نے باورچی خانے کے دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''اور ہاں کھانا بہت مزیدار تھا۔'' جواب میں اس نے ہاتھ روک کر بابر کی طرف دیکھا تھا۔

''انسان سدا ایک جیسا نہیں رہتا۔'' اس نے کہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

''ہاں۔'' بابر نے اس کی بات کی تائید کی۔ ''مگر انسان جتنا بھی بدل جائے اس میں پہلے والی کچھ نہ کچھ جھلک باقی رہتی ہے، تم میں تو وہ بھی نظر نہیں آرہی۔''

جواب میں وہ خاموشی سے برتن دھوتی رہی۔

''تم اپنے ابا کے گھر کیوں گئیں اور واپس کیوں آگئیں؟'' بابر نے سوال کیا۔

''عزت کی تلاش میں گئی تھی، مزید بے عزت ہو کر واپس آگئی۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''صبیحہ تم نے یہ تجربہ کیوں کیا؟'' اس نے بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔

''تجربہ نہ کرتی تو پتا کیسے چلتا کہ غلط کیا ہے صحیح کیا ہے۔'' اس نے بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بہت بدل گئی ہو صبیحہ...... اتنی تبدیلی تم میں کیسے آئی؟'' وہ ایک بار پھر کہے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''تمہاری وجہ سے۔'' اس نے دھلے ہوئے برتنوں کا ٹوکرا اٹھا کر لکڑی کی چوکی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میری وجہ سے!'' وہ چونک کر بولا۔

''ہاں۔'' اس نے دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''یاد ہے تم نے کہا تھا تم چڑنا، جھلانا اور دوسروں کو تنگ کرنا چھوڑ دو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' اسے بابر کے کہے الفاظ درست ترتیب کے ساتھ یاد تھے۔

''ہاں یاد ہے۔''

''بس میں نے چھوڑ دیا وہ سب، سب تو ٹھیک نہیں ہوا، میں ٹھیک ہوگئی۔'' وہ مسکرائی، اس کی مسکراہٹ میں پنہاں بہت سے دکھ لمحے بھر میں بابر پر آشکار ہوگئے تھے۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

''آئی ایم سوری صبیحہ اگر جو میرے الفاظ نے تمہیں کسی تکلیف دہ راستے کا مسافر بنا دیا۔'' وہ بے اختیار بولا۔

''نہیں، معذرت والی کوئی بات نہیں۔'' وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ ''سب کچھ ویسے ہی ہونا ہوتا ہے جیسے وہ ہوتا ہے۔ تم مجھے کچھ نہ بھی کہتے تب بھی ایسا ہی ہوتا۔''

''اس وقت میں بہت کم عمر تھا اور اپنے تئیں سیانا بن رہا تھا۔'' بابر نے سر جھٹک کر کہا۔ ''مجھے نہیں علم تھا تم میرے الفاظ کو اتنی سنجیدگی سے فالو کرو گی، تمہارا وہ جارحانہ، لڑاکا اور باغیانہ انداز، ہی ٹھیک تھا، تم ویسی ہی رہتیں تو شاید تمہاری زندگی مختلف ہوتی۔''

''تم چائے پیو گے، چائے بناؤں؟'' جواب میں وہ چولھے کی طرف مڑتے ہوئے بولی اور بابر کو اچانک ہی اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا اور جرم کا یہ احساس اس قیام کے دوران دو چند ہوگیا جب ایک رات وہ چھت پر سوتے ہوئے پیاس کے احساس سے جاگ اٹھا اور پانی پینے نیچے آیا۔ صحن میں بچھی چارپائیوں میں سے دو سے سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں...... ساتھ ہی ساتھ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ وہ وہیں رک گیا۔ وہ زینب خالہ اور صبیحہ کی آوازیں تھیں۔

''عمر بھر کے احسان کا یہ جواب دو گی تم۔'' زینب خالہ نے کہا تھا۔

''میں کیا کروں امی، یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' صبیحہ کا جواب آیا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ سوں سوں کرتی دوپٹے سے ناک پونچھ رہی تھی۔

''باپ نے دھتکار کر گھر سے نکال دیا۔ اس کی جو ہنسی بنی وہ الگ، اب میری عمر بھر کی ریاضت کا مذاق بنانا چاہتی ہو۔'' زینب خالہ دبی آواز میں ڈپٹ رہی تھیں۔

''آپ ایک بار ہی میرے گلے پر چھری پھیر دیں امی، مجھ سے یہ قربانی نہ مانگیں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

”مسئلہ کیا ہے، برائی کیا ہے، گھر کی مالکن بن جاؤ گی، عمر بھر سیاہ سفید کی مالکن بنی رہو گی...... کہیں اور سے کوئی شہزادہ کبھی نہیں آئے گا تمہاری چاہ کرنے۔“

”امی پلیز اتنا جبر نہ کریں، میرا دم گھٹ جائے گا۔“ اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔ اسی دم دیوار پر بیٹھی بلی نے صحن میں چھلانگ لگائی اور زینب خالہ اٹھ کر اسے بھگانے لگیں۔ بابر تیزی سے مڑ کر سیڑھیاں چڑھتا اوپر چھت پر آ گیا۔

”نہ جانے کیا مسئلہ ہے اور کیا ناگہانی ہونے والی ہے ان ماں بیٹیوں کے ساتھ۔“ وہ رات بھر سوچتا رہا۔

رات کے اس منظر کا عقدہ اگلی صبح ہی کھل گیا... جب عارفہ مامی نے اسے بتایا کہ وہ اسلم کا رشتہ صبیحہ سے طے کر رہی ہیں۔

”اسلم!“ بابر کا حلق کڑوا ہو گیا۔ ”وہ آوارہ، بیکار، محلے بھر کی لڑکیوں کا ناکام عاشق، ان پڑھ اور بدتہذیب شخص۔“ اسے گزشتہ رات کی سنی سسکیاں یاد آنے لگیں۔

”مجھے اس گھر کا کوئی دوسرا مستقبل نظر نہیں آتا، صبیحہ ہی ہے جو سب سنبھال لے۔“ نانی مولسری کھٹیا پر لیٹی لیٹی اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ بابر نے زینب خالہ کو دیکھا جو اس گفتگو سے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”یہ کیسی بے بسی ہے جس کا ساتھ عمر بھر کا ٹھہرا۔“ بابر کے دل میں ابال سا آیا۔ وہ اٹھ کر صحن میں آ گیا جہاں مولسری کے درخت تلے چھوٹی سی پلنگڑی بچھائے صبیحہ اس پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ قریب رکھے حمام کی ٹونٹی کھولے مائی رقیہ کوئی کپڑا دھو رہی تھیں۔ بابر کے قریب آنے پر صبیحہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم صاف انکار کر دو صبیحہ...... تمہارا اور اسلم کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔“ بابر نے بغیر تمہید باندھے صاف لفظوں میں کہا۔ وہ دم بخود بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

”کس امید پر انکار کر دوں...... تم حالات جانتے ہو۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد سر جھکائے ہوئے کہا۔

بابر نے حمام کے قریب سے گزرتی نالی کی طرف دیکھا جس میں مولسری کے زعفرانی ڈنڈیوں والے...... پھول صابن ملے پانی میں ڈوبے باہر گلی کی طرف بہہ رہے تھے۔

”میری امید پر۔“ اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا اور پھر صبیحہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے اور آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے آس کے جگنو جاگے تھے۔

”میرا مطلب ہے...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ بابر نے گھبرا کر دھیان دوبارہ نالی کے پانی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”اسے میں ممکن کر کے دکھاؤں گا، تم دیکھنا!“

یہ کہنے کے بعد وہ وہاں رکا نہیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل گیا۔ اس روز اس شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے اس نے بارہا سوچا، وہ کیا سوچ رہا تھا، وہ کیا کرنے جا رہا تھا، جو سوچ رہا تھا جو کرنے جا رہا تھا کیا وہ ممکن تھا۔ اس کا صبیحہ سے کیا تعلق تھا۔ کیا اس کے دل میں کوئی خلش تھی، صبیحہ سے ہمدردی تھی، اس پر ترس آ رہا تھا یا اسے صبیحہ سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسے اپنے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا سو مزید سوچنے کا عمل موخر کرتے ہوئے وہ گھر واپس آ گیا۔ دالان میں مولسری والی نانی اکیلی بیٹھی تھیں۔ وہ دل کڑا کر کے سیدھا ان کے پاس چلا گیا۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے نانی۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھنے کے بعد بولا۔

”ہاں کہو بیٹا۔“ نانی نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی

اسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے کتنے الفاظ درکار تھے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر صحن سے رونے پیٹنے کی آوازیں آتی سنائی دیں۔ وہ گھبرا کر باہر نکلا۔ عرصے سے مسجد میں دن رات گزارتے ماموں عبید اللہ کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی میت گھر لائی جا رہی تھی۔ اس سانحے میں سب کچھ ادھورا رہ گیا اور سوم کے بعد اسے امی کے ساتھ گھر واپس آنا پڑا۔

گھر آ کر امی سے دبے لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرنے پر اسے اتنی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کہ چند گھنٹوں کی وہ ہمدردی، خلش، ترس یا لگاؤ سب ہوا ہو گیا۔ امی نے اس کے نانی مولسری کے گھر جانے پر سخت پابندی لگانے کے بعد نانی کو صبیحہ اور اسلم کی شادی جلد کر دینے کی بابت طویل خط بھی بھجوا دیا۔ جس کے جواب میں اُدھر سے دو ماہ کے بعد نوید مسرت کے الفاظ سے سجا سرخ رنگ کا شادی کارڈ موصول ہو گیا۔ امی فاتحانہ نظروں سے بابر کی طرف دیکھتی مریم سمیت شادی میں شرکت کے لیے رخصت ہوئیں اور بابر نے وہ دعوتی کارڈ پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دیا۔

”اسلم بھائی اب ماموں عبید اللہ کی طرح ان کے کمرے میں بیٹھ کر لوگوں سے سرگوشیوں میں باتیں کیا کریں گے۔“ شادی سے واپسی پر مریم نے خبر دی تھی۔

”اور صبیحہ بے چاری نے شادی کا جوڑا بھی سرخ کے بجائے سفید بنایا مامی عارفہ کے ڈر سے۔“ دوسری خبر ملی۔ بابر کی آنکھوں کے سامنے لکڑی کی بڑی الماری کے تختوں پر جمے مرتبان اور بوتلیں ناچ گئیں۔ اس کے حلق میں رُب شہتوت سے بنی کھٹی میٹھی ٹکیوں کا انجان ذائقہ گھل گیا۔ ”سفید عروسی لباس میں ملبوس دلہن کیا اب اپنے پراندے کی گرہوں میں اسلم کی الماری کی چابی چھپائے پھرے گی۔“ اس نے سوچا اور شدتِ کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے بعد دن، مہینے، سال گزر گئے۔ وہ ڈاکٹر

بد دعا

کسی شخص نے حضرت ابوالدرداؓ کو تکلیف پہنچائی۔ آپ نے کہا کہ اللہ اس شخص کو تندرستی، عمر دراز اور کثیر مال عطا فرما۔ اس طرح حضرت ابوالدرداؓ نے اس شخص کو بد دعا دی۔ کیونکہ جب یہ چیزیں کسی کو ملتی ہیں تو اس کو تکبر، غفلت آخرت سے غافل بنا دیتی ہیں اور وہ ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ (اس کے لیے ہلاکت اور تباہی ہے)

مرسلہ: سعدیہ رحمن، کراچی

بن کر فوج میں چلا گیا۔ اس کی شادی ہوئی، بچے ہوئے برسا برس فوج میں گزار کر ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے اپنا کلینک اسلام آباد میں بنا لیا۔ پہلے تو ابو، پھر امی دنیا سے چلے گئے۔ اس کی شادی کے اٹھائیسویں سال میں اس کی بیوی مہناز کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ بیٹی بیاہ کر امریکا سدھار چکی تھی۔ بیٹا دبئی میں ملازمت کر رہا تھا۔ وہ اسلام آباد میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی مگر وہ خود کو فٹ رکھنے کی ہر کاوش جاری رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ زندہ دلوں کی طرح زندہ رہا تھا اور یہ زندہ دلی اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ ہر سال ایک مرتبہ وہ اپنے کلینک سے آف لیتا اور دنیا کی چھت پر ہونے والے اپنے پسندیدہ کھیل پولو کے تین میچ دیکھنے شندور پہنچ جاتا۔ مولسری والی نانی، ان کا گھر، اس گھر کے مکین، صبیحہ اور اس سے چند گھنٹوں کا وہ تعلق جس کا کوئی نام نہیں تھا سب خواب ہوئے۔ لیکن کبھی کبھار یادوں میں اچانک سے در آتے اور وہ ماضی کی اس کتاب کا ایک، ایک ورق ضرور الٹتا۔ اس رات بھی اپنے ٹینٹ میں لیٹے لیٹے اس نے نہ جانے کیوں اس کتاب کے سب ورق ایک بار پھر الٹے تھے۔

☆☆☆

اگلا دن پولو میچز کے فائنل کا دن تھا۔ روایتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

حریف چترال اور گلگت کی ٹیمیں اپنے اپنے حامیوں سمیت اسٹیڈیم میں موجود تھیں۔ وہ میچ روشانے نے بابر کمال کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا تھا۔ شہنائی اور ڈھول کی آوازوں کا شور ہر طرف گونج رہا تھا اور پولو کے شائقین اپنی اپنی ٹیم کی ایک ایک موو پر تالیاں پیٹ کر داد دے رہے تھے۔

"یہ میچ راؤنڈز میں نہیں چکرز میں کھیلا جاتا ہے۔" بابر کمال نے جوش کے مارے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ روشانے کے کان میں بتایا تھا۔

"یہ لوگ گول ہو جانے پر گیند کو واپس سینٹر میں کیوں نہیں پھینکتے؟" روشانے نے گول کرنے والے کھلاڑی کو گیند اٹھا کر گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"یہ بھی ان کا اصول ہے گول کرنے والا ہی گیند کو اٹھا کر واپس سینٹر میں پھینکے گا۔" بابر نے اسے بتایا اور روشانے حیرت سے گول کرنے والے ہیرو کے پرستاروں کی داد دینے کے انداز دیکھتی رہی۔

"انسان کے شوق، تجسس اور جوشِ تسخیر کی کوئی حد بھی ہے۔" اس نے سوچا۔ "اس بلند ترین جگہ سے دور میدانوں میں اور سمندروں کے قریب بسنے والے باشندوں کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ یہاں اتنی بلندیوں پر انسانوں نے اپنے شوق، تجسس اور ایڈونچر کی حس کو تسکین پہنچانے کے لیے کیسا میلا بپا کیا ہوا ہے" روشانے کے مزاج پر ایک دم پھر وہی یاسیت چھا گئی۔

میچ کے بعد بابر کمال کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے اس نے اپنے انہی خیالات کا اظہار ان سے بھی کیا۔

"اس بات کو رجائیت کی نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔" انہوں نے چاول کی پلیٹ میں چمچ گھماتے ہوئے کہا۔ یہاں کے لوگ سال بھر منجمد کر دینے والے درجۂ حرارت میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے لیے سال کا یہی وقت بہار کا سماں لاتا ہے۔ ان کو حق ہے نا کہ وہ اپنے اس وقت میں جشن منا کر خوش ہو جائیں۔"

"آپ نے مسائل شاید کبھی دیکھے ہی نہیں؟" روشانے نے ان سے بالکل اتفاق نہیں کیا۔

☆☆☆

"آپ اس شفاف پانی میں تیرتی ان ٹراؤٹ مچھلیوں کو دیکھ رہے ہیں نا۔" اس سہ پہر شندور لیک پر ٹراؤٹ کا شکار کرنے میں بابر کمال کا ساتھ دینے کے دوران روشانے نے کہا۔

"یہ کرسٹل کلیئر پانیوں کی مچھلی ہے۔ اس کی رنگت، اس کی جلد دیکھیں اور اس کا ذائقہ دنیا کی اکثر مچھلیوں سے زیادہ اچھا ہے مگر ان مچھلیوں کے متعلق کیا خیال ہے جو ٹھہرے پانیوں، جوہڑوں اور دلدلوں سے پکڑی جاتی ہیں، نہ ان کی رنگت ایسی، نہ جلد، نہ ذائقہ ایسا۔ آپ جیسے لوگ تو شاید انہیں اپنے..... دسترخوان کا حصہ بھی نہ بنائیں کبھی۔"

"ارے، یہ تم نے کیوں کہا۔" پانی میں کانٹا ڈال کر بیٹھے بیٹھے انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"یہ آپ کی اس بات کا جواب ہے جو آپ نے پولو میچ کے بعد کہی تھی۔ آپ نے جس طرح دلدلوں، جوہڑوں اور ٹھہرے پانیوں کی مچھلی نہیں کھائی اسی طرح آپ کو عام لوگوں کے مسائل کی بھی کچھ خبر نہیں۔ جب ہی تو آپ ہر سال یہاں آ کر بڑے سکون سے یہ میلا انجوائے کرتے ہیں۔" روشانے کے لہجے میں تلخی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ میلا نہ ہو اور ادھر کو آنے والے تمام راستے سارا سال ہی بند رہیں، کوئی اِدھر کا رخ نہ کرے تو کیا عوام کے مسائل حل ہو جائیں گے۔" انہوں نے کانٹے کی چرخی گھماتے ہوئے کہا۔

"ہم سب اس ملک کے عوام ہیں روشانے۔" انہوں نے کانٹا ہاتھ سے رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "اپنے اپنے پیمانے میں مسائل کے ساتھ نبرد آزما عوام، کیا یہ ضروری ہے کہ ساری زندگی مسائل سے سر ٹکراتے ہی گزر جائے۔ کیا ان مسائل سے کچھ دیر کی چھٹی انسان

کا حق نہیں۔'' انہوں نے سوال کیا۔ جواب میں روشانے خاموش رہی۔

''جان لو کہ ہر کوئی بقدرِ جثہ اپنے اپنے مسائل سے تھوڑی دیر کی آف ضرور لیتا ہے۔ شادی، بیاہ، میلوں ٹھیلوں میں شرکت کر کے یا ملک کے اندر ہائی سفاری کے ذریعے یا پھر ملک سے باہر حسبِ توفیق تفریح کے لیے جا کر، یہ تھوڑا سا آف انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ میں، تم، مزدور، دہقان، کلرک، افسر، دکاندار، تاجر، بزنس مین سب ہی اس میں شامل ہیں۔ ایسا نہ کریں تو ہم سب پاگل ہو جائیں اور یہ ملک پاگل خانہ بن جائے۔ عوام کیوں اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ سوائے کڑھنے کے کچھ نہیں کرتے۔ کیوں وہ ان کے لمحے لمحے کا حساب ان سے نہیں لیتے۔''

''اس عوام میں بھی میں اور آپ دونوں شامل ہیں۔'' روشانے نے کہا۔

''بالکل ہیں۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''لیکن اس کے لیے اجتماعی کوشش درکار ہے، سو جب یہ اجتماع قائم نہیں ہو جاتا اپنے اپنے آف سے فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ جب ہم آف سے واپس جائیں تو دوبارہ سے اپنے اپنے مسائل سے سر ٹکرانے کے قابل ہو سکیں۔'' وہ مسکرائے اور انہوں نے دوبارہ اپنا کانٹا اٹھا کر پانی میں ڈال دیا۔

''یہ شخص شاید اسی لیے اس عمر میں بھی تازہ دم اور ہشاش بشاش ہے۔'' روشانے نے سوچا اور بابر کمال کے متعلق اس کے اس اندازے کو مزید تقویت اگلے چار دن میں ان کے ساتھ گھومتے پھرتے اور گفتگو کرتے ہوئے ملی۔

''تم اپنے گروپ کو چھوڑو۔'' انہوں نے اسے مشورہ دیا تھا۔ ''جو اتنا دل دہلا دینے والا سفر کر کے یہاں آ ہی گئی ہو تو یہاں کے نظارے تو جی بھر کر دیکھ لو۔ واپسی کا سفر موخر کر دو، میں تمہاری واپسی کا انتظام خود کر لوں گا۔''

روشانے کو لگا وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ان کی رفاقت میں یہاں چند دن کا قیام دلچسپ ثابت ہوا تھا۔ اس کے ذہن پر چھائی یاسیت کی دھول کچھ کچھ چھٹتی محسوس ہونے لگی تھی۔ انہوں نے اسے اس علاقے کا چپا چپا دکھا ڈالا تھا۔ خود وہ ٹریکنگ، فشنگ، ہارس رائیڈنگ اور ہائکنگ کے ماہر تھے۔ روشانے ان کا ساتھ دینے کی کوشش میں سانس پھلا بیٹھتی اور وہ ذرا بھی تھکے ہوئے نہ لگتے تھے۔

''اپنی ڈائٹ، اپنا لائف اسٹائل امپروو کرو روشانے بی بی ورنہ بہت جلد گھٹنوں اور ٹخنوں سے رہ جاؤ گی۔'' انہوں نے اسے دو تین بار کہا تھا۔ ''میرا اور ان علاقوں کا بہت پرانا ساتھ ہے، نہ یہ مجھے تھکا پاتے ہیں نہ میرا دل ان کو دیکھ دیکھ کر بھرتا ہے۔''

''ہاں، ہے تو یہ ایسی ہی جگہ جہاں رہتے ہوئے اس سے دل نہ بھرے۔'' روشانے نے برف پوش چوٹیوں، الپائن کے پھولوں، شفاف جھیلوں اور تاحدِ نظر پھیلے سبزہ زاروں کو دیکھتے ہوئے سوچتی۔ اس کا ذہن ہلکا ہو رہا تھا۔ بابر کمال کی گفتگو اس کے یاسیت بھرے خیالات میں تبدیلی لانے لگی تھی۔ وہ پناہ کوٹ اور چترال کے علاقوں میں جی بھر کر گھومے تھے۔ سیڈار اور دیودار کے درختوں کی پھیلی خوشبو سونگھتے، انہی درختوں کی لکڑی سے بنے گھروں اور فرنیچروں سے متاثر ہوتے وہ یہاں کی ثقافت اور لوگوں کے مزاج سے واقف ہوتی حیران ہو رہی تھی۔ وہ اب تک کہاں رہی تھی۔ اس نے اب تک کیا دیکھا اور کیا کیا تھا۔ اسے لگتا جیسے زندگی شروع ہی اب ہوئی ہو۔

ساتھ ساتھ وہ بابر کمال کی زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق سنہری باتیں سنتی۔ وہ فوج کی ملازمت کے دوران کہاں کہاں رہے تھے۔ انہوں نے دنیا کے کن کن ممالک کا سفر کیا تھا۔ ان کی گھریلو زندگی کیسی گزری تھی۔ اس کے ذہن کا کینوس وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس مختصر وقت میں ہی اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ یہاں آنا اس کی زندگی کا سب سے خوب

صورت تجربہ تھا۔ یہاں آمد نے ہی اسے بابر کمال اور زندگی کی نت نئی جہتوں سے متعارف کروایا تھا۔

''مگر تم بہت introvert ہو لڑکی۔'' انہوں نے اسے اپنے ڈیجیٹل کیمرے میں محفوظ کالاش اور بتام کی سیر کے دوران اپنی تصویریں اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''مطلب یہ کہ اتنے دنوں میں، میں تم سے تمہارے نام، جائے رہائش اور تمہاری جاب کے علاوہ کچھ نہیں جان پایا ہوں۔''

''میرا تعارف صرف اتنا ہی تو ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''میری عمر آپ کے مقابلے میں جتنی کم ہے اتنا ہی میرا تجربہ محدود ہے۔ میری زندگی میں انوکھے واقعات کا فقدان ہے، بس میں یہی کچھ ہوں۔''

''اور تم قنوطی ہو۔'' انہوں نے صاف لفظوں میں کہا۔

روشانے اس حملے پر گڑبڑا گئی۔

''آئی ایم سوری اگر تمہیں برا لگا تو لیکن یہ حقیقت ہے۔'' انہوں نے کیمرا آف کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے مگر یہ عمر تو لطیف تجربوں کا نقطۂ آغاز ہوتی ہے۔ سچ سچ بتاؤ تمہیں ابھی تک کسی سے محبت نہیں ہوئی کیا؟'' روشانے کا دل ایک دھڑکن مس کر گیا۔

''آپ نے کہا تھا آج ہم چترالی پٹی اور جانوروں کے سینگوں سے بنے فنگر رنگز کی خریداری کریں گے۔'' اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''کب کریں گے بھئی، شام ہو رہی ہے۔''

''ہوں۔'' انہوں نے اپنا کیمرا کور میں محفوظ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''چلو ٹھیک ہے یہ خریداری کرتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر اس سے آگے چل دیے۔

☆☆☆

''سچ سچ بتاؤ تمہیں ابھی تک کسی سے محبت نہیں ہوئی۔'' اس رات چترال میں پی ٹی ڈی سی موٹل کے اس چھوٹے سے کمرے میں بیڈ پر لیٹتے ہوئے بابر کمال کی آواز ایک بار پھر روشانے کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ٹھیک ہے تمہاری عمر کم ہے لیکن یہ عمر تو لطیف تجربوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوتی ہے۔'' ان کی کہی دوسری بات اسے یاد آئی۔

''جمال......!'' اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔

''تم اتنی پیاری ہو کہ تم سے محبت کرنے کے لیے ایک عمر کم ہے۔'' پھر اس کے کانوں سے ایک اور آواز ٹکرائی۔

''بھئی میں تم کو روشانے نہیں کہوں گا، تم میرے لیے صرف روشن ہو۔ میرا روشن ستارہ......''

آنسو بے اختیار روشانے کے چہرے پر بکھر گئے۔

وہ اوہائیو یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ جبکہ وہ خود وہاں لینڈ اسکیپ آرکیٹیکچر پڑھنے گئی تھی۔ ان دونوں کی ملاقات ان کے مشترکہ دوستوں علی اور رابعہ کے گھر ہوئی تھی۔ علی، جمال کا دوست تھا اور رابعہ روشانے کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ علی اور رابعہ کے گھر وہ ویک اینڈ ڈنر اس عمر کے پہلے لطیف تجربے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا تھا۔

''میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ اور ان کی فیملی ان دنوں پاکستان گئے ہوئے ہیں۔ تم اگر کبھی مزیدار پاکستانی کھانے کی خواہش مند ہو تو مجھے کال کر کے بتا دینا۔ میں تمہارے لیے ایک اچھے سے ڈنر کا اہتمام کروں گا۔ میں بہت اچھا کک ہوں یاد رہے۔'' وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا اور پھر وہ اکثر ہی ملنے لگے تھے۔ ان دونوں کے میجرز الگ تھے مگر ڈیپارٹمنٹ ایک ہی تھا۔ یونہی آتے جاتے نظر آ جانے پر ہیلو ہائے سے بات بڑھتے بڑھتے دوستی تک آ گئی تھی۔

''میں بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں۔'' اس نے

ایک دن کہا تھا۔ ”میں نے جہاں سے اے لیولز کیا، وہاں بھی میری بہت سی فرینڈز تھیں۔ یہاں بھی بہت سی فرینڈز ہیں۔ امریکن، انڈین، ساؤتھ ایشین، مڈل ایسٹ سے آئی ہوئی لڑکیاں، افریقن...... مگر یار تم کیوں ان سے اتنی مختلف لگی ہو مجھے۔“

”تم ایک ہی طرح کی لڑکیوں سے ملتے رہے ہوگے، اس لیے میں ان سے مختلف لگی تمہیں۔“ روشانے نے مسکرا کر کہا تھا۔

”نہیں یار...... تم مختلف ہو۔ سادہ، معصوم اور خوب صورت۔ یہ تین لفظ تمہاری شخصیت کو explain کرنے کے لیے بہت کم ہیں مگر یہی تین لفظ اس کو مکمل طور پر explain کر سکتے ہیں۔“ اس نے کہا تھا۔

”میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں...... ایک مڈل کلاس فیملی کی بیٹی...... بس مجھے محنت اور لگن نے یہاں تک پہنچا دیا۔ میرے بزرگوں نے تو شاید کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ان کی نسل میں کوئی لڑکی پڑھنے کے لیے امریکا تک پہنچ جائے گی۔“ روشانے نے صاف گوئی سے کہا۔ ”تم میرا فیملی بیک گراؤنڈ دیکھ لو تو شاید حیران رہ جاؤ۔ میرا یہاں تک کے سفر کا راز میرے بک وارم (کتابی کیڑا) ہونے میں مضمر ہے صرف۔“

”ہر فیملی میں ایک پہلا شخص ہوتا ہے، کسی نہ کسی دور میں، کسی نہ کسی نسل میں اور وہ پہلا شخص ہی پھر آگے کی فیملی ہسٹری بناتا ہے۔ اپنی فیملی کا وہ پہلا شخص، شاید تم ہی ہو۔“ اس نے روشانے کے اعتراف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ بہت اچھی فیملی کا بیٹا تھا۔ اسے کوئی مالی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ وہ زندہ دل، خوب صورت، بلند قامت اور خوش گفتار لڑکا تھا۔ اور لڑکیوں میں بے حد مقبول بھی تھا۔ روشانے اس کی دوستی کی بہت قدر کرتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اسے ہمیشہ اس کے سامنے اپنا آپ کم مایہ سا لگتا تھا۔ شاید وہ اس کی اس کیفیت کو سمجھتا تھا اسی لیے وہ اس کا اعتماد بڑھانے کی لاشعوری کوشش کرتا رہتا تھا۔

”میری منزل یہاں سے ڈگری لے کر واپس وطن جانا ہے۔ مجھے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔“ ایک روز جمال کے اس اعتراض پر کہ وہ ہر وقت لائبریریز میں کیوں موجود پائی جاتی ہے، اس نے جواب دیا تھا۔

”بات سنو...... میں اگر یہ کہوں کہ میں تمہارے ساتھ مل کر تمہاری اس کوشش میں شامل ہونا چاہتا ہوں تو تمہارا جواب کیا ہوگا۔“ جمال نے اچانک کہا تھا۔

”کیا مطلب......؟“ وہ بالکل بھی نہیں سمجھی تھی۔

”ایک تو تم بہت کوڑھ مغز ہو۔“ وہ روہانسا ہو کر بولا تھا۔ ”تمہارا دماغ کتابوں اور نوٹس نے چاٹ لیا ہے۔“

”پھر بھی۔“ روشانے نے احمقوں کی طرح اپنا سوال دُہرایا تھا۔

”پھر بھی یہ محترمہ کہ میں آپ کو پروپوز کر رہا تھا ان ڈائریکٹلی۔“

”کیا!“ اردگرد کا پورا منظر روشانے کے سامنے گھوم گیا تھا۔ شاید دنیا کی وہ آخری بات ہوتی جس کا تصور وہ کر سکتی تھی۔

”ہاں، ایسا ہی ہے۔“ وہ سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”یار تم میں کوئی مقناطیسی کشش ہے...... جو مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہے۔ ایسا لگتا ہے میں تمہارے سلسلے میں بے بس سا ہو گیا ہوں۔ میں جتنا...... avoid کرتا ہوں اتنا ہی تمہارا خیال میرا پیچھا کرتا ہے۔ میں واقعی بے بس ہو گیا ہوں۔ میری کیمسٹری ایک دم تم سے مل گئی ہے۔“

”م...... مگر...... میں۔“ بے ترتیب الفاظ روشانے کے منہ سے نکلے۔

”یار میں تمہاری زندگی کی ہر مشکل، ہر خوشی، ہر آسانی اور ہر دکھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز تم میرے پروپوزل کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرو۔“ وہ

کہہ رہا تھا۔

”یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے، تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“ روشانے نے زبان کی لکنت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہارے بارے میں کچھ جاننا بھی نہیں ہے۔ مجھے بس یہی کافی ہے کہ تم ہو اور میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔“ اس نے فیصلہ کُن انداز میں جواب دیا تھا۔

اس کے جذبات کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس نے روشانے کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ اتنے...... بھرپور انداز میں اس سے محبت کا اظہار کرتا، اس کی چھوٹی چھوٹی سی عادتوں کو سراہتا اور اس کے کہے الفاظ کو دُہراتا تھا کہ روشانے کو لگتا وہ خود بھی پور پور اس محبت کی بارش میں بھیگتی جا رہی ہے۔

”میں یہاں پڑھنے آئی ہوں، ڈگری لینے صرف ڈگری لینے۔“ کئی بار وہ جمال کے تصور کو جھٹک کر خود کو یاد دلانے کی کوشش کرتی مگر اسے ایسا لگتا جیسے اس کا تصور زندگی کے باقی کاموں پر حاوی ہو گیا تھا۔

وہ اس کے کہنے پر اکثر اس کے ساتھ باہر گھومنے بھی جانے لگی تھی۔ وہ اسے اس کی ریزیڈنس سے لینے آتا اور وہ ایتھنز کے پارکس اور شاپنگ سینٹرز میں گھومتے۔ اس سے پہلے روشانے کی اوہائیو میں زندگی صرف وڈرف ایونیو میں...... اسکول آف آرکیٹکچر اور اس کی ریزیڈنس بلیک برن ہاؤس تک ہی محدود تھی۔ یہیں اسے لائبریریز اور ای ایڈ مل جاتی تھی اور ضرورت کی ہر چیز بھی۔ یہاں سے باہر ایتھنز کی زندگی دیکھنے کا موقع صرف جمال کی سنگت کا نتیجہ تھا۔

”کیا میں اپنے مقصد سے ہٹتی جا رہی ہوں۔“ کبھی کبھار وہ تھم کر خود سے پوچھتی۔ وہ اپنی فیملی سے کمٹ منٹ کر کے آئی تھی۔ اسے یہاں سے ڈگری لے کر واپس جانا تھا۔ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی زندگیوں کو بہتر بنانا تھا مگر وہ کس چکر میں پڑ گئی تھی۔ اس نے کئی بار خود کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی ہر منطق، ہر دلیل جمال کے جنونِ محبت کے سامنے بھسم ہوئی جاتی تھی۔

”یہ میری طرف سے باقاعدہ پروپوزل کا ٹوکن تمہارے لیے۔“ پھر ایک روز جمال نے اسے ایک خوب صورت جیولری باکس پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس جیولری باکس میں ننھے ننھے ڈائمنڈ سے سجی ایک خوب صورت انگوٹھی تھی۔

”کیا تم واقعی سنجیدہ ہو۔“ روشانے نے انگوٹھی دیکھ کر بلیوں اچھلتے دل پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میں جھک مار رہا ہوں کیونکہ میرا تمہارا صرف مذاق کا رشتہ ہے۔“ وہ جھلا کر بولا۔

”ہم خود سے یہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ ہمارے ماں باپ، ہمارے خاندان۔“ اس نے اسے حقیقت یاد دلانا چاہی۔

”میں ان فارمیلیٹیز پر یقین نہیں رکھتا۔“ وہ بے نیازی سے بولا تھا۔ میرے ماں باپ میرا ہیڈک ہیں۔ ان کو سنبھالنا میرا کام ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ مجھے خود ہی کرنا چاہیے۔ ہاں انہیں انفارم کرنا ضروری ہے، وہ کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔

ہاں البتہ تم بولو تم کیا چاہتی ہو۔“

روشانے کے چہرے پر پھیلتے تذبذب کے آثار دیکھ کر وہ بولا۔ ”اگر یہ اتنا ضروری ہے تو میں یہاں سے واپسی پر خود تمہارے والدین سے مل کر ان سے بات کرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔“

روشانے نے سر اٹھا کر اس اونچے لمبے، خوش شکل شخص کو دیکھا جو بہت سی لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن تھا مگر بہت سی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس نے روشانے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا دل خوشی سے سرشار ہو گیا اور اس نے رنگ پہننے کے لیے اپنا ہاتھ جمال کے سامنے کر دیا۔ وہ چونکا اور پھر جیسے ایک دم خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے باکس سے وہ

خوب صورت انگوٹھی نکالی اور اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنادی۔

''تم کو میں روشانے نہیں کہوں گا۔ میرے لیے تم روشن ہو صرف روشن ...... میرا روشن ستارہ۔'' اس نے روشانے کا ہاتھ اپنے لبوں سے مس کرتے ہوئے کہا تھا اور روشانے کے اردگرد جیسے ان گنت روشن ستارے چمک گئے تھے۔ اس کے بعد کا عرصہ کیسے گزرا، اس نے کیسے اپنی ڈگری مکمل کی روشانے کو یاد نہیں تھا کیونکہ یہ سب اس نے ایک عالمِ بے خودی میں کیا تھا۔

وہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹ آئی تھی۔ اپنے گھر، اپنی فیملی کے پاس مگر اس کا دل وہیں اٹکا رہ گیا تھا جہاں جمال تھا۔

''تم فکر نہیں کرو تمہارے گھر پہنچنے کے ٹھیک ایک ماہ بعد میں تمہارے پیرنٹس کے پاس ہوں گا۔'' اسے رخصت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے جمال نے کہا تھا۔

گھر واپس آکر اس کا جسم سراپا انتظار بن گیا تھا۔ وہ ایک ایک گھڑی گن کر مہینہ گزار رہی تھی۔ اس دوران دوبار اسے جمال کا فون آیا تھا۔ مختصر گفتگو کی ان کالز میں بھی جلد آنے کا ذکر تھا۔

''بس اب تم جاب کے لیے اپلائی کرنا شروع کردو۔'' پندرہ دن کے بعد اس کی امی نے اسے کہا تھا۔ ''تمہاری ڈگری کی کیا ویلیو ہے تم ابھی اس سے ناواقف ہو غالباً۔'' اس نے اپنے خوابوں کی دنیا سے نکل کر اس روز اپنی امی کو پاکستان واپسی کے بعد پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ ان کے محنت کے عادی گٹھے جسم کی رنگت سیاہی مائل ہو رہی تھی، بالوں میں سفیدی اتر آئی تھی اور چہرے کے نقوش پر ایک عجیب سا کھردرا پن اور سختی کا ڈیرا تھا۔ وہ ایک عرصے سے محنت مزدوری میں مصروف تھیں۔ روشانے نے عمر بھر انہیں لوگوں کے کپڑے سیتے، لحافوں میں ڈورے ڈالتے، لوگوں کے کپڑوں کے ڈھیر استری کرتے اور پھر اچار، چٹنیاں اور مربے بنا کر بیچتے دیکھا تھا۔ اب یہ وقت تھا کہ ان کے ڈالے اچار، چٹنیاں اور مربے ان کے تجویز کردہ نام رحیم پکلز کے نام سے شہر کے جنرل اسٹورز پر ڈبا بند پیکنگ میں بکتے تھے۔ اچار اور چٹنیوں کے مسالے وہ خود صاف کرتی تھیں اور ان کے ہاتھ اور ناخن مرچوں اور ہلدی کے رنگوں میں رنگے رہتے تھے۔ روشانے نے اپنی اس محنت کش ماں کے منہ سے کبھی کسی چیز کی شدید خواہش کا ذکر نہیں سنا تھا سوائے روشانے کی اعلیٰ تعلیم کے۔ اس نے اپنی ماں کے جسم پر موجود سستی لان کے پرنٹڈ... سوٹ، رنگ اڑے جارجٹ کے دوپٹے اور پاؤں میں پہنی پلاسٹک کی کالی چپل کو دیکھا۔

''میری ماں کی آنکھوں میں آس ہے، آنے والے اچھے دنوں کی امید، اس کی اسکالرشپ ہولڈر بیٹی کی ڈگری ویلیوایبل ہے، وہ اچھی جگہ نوکری کرکے اچھا پیسہ کمائے گی تو اس کی چھوٹی بیٹی اور بیٹے کی زندگی سنور جائے گی...... تو پھر میں اس کے ساتھ کیا کرنے جارہی ہوں۔ اپنی ڈگری سمیت اس کے ہاتھوں سے نکل جانے کی تیاری میں مصروف میں آج کل پر نوکری کی تلاش کا کام ٹالتی پھرتی ہوں اور جب اس پر انکشاف ہوگا کہ آنے والا اچھا مستقبل تو ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی ہاتھ سے نکل گیا تو اس کا کیا حال ہوگا۔'' اس نے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

''ایک سے ایک تعمیراتی کمپنی موجود ہے یہاں...... تم سب میں اپلائی کردو۔'' امی کا اصرار بڑھنے لگا تھا اور روشانے نے گھڑی کی ہر ٹک ٹک کو گننا شروع کردیا تھا۔ ایک مہینہ عموماً اتنا طویل نہیں ہوتا جتنا وہ ایک مہینہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ امی کو مطمئن کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر سی وی میل کرتی رہتی تھی مگر اس نے انہیں کبھی بتایا نہیں تھا کہ کتنی میلز کے جواب میں اسے انٹرویو کے لیے بلایا جاتا تھا۔

وہ دو اگست کا دن تھا، اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس کی پاکستان آمد کے ٹھیک ایک ماہ بعد کا دن اور اس کے گھر کی کال بیل بج اٹھی تھی۔ صحن میں کپڑے بچھے تھے جن پر جابجا، آم، آملے اور گکرونڈے خشک ہونے کے لیے بکھرے تھے۔ اس کی چھوٹی بہن مونا امی کے ساتھ مسالوں کے ڈھیر صاف کروانے میں مشغول تھی جب سرمد آنے والے کو ساتھ لیے صحن میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اونچا لمبا، خوش شکل اور خوش گفتار جمال اپنے وعدے کے عین مطابق ٹھیک ایک ماہ کے بعد اس کے گھر میں موجود تھا۔ روشانے نے برآمدے کے آگے لگی گرل کے پار اسے کھڑے دیکھا تھا اور گھبرا کر کانوں پر دھرے ہیڈ فون اتار دیے تھے۔

''میرا نام جمال ہے، میں روشانے کے ساتھ اوہائیو یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔'' وہ ہاتھ روک کر خود کو دیکھتی امی سے مخاطب تھا۔ امی نے مسالوں کا تھال فرش پر رکھا اور دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی اسے صحن کے ایک طرف بنے ڈرائنگ روم میں لے گئی تھیں۔

''تمہید باندھے بغیر میرا مدعا ایک ہی ہے آنٹی اگر آپ اجازت دیں تو کہوں؟'' اس نے امی سے کہا تھا۔

''ہاں کہو۔'' امی نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں اور پھر کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں روشانے سے شادی کرنا چاہتا ہوں... اور روشانے بھی یہی چاہتی ہے، ہمیں آپ کی اجازت درکار ہے۔'' روشانے نے دیکھا امی نے سامنے دیوار پر لگے ہرن کے اس سر کو غور سے دیکھا جو سنا تھا کبھی ابا نے شکار کیا تھا اور پھر سر جھکا دیا تھا۔

''تمہارے والدین؟'' ان کے منہ سے الفاظ نکلے تھے۔

''کیا میں کافی نہیں ہوں آنٹی؟'' جمال نے نرمی سے کہا۔

''ہاں تم کافی ہو۔'' امی کے جواب نے روشانے پر حیرت کے پہاڑ گرادیے تھے۔

''لیکن تمہارے والدین کہاں ہیں؟''

''میرے ڈیڈی ذرا مختلف مزاج کے آدمی ہیں۔ ان سے بات کرنے کے لیے ان کا موڈ دیکھنا پڑتا ہے اور میری ممی ہر کام میں ڈیڈی کے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔ میں نے روشانے سے ایک ماہ کا وقت لیا تھا۔ میں چھ دن پہلے ہی یہاں پہنچ پایا ہوں۔'' جمال سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

''اور تمہارے ڈیڈی کا موڈ اس بات کو سننے والا نہیں لگا ہوگا تمہیں، ہے نا؟'' امی کے لہجے میں طنز تھا، تمسخر تھا یا وہ لہجہ نارمل تھا روشانے اندازہ نہیں کرپائی تھی۔

جواب میں جمال خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگا تھا۔

''کیا اسی لیے کسی کمپنی سے کوئی جواب، کوئی انٹرویو لیٹر نہیں آرہا تھا۔'' امی نے روشانے کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔

''کب اور کہاں ہوگی یہ شادی؟'' پھر امی نے جمال کی طرف دیکھا۔ جمال اور روشانے نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ امی اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مان جائیں گی روشانے نے سوچا بھی نہیں تھا۔ عمر بھر کی شدید خواہش سے ایک دم دست برداری۔

''آنٹی آپ سمجھیں روشانے کے ساتھ اللہ نے اب آپ کو اسی عمر کا ایک بیٹا بھی دے دیا ہے، میں آپ کے ہر مسئلے، ہر پریشانی کا ساتھی بنوں گا۔'' جمال خوشی سے کانپتی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''ہوں۔'' وہ اس کی بات پر غور کرکے ذرا سا مسکرائی تھیں۔ ''میں نے پوچھا کب اور کہاں ہوگی یہ شادی؟''

''جب اور جہاں آپ کہیں گی۔'' وہ فوراً بولا تھا۔

اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد امی نے اسے جمال کے ساتھ رخصت کردیا تھا۔

''یہ میرا فیصلہ نہیں ہے۔ میں نے صرف تمہارے فیصلے پر آمین کہی ہے کیونکہ اگر میرے انکار

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے باوجود تم اس سے شادی کرلیتیں تو مجھے زیادہ دکھ ہوتا۔'' اس کی رخصتی سے ایک دن پہلے انہوں نے کہا تھا۔ ''میرے پاس تمہیں دینے کو بجز دعاؤں کے کچھ نہیں ہے۔ اللہ کرے تمہارا انتخاب تمہارے لیے درست ثابت ہو۔''

''امی میں بہت خود غرض نکلی ...... آپ مجھے معاف کردیں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''بے غرضی کا نتیجہ بہت دیکھا، خود غرضی کا کیا نکلتا ہے یہ بھی دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے مبہم سے انداز میں کہا تھا۔

روشانے کے دل پر ماں کو یہ صدمہ پہنچانے کا بوجھ تھا مگر جمال کی ہمراہی میں وہ دنوں میں بھول گئی کہ اس نے ماں سے کمٹ منٹ کا کیا حشر کیا تھا۔ اس کی زندگی کی سوئی جمال ہی کے گرد گھومنے لگی۔ وہ اسے رخصت کروا کر پہلے کراچی اور پھر ابوظہبی لے گیا جہاں اسے بہت اچھی جاب کی آفر ہو چکی تھی۔

''میرے ڈیڈی شاید ابھی ہماری شادی کو ذہنی طور پر قبول نہ کریں اس لیے میں نے ان سے ذکر نہیں کیا اور ممی تو ویسے ہی ڈیڈی کے اشاروں پر چلتی ہیں اس لیے ان سے ذکر کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' جمال نے جب اسے بتایا تو نہ جانے کیوں اس کے اندر کوئی چیز بہت زور سے چبھی تھی۔

''مجھے بھی جاب کرنی ہے جمال...... مجھے امی کو سپورٹ کرنا ہے۔'' شادی کے دو ماہ بعد اس نے زندگی کی رنگینیوں سے نکلتے ہوئے کہا۔

''تمہاری مرضی ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''ویسے یہ بھی ٹھیک ہے تمہیں اپنی ڈگری کو استعمال کرنا چاہیے۔'' جمال کا جواب اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اس کا خیال تھا وہ ایک بار یہ ضرور کہے گا کہ امی سے اور خود اس سے اس نے بھرپور سپورٹ کا وعدہ کر رکھا تھا۔

اس کو جس جگہ جاب ملی وہاں اسے نو گھنٹے گزارنا ہوتے تھے۔ اسے بھولنے لگا کہ زندگی اور زندگی کے آرام و آسائش کیسے تھے۔ اس کا ذہن اور جسم تھکا ہوا سا رہنے لگا تھا۔

''یہ بہت ٹف ہے، میں سخت تھک جاتی ہوں۔'' اس نے جمال سے کہا تو جواب میں اس نے شانے اچکا دیے۔

''یہاں تو جابز ایسی ہی ہوتی ہیں اور پھر تمہیں اپنی امی کو سپورٹ بھی تو کرنا ہے۔'' روشانے نے چونک کر دیکھا، کیا جمال کے لہجے میں طنز تھا یا وہ مذاق میں یہ بات کررہا تھا مگر اسے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا تھا۔ پھر زیادہ وقت نہیں لگا تھا جب ان دونوں کے درمیان رہن سہن اور سوچ کا فرق ڈسکس ہونے لگا۔ فیملی بیک گراؤنڈز اور ویلیوز کے فرق کی بات ہونے لگی۔ وہ محبت جو اس رشتے کی بنیاد بنی تھی آہستہ آہستہ نہ جانے زندگی کے کس کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی...... روشانے جتنی کوشش کرتی زندگی سلجھ کر گزارے وہ اتنی ہی الجھتی جارہی تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے تھے ڈیڈی، مڈل کلاس لوگوں کی ذہنیت ہی الگ ہوتی ہے۔ اب اس کے دن رات ماں کو سپورٹ کرنے کی کوشش میں گزر رہے ہیں۔ میں اور میری ذات بالکل ہی منفی ہوتی جارہی ہے۔ کیا ہے ازدواجی زندگی، کیا ہوتی ہے بیوی اور کیا ہوتا ہے گھر کا سکھ، اچار کے مسالوں میں بسے ذہن شاید کبھی نہ جان سکیں۔ چاہے دنیا بھر کی کتنی ہی کتابیں گھول کر پی جائیں۔'' ایک رات جب وہ پانی پینے کے لیے اٹھی اس نے سنا جمال کسی سے فون پر بات کررہا تھا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا آپ جیسے پریکٹیکل مائنڈڈ انسان کا بیٹا ہوتے ہوئے میں اتنا اموشنل فیصلہ کیسے کر بیٹھا۔'' وہ اپنے دھیان میں بیٹھا باتیں کیے جارہا تھا۔ گھومتے ذہن کے ساتھ وہ واپس اپنے بیڈروم میں واپس آگئی۔

''یہ حقیقت تھی محبت کی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے سوچا۔ وہ جو اس کا روشن ستارہ تھی، اس کے ڈوب جانے میں صرف اتنے سے ہی دن لگنے تھے۔

وہ جس کی خاطر وہ سب کچھ کرنے پر تیار تھا، اس کے متعلق کسی سے فون پر کیا گوہر افشانیاں کررہا تھا۔ اس کے لہجے میں کتنی حقارت تھی اس کے لیے، اس کے گھر والوں کے لیے۔

روشانے نے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ سے نکلنے والی چیخ کو روکا۔

وہ جس کے متعلق اس کو کچھ نہیں جانتا تھا، جس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ تھی اور اسے اس سے شدید محبت ہوگئی تھی وہ اس کے متعلق کیا باتیں کررہا تھا۔'' روشانے نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے پھر شاید وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ جب اسے ہوش آیا وہ اپنے بیڈ پر لیٹی تھی اور جمال اس کے سامنے سنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''آئی ایم رئیلی سوری روشن...... یہ حقیقتاً ایک بڑا نقصان ہے۔'' اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بولا تھا۔ روشانے کو آہستہ آہستہ یاد آنے لگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے سوچا شاید اس کی بے ہوشی نے جمال کو شرمندگی میں مبتلا کردیا تھا۔

''میں نے تمہارے لیے سیٹ کنفرم کروالی ہے۔'' پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

''صرف تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کررہا تھا۔ اب وقت ضائع مت کرو، چیک ان کرنے میں تھوڑا ہی ٹائم باقی ہے۔'' وہ خالی نظروں سے جمال کو دیکھتی اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

''اٹھو یار، جلدی کرو۔'' اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''روشن تمہاری امی ایک اچھی خاتون تھیں، مجھے ان کی اچانک ڈیتھ کا بہت افسوس ہے لیکن ہنی آئی ایم ویری سوری، میں تمہارے ساتھ نہیں جا پاؤں گا۔ مجھے چھٹی نہیں ملی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ روشانے کے ارد گرد دھماکے سے ہونے لگے۔

''کیا یہ ایسا اور اتنا زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔'' وہ لفظ نقصان کو ڈیفائن کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے پتا نہیں چلا کب جمال نے اسے پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا اور ائر پورٹ پر ڈراپ کردیا۔ کب اس نے چیک ان کیا اور کب اس کی فلائٹ لاہور ائرپورٹ پر پہنچی۔ بس پتا تھا تو صرف اتنا کہ نقصان ہو چکا تھا، کتنا...... اس کا تخمینہ لگانا باقی تھا۔ اس کی ماں زیادہ عرصے اس کا دیا ہوا صدمہ سہار سکی نہ خود غرضی کا انجام دیکھنے کے لیے زندہ رہ پائی۔ اس نے ہوش و حواس میں آنے پر اپنے سہمے ہوئے بہن اور بھائی کو ساتھ لگایا۔

''میں جو ہوں تمہارے سر پر۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''آئی ایم سوری جمال...... حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ میں تمہارے پاس واپس نہیں آپاؤں گی ابھی۔'' پندرہ دن بعد اس نے جمال کو خود کال کی۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' جواب میں وہ بولا۔ ''ویسے بھی ابھی ہمیں اچھی طرح سوچ کر ایک دوسرے کو جوائن کرنا چاہیے کہ کیا واقعی ہم ایسا چاہتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور کال منقطع کردی۔

اس عمر میں وارد ہوئے پہلے لطیف احساس کا انجام منطقی تھا یا غیر منطقی اس کا فیصلہ تو وہ نہیں کرسکی مگر جو بھی انجام تھا المیہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے خود کو مشین بنا لیا تھا۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اسے جلد جاب مل گئی۔ مونا ابھی سیکنڈ ائیر میں پڑھ رہی تھی کہ اس کا بہت اچھا رشتہ آگیا، اس نے مونا کی شادی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ سرمد پڑھائی سے دل اٹھا بیٹھا تھا اس نے بھاگ دوڑ کر کے اٹلی کا ویزا حاصل کرلیا اور وہاں چلا گیا۔ تب سے اب تک وہ تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ ایک روٹین میں بندھی مشینی زندگی، اس نے خود پر پابندی لگا رکھی تھی کہ اسے نہیں سوچنا کیا اسے جمال کو ری جوائن کرنا چاہیے یا نہیں۔'' اس نے اس پابندی کے تحت ایک بار بھی نہیں سوچا کہ جمال نام کا شخص کبھی اس کی زندگی میں آیا بھی تھا مگر اس روز

بابر کمال کے سوال پر۔ ''سچ سچ بتاؤ تم نے کبھی محبت کی ہے یا نہیں۔'' اس کے سارے خفیہ زخم ادھیڑ ڈالے تھے۔ اس نے بہت کچھ یاد کر لینے کے بعد سسکی بھری اور کروٹ بدل کر اندھیرے میں دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''ان پانیوں کو دیکھ رہی ہو۔'' اگلے روز اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے ایک جھرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابر کمال نے کہا۔ ''چاندنی راتوں میں یہاں کی جھیلوں اور جھرنوں میں جگنو روشن ہوتے ہیں اور جل پریاں ناچتی ہیں۔''

''عجیب سی فرضی حکایت ہے۔'' روشانے نے مسکرا کر کہا۔

''جو بھی ہے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہے۔'' وہ ہنسے۔ ''کیا خیال ہے تمہیں وہ رنگ خرید کر دی جائے، جس کو پہننے سے اچھی قسمت یا تو آتی ہے اور اگر گم ہو چکی ہو تو لوٹ آتی ہے۔'' وہ بولے۔

''پھر وہی روایتی باتیں۔'' وہ بولی۔

''لڑکی تم بہت سنگدل ہو...... معصوم لوگوں کے خیالات ہیں کیوں جھٹلاتی ہو۔'' وہ جھنجلا کر بولے۔

''چلیں آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"that should be the spirit"

وہ قہقہہ لگا کر بولے اور انہوں نے اسے جانوروں کے سینگوں سے بنی دو انگوٹھیاں خرید کر دیں۔ ایک دو اور بھی سوینیر خریدے اور اس کو پُرتکلف ناشتا بھی کروایا۔ اس روز اس کو واپس لوٹنا تھا۔ اس کی چھٹی ختم ہو رہی تھیں۔ بابر کمال نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے پی آئی اے کی شیڈولڈ فلائٹ میں اس کے لیے سیٹ بک کروا دی تھی۔ وہ اسے ائرپورٹ چھوڑنے بھی آئے تھے۔

"have a safe and sound flight" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی تھی۔ وہ سر ہلا کر مڑی تھی۔

''سنو۔'' انہوں نے پیچھے سے آواز دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

''تم صبیحہ کی بیٹی ہو نا؟'' ان کے لہجے میں عجیب سا یقین تھا۔ وہ لمحے بھر کو چونکی اور پھر سنبھل کر سر ہلا دیا۔

''اور آپ جمال کے ڈیڈی ہیں۔'' اب کے روشانے نے اسی یقین سے سوال کیا۔

اب کے چونکنے کی باری ان کی تھی۔

''تم......'' انہوں نے عینک کا زاویہ درست کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''میں روشانے کریم ہوں...... جمال نے جس سے شادی کی تھی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور اپنے رک سیک کا اسٹریپ ٹھیک کیا۔

''وہ تو روشن...... میرا مطلب ہے۔'' وہ بوکھلا گئے تھے۔

''سب کے لیے روشانے، جمال کے لیے روشن۔'' اس نے کہا اور دوبارہ مڑ گئی۔ وہ وہیں کھڑے اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید بہت کنفیوز ہو گئے تھے۔

☆☆☆

وہ ہر سال شندور آتے تھے اور ڈھیروں ناقابلِ فراموش یادیں لے کر لوٹتے تھے مگر اس بار شندور میں قیام نے انہیں ایک انوکھے تجربے سے دوچار کیا تھا۔ ان کا ماضی...... ان کا حال اور ان کا مستقبل سب اپنی جھلک اس قیام کے دوران دکھا گئے تھے۔ چند دن پہلے تک وہ نہیں جانتے تھے کہ اس بڑے سے پتھر پر بیٹھی لڑکی کی طرف متوجہ ہونے پر انہیں اپنا ماضی بھی یاد آئے گا اور اپنے حال پر نظر ڈالنے پر بھی مجبور ہونا پڑے گا۔

انہیں اسی قیام کے دوران اپنے ماضی کی کتاب میں سے مولسری والی نانی اور صبیحہ والا باب کیوں یاد آیا تھا۔ اگرچہ اس وقت انہیں سمجھ نہیں آئی تھی مگر اس لڑکی روشانے کریم کے ساتھ گزرے چند دنوں میں انہیں سمجھ آ گئی تھی لڑکی شکل صورت میں صبیحہ کی کاپی

تھی، گفتگو کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات بھی اس سے مشابہ تھے اسی لیے تو وہ اسے رخصت کرتے وقت اس سے یہ پوچھتے وقت اتنے شیور تھے کہ وہ صبیحہ کی بیٹی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ دوسری طرف سے نفی میں جواب آ ہی نہیں سکتا تھا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ لڑکی انہیں جس حوالے سے جانی تھی وہ حوالہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ وہ اتنی تلخ، اتنی سنگدل اتنی مایوس کیوں تھی۔ یہ اس کے چلے جانے کے بعد انہیں اندازہ ہوا تھا۔ وہ دن انہوں نے موٹل میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے گزار دیا تھا۔

وہ روشن تھی، جمال کی روشن، جس سے شادی کرنے پر انہوں نے جمال کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اس سے شادی کا عندیہ ظاہر کرنے پر ہی اس لڑکی کا بیک گراؤنڈ سن کر انہوں نے جمال کو مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس گھرانوں کی نفسیات پر ایک مدلل لیکچر دیا تھا۔ ''ایسے گھرانے جن کے لڑکے اور لڑکیاں جتنا مرضی پڑھ جائیں، جو مرضی بن جائیں ان کے اندر سے وہ مخصوص احساسِ کمتری جا ہی نہیں سکتا۔ مسکینی جن کی شخصیت کا خاصہ ہوتی ہے اور کنجوسی جن کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔''

''وہ ایسی نہیں ہے ڈیڈی، وہ بہت خوداعتماد اور پُرکشش شخصیت کی مالک ہے، جب تک وہ خود نہ بتائے اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ ایسے بیک گراؤنڈ سے آئی ہے۔'' جمال پر لڑکی کے عشق کا بھوت سوار تھا اور اس کے پاس اس کے حق میں سو دلائل بھی تھے۔

''تم...... تم!'' وہ بپھرے ہوئے تھے اور غصے و اضطرار میں ان سے ٹھیک طریقے سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ''تم اتنا احمقانہ فیصلہ کرنے جا رہے ہو جس پر پچھتاوے کے لیے تمہاری ایک عمر نا کافی ہو گی۔''

''فیصلہ کرنے نہیں جا رہا ڈیڈی...... فیصلہ تو ہو چکا ہے صرف آپ کو مطلع کر رہا ہوں۔'' جمال نے ازحد سکون سے ان کے اضطرار کا جواب دیا تھا۔

''اوہ خدا۔'' یہ ان کا وہ بیٹا تھا جس کے مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے۔

''اس نے مجھ سے بہتر طریقے سے ڈگری لی ہے اور اسی اوہائیو سٹیٹ یونیورسٹی سے جس میں آپ نے مجھے زرِ کثیر لگا کر پڑھایا ہے وہ اسکالرشپ پر پڑھتی رہی ہے۔'' پھر جمال نے انہیں اس لڑکی کی خوبیاں گنوانا شروع کیں۔

''اسکالرشپ پر۔'' انہوں نے چبا چبا کر لفظ ادا کیے۔ ''جو نہ ہوتا اسکالرشپ تو اس کے فرشتے بھی وہاں پہنچنے کے خواب نہیں دیکھ سکتے تھے۔''

''آپ انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہیں ڈیڈی۔ اس میں ایسی امتیازی خصوصیات موجود ہیں جنہیں دیکھ کر آپ کے فرشتے بھی حیران ہو جائیں گے۔''

''او یو شٹ اپ۔'' وہ جمال کے تیور دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گئے۔ ''جاؤ، پورا کرتے پھرو اپنا پاگل پن کا شوق۔ میرا تمہارا تعلق ختم ہو گیا، میں ایسا تعلق قائم رکھنا ہی نہیں چاہتا جس پر ایسے بیک گراؤنڈ کی ایک عام سی لڑکی حاوی ہو جائے۔'' انہوں نے آخری پتا کھیلا تھا۔

''اوکے ڈیڈی! یہ آپ کی چوائس ہے۔'' وہ جوتوں کی ایڑیوں کے بل مڑا تھا اور تیز قدموں سے چلتا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

یہ ان کی کامیاب ترین زندگی کی سب سے پہلی اور ناقابلِ برداشت شکست تھی۔ ان کا وہ بیٹا جس نے ان کی انگلی پکڑ کر دنیا میں چلنا سیکھا تھا، ان کی نظروں سے دنیا کو دیکھنا سیکھا تھا، جو اُن کے ذہن کو فالو کرتے ہوئے سوچتا تھا۔ اس نے اس مقام پر آ کر ان کی ذات پر جھاڑو پھیر کر انہیں ایک کونے سے لگا دیا تھا۔ انہیں اس ان دیکھی، ان جانی لڑکی سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس لڑکی اور اس کے گھر والوں کو شوٹ کر ڈالیں جس نے ان کے بیٹے کو ان کے مقابل لا کھڑا کیا تھا۔

''کوئی اس کو فون نہیں کرے گا۔ کوئی اس سے رابطہ نہیں رکھے گا۔'' انہوں نے مہناز اور عظمیٰ سے کہا تھا۔ وہ ان کے اشاروں پر گھومنے والی بے بسی سے سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔

جمال ان سے سات ماہ دور رہا تھا۔ سات ماہ کے دوران ایک بار بھی اس نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ سات ماہ سات سال یا سات صدیاں، جن کا ایک، ایک پل ان کے لیے عذاب لے کر آیا تھا۔ وہ غصے سے کھولتے رہتے۔ ان کے مزاج میں چڑچڑاپن اتر آیا۔ وہ بات بے بات لوگوں سے الجھتے، ملازموں پر برستے اور بستر مرگ پر پڑی مہناز پر طنز کے تیر برساتے جن کا پیدا کیا بیٹا ایسا نافرمان نکلا تھا۔ جب کبھی جمال کی طرف سے رابطہ نہ کرنے کا سوچ کر ان کو خیال آتا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک پُرمسرت زندگی گزار رہا ہوگا ان کے اندر آگ سی لگ جاتی۔ وہ اس حقیقت کو قبول کر ہی نہ پاتے تھے کہ جمال نے ان پر اس لڑکی کو ترجیح دی تھی۔ ٹھیک سات ماہ بعد آدھی رات کو ان کے اندر جلتی آگ پر جمال کی غیر متوقع کال نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تھے۔

''آپ ٹھیک کہتے تھے ڈیڈی، مڈل کلاس لوگوں کی ذہنیت ہی الگ ہوتی ہے۔'' جمال کے اعتراف کا سلسلہ سلام کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔

''اس کے دن رات ماں کو سپورٹ کرنے کے چکر میں گزرتے ہیں اور میں اور میری ذات بالکل ہی منفی ہوتی جارہی ہے۔'' جمال بولے جارہا تھا اور ان کے اندر بھڑکتی آگ ٹھنڈی پڑتی جارہی تھی۔

''اچھا کیا جو تم نے یہ تجربہ کر کے خود جان لیا کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا' میں تمہیں کیا سمجھاتا تھا۔'' انہوں نے اپنے دل کی خوشی پر قابو پاتے ہوئے مدبرانہ انداز سے کہا۔ ''ورنہ شاید تم کو پچھتاوا ستاتا رہتا۔''

اس کال کے ٹھیک دس دن بعد جمال ان کے روبرو تھا۔

''وہ خود ہی چلی گئی۔ اسے پتا چل گیا تھا وہ میرے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔'' اس نے مژدہ جاں فزا سنایا تھا۔ جمال نے ان سے معذرت کر لی تھی اور انہوں نے پدرانہ شفقت کے تحت اسے معاف بھی کر دیا تھا۔ اس کے چند دن بعد ہی مہناز کا انتقال ہو گیا اور پھر عظمیٰ امریکا اور جمال دبئی سدھار گئے۔

اس واقعے کے بعد وہ جمال کو وقت دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنی فنانشل لائف سیٹل کر لے اور اس کے بعد وہ اس کی اپنی مرضی سے شادی کر دیں۔

مگر روشانے کریم سے اتفاقیہ ملاقات نے ان کے نظریات، سوچ اور تعصبات کو پلٹا کر رکھ دیا تھا۔ روشانے جسے روشن کے نام سے جمال نے ان سے متعارف کروایا تھا' صبیحہ کی بیٹی تھی۔ صبیحہ جس سے چند گھنٹوں کے بے نام تعلق نے انہیں ایک عرصے مضطرب رکھا تھا۔ اگر صبیحہ کی بیٹی کا بیک گراؤنڈ اعتراض کی وجہ تھا تو وہ خود کون تھے، ان کا پس منظر کیا تھا۔ وہ کب اتنے اونچے، اتنے ناقابل رسائی ہو گئے تھے کہ صبیحہ کی اولاد ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے جمال کی پسند کو ریجیکٹ کرنے پر خود پر نفرین بھیجنے میں وہ دن گزار دیا اور وہ رات روشانے کریم جیسی لڑکی کو اپنی زندگی سے بے دخل کر دینے پر جمال کی بد قسمتی پر کڑھتے گزار دی تھی۔

☆☆☆

''مجھے نہیں معلوم امی سے آپ کا کیا تعلق تھا۔ مجھے آپ میں جمال کی شبیہہ نظر آئی تھی۔ آپ کی گفتگو' مسکرانے کا انداز اور آپ کی باتیں سب جمال کی جھلک دکھاتی تھیں۔ آخری دن تک مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ جمال کے ڈیڈی ہیں۔'' شندور سے واپس اسلام آباد پہنچتے ہی جب انہوں نے روشانے کو فون کیا تو اس نے انہیں بتایا تھا۔

جواب میں انہوں نے اسے صبیحہ سے اپنے تعلق کی داستان سنا دی۔

''اتنے سالوں بعد امی کے ان الفاظ کا عقدہ مجھ پر کھلا جو انہوں نے جمال کے جملے کیا میں کافی نہیں ہوں'' کے جواب میں کہا تھا۔'' دوسری طرف سے روشانے کی بھیگی ہوئی آواز آئی۔

''امی نے یقیناً جمال میں آپ کو دیکھ لیا تھا جب ہی انہوں نے کہا، ہاں تم کافی ہو۔''

بابر کمال کا دل رکنے لگا۔

''جب ہی امی نے میرے ان سے اپنی خود غرضی پر معذرت کرنے پر مجھ سے کہا تھا کہ بے غرضی کا نتیجہ بہت دیکھا، خود غرضی کا کیا نکلتا ہے یہ بھی دیکھتے ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی اور بابر کمال کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ الٹ ٹپ صبیحہ سلیقہ شعار صبیحہ بن جانے کی پاداش کی سزا پا کر مر چکی تھی۔ پھر وہ روشانے سے اکثر اسکائپ پر گفتگو کرنے لگے۔

''دادی، جو میری اصلی دادی نہیں تھیں بتایا کرتی تھیں کہ امی کسی زمانے میں بہت پُرکشش، ضدی اور باغی ہوتی تھیں۔'' ایک دن اس نے بتایا۔

''میں جب اپنی مرنجان مرنج، راضی بہ رضا اور محنت کش ماں کو دیکھتی تو حیران ہوتی کیا یہ عورت، سرکش' ضدی، باغی، پھوہڑ اور بدسلیقہ ہو سکتی تھی۔ امی سے ایک روز پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو بولیں ہاں میں ویسی ہی تھی۔ پھر مجھے ایک وعدے کی زنجیر نے بدل دیا۔ میرا مزاج سرکش ہونے لگتا تو زنجیر جھٹکا لگاتی تمہیں کوئی منع کر گیا ہے۔ چڑنا، جھلانا اور سب سے جھگڑنا چھوڑ دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا اور میں ایسی ہو گئی۔''

بابر کے دل میں جیسے اکٹھے کئی تیر پیوست ہو گئے۔

''میرا خیال تھا امی باغی، سرکش اور لڑاکا رہتیں تو اچھی رہتیں۔ امی کو نانی نے اپنے نکھٹو پوتے اسلم سے بیاہ دیا۔ امی کا سارا دن جڑی بوٹیاں پیس کر رنگ برنگی گولیاں اور شربت بنانے میں گزر جاتا اور نکھٹو شوہر حکمت کے نام پر خواتین سے دوستیاں مٹھارتا ...... امی کی نانی نے وہ گھر امی کے نام کر دیا اور جب ان کا انتقال ہوا تو اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد نکھٹو پوتا بھی رات کا سویا صبح اٹھا ہی نہیں۔ امی آزاد ہو گئیں،

ہم لوگ

رات کے اندھیرے سے ڈرتے ہیں قبر سے کیوں نہیں ڈرتے۔ سانپوں سے ڈرتے ہیں نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ بچھو سے ڈرتے ہیں پر قرآن پاک کی تلاوت کیوں نہیں کرتے۔ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں، شیطان سے کیوں نہیں۔ ہم لوگ جنت میں جانا چاہتے ہیں پر مسجد کیوں نہیں جاتے، رشوت تو دے لیتے ہیں پر غریب کو کھانا کیوں نہیں کھلاتے۔ غیبت تو کر لیتے ہیں پر اچھے کام کی تبلیغ کیوں نہیں کرتے۔ گانے گاتے ہیں درود نہیں پڑھتے۔ تین گھنٹے کی فلم تو دیکھ سکتے ہیں پر دس منٹ کی نماز ادا کیوں نہیں کر سکتے۔

سوچیے گا ضرور......؟

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

اسلم سے امی کی کوئی اولاد نہیں تھی مگر دادی عارفہ نے زبردستی امی کا نکاح ابا سے کروا دیا جو اُن کے بھتیجے تھے۔ انہیں اس گھر میں رہنے کا جواز چاہیے تھا۔ یوں امی خدمت گزاری کے نئے چکر میں پڑ گئیں اب کے اولاد بھی ہو گئی اور ذمے داریاں بھی بڑھتی گئیں۔ ابا ٹی بی کے دائمی مریض تھے۔ ہم نے انہیں ہمیشہ کھانستے اور خون تھوکتے ہی دیکھا۔ امی ان کی خدمت گزاری کے ساتھ حکمت، سلائی اور دوسری محنت مزدوریوں میں عمر گزار گئیں۔ ابا مر گئے، دادی عارفہ مر گئیں اور مولسری والا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ ہمارا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی وہیں گزری۔''

''اوہ میرے خدا...... اتنا کچھ ہوا، ہوتا رہا اور ہم بے خبر رہے۔'' بابر نے پیشانی مسلی۔ ''صبیحہ...... ایک احمقانہ مشورہ تمہاری زندگی کو یوں لے ڈوبے گا میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" اور اب یہ......" انہوں نے اپنے سامنے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر موجود لڑکی کو دیکھا۔ "اس کی زندگی بھی میری وجہ سے...... میرے بیٹے کی وجہ سے یوں برباد ہوئی جارہی ہے۔"

"روشانے ...... میں تمہارا اور تمہاری ماں کا قصوروار ہوں۔ مجھے قصاص ادا کرنے کی مہلت دو بیٹا۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اسکرین سے آؤٹ ہوگئے۔

☆☆☆

"کیا ہو رہا ہے ڈیڈی؟" جمال چھٹی پر آیا ہوا تھا اور باپ کو اپنے کیمروں، فوٹو البمز اور لیپ ٹاپ میں الجھے دیکھ کر اُن کے قریب آ گیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مصروف انداز میں بولے۔ "اس بار کے شندور ٹرپ کی تصویریں محفوظ نہیں کر پایا تھا۔ وہ کر رہا ہوں۔ دیکھو گے؟"

"شیور۔" وہ ان کے قریب بیٹھ گیا اور لیپ ٹاپ پر شندور ٹرپ کا سلائیڈ شو اسٹارٹ ہو گیا۔ ڈیڈی واکنگ اسٹک پکڑے کسی پہاڑ پر کھڑے مسکراتے ہوئے۔ ڈیڈی اور غیر ملکی سیاحوں کا گروپ فوٹو، شندور ٹاپ پر موجود ٹینٹ ویلج، پولو میچز کی تصویریں، ڈیڈی اور ان کی دوست کارا، ڈیڈی اور پورٹرز، ڈیڈی اور...... جمال تصویریں دیکھتے ہوئے دل میں سوچ رہا تھا مگر دسویں تصویر پر وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ڈیڈی اور سرخ مفلر اور جیکٹ میں ملبوس وہ لڑکی، پولو میچ کے دوران، ٹراؤٹ فشنگ کرتے ہوئے، ٹریکنگ پر ہارس رائیڈنگ کے دوران، چترال میں مختلف جگہوں پر، لنچ اور کیمپ فائر کے دوران، جمال کے اعصاب تن گئے۔

"ڈیڈی یہ......؟" اس نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا۔

"ہوں...... کیا؟" وہ سر جھکا کر کیمرے کا لینس ٹھیک کر رہے تھے، اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"یہ......" جمال نے لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں بابر کمال اور روشانے چترالی پٹی کے کوٹ پہنے مسکرا رہے تھے۔

"ارے ہاں، یہ روشانے کریم ہے۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "بہت دلچسپ لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وقت گزرا اس دفعہ......"

جمال منہ کھولے ان کی بات سن رہا تھا۔ وہ دوبارہ کیمرے کے لینس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد جمال نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی اور ان تصویروں کو دوبارہ دیکھنے لگا جو ڈیڈی نے روشانے کریم کے ساتھ کھنچوائی تھیں۔ "اس لڑکی کے بارے میں کوئی خاص بات ڈیڈی۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"اوہ ہاں۔" وہ سر اٹھا کے بولے۔ "یار یہ بہت ٹیلنٹڈ لڑکی ہے۔ میں اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ بہت پڑھی لکھی، میچور، سمجھدار، شریف، باکردار اور سلیقہ مند لڑکی ہے۔ وہ کسی کی بھی آئیڈیل ہو سکتی ہے۔" جمال نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"ڈیڈی!" پون گھنٹے کی خاموشی کے بعد کمرے میں جمال کی آواز ابھری۔ انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ جانتے ہیں یہ کون ہے؟"

"بتایا تو ہے یہ روشانے کریم ہے، لاہور میں کسی کمپنی میں بہت اچھی جاب کر رہی ہے۔"

"یہ روشن ہے ڈیڈی۔" جمال کی آواز آئی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم یقیناً مذاق کر رہے ہو۔" انہوں نے کہا۔

"یہ روشن ہے ڈیڈی۔" جمال کی آواز بلند ہوئی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ وہی لڑکی ہے جس سے شادی کرنے کے خیال پر آپ نے مجھے بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔ جس کے بارے میں آپ کا خیال تھا کہ جتنا مرضی بڑھ جائے ان کے اندر کا کامپلیکس جا ہی نہیں سکتا۔ مسکینی اور کنجوسی ان کی شخصیت کا خاصہ

ہوتی ہے۔ وہ لڑکی جس سے شادی کے فیصلے پر پچھتاوے کو میری ایک عمر نا کافی ہے۔ اور جسے انہی لیکچرز کے زیرِ اثر میں نے سات ماہ کے اندر ہی پرکھ کر چھوڑ دیا۔ آپ کی وجہ سے صرف آپ کی وجہ سے۔" وہ انگلی سے ان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "اب یہی لڑکی پڑھی لکھی، شریف، باکردار، میچور، سلیقہ مند لگی آپ کو۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تم اسے چھوڑ دینے کے لیے مجھے ملزم قرار نہیں دے سکتے۔" انہوں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اگر یہ وہی لڑکی ہے تو تمہیں اپنے انتخاب پر فخر ہونا چاہیے تھا۔" انہوں نے اسکرین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم نے اس سے محبت کی اور پھر شادی کی۔ یہ لڑکی تمہارے لیے اتنی اہم تھی کہ اس کے لیے تم نے ہمیں چھوڑ دیا۔ میں نے تمہیں شادی سے منع کیا تھا، اس کو چھوڑنے پر میں نے تو مجبور نہیں کیا تھا۔" انہوں نے جمال کی طرف دیکھا۔ "اگر وہ محبت تھی...... اگر وہ جنون تھا تو کیا محبت اور جنون کی بس اتنی ہی عمر ہوتی ہے۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں جمال سے پوچھا۔ "کیا محبت اور جنون ہانڈی کا ابال ہوتی ہے، بوائلنگ پوائنٹ پر کنارے سے باہر اور آنچ بند ہونے پر پیندے سے لگ جانے والی۔"

"نہیں صاحبزادے۔" کچھ دیر جمال کی طرف دیکھنے اور جواب نہ ملنے کے بعد انہوں نے سر ہلایا۔ "محبت کی ہانڈی کے نیچے آنچ کا ہائی پوائنٹ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ محبت اگر ہونی ہوتی ہے تو پھر آنچ چاہے بہت ہلکے پوائنٹ پر ہو یہ اپنی تمازت قائم رکھتی ہے۔ یہ سرد نہیں پڑتی۔ یہ ختم نہیں ہو جاتی۔ جو ہو جاتی ہے وہ محبت نہیں ہوتی۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ جمال دم بخود بیٹھا ان کی بات سن رہا تھا۔

"اگر یہ وہی لڑکی ہے تو تمہیں اسے سر آنکھوں پر بٹھائے رکھنا چاہیے تھا کیونکہ تمہارے لیے اس نے اپنی ماں سے کمٹ منٹ کو توڑا تھا۔ تم نے اسے ایک نئے جہنم زار میں کیوں دھکیل دیا۔ تم نے اسے تنہا کیوں چھوڑ دیا۔"

"بہت سی غلط فہمیاں...... آپ کی ناراضی کا نفسیاتی اثر، اس کی بے نیازیاں، اس کی امی کی ضرورتیں، میرا جذباتی پن!" جمال نے اعتراف کرنا شروع کیا۔ "میرے اور اس کے درمیان حائل ہونے لگے۔"

"اس لیے کہ وہ محبت نہیں محض ایک جذباتی کیفیت تھی۔" بابر کمال نے اس کو جتایا۔

"نہیں۔" جمال تڑپ کر بولا۔ "وہ محبت تھی...... خدا کی قسم وہ محبت تھی۔"

"پھر اتنی کم عمر تھی اس کی... کیوں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"آپ کو میں نے بتایا نا۔" جمال نے کہا۔ "اس کے اور میرے ماحول کا فرق۔"

"تم نے اس سے کہا تھا تمہارے لیے اس کا ہونا کافی ہے۔ کہا تھا یا نہیں؟" انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

"اوہ...... تو آپ سب جانتے ہیں۔" اب کے جمال ٹھٹکا۔

"ہاں اتفاق سے۔" انہوں نے سر جھکایا۔ "بالکل اچانک، بغیر توقع کے...... میں سب جانتا ہوں۔" وہ دونوں خاموش ہو گئے جیسے ایک دوسرے سے بچنا چاہ رہے ہوں۔

"جمال!" پھر بابر کمال کی آواز ابھری۔ "یہ لڑکی صبیحہ کی بیٹی ہے۔" انہوں نے کہنا شروع کیا اور جمال سنتا رہا۔

"کیا اتفاق ہے کہ ماں کو جس باپ نے عمر تباہ کرنے پر لگایا، بیٹی کو اسی کے بیٹے نے وقتی جذباتیت کا نشانہ بنا دیا۔" اپنی بات کے اختتام پر انہوں نے کہا۔

"آپ اس کو وقتی جذباتیت مت کہیں ڈیڈی۔" جمال کے لہجے میں سختی تھی۔ اس پر باپ سے سنی داستان کے دھچکے کا اثر بھی تھا۔ "وہ محبت تھی، وہ محبت تھی۔" اس نے دُہرایا۔

"وہ محبت تھی...... یہ میں نے اس سے دور چلے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

جانے کے بعد جانا، میرا دن اس کی یاد میں تڑپتے گزرتا ہے اور رات اس کے فراق میں جلتے۔ اگر یہ محبت نہ ہوتی تو میری یہ کیفیت بھی نہ ہوتی۔“

”تو...... کیوں...... اس سے رجوع نہیں کیا۔“ انہوں نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔”کیوں اسے نہیں بتایا کہ اس سے دور رہ کر تم نے کیا محسوس کیا ہے۔“

”انا آڑے آتی رہی۔“ ایک اور اعتراف آیا۔

”گدھے! کبھی محبت میں بھی کوئی انا ہوتی ہے۔“ وہ ڈپٹ کر بولے۔”اسی لیے تو کہتا ہوں تم غلط کہتے ہو کہ یہ محبت تھی۔“ انہوں نے اسکائپ آن کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو روشانے، کیسی ہو بیٹا؟“ وہ اسکرین کے سامنے بیٹھے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ بتائیں۔“ کمرے میں وہ مانوس آواز ابھری تھی۔ جمال نے دل میں بے چینی محسوس کی۔

”روشانے کیا تم مجھے اپنی امی کی امنگوں کا قتل معاف کرسکتی ہو؟“ وہ کہہ رہے تھے۔

”میری امی کہتی تھیں جو کچھ ہوتا ہے اسے ہونا ہی ہوتا ہے، لوگوں کو قصوروار ٹھہرانے کا کیا فائدہ۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”تمہاری امی گریٹ تھیں، روشانے کیا تم بھی اتنی ہی گریٹ ہو۔“ وہ کہہ رہے تھے۔

”میں بہت عام سی لڑکی ہوں، میرے رویے بھی عام انسانوں والے ہیں۔“ اس کی آواز آئی تھی۔

”اگر میں تم سے ایک اور معافی کا طلب گار ہوں تو کیا تم معاف کردوگی؟“ انہوں نے پوچھا۔ جواب میں خاموشی تھی۔ جمال کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”وہ آپ کا قصور نہیں تھا آپ کا ری ایکشن فطری تھا۔“ کچھ دیر بعد جواب آیا۔

”تو پھر جس کا قصور تھا۔ اسے معاف کرسکتی ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔ جواب میں پھر خاموشی چھا گئی۔ جمال اپنی جگہ سے اٹھ کر باپ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”روشن...... کیا تم صبیحہ آنٹی جیسی فراغ دل ہو۔“ اس نے بے قراری سے کہا اور روشانے نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ شخص جو اس کے دل میں بستا تھا، وہ آواز جو اس کی روح کے ساتھ تھی کتنے عرصے بعد دکھائی اور سنائی دیے تھے۔

”وہ بے غرض تھیں۔ میں خود غرض ہوں۔“ الفاظ بے اختیار اس کے منہ سے نکلے تھے۔

”بے غرضی نے زندگی ضائع کردی۔ کیا خود غرضی زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔“ جمال نے سوال کیا۔ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

روشانے نے جمال کے جڑے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر بابر کمال کی طرف......

”مان جاؤ روشانے کہ محبت کی حدت مدھم آنچ پر بھی قائم رہتی ہے۔ مان جاؤ کہ تمہاری شخصیت پر چھائی یاسیت اور تلخی محبت کا نتیجہ ہے۔“ بابر اسے اکسا رہے تھے۔

”محبت اعزاز ہوتی ہے، خیرات نہیں۔“ وہ بولی۔ اس کے اس جملے نے بابر کمال اور جمال کو دم بخود کردیا تھا۔

”محبت کرنے والوں کے درمیان ذات کی نفی، وقت کی کمی، مالی مسائل اور ذاتی رکھ رکھاؤ حائل نہیں ہوتے۔ محبت شیئرنگ کا دوسرا نام ہے۔ بے گانگی کا نہیں۔ محبت کتاب ہے اخبار نہیں جو آج پڑھا کل باسی ہو جائے۔ محبت ٹشو پیپر کا باکس نہیں جسے استعمال کر کے پھینک دیا جائے۔ محبت، عطر میں بھیگا وہ رومال ہے جو ہزار بار دھل جانے پر بھی عطر کی مہک دیتا رہتا ہے اور ہر وقت استعمال میں رہتا ہے۔“ وہ بولتی جارہی تھی اور بابر کمال اور جمال کے پاس اس کے ایک بھی جملے کا جواب نہیں تھا۔

”روشانے۔“ پھر بابر کمال نے تھوک نگلتے

ہوئے کہا۔ "تم جو کہہ رہی ہو اس کا حرف، حرف سچ ہے مگر یاد رکھو یہ محبت ہی ہے جس کا ظرف اتنا وسیع ہوتا ہے کہ محبت کی نفی کرنے والے کے اعترافِ جرم پر اسے معاف بھی کر دیتی ہے۔" کچھ لمحے توقف کے بعد بولے۔

"تم صبیحہ کی بیٹی ہو، جو ایک وعدے کی زنجیر پر زندگی لٹا دینے کی قائل تھی۔ تم اتنی پتھر دل نہیں ہو سکتیں کہ تمہارا مجرم تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہو اور تم معاف نہ کرو۔ کہو تو جمال کے ساتھ میں بھی ہاتھ جوڑ دوں۔" انہوں نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"پلیز آپ......" روشانے نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

"جمال کل ہی تمہارے پاس آ رہا ہے، دیکھتے ہیں اس نادان کی محبت حاوی ہوتی ہے یا تمہاری ناراضی۔" انہوں نے آخری بات کہی۔

☆☆☆

شندور فیسٹول کا آغاز ہو چکا تھا۔ بابر کمال حسبِ معمول اس کے آغاز سے ایک دن پہلے ہی یہاں موجود تھے۔ پرانے دوستوں، ملاقاتیوں، نظاروں کو دیکھنے، ٹینٹ میں ساتھیوں کے ساتھ انڈور گیمز کھیلنے کے دوران ان کی آنکھیں جیسے کسی کی منتظر تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ گزشتہ شندور پولو فیسٹول میں گزرے واقعات بھی یاد کر رہے تھے۔ ایک دن گزرا، دوسرا دن بھی گزر گیا اور تیسرے دن جیسے ان کی منتظر نظروں کو قرار آ گیا۔

روشانے اس بار جمال کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔ اس بار یہ جوڑا ان کی خاص دعوت پر یہاں آیا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کو جیسے وہ جی اٹھے تھے۔ روشانے کے چہرے پر اس بار حقیقی مسرت تھی۔ اس کی گفتگو میں امید اور خوشی تھی۔ وہ بات بے بات مسکرا رہی تھی۔ انہوں نے جمال کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور سکون بھی۔

"ہاں، وہ محبت ہی تھی وقتی جنون نہیں تھا۔"

انہوں نے سوچا۔ اور اس طویل عرصے کو یاد کیا کے دوران جمال اور وہ روشانے کو منانے میں مشغول رہے تھے۔ بے غرض ماں کی خود غرض بیٹی کو چوٹ کھائے جذبات کا دکھ تھا اور وہ ماں کی طرح محبت روایات کو نبھانے کی خاطر جمال کو rejoin کر کی قائل ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ایک بار دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ دو تمہیں مجھ محبت نہیں رہی، میں واپس چلا جاؤں گا۔" آخر کا جمال نے کہا اور اس کی ساری دلیلیں ختم ہو گئی تھیں۔

"محبت میں انا نہیں ہوتی، محبت میں انتقام بھی نہیں ہوتا۔" بابر نے روشانے سے کہا تھا اور اس نے سر جھکا دیا تھا۔

☆☆☆

روشانے اور جمال شندور ٹاپ پر اِدھر اُدھر گھ رہے تھے اور انہیں یوں اکٹھا دیکھ کر بابر کمال کے سینے میں سکون اتر گیا تھا۔

"صبیحہ! مجھے امید ہے قصاص قبول کر چکی ہو گی تم۔" انہوں نے تصور میں بیٹھی ایک شبیہہ کو مخاطب کیا اور ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

صرف ایک سال بعد، یہ وہی جگہ تھی، وہی منظر اور وہی گہما گہمی مگر اس کا دل خوش تھا، مطمئن تھا اور پرسکون بھی۔

"میری خود غرضی نے ان لوگوں کو بتا دیا کہ طبقاتی فرق اہم ہوتا ہے یا دل میں بسے جذبے۔" روشانے نے بھی کسی نادیدہ شبیہہ کو دل میں مخاطب کیا۔ "اور اگر لوگ اعتراف کر لیں اور اقرار بھی تو محبت تو واقعی اعلیٰ ظرف ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے پتا ہوتا ہے جو ہونا ہے اسے ہونا ہی ہوتا ہے۔ لوگوں کو قصور وار ٹھہرانے کا کیا فائدہ۔" اس نے سوچا اور شندور جھیل کے شفاف پانیوں کی طرف دیکھا۔ شام کے اترتے اندھیروں میں جہاں آس کے روشن جگنو اور امید کی جل پریاں رقصاں تھیں۔

ہم الزام ان کو دیتے تھے

سلمیٰ غزل

وہ دن کس قدر خوب صورت اور حسین تھے جب میں امریکا کی ایک مشہور یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا اور ایک سال بعد میں چھٹیوں میں حویلی آیا تھا۔ حویلی میں عجیب طرح کی چہل پہل تھی۔ جب سے دادا کا انتقال ہوا تھا پہلی بار حویلی میں یہ رونق نظر آ رہی تھی ورنہ ان کی زندگی میں ان کا رعب و دبدبہ، اصول پسندی اور سخت رویہ اس طرح کی ہر خوشی پر حاوی تھا اور یوں لگتا تھا کہ لوگ سانس بھی اُن سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پوچھ کر لیتے ہیں شاید اسی وجہ سے دادی بھی ایک دن سانس لینا بھول گئیں اور خاموشی سے سوتے سوتے گزر گئیں۔ میں چھوٹا تھا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب دادا ہاتھ میں عصا پکڑے اور سر پر پگڑی باندھے اپنے کمرے سے نکلتے تھے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔ اُن کی مرضی کے خلاف کسی کی بات کرنے کی مجال نہیں تھی۔ وہ پٹھان تھے اور پٹھانوں والی تمام خاصیتیں اُن میں موجود تھیں، سخت دل، بے رحم اور ضدی...... مردوں کو ہر طرح کی آزادی تھی لیکن خواتین پر ہر طرح کی پابندیاں۔ گھر کے تمام لڑکوں سے لے کر خود دادا تک بیرونی ممالک سے ڈگری یافتہ تھے لیکن لڑکیوں کو پانچویں جماعت سے زیادہ اسکول جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب چھوٹے چچا نے اپنی پسند کی شادی کا اعلان کر کے حویلی کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ چچی فرخندہ نے یونیورسٹی میں اُن کے ساتھ پڑھا تھا پھر چچا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکا چلے گئے لیکن چچی سے ان کا رابطہ بدستور رہا اور پھر چچا کی ضد کے آگے دادا کو ہار ماننی پڑی اس شرط پر کہ چچی حویلی میں ان کے اصولوں کے مطابق زندگی گزاریں گی۔

اب میں سوچتا ہوں کہ کسی نے سچ کہا ہے عشق اندھا ہی نہیں گونگا بہرا بھی ہوتا ہے جو چچی نے ان کی ہر شرط مانتے ہوئے حویلی کے اصولوں پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اپنا کیریئر، اپنے بہن، بھائیوں اور ماں کی محبت...... کوئی بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھا۔ چچی بے حد ملنسار، خوش اخلاق اور خوش مزاج تھیں، میں تو ان کا دیوانہ تھا۔

پھر مجھے مری کانونٹ بھیج دیا گیا اور میرا گھر والوں سے تعلق واجبی سا رہ گیا۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے، حویلی میں لوگ کس طرح رہ رہے ہیں میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ چچا کی دو بیٹیاں تھیں نازش اور بینش جو اس وقت پرائمری اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ میرے بعد کیا ہوا مجھے خبر نہ ہوئی لیکن جب میں چھٹیوں میں گھر آیا تو چچی اور ان کی بیٹیاں حویلی میں موجود نہیں تھیں اور کسی نے کچھ بتایا بھی نہیں۔ لڑکپن ایسا ہی ہوتا ہے بے فکر، بے پروا اور بیگانہ......

اور آج جب میں ایم بی اے مکمل کر کے حویلی لوٹا تو فراز نے بتایا کہ ''چھوٹی چچی آئی ہوئی ہیں۔''

اس دن میں نے نازش کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ہیرے جیسی چمک تھی، چال میں شہزادیوں جیسا وقار تھا، چہرے پر فرشتوں جیسا تقدس تھا اور ہنسی میں جھرنوں کی نغمگی، کلیوں کا سا حسن اور معصومیت! میں لمحے بھر کو مبہوت رہ گیا۔

امی بڑے سے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں، مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو کر بولیں۔ ''صبح سے کہاں غائب تھے۔ اتنے سال بعد آئے ہو، میرا دل نہیں کرتا کہ ایک منٹ بھی تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل ہونے دوں۔''

ان کو پیار دے کر میں چچی کی طرف گھوما ان کے چہرے پر بلا کا نور اور تقدس تھا۔ انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر گلے لگا لیا۔ وہ بے آواز رو رہی تھیں، ماحول ایک دم سوگوار ہو گیا ہمارے پرانے اور جدی پشتی ملازم فیض بابا نے آ کر اس ماحول کو بدلا۔ وہ چائے لائے تھے۔ چائے پی کر سب لان میں آ گئے جہاں نازش میری چھوٹی بہن صوبیہ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکا سا حجاب چھا گیا اور اس نے دوپٹا کھول کر اپنے شانوں پر پھیلا لیا۔

''نازش، بینش کہاں ہے؟ صبح سے وہ نظر نہیں آ رہی......؟'' بینش کے ذکر پر نازش کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا۔ اس نے کچھ بولنے سے پہلے ہی سختی سے ہونٹ بھینچ لیے ایک اضطراری کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میری سوالیہ نظریں اٹھتی دیکھ کر صوبیہ جلدی سے بولی۔

''بینش باجی کی ڈیتھ ہو گئی۔''

''ہیں، یہ کب ہوا اور مجھے کسی نے بتایا کیوں

نہیں؟'' میں دکھ سے بولا۔

''آپ سے ہمارا رابطہ ہوتا تو معلوم ہوتا نا! چار سال ہو گئے۔'' نازش نے تلخی سے جواب دیا۔

''ہوا کیا تھا، وہ تو بچپن ہی سے خوب صورت اور صحت مند تھی۔''

''موت کا شکنجہ جوان، خوب صورت اور صحت مند نہیں دیکھتا جس کی آتی ہے وہی جاتا ہے اور آپ کے لیے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ اپیا اب ہم میں نہیں۔'' نازش کی آواز بھرا گئی اور وہ بھاگتے ہوئے اندر حویلی میں چلی گئی۔

☆☆☆

مجھے بینش کی جوان موت کا بڑا دکھ تھا جو ایک معما تھی بلکہ میرے لیے تو چچی کا اچانک حویلی چھوڑ کر جانا اور پھر واپس لوٹنا بھی حیران کن تھا۔

ہماری یہ حویلی بڑی پرانی اور قدیم تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بلکہ دادا کے انتقال کے بعد اس کو جدیدیت...... کا رنگ دے دیا گیا تھا لیکن اس حویلی کے مکینوں کا اپنا ایک الگ طرزِ معاشرت تھا۔ اپنی روایتیں اور اپنے قوانین تھے جن سے علیحدگی ناممکن تھی۔ ہر شخص پر ان کی پابندی لازمی تھی جو بھی یہاں آتا تھا اس کو یہاں کی روایتوں اور قوانین کا امین بننا پڑتا تھا۔ صدیوں پرانی روایتوں کو میرے ابو، امی بڑے ہونے کے ناتے بڑی مشکلوں سے سہارا دیے ہوئے تھے اس لیے اب تک حویلی کا شیرازہ نہیں بکھرا تھا مگر دادا کے انتقال کے بعد اتنی تبدیلی ضرور آ گئی تھی کہ لڑکیوں کو پڑھنے کی آزادی مل گئی تھی۔ میری چھوٹی بہن صوبیہ کالج میں پڑھ رہی تھی اور میری پھپھو کی بیٹیاں بھی پڑھنے کی خاطر لاہور کے ہاسٹل میں رہ رہی تھیں جو دادا کی زندگی میں ناممکن تھا۔

☆☆☆

اس دن موسم بے حد خوش گوار تھا۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ میری چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور میرا دل روز بروز نازش کی زلفوں کا اسیر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مزاج بھی تھی، اس کا شعری ذوق اعلیٰ درجے کا تھا اور اکثر وہ لائبریری میں پائی جاتی تھی۔ ایک دن اسے تلاش کرتے ہوئے میں لائبریری میں جا پہنچا۔

''بہت بور ہو تم!'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے برا سا منہ بنایا۔

''کیوں......؟ میں نے کیا کیا ہے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''یار سارا دن تم یہاں گھسی رہتی ہو اور میں باتیں کرنے کو ترس جاتا ہوں۔ دو دن تو رہ گئے ہیں میرے واپس جانے میں۔''

''ارے آپ اتنی جلدی جا رہے ہیں؟''

''کہو تو نہ جاؤں؟'' میں نے اچانک سوال کیا تو وہ گھبرا کر بولی۔

''ارے نہیں، میرا مقصد یہ نہیں تھا، ہم تو خود اگلے مہینے یونیورسٹی کھلنے پر شہر چلے جائیں گے۔'' پھر وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''اُف اللہ! میرے بچپن کے زمانے کی کتابیں آج تک یہاں موجود ہیں۔''

''تمہیں اپنا بچپن یاد ہے؟'' مجھے اس کے حافظے پر تعجب ہوا۔

''اچھی طرح حرف بہ حرف، ایک، ایک لمحہ، ایک، ایک بات، بھلا کوئی اپنا ماضی بھی بھولا ہے۔ وہ ماضی جو......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی، حقارت تھی، بغاوت تھی، نفرت تھی...... طنز تھا، اس کا چہرہ جذبات کی گرمی اور غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ میں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ششدر رہ گیا اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ لائبریری چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

دو دن بعد جب میں حویلی سے نکلا تو نازش کا احساس میرے ساتھ تھا، اس کی خوشبو نے میرا گھیراؤ کیا ہوا تھا اس لیے بھائی جان کے گھر جب بیٹے ہونے کی خوش خبری ملی تو گھر آتے ہوئے مجھے ہمیشہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔
احتشام بھائی کی شادی کے چار سال بعد ریان کی آمد نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی، سب بے حد خوش تھے دنیا جہان کی رسمیں کی جا رہی تھیں جشن کا سماں تھا۔ کام کر کر کے میں تھک گیا تھا اور وہ چھوٹی موئی نازش تو بالکل ہی بے دم ہو گئی تھی۔ رات گئے جب میں نے سونے کا ارادہ کیا تو پتا چلا میرے کمرے میں پھپو کی فیملی براجمان ہے۔ میں جلا بھنا ڈرائنگ روم میں آیا تو دیکھا نازش بے سدھ صوفے پر سو رہی ہے۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور بھولپن تھا، دل چاہا اس کو اٹھا کر ڈھیر ساری باتیں کروں۔ میری آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی، مجھے دیکھ کر وہ گھبرا کر اپنا دوپٹا سنبھالنے لگی۔
''تم سو جاؤ نازش، میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔'' میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔
''نہیں، نہیں آپ یہیں لیٹ جائیں، میں امی کے پاس چلی جاتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔
''سنو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' میں نے التجا کی اور اس کے قریب ہو گیا۔ میری نگاہوں میں نہ جانے کیا تھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں شاید اس کو میری نگاہوں سے وہ سب کچھ محسوس ہو گیا تھا جس کے لیے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر اس کا جواب بڑا سرد اور کورا تھا۔
''نہیں، آپ کے پاس بیٹھنے کے لیے میرے پاس نہ وقت ہے اور نہ جگہ، یہ مہربانی آپ کسی اور پر کریں۔'' اس نے یہ الفاظ کچھ اس انداز میں کہے جیسے وہ جان چکی ہو کہ میرے دل میں اس کے لیے کیا مقام ہے۔
''نازش میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ مجھے ناپسند کرنے کی تمہارے پاس کوئی ٹھوس وجہ ہو گی۔'' میں نے آخر کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
''کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ میں مجبور ہوں آپ کو بغیر کسی ٹھوس وجہ کے ناپسند کرتی ہوں۔'' نازش نے جواب دیا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے گریز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اماں سے کہوں گا اگلی مرتبہ میرے آنے پر چچی سے میرے لیے اس کا ہاتھ مانگ لیں۔

☆☆☆

اماں اور بھائی جان سے تقریباً روز ہی فون پر بات ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھار چچی سے بھی میں موبائل پر ہیلو ہائے کر لیا کرتا تھا لیکن اس دشمنِ جاں نے تو مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی، اس کا موبائل عموماً آف ہی ملتا تھا پھر اچانک امی کے ارجنٹ بلاوے پر مجھے آنا ہی پڑا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ گھر میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی، حویلی پر نیا رنگ و روغن ہوا تھا، میرے کمرے میں جہازی سائز نیا بیڈ ڈالا گیا تھا۔ حریری پردوں اور ایرانی قالین کی وجہ سے کمرا چمک رہا تھا۔
''یہ سب کیا ہے امی؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔
''تمہاری شادی ہے اگلے ہفتے۔'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔
''ہیں......!'' میں صوفے سے ایک فٹ اوپر اچھل پڑا۔ ''مجھ سے بغیر پوچھے، بغیر بتائے میری پسند جانے بغیر۔'' میں بھنا کر بولا۔
''ماں ہوں تیری، تجھ سے زیادہ تجھے جانتی ہوں۔ کیا نازش پسند نہیں تجھے؟''
''اماں......'' میری چیخ میں خوشی کے سارے رنگ تھے اور اکثر جب میں زیادہ لاڈ میں آتا تو امی سے اماں پر پہنچ جاتا تھا۔ میں بے اختیار امی کے گلے لگ گیا اور ان کے ہاتھ چومنے لگا۔ بھیا اور بھابی ہنسنے لگے۔
''اچھا بس پرے ہٹو، زیادہ پھیلو مت، ابھی کیسے آنکھیں دکھا رہے تھے۔'' امی نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔ میں کھسیانا ہو گیا۔
''ارے میری، پیاری پیاری اماں وہ تو بس میں

ایسے ہی...... ارے ہاں یہ نازش ہے کہاں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ بھیا اور بھابی مسکرانے لگے۔
''وہ اب تمہارے سامنے نہیں آئے گی شادی ہونے تک۔'' بھابی نے مسکرا کر کہا۔
''لاحول و لاقوۃ! یہ کیا بات ہوئی اماں، بڑی واہیات رسم ہے بلائیں اسے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کٹ کھنی بلی کو دیکھنے کے لیے دل بے تاب تھا۔
''سمجھا کرو یار، اب ایک ہی مرتبہ اچھی طرح دیکھ لینا۔'' بھیا نے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری اور میں معاملے کی تہ تک پہنچ کر جھینپ سا گیا۔

☆☆☆

چند ہی دنوں میں حویلی شادی کے ہنگاموں سے گونج اٹھی اور سردیوں کی ایک حسین شام نازش میری زندگی میں آ گئی۔ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور دھڑکنیں سانس کی مدھر تال پر رقص کر رہی تھیں۔ میرا کمرا تازہ پھولوں سے مہک رہا تھا میری خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا میں نے بے تابی سے بیڈ کے چاروں طرف لٹکی ہوئی گلاب اور موتیے کی لڑیاں سرکائیں تو وہ بیڈ پر نہیں تھی اسی لمحے وہ واش روم سے باہر نکل آئی۔ اس نے عروسی جوڑا اتار کر سادہ سا سوٹ پہن لیا تھا، دھلا ہوا چہرہ میک اپ کے بغیر بھی خوب صورتی سے چمک رہا تھا۔ میں جو اس کا سجا سجایا روپ دیکھنے کا متمنی تھا حیران رہ گیا۔
''یہ سب کیا ہے نازش، ابھی تو تم نے مجھے خود کو دلہن کے روپ میں دیکھنے بھی نہیں دیا۔''
''دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ سب میری امی اور تائی امی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ میں اس شادی کے لیے قطعی راضی نہیں تھی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔
''کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔
''دکھا دی نا مردوں والی ذہنیت؟'' وہ تلخی سے بولی۔ ''میں تو شادی کے حق میں ہی نہیں تھی کسی سے بھی کہ شادی مرد سے ہوتی ہے اور مجھے مردوں سے نفرت ہے۔''
''تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟ آخر بے چارے مردوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تمہیں ان سے نفرت ہے؟'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔
''میں یہ سب بتانے کی پابند نہیں ہوں البتہ آپ جو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں تو آپ کی یہ آزمائش ہے۔ میں آپ کے ساتھ بیوی نہیں دوست بن کر رہنا چاہتی ہوں، اگر آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں تو میری مرضی کے خلاف زور زبردستی سے اپنا حق لینے کی کوشش مت کیجیے گا ورنہ میں کچھ بھی کر ڈالوں گی۔'' اس کا لہجہ اتنا سخت اور آہنی تھا کہ میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ میں جو اپنی قسمت پر نازاں تھا اور سمجھ رہا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں میرے قدم چوم رہی ہیں نازش کی باتوں پر ششدر رہ گیا۔ اس کا رویہ ناقابلِ فہم تھا میں مرد ضرور تھا لیکن نہ ہوس پرست اور نہ سفلی جذبات کا مطیع! اپنا جائز حق لینے میں بھی میں زور زبردستی کا قائل نہیں تھا پھر نازش تو میری اولین چاہت تھی اس کو تکلیف دینے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے تکیہ اور کمبل لے کر نزدیکی صوفے پر لیٹ گئی اور منہ تک کمبل اوڑھ لیا گویا اب کوئی بات کرنے کی گنجائش نہیں۔ دل تو چاہ رہا تھا تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دوں وہ کوئی غیر نہیں میری بیوی تھی اور خونی رشتہ تو ہمیشہ سے تھا۔ اس اچانک حادثے نے مجھے ادھ موا کر دیا۔ میں چاہتا تو زبردستی اپنے حقوق منوا سکتا تھا مگر میں نے اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ پورے یقین اور خلوص کے ساتھ وہ اپنے حقوق ادا کرے۔

☆☆☆

گھر میں دن بھر اس کا رویہ نارمل رہتا۔ امی کی وہ لاڈلی بہو اور بھابی کی چہیتی دیورانی تھی مگر رات میرے کمرے میں آتے ہی اس کا رویہ سرد اور---

بیگانہ ہو جاتا۔ میں ایک مہینے کی چھٹی لے کر آیا تھا لیکن میں نے ایک ہفتے بعد ہی واپسی کی رٹ لگا دی۔

''تم تو ایک ماہ کی چھٹی لے کر آئے تھے؟'' امی حیرانی سے بولیں۔

''کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہے اس لیے جلدی جانا پڑ رہا ہے اور پھر آپ کی بہو تو ہے آپ کے پاس۔'' میں نے حتی الوسع اپنا لہجہ شوخ بنانے کی کوشش کی۔

''ہاں تو نازش تمہارے ساتھ جائے گی، لو بھلا چار دن شادی کو ہوئے ہیں اسے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔'' امی کا لہجہ قطعی اور فیصلہ کُن تھا۔

''تائی امی میں ابھی آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔'' نازش نے چالاکی سے امی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے گریز کا راستہ اختیار کیا لیکن امی کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور اسے میرے ساتھ اسلام آباد آنا پڑا۔ رفتہ رفتہ میرا سکون چھنتا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زندگی پر چھائے اس جمود کو کیسے توڑوں۔ ہمارے درمیان اجنبیت کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھی۔ سوائے چند رسمی جملوں کے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بیگانے رویے سے میں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ وہ پلکیں جھکا کر نہ جانے خلاؤں میں کیا ڈھونڈتی رہتی۔ وہ سارا دن گھر میں اور میں آفس میں مصروف رہتا اس کو گھر سجانا بنانا اور سنوارنا خوب آتا تھا لیکن میری زندگی کی کشتی طوفانوں کے تھپیڑوں کی نظر ہو چکی تھی۔ وہ میرے لیے شجرِ ممنوع تھی اور اس کا قرب ناممکن۔ ہم دو اجنبیوں کی طرح ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے تھے، نہ جانے کیوں وہ اتنی سرد اور منجمد تھی ہر احساس سے عاری جیسے پتھر کی مورت اور اس کی شوخی و شرارت جانے کہاں کھو گئی تھی۔ وہ مجھ سے کترائی کترائی رہتی تھی حالانکہ میرا ہر کام وہ خود کرتی تھی مگر میری ہر سیدھی بات کا ایسا معنی خیز جواب دیتی کہ میں ساری رات الجھتا رہتا کہ وہ کیا کہہ جاتی ہے۔

میرا والہانہ پیار، وارفتگی اور جذباتی پن دیکھ کر اس نے ایک دن یہاں تک کہہ دیا۔

''ان تلوں میں تیل نہیں، بیکار اپنا وقت ضائع نہ کریں۔'' میرے دہکتے ارمانوں پر اوس پڑ جاتی اور میں نڈھال سا ہو جاتا۔

''اتنی سرد مہری بھی اچھی نہیں ہوتی نازش۔''

''آپ نے مجھے حاصل تو کر لیا اور کیا چاہیے؟''

''مجھے مکمل نازش چاہیے مع اس کے پیار اور قربت کے۔''

''آپ واحد مرد ہیں جو اتنے بے بس نظر آتے ہیں، ورنہ مرد......'' زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ سے میں سلگ اٹھا۔ اس کی معنی خیز طنزیہ گفتگو میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی اور میں اپنے دہکتے جذبات کو بہلانے کے لیے جانے کتنی راتیں جاگ کر گزار چکا تھا۔

☆☆☆

اس دن سردی کچھ معمول سے زیادہ ہی تھی۔ اسلام آباد بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور فضا میں مرگلہ کی پہاڑوں کی خوبی رچی تھی۔ اسلام آباد کا موسم یوں بھی سردیوں میں بہت خوب صورت ہو جاتا ہے۔ مجھے کافی پیتے ہوئے اچانک نازش کا خیال آیا، وہ کافی میرے آگے رکھ کر جانے کہاں چلی گئی تھی۔ رات کی آمد کے ساتھ سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے شیشے سے جھانک کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ وہ بغیر کسی گرم کپڑے کے سردی سے بے نیاز لان میں ٹہل رہی تھی میں غصے میں اسے گھسیٹتا ہوا اندر لایا۔

''کیا پاگل ہو گئی ہو، سردی سے مرنا چاہتی ہو؟''

''ہاں، میں مرنا چاہتی ہوں۔'' اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ میں نے ہیٹر آن کیا اور اسے اچھی طرح کمبل میں لپیٹ کر بانہوں میں بھر لیا۔ اس کے ہونٹ سردی سے نیلے پڑ گئے تھے اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

اور پھر...... وہ بغیر کسی مزاحمت کے میری بانہوں میں پگھل گئی، میں بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ وہ میری بیوی تھی جائز اور قانونی...... آخر کہاں تک خود پر پہرے بٹھاتا اور کب تک ضبط کرتا، وہ بھی شاید فطرت کے خلاف لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو وہ نہائی دھوئی پھول کی طرح ترو تازہ صوفے پر بیٹھی رو رہی تھی۔

''کیا ہوا نازش اس طرح رو کیوں رہی ہو؟'' میں نے شرارت سے اس کی لٹ کھینچی۔

''مت بات کریں مجھ سے۔ آپ نے وعدہ خلافی کی ہے۔'' وہ غصے سے چلائی۔

''یار اس میں تمہاری رضا بھی تو شامل تھی۔'' میں شوخی سے بولا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی، خجالت اور حیا کی لالی دوڑ گئی اور وہ روتے ہوئے غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں خوش تھا پتھر میں جونک لگ گئی تھی۔ رات کے خمار نے میرے روم روم میں بجلی سی بھر دی تھی مگر یہ میری خام خیالی تھی، رات میں نے اس کے کمرے میں جانا چاہا تو وہ بند تھا اور اس نے لاکھ کہنے پر بھی دروازہ نہیں کھولا تھا۔ صبح میں اس پر غصے میں برس پڑا۔

''یہ سب کیا ہے نازش، میں تمہارا شوہر ہوں میرا حق ہے تم پر۔''

''بس وہ میری غلطی تھی، لمحاتی بھول، عورت کی جذباتی لغزش۔ لیکن اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ اس غلطی کا اعادہ کر کے اس کا نتیجہ بھگتوں......'' وہ غصے میں کہہ کر ناشتے کی میز سے اٹھ گئی اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا لیکن یہ نازش کی بھول تھی اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی تو ''عورتوں کو مردوں کی کھیتیاں'' نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کس کو دخل ہے بارش کا ایک قطرہ بھی بیج کو جڑ پکڑا دیتا ہے۔

☆☆☆

نازش کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی مگر وہ کسی ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ امی اور

سپنا

دیکھا تھا میں نے اِک سپنا
نہ جس میں تھا کوئی اپنا
تھی ہر طرف رسوائی
پھر اک امید کی کرن نظر آئی
نہ جانے وہ کیسی صورت تھی
چاند سی وہ مورت تھی
پھر اچانک وہ غائب ہوئی
کہ جیسے بادلوں میں چاند
کی کوشش دیکھنے کی پر
دیکھ نہ سکا اسے
آج بھی اِک سپنا ہے
کہ دیکھوں وہ سپنا!

شاعر: محمد امین خضر

مرسلہ: آرزو زئی، اسلام آباد

چچی کو پتا چلا تو وہ ناراض ہونے لگیں کہ اس کو فوراً حویلی لاؤں۔

دوسرے ہی دن ہم حویلی پہنچ گئے۔ نازش کی پیلی رنگت دیکھ کر سب نے مجھے جھاڑنا شروع کر دیا۔ رات جب سب کے سامنے بھرم رکھنے کے لیے وہ میرے کمرے میں آئی تو میں اس پر برس پڑا۔

''کب تک یہ دکھاوا اور بناوٹ کرو گی؟''

''جب تک میرے دم میں دم ہے مگر میں اپنی بات دُہرانا نہیں چاہتی مجھ سے دور رہنا۔'' اس نے تنبیہ کی۔

''تم حد درجہ گستاخ اور بدتمیز ہو، تمہیں ذرا بھی میری خواہشوں کا احترام نہیں۔''

''تم مرد ہو کر اتنے بے بس کیوں ہو، طاقت

آزمالو......'' عجیب سے تحقیر آمیز لہجے میں وہ بول رہی تھی۔

''نازش میرے صبر کو مت آزماؤ، میرے جذبات کا احترام کرو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''عورت ہی کیوں، کسی مرد نے بھی کبھی کسی عورت کے جذبات کا احترام کیا ہے۔'' وہ چیختے ہوئے بولی۔

''آخر تمہیں مجھ سے شکایت کیا ہے؟'' میں بے بس ہوکر بولا۔

''یہی کہ تم مرد، ہو ظالم، خود پرست اور خود پسند، عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے اپنے سفلی جذبات کی تسکین کا ذریعہ......'' وہ بڑی نفرت سے بولی اور کمرے سے چلی گئی۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے میری کافی دیر سے آنکھ کھلی تو پورا گھر قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا تو چچی اور امی نے مجھے بانہوں میں گھیر لیا۔

''مبارک ہو بیٹا، تم باپ بننے والے ہو۔'' میرے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''جاؤ نازش اپنے کمرے میں ہے۔'' میری متلاشی نگاہوں کو محسوس کر کے امی نے پیار سے کہا اور میں بگٹٹ کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی مجھے بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ سارے شکوے شکایتوں اور ملال کے رنگوں پر خوشیوں کے رنگ غالب آ گئے۔

''نازش......نازش! اُف میں کس قدر خوش ہوں تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔'' میں نے اس کی پیشانی پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔

''نازش اگر ہمارے پہلا بیٹا ہوا تو اس کا نام طلحہ اور بیٹی ہوئی تو بینش رکھیں گے۔''

''ہرگز نہیں! اول تو میں اس بچے کو اباٹ کرا رہی ہوں دوسرے میری کوکھ سے کبھی کوئی مرد جنم نہیں لے گا۔'' وہ نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''نازش!'' میری چیخ بہت بلند تھی اور میرا ہاتھ بے اختیار اٹھ گیا اور میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے سارا غصہ گلاس پر نکالا جو چھناکے سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔

''ہاں تو مارو، مارو مجھے چیزوں پر کیوں غصہ اتار رہے ہو، آخر مرد ہو نا اپنی طاقت کا مظاہرہ تو کرو گے۔'' وہ طنزیہ بولی۔

''دیکھو نازش میری برداشت کو اتنا نہ آزماؤ کہ میرا صبر اور حوصلہ پست ہو جائے اگر تم نے ایسی ویسی کوئی بھی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا تم کیسی ماں ہو۔'' میں دکھ سے بولا۔ ''اس بچے کو قتل کرنے کا سوچ رہی ہو جو ابھی دنیا میں بھی نہیں آیا، مجھ سے نفرت صحیح لیکن اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ لڑکا ہو اور کسی بے بس اور معصوم لڑکی کو اپنے ظلم کا شکار بنائے اور اگر لڑکی ہو گئی تو ساری زندگی مرد کی غلامی کرے گی اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ اگر مجبوری میں کیا بھی تو صرف لڑکی پیدا کروں گی اور اس کی تربیت ایسی کروں گی کہ سارے مرد اس کی ٹھوکروں میں ہوں گے۔'' اس کے لہجے میں مردوں کے خلاف زہر بھرا تھا۔

''کیا قدرت سے لڑو گی کہ لڑکی ہی پیدا ہو۔'' میں طنزاً مسکرایا۔ ہم دونوں بہ آواز بلند اس قدر زور شور سے لڑنے میں مصروف تھے کہ کب چچی دروازہ ناک کر کے اندر آ گئیں پتا ہی نہیں چلا اور میں جو اب بپھر چکا تھا بغیر کسی لحاظ کے بولتا ہی چلا گیا۔ نازش کی ایک ایک گستاخی، اس کا گریز، اس کی نفرت میں نے چچی کے سامنے کچھ نہیں چھپایا۔ پہلے چچی کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر سفید پڑ گیا۔ وہ لہرائیں اور میں نے بڑھ کر انہیں تھام لیا وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ نازش کی چیخوں سے پورا گھر اکٹھا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ شرمندہ اور نازش بھی سب کو یہ بتانے سے قاصر تھی کہ اچانک چچی کو ہوا کیا ہے۔

☆☆☆

چچی کو سنبھلنے میں ایک ہفتہ لگا لیکن ایک جامد چپ اور خاموشی نے اُن کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ ایک دن امی نازش کو لے کر ڈاکٹر کے یہاں گئی ہوئی تھیں تب چچی میرے کمرے میں آ گئیں۔

''ارے آپ نے کیوں تکلیف کی مجھے بلا لیا ہوتا۔'' ان کی طبیعت کے پیشِ نظر میں نے انہیں گاؤ تکیہ کے سہارے سے بٹھا دیا۔

''بیٹا اشعر میں تم سے بہت شرمندہ ہوں، کاش میں نے نازش کی شادی نہ کی ہوتی یا کم از کم اس کے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دیتی۔''

''چچی جان مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ بس ایک انجانی سی خلش ہے الجھن ہے نازش کے رویے پر۔''

''اس کے لیے بیٹا مجھے ماضی میں جانا پڑے گا۔'' ان کی آواز دور خلاؤں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

نازش اپنے اور بینش کے مشترکہ کمرے میں جا رہی تھی جب دادا کے کمرے سے اپنا نام سن کر وہ رک کر سننے پر مجبور ہو گئی۔

''اب نازش اور بینش گھر میں رہیں گی۔ ہمارے خاندان میں لڑکیاں پڑھنے کے لیے شہر نہیں جاتیں۔ یہ ہماری روایتوں اور اصولوں کے خلاف ہے اور تم جانتی ہو اس کا باپ بھی ہمارے فیصلوں سے ٹکرانے کی ہمت نہیں رکھتا۔''

''لیکن بابا جان، زمانہ بدل چکا ہے ہمیں زمانے کا ساتھ دینا چاہیے ورنہ ہم کہیں پیچھے رہ جائیں گے۔ ایک پڑھی لکھی ماں ہی اولاد کی صحیح تربیت کر سکتی ہے۔'' چچی جان نے بڑے ادب سے بابا جان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''بس...... چھوٹی بہو بہت بول لیا اب اس سے آگے ایک لفظ نہیں، ہمیں زمانے کا سبق نہ پڑھاؤ تم نے پڑھ لکھ کر کیا کر لیا؟ ہم نہیں چاہتے ہماری لڑکیاں بھی پڑھ لکھ کر تمہاری طرح ہی کریں اور پھر ہمارے اپنے قاعدے، قوانین اور اصول ہیں اور ہم تمہاری بچیوں کے لیے حویلی کی قدیم روایتوں کو نہیں توڑ سکتے۔ آئندہ ہم ایسی کوئی بات نہ سنیں۔''

''بیٹا! یہ سب نازش نے اپنے کانوں سے سنا، وہ ویسے بھی گھر کے ماحول سے خوش نہیں تھی۔ تمہارے چچا بھی شادی کے بعد وہی روایتی مرد بن گئے تھے جن کا تعلیم نے کچھ نہیں بگاڑا تھا اس کے برخلاف تمہارے ابو بے حد سلجھے ہوئے، بُرد بار اور متحمل مزاج تھے اور بھابی ان کا پرتو...... میری نازش زیادہ ہی حساس تھی اس نے ہمیشہ مجھے روتے آنسو بہاتے اور ایک مرد کی مار کھاتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ میں اپنے پیچھے ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی کیونکہ باپ مر چکا تھا اور میری ماں اور بھائیوں کی اس شادی میں مرضی نہیں تھی۔ کیا منہ لے کر ان کے در پر جاتی۔ تمہارے چچا کو سب سے زیادہ بیٹا نہ ہونے کا دکھ تھا اور پڑھے لکھے ہونے کے باوجود وہ یہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں تھے کہ میڈیکلی بیٹا یا بیٹی پیدا کرنا عورت کے اختیار میں نہیں اور تمہارے دادا ان کے ہمنوا ہوتے۔

بینش تو پھر بھی باپ کے رویے کو محسوس نہیں کرتی تھی لیکن نازش کو چھوٹا ہونے کے باوجود باپ اور دادا کے رویے نے توڑ ڈالا تھا، وہ حساس اور زود رنج ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد نازک اور کمزور تھی مگر اس کے دل میں ایک آتش فشاں الاؤ کی طرح پک رہا ہے یہ میں نہیں جانتی تھی پھر حالات کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ تمہارے چچا ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر... ہو گئی، وہ جیسے بھی تھے میرے شوہر اور بچوں کے باپ تھے۔ عدت کے بعد میں نے اپنی تعلیم کو کام میں لانا چاہا تو بابا جان نے ایک اور بم گرا دیا۔

ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں گھر سے باہر قدم نہیں نکالتیں اور اب تم کس حیثیت سے اس گھر میں رہ سکتی ہو اس لیے بہتر ہے تمہارا نکاح تمہارے جیٹھ سے کر دیا جائے۔'' یہ ایسا حکم تھا جس نے ہم سب کو سر

سے پاؤں تک ہلا دیا۔ تمہارے ابو کے احتجاج اور بھابی کے رونے پیٹنے کے باوجود بابا جان نے اپنا حکم واپس لینے سے انکار کر دیا تو میرے پاس رات کی تاریکی میں بڑے بھیا اور بھابی کی مدد سے حویلی چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا اور نازش ہر چیز کو دل پر لیتی رہی پھر سونے پہ سہاگا یہ ہوا کہ بینش کی کالج میں ایک لڑکے سے دوستی ہو گئی۔ میں نے لاکھ سمجھایا مگر... تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے، میں نے بھی تو اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف تمہارے چچا سے شادی کی تھی فرق صرف یہ رہا کہ میں نے خوشی خوشی اپنی بیٹی کی شادی کر دی اور گھر کے دروازے اس کے لیے بند نہیں کیے مگر بیٹی اپنی انا اور خودداری کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس کا شوہر بھی ایک انا پرست اور کم ظرف مرد نکلا جس نے صرف روپے، پیسے کے لالچ میں بینش سے شادی کی تھی۔ اس کے مطالبات اور بینش کا انکار، میں لاعلم رہی۔ وہ اس کے مطالبات اور ظلم برداشت نہ کر سکی اور ایک دن اس نے دونوں بچوں کے ساتھ زہر کھا کر خودکشی کر لی۔'' چچی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں اور اشعر دم بخود تھا۔

''میری نازش کے لیے یہ کسی تازیانے سے کم نہیں تھا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس کے دل میں مردوں کے خلاف اتنا زہر بھر چکا ہے کہ وہ خود زہریلی ہو گئی ہے۔ میں نے تو مارے ڈر کے کبھی اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کے دادا نے بچپن میں ہی اس کی بات تم سے طے کر دی تھی کیونکہ تمہارے ابو امی اور میں نے یہ عہد کیا تھا کہ بچپن کے اس رشتے کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے نہ تمہیں بتائیں گے تاوقتیکہ تم دونوں خود اس خواہش کا اظہار نہ کرو۔ تمہاری پسند کا تو ہمیں اندازہ تھا لیکن میں آج تمہیں بتا رہی ہوں کہ نازش بچپن سے تمہاری دیوانی تھی، بے حد محبت کرتی ہے آج بھی تم سے...... میں نے خود اسے راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ ماں اور بہن کی محرومیوں کا بدلہ وہ تم سے لے گی ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اتنی بے وقوف ہے کہ اس کے سامنے مرد کا ایک ہی روپ رہا۔ وہ اپنے تایا کو بھول گئی کہ جن کا اخلاقی اور مالی سہارا نہیں ہوتا تو آج میں اس مقام پر نہ ہوتی۔ تمہارے ابو امی نے جس طرح قدم قدم پر میرا ساتھ دیا، میری رہنمائی کی میرا روم روم ان کا احسان مند ہے اور پھر اس بے وقوف کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اپنی آخری عمر میں اس کے دادا نے بھی ہمیں معاف کر دیا تھا بلکہ اپنی وصیت میں ہمارے لیے جائداد کا بڑا حصہ بھی چھوڑا تھا جبکہ باپ کے مرنے کے بعد تو پوتیوں کا شرعی حق ہوتا ہی نہیں لیکن شاید وہ اپنی زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے......اور سب سے بڑھ کر تو تم اس کے سامنے مردوں کی فراخ دلی، ایثار، قربانی اور وسیع القلبی کی زندہ مثال ہو۔ دنیا کا کون سا مرد اتنی سرکشی، نافرمانی اور بدزبانی برداشت کرتا ہے۔ اس کی ہٹ دھرمی اور ضد کے باوجود جس طرح تم نے اس کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا اس کی تو کوئی مثال نہیں ملتی۔ مجھے دکھ صرف اسی بات کا ہے کہ نازش کو اپنا اصل چہرہ آئینے میں نظر نہیں آیا۔'' وہ ذرا سا رکیں پھر اشعر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا، نازش بے وقوف ہے، نادان ہے، ناسمجھ ہے ایک ہی لکڑی سے سب کو ہانک رہی ہے حالانکہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، آج نہیں تو کل اس کو اس کا ادراک ہو جائے گا۔ یہ تم دونوں کا معاملہ ہے اس لیے میں کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر لگتا ہے نازش کو آئینہ دکھانا ہی پڑے گا۔''

''نہیں چچی جان!'' میں بے ساختہ بول پڑا۔ ''آپ اس معاملے میں بالکل نہیں بولیں گی۔ میں چاہتا ہوں نازش خود اپنی غلط فہمی اور میری محبت کو محسوس کرے اس کو خود اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہو۔''

☆☆☆

''اُف میں نے یہ کیا کیا......'' نازش جو ابھی ابھی ڈاکٹر سے چیک اپ کرا کر آئی تھی کمرے سے آتی امی کی آواز سن کر ساکت و جامد رہ گئی۔ اس میں خود سے نظریں ملانے کی سکت نہیں تھی، ضمیر کی عدالت نے اسے مجرم ٹھہرا دیا تھا۔

''ہم الزام ان کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا۔ کاش اشعر، تم اتنے اچھے اور میں اس قدر بری نہ ہوتی۔''

نازش کے رویّے میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ اچانک یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی۔ میں نے بھی جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا بلکہ جس جگہ بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوتا میں وہاں سے کھسک لیتا۔

نازش کی ڈلیوری کے دن قریب تھے اس لیے میں اسے اسلام آباد ساتھ لے کر نہیں آیا لیکن قدم قدم پر اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں، اس کی خوشبو کا احساس مجھے اسے بھولنے نہ دیتا۔ میں روزانہ ہی گھر موبائل پر بات کرتا تھا اور جب امی پوچھتیں نازش سے بات ہوئی تو میں صفائی سے جھوٹ بول دیتا۔ ''روز ہی ہوتی ہے۔''

دو تین روز سے مسلسل میرے موبائل پر انجانی کال آ رہی تھی لیکن میں جیسے ہی ہیلو کہتا موبائل آف ہو جاتا، پتا نہیں کون تنگ کر رہا تھا۔ پھر اماں کے فون نے میرے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ ہم دونوں ہی جیت گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کی مراد پوری کر دی تھی۔ نازش نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر اسپتال پہنچ جاؤں۔ سب سے مبارک بادیاں وصول کرتے ہوئے میں کمرے میں داخل ہوا جہاں سی سیکشن کے بعد ہوش میں آنے پر نازش کو کمرے میں لایا گیا تھا۔ اس کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں مگر میں اس کی طرف دیکھے بغیر بچوں کی طرف بڑھ گیا۔

دونوں بہن بھائی سوئے ہوئے بے حد پیارے لگ رہے تھے۔ ضبط کے باوجود خوشی سے میرے آنسو نکل آئے۔

''اشعر!'' نازش کی دھیمی اور نقاہت بھری آواز میرے کانوں میں پڑی۔ پہلی مرتبہ اس نے مجھے میرے نام سے پکارا تھا اور مجھے اپنا نام اتنا پیارا کبھی نہیں لگا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس پر اپنا چہرہ رکھ کر بے آواز رونے لگی۔

''نازش پلیز مت روؤ!'' میں بے چین ہو گیا۔ ''دیکھو اللہ نے ہم دونوں کی خواہش پوری کر دی، اب تو تم مردوں کی طرف سے اپنا دل صاف کر لو۔ میں تمہاری مرضی کے خلاف ایسی غلطی اب کبھی نہیں کروں گا یہ ایک مرد کا وعدہ ہے۔''

''خدا کے لیے!'' وہ تڑپ اٹھی۔ ''بھگو بھگو کر جوتے نہ ماریں، میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں اپنی ہر غلطی، ہر کوتاہی اور ہر بدزبانی پر۔ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور میری کم ظرفی نے مجھے خود اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ میں تو خود عورت کے مکروہ پن اور بدگوئی کی مثال بن گئی ہوں، آپ اس کم ظرف عورت کو اپنے بچوں کے صدقے معاف کر دیں۔'' میں اس کی طرف گھوما اس کے چہرے پر ممتا کا نور اور آنکھوں میں التجا تھی۔ شرمساری سے نظریں جھکی ہوئی تھیں اور میں اس کے چہرے پر خجالت اور پژمردگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''اول تو میں تم سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا اور تم نے جتنا اچھا تحفہ دیا ہے اس کے بعد تو تم معافی کی نہیں انعام کی مستحق ہو۔'' خوشیاں میرے دروازے پر دستک دے رہی تھیں اور میں ناشکرا مرد نہیں تھا جو ان خوشیوں سے منہ موڑ لیتا۔ میرے صبر و شکر کا پھل بہت میٹھا تھا اور ایک لمبا اور پُرسکون راستہ میرے سامنے تھا۔

ناولٹ

لاپتا

نمرہ احمد

شام کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دوپہر میں خوب بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے ہری گھاس ابھی تک گیلی تھی۔ ڈرائیووے کا فرش بھی پانی کی تہ سے شیشے کے مانند چمک رہا تھا۔

وہ موسم سے جیسے بے نیاز سی لان کے وسط میں رکھی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ چائے کا کپ سامنے میز پر رکھا تھا اور اخبار کے صفحات گھٹنے پر پھیلائے وہ کوئی سیاسی کالم پڑھنے میں منہمک تھی۔ پڑھتے پڑھتے وہ چائے کا کپ بھی اٹھالیتی اور ذرا سا گھونٹ بھر کر واپس رکھ دیتی۔ اس دوران بھی اس کی نگاہیں اخبار سے نہ ہٹتیں۔

وہ سادہ گلابی رنگ کے جوڑے میں ملبوس تھی۔ دوپٹا شانوں پر پھیلا تھا، بال کندھوں تک آتے تھے جنہیں اس نے کیچر میں ہاف باندھ رکھا تھا۔ سامنے

سے بال ترچھے سے کٹے ہوئے تھے اور اتنے چھوٹے تھے کہ کانوں کے پیچھے نہیں اڑسے جاتے تھے، سو جب وہ یونہی گردن جھکا کر اخبار پڑھنے میں محو ہوتی تو یہ چند لٹیں ماتھے پر جھول رہی ہوتیں۔ دفعتاً میز پر رکھا اس کا موبائل ایک حرکت کے ساتھ بجنے لگا۔ اس نے کالم کی سطر پڑھتے پڑھتے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا اور چہرے کے سامنے لا کر اسے دیکھا۔ رضا انکل کی کال تھی، ابا میاں کے بہترین دوست جو ہر دوسری شام یہیں پائے جاتے تھے۔ آج جانے کیوں نہیں آئے تھے۔ اس نے سبز بٹن دبایا اور فون

کان سے لگالیا۔

''السلام علیکم رضا انکل! کیا حال ہیں آپ کے؟'' وہ پھر سے کالم پہ نگاہیں جمائے کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز میں وہی سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا جو اس کے چہرے بلکہ پوری شخصیت پہ چھایا ہوا تھا وقار بھرا ٹھہراؤ۔

''میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، تمہارے ابا میاں کا بھوت اترا انیکسی کو کرائے پہ چڑھانے کا یا نہیں؟''

''کہاں انکل...... میری تو سنتے ہی نہیں ہیں، حالانکہ کہہ کہہ کر تھک چکی ہوں کہ ضرورت کیا ہے گھر میں شور کرنے کی۔ ہم دو لوگ ایک دوسرے کو بہت ہیں مگر...... لیں وہ آہی گئے۔'' اس نے صفحہ پلٹتے ہوئے ابا میاں کو برآمدے کی سیڑھیاں اترتے دیکھ لیا تھا، جبھی ایک گہری ٹھنڈی سی سانس لی۔

''بعض اوقات دو کو تیسرے کی ضرورت ہوتی ہے محترمہ!'' وہ جب بھی خفگی بھرا ناصحانہ انداز اپناتے اسے یوں ہی محترمہ کہتے تھے۔

''ہمارا تیسرا اللہ ہے اور وہ ہمیں کافی ہے۔'' اس نے دانستہ بلند آواز میں کہا اور فون ابا میاں کی جانب بڑھا دیا جو اس کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھ رہے تھے۔

''لیجیے، آپ کے دوست ہیں جو آج غلطی سے یہاں نہیں آئے۔'' ابا میاں نے مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے فون تھام لیا۔ اس کی آواز رضا انکل نے سن لی تھی جبھی خفگی سے بولے۔

''لالہ رخ سے کہو، اگر میرا آنا اتنا ہی برا لگتا ہے تو آئندہ نہیں آؤں گا۔'' فون کی آواز اتنی تھی کہ وہ سن سکتی تھی۔

''بہت بہتر، یہی بات اسٹامپ پہ لکھ کر دیں تو میں مانوں گی۔'' وہ شگفتگی سے کہتی واپس اخبار کی جانب متوجہ ہوگئی۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ مذاق کر رہی ہے مگر وہ مذاق کرتے ہوئے بھی مسکراتی نہیں تھی۔ بس ایک ٹھہراؤ سا تھا چہرے پہ اور وہی ٹھہراؤ لالہ رخ کی ساری زندگی بن چکا تھا۔

''سن لیا اپنی بیٹی کا جواب، اب بتاؤ میرے کام کا کیا بنا؟'' کرسی کھینچ کر آرام سے بیٹھ لینے کے بعد اب ابا میاں فون پہ کہہ رہے تھے۔ ان کی بات کے جواب میں رضا انکل کچھ بتانے لگے تھے۔ آواز قابلِ سماعت تھی مگر وہ توجہ نہیں دے رہی تھی، سو سن نہ پائی۔

''اچھا، یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ فیملی ساتھ ہے یا اکیلا ہے؟ ہوں اچھا...... بہن، بھائی نہیں ہیں تو ماں باپ، بیوی، بچے تو ہوں گے۔ اچھا...... اچھا...... باپ نہیں ہے اور ماں؟ اچھا ٹھیک، تو وہ بھی کراچی سے آرہی ہے یا یہ اکیلا ہوگا؟ ہاں، خیر ایک بندہ بھی بہت ہوتا ہے۔ میں تو کافی عرصے سے کہہ رہا تھا کہ اس انیکسی کو رینوویٹ کرواؤں مگر یہ لالہ اس بڈھے کی سنتی کہاں ہے۔ اپنی ہی مرضی کرتی ہے۔'' لالہ رخ نے صفحے سے نگاہ نہیں اٹھائی، ویسے ہی انہماک سے پڑھتی رہی۔

''یہ تو اب بھی میں نے نوراں سے کہہ کر انیکسی کی صفائی کرائی ہے، اسے کھولا ہے تاکہ یہ کرائے پر چڑھ سکے۔ ورنہ ہماری دخترِ نیک اختر کا بس چلے تو گھر میں پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کا داخلہ بھی بند کردیں۔ خیر، تم کاشان کو کہو کل ہی مستری، مزدوروں کو بھیج دے ادھر تاکہ مرمت کا کام ہوسکے، ورنہ انیکسی رہنے کے قابل بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے رضا انکل سے ان کے بیٹے کاشان کا نام لے کر کہا۔ کاشان اپنی بیوی کے ساتھ اکثر ان کی طرف چکر لگایا کرتا تھا اور ایسے بہت سے کام ابا میاں اس کے سپرد کرتے رہتے تھے جنہیں وہ بخوشی انجام دیتا تھا۔

''تو تمہارے دوست کا یہ بیٹا کب تک آجائے گا؟ ہوں...... ٹھیک ہے، بس تم اس کو پتا وغیرہ خود سمجھا دینا اور میرا نمبر دے دینا۔ میں بات کرلوں گا۔'' فون بند کرکے انہوں نے میز پر رکھا اور اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح اخبار کے مطالعے میں محو تھی۔

''کرائے دار مل گیا ہے۔'' انہوں نے پُرمسرت انداز میں اطلاع دی۔

''میں تو اب بھی کہوں گی کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔'' وہ پڑھتے ہوئے بولی۔

''بس پھر نہ ہی کہو۔'' وہ جیسے بگڑ کر کھڑے ہوئے۔ ''تم تو اس گھر کی ویرانیوں کی عادی ہوگئی ہو مگر میں نہیں ہونا چاہتا۔'' وہ خفگی سے بڑبڑاتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے واپس اندر چلے گئے۔

لالہ رخ نے اطمینان سے اگلا صفحہ پلٹا، وہ وقت گزر گئے جب اسے ایسی باتوں سے فرق پڑتا تھا۔ اب تو ہر شے میں جمود اور ٹھہراؤ تھا اور اس نے ان ویرانیوں کے ساتھ سمجھوتا کرلیا تھا۔

☆☆☆

انیکسی سے صبح سے شور کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ پالش، پینٹ، مرمت، چیزوں کی اٹھا پٹخ، مزدوروں کا آنا جانا، انیکسی کے بیرونی برآمدے کے باہر مشینوں، ٹائلز اور ایسی چیزوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ اسکول سے آئی تو سارے لان میں افراتفری دیکھی۔ کار پورچ میں کھڑی کرکے وہ باہر نکلی اور ایک نظر انیکسی پر ڈال کر اندر چلی گئی۔ وہ نظر خاصی بے نیاز اور بے پرواسی تھی۔

انیکسی کے برآمدے میں کاشان کے ساتھ کھڑے ابا میاں نے تاسف سے اس کی وہ نظر دیکھی اور سر جھٹک کر کاشان سے بات کرنے لگے، وہ بات جو ڈرائیو وے میں گاڑی داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے ادھوری چھوڑ دی تھی۔

وہ آتے ہی سوگئی، کھانا نہیں کھایا سو شام میں جب وہ کچن میں کھڑی مائیکرو ویو میں کھانا گرم کررہی تھی، ابا میاں اور کاشان محوِ گفتگو اندر داخل ہوئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''کیسے ہو کاشان اور تب سے نہیں گئے یا دوبارہ آئے ہو؟ ابا میاں بھی تمہیں خوامخواہ تکلیف دیتے رہتے ہیں، اتنے ہلکان مت ہوا کرو۔'' وہ بہت شائستگی سے کہتی ساتھ ساتھ کئی کام نبٹا رہی تھی۔ کھانا اس نے نکال کر الگ رکھ دیا تھا۔ اب فریزر سے کباب، رول، سموسے نکال رہی تھی۔

''یہ تو میرا فرض ہے لالہ رخ...... اور آپ ٹھیک ہیں؟'' وہ دھیرے سے ہنس کر بولا اور ابا میاں کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ لاکھ انکار کرتا مگر ابا میاں اسے ایک پُرتکلف سی چائے پلوائے بغیر جانے نہ دیتے تھے۔

''فرض تو خیر کسی اور کا تھا۔'' وہ فرائی پین میں

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826,021-32446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

تیل انڈیلتے ہوئے ہولے سے بڑبڑائی۔ کاشان نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ گردن ذرا سی ترچھی کیے تیل ڈال رہی تھی۔ اس کی نگاہیں تیل کی گرتی دھار پر جمی تھیں، چہرے پر وہی ازلی سکون تھا۔ اس کی ان ٹھہری ہوئی باتوں کے سب عادی تھے پھر بھی ہر بار کاشان چونک جایا کرتا تھا لیکن پھر سر جھٹک کر پچھلے کام میں مگن ہو جاتا۔

''بس ایک ہفتے کا کام ہے، آپ سر پر رہیں گے تو چھ دن میں ہی ختم ہو جائے گا ورنہ چھ ہفتے لگائیں گے یہ لوگ۔ میں ڈیلی چکر لگاتا رہوں گا، یہ بندہ اچھا ہے، کام ٹھیک سے کرے گا۔''

لالہ رخ نے تیل کی سطح کو دیکھا۔ اس پہ بلبلے بننے لگے تھے۔ بہت ننھے، تقریباً نادیدہ سے بلبلے...... اس نے جمے ہوئے کچے رول اٹھائے اور ایک ایک کر کے تیل میں ڈالتی گئی۔ ہر رول کے گرتے ہی شڑر شڑر کی آواز بلند ہوتی اور ان گنت بلبلے سفید رول سے علیحدہ ہونے لگتے۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ تمام کمروں کو وہی پرانے آف وائٹ کے بجائے کسی اور رنگ میں پینٹ کرواؤں، تم کیا کہتے ہو؟''

''بالکل انکل...... جیسے ہمارے لونگ روم کا پینٹ ہے، ایک دیوار گہری سی گرین تو باقی تینوں، بہت ہلکی سی گرین۔ اس طرح کے شیڈز اچھے لگیں گے۔''

دوسرے چولھے پر اس نے توے کو چکنا کر کے کباب تلنے شروع کر دیے تھے۔ پھینٹے ہوئے انڈے میں لتھڑے کباب وہ گرم توے پر رکھتی گئی۔ رول اب ایک طرف سے سنہری ہونے لگے تھے۔ اس نے کفگیر سے ان کو پلٹا۔ اس کا کھانا ایک طرف ڈھکا اب ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔

''ہاں، یہی بہتر رہے گا، کل فیاض سے کہنا آ کر اسپلٹ اور ایل سی ڈی کی فٹنگ کر جائے۔''

چائے کو دم آ رہا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مشغول تھے۔ لالہ رخ سنہری سنہری تلے ہوئے رول، سموسے اور کباب الگ الگ پلیٹوں میں نکالنے لگی۔ پھر اس نے کیبنٹ سے ککیز کا جار نکالا اور ککیز پلیٹ میں سیٹ کیے۔ فریش چاکلیٹ کیک فریج میں رکھا تھا۔ اس نے وہ بھی ساتھ میز پر رکھا اور چائے پیالیوں میں ڈالنے لگی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔

''کیا نام بتایا تھا تم نے اس لڑکے کا؟'' ابا میاں ایک کُکی چکھتے ہوئے جیسے یاد کر کے پوچھنے لگے۔

''فرہاد، فرہاد تیمور۔''

''ہوں، اگلے سوموار تک تو آ جائے گا نا؟''

''جی...... یہاں کسی ہوٹل میں رہ رہا ہے ابھی۔ اچھا بندہ ہے، میں ملا تھا۔ ابا کے ایک دوست کا بیٹا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ انیکسی کرائے پر چڑھانی ہے تو ہم نے اسے کہہ دیا۔ وہ گھر ہی ڈھونڈ رہا تھا مگر آپ تو جانتے ہیں اکیلے بندے کو پورشن آسانی سے نہیں ملتا۔''

اسی پل ''ٹن'' کی آواز کے ساتھ وال کلاک نے چھ بجائے۔ لالہ رخ کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ تھمے، اس نے چونک کر گھڑیال کو دیکھا اور پھر یک دم سب کچھ وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد وہ سنک کے پیچھے بنی دیوار گیر کھڑکی سے جو لان میں کھلتی تھی، ڈرائیو وے پر تیز تیز قدموں سے چلتی گیٹ کی طرف جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

کاشان اور ابا میاں اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے ایک دفعہ بھی مڑ کر لالہ کو نہیں دیکھا تھا۔ انہیں پتا تھا کہ وہ کدھر جا رہی تھی۔ انہیں پتا تھا کہ وہ روز شام کو چھ بجے کدھر جاتی تھی۔ انہیں یہ بھی پتا تھا

کہ وہ پچھلے آٹھ برسوں سے روز شام کو چھ بجے ادھر جایا کرتی تھی اور انہیں یہ بھی پتا تھا کہ ٹھیک دس منٹ بعد جب وہ واپس آئے گی تو اس کے چہرے پر آٹھ برسوں کی تکان رقم ہو گی۔ اس لیے اسے جاتے اور واپس آتے دیکھنے سے وہ گریز کیا کرتے تھے کہ ان کا دل اسے یوں دیکھ کر بہت اندر تک کٹ جاتا تھا۔

☆☆☆

''ابا میاں......'' وہ قدرے خفگی سے انہیں آوازیں دیتی انیکسی کے برآمدے تک آئی تھی۔ برآمدے کے ستون کے پاس کھڑے ہو کر اس نے دیکھا۔ اندر کو جاتا دروازہ پورا کھلا تھا اور ابا میاں لاؤنج میں کھڑے نوراں اور اصغر کو ہدایات دے رہے تھے یا شاید ان کے کام میں کیڑے نکالتے خفا ہو رہے تھے۔

نوراں اپنے چودہ سالہ بیٹے اصغر کے ساتھ بھاگ بھاگ کر کام نبٹا رہی تھی۔ انیکسی رنگ و روغن اور نئے پالش شدہ فرنیچر سے چمک اٹھی تھی۔ لالہ رخ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ برآمدے میں جہاں پہلے چپس کا کام تھا اب وہاں سفید لش لش چمکتا ماربل لگا تھا۔ اندر ایک بیڈ روم، اٹیچ باتھ، کچن اور ایک لونگ روم تھا۔ اس نے لونگ روم کی چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر سرسری سا اندر دیکھا۔ وہاں سے سارے گھر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ سب جگہ سفید ماربل کا کام ہوا تھا۔ لونگ روم کی ایک دیوار گہری سی گرین اور باقی ہلکی گرین تھیں اندر بیڈ روم کے کھلے دروازے سے بھی یونہی پیچ کلر کے دونوں شیڈز کی دیواریں جھانک رہی تھیں۔

''ابا میاں!'' اس نے انہیں پکارا۔

''جی محترمہ...... فرمائیں۔'' وہ نوراں کو برہمی سے کچھ کہتے کہتے پلٹے۔

''دوائی لی آپ نے؟''

''نہیں...... اور نہ ہی میرا موڈ ہے۔'' وہ سخت خفا لگ رہے تھے۔

''موڈ ہو یا نہ ہو، یہ پکڑیں اور کھائیں۔'' اس نے ٹیبلیٹ اور پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں تھمایا۔

''ہٹاؤ، مجھے نہیں لینی دوا۔ عاجز آ چکا ہوں میں ان دواؤں سے۔'' انہوں نے اکتا کر گلاس واپس اسے تھمانا چاہا مگر وہ دو قدم پیچھے کو ہٹ گئی۔

''نہیں کھانی تو نہ کھائیں، میں یہی گلاس اٹھا کر آپ کی اس نئی پینٹ شدہ دیوار پر دے ماروں گی تو آپ کو یاد آئے گا کہ لالہ رخ کون ہے۔''

''مجھے یاد ہے کہ لالہ رخ کون ہے۔'' انہوں نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے دوائی نگلی اور پانی کا گلاس اسے واپس تھمایا۔

''تم نے انیکسی کی تعریف نہیں کی۔'' انہیں دفعتاً یاد آیا۔

''ہاں، اچھی لگ رہی ہے۔'' اس نے اسی ٹھہراؤ سے کہا، وہ جانتے تھے کہ اس نے بغیر کسی جذباتی احساس کے یہ فقرہ ادا کیا ہے۔ غیر دلچسپی، بے نیازی اور سنجیدگی...... وہ آٹھ سال سے لالہ کے اسی چہرے کے عادی ہو چکے تھے پھر بھی ہر بار یہ چہرہ ایک نئے دکھ سے روشناس کراتا تھا۔ اس کے چہرے میں انہیں اور بہت کچھ یاد آنے لگتا۔

''کرایہ دار دو چار روز میں آ جائے گا۔'' انہوں نے اس کی دلچسپی پیدا کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

''ہوں۔'' وہ سر ہلا کر واپس جانے کے لیے پلٹ گئی۔

''کدھر؟'' وہ جانتے تھے کہ مغرب کے قریب وہ کہاں جا رہی ہو گی پھر بھی پوچھ بیٹھے۔ ایک نئے دکھ سے روشناس ہونے کے لیے۔

''کھانا بنانے۔'' وہ مڑ کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی اور اس کا وہ دو لفظی فقرہ ان کو بہت کچھ

یاد کرا گیا۔

''جاؤ...... کھانا بناؤ......'' وہ دھیرے سے بولے اور رخ پھیر گئے۔ ان دونوں کا کھانا نوراں دوپہر سے پہلے پہلے بنالیتی تھی جو رات تک پورا ہوتا تھا۔ مگر ہر شام لالہ رخ ایک برتن میں علیحدہ کھانا تیار کرتی تھی۔ وہ اس ریاضت کی عادی تھی، وہ جانتے تھے۔

وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر چلی گئی۔ ابا میاں نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا اور پھر آنکھ کے کنارے کو انگلی سے پونچھا۔

لالہ رخ ان کی طرح نہیں روتی تھی، وہ چپ چاپ اپنا کام کیے جاتی۔ کبھی کبھی ان کا دل کرتا تھا کہ وہ روئے، زور زور سے اونچا اونچا، اپنے اندر کا غبار باہر نکال لے مگر وہ روتی نہیں تھی اور انہیں لگتا تھا کہ یہ آنسو اس کے اندر جمع ہو کر ایک سمندر بن جائیں گے اور ایک دن اس کو بہا کر لے جائیں گے اور ابا میاں کو اس دن سے بہت ڈر لگتا تھا۔

☆☆☆

آتش دان میں آگ جل رہی تھی، لالہ رخ اس کے قریب کرسی ڈالے بیٹھی گھٹنوں پہ میگزین رکھے بہت انہماک سے پڑھ رہی تھی۔ اس کے بال کیچر میں مقید تھے اور وہ پاؤں اوپر کو سمیٹے بیٹھی تھی۔ ابا میاں بڑے صوفے پر بیٹھے ریموٹ پکڑے چینل بدل رہے تھے، وہ کسی ایک چینل پر ٹھہرتے نہیں تھے، بار بار بٹن دباتے۔ آوازوں کا سلسلہ شروع ہوتا پھر چینل بدلنے سے دو سیکنڈ کے لیے تھمتا پھر دوبارہ شروع ہوتا۔ یہ چکر کافی دیر سے جاری تھا۔

''آپ کا کرایہ دار نہیں آیا؟'' لالہ رخ نے میگزین کا صفحہ پلٹتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ صرف بات برائے بات پوچھ رہی تھی۔

''نہیں، شاید کل تک آجائے۔'' لاؤنج میں خاموشی چھا گئی۔ چینل بدلنے سے ٹوٹنے، جڑنے والا شور سنائی دینے لگا۔

''آج اس کا فون آیا تھا۔'' انہوں نے کہا تو اس نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا۔

''کس کا؟''

''فرہاد کا...... اسی کرائے دار کا۔'' وہ ٹی وی پہ نگاہیں جمائے کہہ رہے تھے، سو انہوں نے لالہ کے ڈھیلے پڑتے اعصاب کو نہیں دیکھا۔

''اچھا۔'' وہ بے دلی سے میگزین کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''مجھے بات کرنے کے انداز سے تو بہت سلجھا ہوا لگا۔ کراچی میں گھر ہے اس کا۔ ماں باپ کا اکلوتا ہے، شادی ابھی کی نہیں ہے اور باپ کی ڈیتھ کے بعد ماں کراچی میں ہوتی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کچھ عرصے بعد ماں بھی اِدھر آجائے گی۔''

''ہوں......'' وہ پڑھتی رہی۔

''انجینئر ہے، میکاٹرونکس میں، مک ماسٹر سے پڑھا ہے۔''

''اچھا۔''

''آج کل یہاں اسلام آباد کے کسی ہوٹل میں رہ رہا ہے، بلیو ایریا کے قریب۔''

''ہوں۔'' انہیں لگا وہ ان کی بات سن بھی نہیں رہی۔

''اس کے آنے سے رونق ہو جائے گی، ہیں نا؟''

''ہوں۔'' مبہم سا جواب دیا۔

''میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ وہ دوپہر اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا اور اس معاملے میں وہ ہمارا مہمان ہوگا، نہ کہ کرائے دار۔''

''کیا ضرورت ہے کسی اجنبی کو گھر میں داخل کرنے کی؟'' اس کی پیشانی پہ ذرا سا بل پڑا۔

''اجنبی کو اپنا بنتے دیر کتنی لگتی ہے۔ بعض اجنبی بہت آرام سے قریب آجاتے ہیں۔''

''اور بعض اپنے بہت آرام سے دور چلے جاتے ہیں۔'' اس کی نگاہ میگزین سے پھسلتی ہوئی دہکتے کوئلوں پر جا ٹکی۔ سرخ ہوتے کوئلوں سے ننھی منی چنگاریاں اٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

''اپنی مرضی سے کون دور جاتا ہے لالہ؟ یہ تو قسمت ہوتی ہے جو داؤ کھیل جاتی ہے اور انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔''

''ہر داؤ قسمت نہیں کھیلتی ابا میاں، بعض داؤ انسان بھی کھیل جاتے ہیں انسانوں کے ساتھ اور سب سے مہلک داؤ تو یہی ہوتے ہیں پھر ہم ساری عمر اسی لکیر کو پیٹتے رہتے ہیں۔ بچوں کی طرح روتے رہتے ہیں مگر ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ہم تہی داماں رہ جاتے ہیں۔'' وہ دہکتے کوئلوں کو دیکھتی کہتی جا رہی تھی۔ ابا میاں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ بولتی کم تھی اور جب بولتی تھی تو ایسی باتیں ہی کیا کرتی تھی۔

''صبر کرو لالہ، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

''صبر؟'' وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ ''صبر ہی تو کر رہی ہوں، ابا میاں، صبر شکوہ نہ کرنے کو کہتے ہیں اور میں وہی تو کر رہی ہوں۔'' دونوں کے درمیان طویل خاموشی چھا گئی۔ پس منظر میں نیوز چینل کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی مگر اسے سن کوئی نہیں رہا تھا۔

''ابا میاں......'' اس نے آتش دان کو دیکھتے جیسے بہت زور سے انہیں پکارا۔

''ہوں؟'' وہ ہولے سے بولے۔

''میں کسی کو نہیں معاف کروں گی ابا میاں...... میں حشر کے دن ایک ایک کا گریبان پکڑوں گی، آج تو وہ بچ گئے ہیں، اُس دن کوئی نہیں بچ سکے گا۔ اُس دن ان کو چن چن کر ایسی ہی آگ میں ڈالا جائے گا جس میں انہوں نے مجھے ڈالا ہے، میرے صبر کی آگ انہیں راکھ کر دے گی ابا میاں، میں کسی کو معاف نہیں کروں گی۔'' وہ کوئلوں کی سرخی، سیاہی کو دیکھتی بے خودی کے عالم میں کہتی جا رہی تھی۔

ابا میاں چپ چاپ اسے دیکھے گئے۔ معاف تو وہ بھی نہیں کر سکے تھے، نہ کریں گے، یہ وہ جانتے تھے پھر بھی وہ ایسی باتیں کرتی تو ان کے دل پہ چھایا بوجھ بڑھ جاتا۔ خدا جانے اس شب کی سحر کب طلوع ہوگی۔

☆☆☆

چکن بریانی کی خوشبو سارے کچن میں پھیلی تھی۔ وہ احتیاط سے وزن دے کر پتیلے کا ڈھکن بند کر رہی تھی۔ ابھی دم آجائے تب تک وہ رائتا تیار کرے گی۔ سبزیاں سامنے نکلی رکھی تھیں، بس ان کو کاٹنا تھا۔ دہی پھینٹ کر رکھا تھا۔ اس نے جلدی جلدی رائتا تیار کیا۔ اسے بڑے لنچ باکس میں ڈال کر پیک کیا۔ دم آچکا تو پتیلے کو نوراں نے کپڑے میں لپیٹ دیا۔

''اب اسے گاڑی میں رکھوا دو، میں آرہی ہوں۔'' وہ سنک کی ٹوٹی سے ہاتھ دھوتے ہوئے بولی تو نوراں سر ہلا کر باہر چلی گئی۔

وہ پرس اور چابیاں اٹھائے لاؤنج میں آئی تو آتش دان کے سامنے شطرنج کی چھوٹی میز سجی تھی۔ ابا میاں اور رضا انکل آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ابا میاں نے اپنے پیادے کو انگلیوں میں پکڑ رکھا تھا اور لب دانت سے دبائے بہت غور سے بساط کو دیکھ رہے تھے۔

''رضا انکل...... آپ کب آئے؟'' اس نے ان کی آمد کی کوئی آہٹ نہیں سنی تھی جبھی ذرا حیرت سے کہتی ان کے قریب آئی۔

”جب آپ اپنا روزانہ کا پتیلا بنانے میں مگن تھیں۔“ وہ سر اٹھا کر مسکرا کے اسے دیکھنے لگے۔

”تبھی ...... خیر مگر آپ تو مجھے اسٹامپ پر لکھ کر نہیں دے رہے تھے کہ اب نہیں آئیں گے......؟“

”وہ ارادہ میں نے چند روز کے لیے ملتوی کردیا ہے۔“

”اور ایسا کیوں کیا؟“ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی جھک کر سینڈل کے اسٹریپس بند کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”تمہارے اس ابا میاں کی محبت کھینچ لاتی ہے۔“

”یا یوں کہیے کہ شطرنج کی محبت کھینچ لاتی ہے۔“

”اب یہ تو تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا سمجھو۔“

”اچھا میں چلی۔“ وہ اسٹریپس بند کر کے اٹھی اور پرس اٹھا کر کندھے پر لٹکایا۔

”کدھر؟“ رضا انکل جانتے تھے مگر کبھی کبھی یونہی سوال کرلیا کرتے تھے۔

”یتیم خانے جارہی ہوں کھانا دینے۔“ پھر رک کر ابا میاں کو دیکھا۔ ”آپ کھائیں گے، بریانی ہے؟“ حالانکہ وہ ان کا جواب جانتی تھی پھر بھی پوچھ ہی لیا کہ ابا میاں کو بریانی بہت مرغوب تھی۔

”نہیں، ہمارا کھانا بہت ہے، تم وہیں دے آؤ۔“

”بہت بہتر......“ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ رضا انکل اسے جاتے دیکھتے رہے...... کچھ سوچ کر اچانک اسے پکار بیٹھے۔

”سنو لالہ......“ وہ دروازہ... کھولتے کھولتے پلٹی۔

”جی؟“ وہی ٹھہراؤ بھرا سنجیدہ انداز جس میں برسوں کی مسافت کی دھول جمی تھی۔

”تم تھکتی نہیں ہو لالہ رخ؟“

”جیسے آپ کو شطرنج نہیں تھکاتی، ویسے ہی مجھے میرا کام نہیں تھکاتا۔ ہر شخص کی ایک عبادت ہوتی ہے اور یہ کام میری عبادت بن چکا ہے رضا انکل، پھر عبادت میں تھکاوٹ کیسی؟“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ سر ہلا کر گویا لاجواب سے ہوگئے۔

”اللہ حافظ۔“ وہ دھیرے سے کہہ کر باہر نکل گئی۔ رضا انکل ایک افسردہ سی سانس باہر کو نکالتے واپس بساط کی طرف پلٹے۔

☆☆☆

”ان کو بھی کاٹو، یہ ادھر سے بھی اکھاڑو، اور گملے کے پیچھے سے بھی۔“ وہ حسب عادت نوراں کے سر پر کھڑے ہو کر کیاریوں کی کاٹ چھانٹ کروا رہی تھی۔ ہفتے کا دن تھا اور اس کا آج آف ہوتا تھا، سو وہ ان دو چھٹیوں میں گھر کے سارے نظر انداز رہ جانے والے کام کیا کرتی تھی۔

”مالی آج پھر نہیں آیا؟“

”نہیں بی بی، کل کہہ رہا تھا کہ اس کی دادی فوت ہوگئی ہے، گاؤں جا رہا ہے۔“

”غالباً تیسری دفعہ فوت ہوئی ہے اس کی دادی‘ اس کو یاد کرا دینا تھا۔“

”میں نے کہا تھا، پر وہ کہہ رہا تھا کہ دادے کو شادیوں کا بہت شوق ہے۔“ نوراں قینچی تیز تیز چلاتی پتے کاٹ رہی تھی۔

”جانے دو نوراں...... اس کا دادا شاید تین سال قبل پہلی دفعہ فوت ہو چکا ہے۔ کل تو اتوار ہے، اب سوموار کو ہی آئے گا۔ اس سے کہنا شام میں مجھ سے مل کر جائے ورنہ میں اس کے دادا سے ہی بات کروں گی اب۔“ وہ ہاتھ میں پائپ پکڑے باری باری گملوں کو پانی دے رہی تھی۔ پانی کی دھار سے گملوں کی مٹی لبالب بھر جاتی تو وہ پائپ کا رخ دوسرے گملے کی طرف کر دیتی۔ گملوں اور کیاریوں

میں اگے پودوں پر سے دھول اترنے لگی تھی۔ لہلہاتا ہوا سبز رنگ نکھر گیا تھا۔ سارے لان میں گیلی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی۔ بارش کے بعد کی خوشبو جب آسمان دھل کر صاف ہو جاتا ہے۔

”پانی بھی کتنی مقدس شے ہے بی بی، ہر چیز کو پاک کر دیتا ہے، ساری دھول اور گرد بہا لے جاتا ہے۔“ نوراں قینچی کی نوک سے مٹی میں اگی خودرو جڑی بوٹی اکھاڑتے ہوئے بولی تھی۔ وہ اکثر یونہی فلسفیانہ باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کی بیٹی دو دفعہ بیوہ ہو کر بہت دقتوں سے تیسری دفعہ بیاہی گئی تھی۔ چھوٹی دونوں بیٹیاں پیدائشی معذور تھیں، بس ایک بیٹا ہی اس کا سہارا رہ گیا تھا۔ حالات نے اسے ایسا بنا دیا تھا شاید۔

”پانی ہر شے نہیں دھو سکتا نوراں...... یہ زخم نہیں دھو سکتا، یہ دل کے داغ اور آگ کے جلے نشان نہیں دھو سکتا۔“

”مگر راکھ تو بہا کر لے جا سکتا ہے نا بی بی۔“ وہ ذرا سا چونکی، پائپ ہاتھ میں ڈھیلا پڑا۔ دھار کا رخ بدل گیا۔ پانی نے اس کے پائنچوں کو بھگو دیا تو اس نے فوراً پائپ سیدھا کیا۔

”بہت سوچتی رہتی ہو تم نوراں۔“

”بس بی بی، بندہ جو سوچے، اچھا سوچے، ورنہ دماغ کھوکھلا ہونے لگتا ہے، یہ والی بھی نکال دوں؟“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ نوراں سر جھکائے مگن سی کام کرنے لگی، دفعتاً کسی آہٹ پر سر اٹھایا اور زور سے ہاتھ ہلایا۔

”ہش...... پرے۔“ اس نے کسی شے کو دور بھگانا چاہا تھا۔ لالہ رخ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ دیوار کی منڈیر سے ایک بلونگڑا درخت پہ پھلانگتا نیچے اتر رہا تھا۔

”ہٹ پرے!“ نوراں اسے بھگانے کو اٹھنے لگی۔

”کیا کر رہی ہو؟ مت بھگاؤ اسے۔“ وہ پائپ کیاری میں ڈال کر خفگی سے کہتی بلی کے بچے کی طرف آئی جو درخت کے تنے کے ساتھ چوکنا سا بیٹھا تھا۔

”کیوں اس بے زبان کو بھگا رہی ہو؟ ایسے کسی کو دھتکارتے نہیں ہیں۔“ وہ آگے بڑھی اور پنجوں کے بل گھاس پر بیٹھتے ہوئے چچ چچ کی آواز نکال کر ہاتھ بڑھایا کہ بلونگڑا قریب آئے۔

اسی پل کھلے گیٹ سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ وہ گھاس پر پنجوں کے بل بیٹھی بلی کو اپنے پاس بلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا رک کر دیکھنے لگا۔

”میں تو بی بی اس لیے کہ...... پتا نہیں جی کس کی بلی ہے، خوامخواہ گھر میں کیوں گھسائیں، گند کرے گی۔“ نوراں شرمندہ ہوگئی۔ جانتی تھی کہ لالہ رخ کو ایسی باتیں کتنی بری لگتی ہیں پھر بھی کوتاہی کر جاتی۔

”ہمارا گھر اس ننھے سے بچے کے لیے چھوٹا تو نہیں ہے نوراں‘ ادھر آؤ میرے پاس۔“ بلونگڑا اس کے ہاتھ کو سونگھتا اس کے قریب آ گیا۔ اس نے پیار سے اس کی فر سہلاتے ہوئے اسے بازو میں بھر لیا۔

”آئندہ کوئی دروازے پہ آئے تو اسے دھتکارنا نہیں، بے گھر کو پناہ دے دینی چاہیے۔ جانے اسے اپنے ٹھکانے کا پتا بھی ہے یا راستہ بھول گیا ہے؟“ وہ اسے بازو میں لیے پیار کر رہی تھی۔

”بلیاں راستہ کبھی نہیں بھولتیں بی بی۔ ان کو میلوں دور بھی چھوڑ آؤ، یہ پھر بھی اپنے گھر واپس پہنچ جاتی ہیں۔“ بلونگڑے کی نرم کھال سہلاتی ہوئی اس کی انگلیاں لمحے بھر کو تھمیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرایا۔

”کاش انسان بھی بلی جیسے ہوتے نوراں۔“ نوراں چند لمحے خاموش رہی پھر یک دم

سے اٹھتے ہوئے لالہ رخ کا کندھا ہلایا۔

''بی بی...... صاب۔'' اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ گیٹ کے ساتھ کوئی کھڑا تھا۔ اونچا، لمبا، اسمارٹ سا شخص۔ جینز کے اوپر گرے جیکٹ میں ملبوس...... اس کے قدموں کے قریب دو بھاری بھرکم سوٹ کیس رکھے تھے۔ وہ بلونگڑے کو بازو میں لیے نووارد کو دیکھتے ہوئے اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا تھا۔

''السلام علیکم!'' ان کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ قدرے گڑبڑا گیا۔

''وعلیکم السلام!'' اس نے انہی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ سر ہلایا۔

''آپ؟''

''میں فرہاد ہوں، فرہاد تیمور...... یزدانی صاحب سے بات ہوئی تھی۔ ان کی انیکسی کرائے پر لینے کے لیے۔'' وہ سنبھل کر اب خوش دلی سے بتا رہا تھا۔

''اچھا۔'' اس نے سر ہلا دیا۔ ابا میاں کا نیا کرائے دار...... یہی سوچ کر وہ نوراں کی طرف پلٹی۔ ''ان کو انیکسی میں لے جاؤ، چابیوں کا گچھا انیکسی کے برآمدے میں میز پر رکھا ہے۔'' وہ پھر سے بلی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو اب اس کے ہاتھ کی پشت چاٹ رہی تھی۔

''یزدانی صاحب گھر پر ہیں؟'' نوراں کے پیچھے جانے کے بجائے وہ رک کر ذرا جھجک کر پوچھنے لگا۔

''نہیں۔'' وہ بلی کو دیکھتی اس کی پشت پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ چند لمحے لب کاٹتا رکا رہا پھر پلٹ گیا۔

نوراں کے عقب میں انیکسی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پلٹ کر اسے دیکھا ضرور تھا۔ وہ ابھی تک بلی کو پیار کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ برآمدے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا، اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھا۔ وہ سامنے لان میں کرسی پر بیٹھی مگن سی اخبار کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ سادہ شلوار قمیص اور اوپر شانوں پہ پھیلی شال، کندھوں تک آتے بال کیچر میں آدھے باندھے ہوئے، وہ دنیا بھر سے لاتعلق سی لگ رہی تھی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا لان کی طرف آ گیا۔

''صبح بخیر......'' اس کے مقابل پڑی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے وہ مسکرا کر بولا تو لالہ رخ نے ذرا چونک کر سر اٹھایا۔

''صبح بخیر۔'' وہ سرسری سا اسے دیکھ کر پھر سے اخبار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اِدھر بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ہوں...... بیٹھ جائیں۔'' وہ اب انہماک سے اپنا پسندیدہ کالم پڑھ رہی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''میں فرہاد ہوں، بنیادی طور پر ایک انجینئر ہوں اور فی الحال اتنا اچھا گھر ملنے پر بے حد خوش ہوں۔''

''نائس!'' لالہ رخ کا چہرہ ابھی تک اخبار پر جھکا تھا۔

''رات میں جلدی سو گیا۔ یزدانی صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ کب تک آ جائیں گے وہ آج؟''

''وہ اپنے دوست کے ساتھ کسی کے گھر گئے ہیں۔ دوپہر تک ہی آئیں گے۔'' اب کے لالہ رخ کی پیشانی پر ننھی سی سلوٹ پڑی تھی، یوں جیسے اس کے مطالعے میں مخل ہوتے شخص سے اسے کوفت ہو رہی ہو۔

''دوپہر کو آ کر تو وہ آرام کریں گے پھر میں شام

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو ہی مل لوں گا۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''یہی کر لیجیے گا۔''

''اس گھر میں صرف آپ دونوں رہتے ہیں؟'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ برسبیل تذکرہ کہہ اٹھا۔

''جی...... فی الحال۔''

''کسی اور کو رہنے آنا ہے کیا؟'' اس کی بات سے وہ یہی سمجھا تھا۔ لالہ رخ نے ذرا سا چونک کر سر اٹھایا پھر ہولے سے سر جھٹکا۔

''شاید......'' وہ چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھے گئی پھر اس کے چہرے سے ہوتی اس کی نگاہ بھٹک کر آسمان تک چلی گئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، کسی کو نہیں آنا۔''

''آپ...... آپ یزدانی صاحب کی بیٹی ہیں غالباً؟''

لالہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تو پھر؟'' وہ ذرا حیران ہوا۔

''میں ان کی بہو ہوں۔''

''اوہ!'' اس کی آنکھوں میں واضح حیرت ابھری۔ ''آپ کے ہزبینڈ کدھر ہیں؟'' وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے گردن کو جنبش دی۔

''وہ اِدھر نہیں ہیں۔''

''تو کدھر چلے گئے؟''

''جہاں کوئی اپنی مرضی سے نہیں جاتا اور جہاں جانے والے واپس نہیں آتے۔ کسی دوسری، ان دیکھی دنیا میں رہ جاتے ہیں وہ۔'' وہ کہتے کہتے کہیں کھو سی گئی تھی۔

''اوہ...... آئی ایم سوری۔'' اس کے چہرے پر تاسف گھل گیا۔

''خیر......'' وہ ایک زود رنج سانس لبوں سے خارج کر کے پھر سے اخبار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ چند ثانیے بہت ملال سے اسے دیکھتا رہا پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔

''کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''کس کو۔'' لالہ نے سر اٹھایا، اس کے چہرے پر نا سمجھی تھی۔

''آپ کے ہزبینڈ کو......'' اس نے لالہ کے دکھ کے پیشِ نظر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''آٹھ سال ہو گئے۔''

''یزدانی صاحب کے ایک ہی فرزند تھے؟''

''جی!'' وہ پھر سے کالم پڑھنے لگی تھی۔

''وہ تو بہت دکھی ہوں گے پھر۔''

''یہاں ہر شخص دکھی ہے فرہاد صاحب...... سب کو اپنے اپنے دکھ لگے ہیں۔ خوش تو کوئی نہیں ہے۔''

''مگر جوان اولاد کا بچھڑ جانا بہت بڑا دکھ ہوتا ہے۔''

''دکھ کا کوئی پیمانہ...... نہیں ہوتا کہ ماپ لیں کون سا دکھ بڑا ہے کون سا چھوٹا۔ ہر دکھ کی اپنی جگہ ہوتی ہے اور ہر شخص کو اپنا دکھ زمین، آسمان سے بھی بڑا لگتا ہے۔''

''صحیح کہا آپ نے، ہر دکھ کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا اس کی سانس میں شامل ہو گئی تھی۔

''بچے ہیں آپ کے؟'' اور پوچھنے کے بعد اسے لگا اس نے کوئی بہت غلط بات کر دی ہے کیونکہ لالہ رخ کے چہرے پر یک دم بہت سا کرب ابھرا تھا۔ اس نے جھٹکے سے گردن اٹھا کر فرہاد کو دیکھا، لب بھینچے وہ...... جیسے بہت کچھ ضبط کر گئی۔ وہ نادم ہو گیا۔

''سوری...... میں پرسنل ہو گیا تھا، مجھے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔''

''میرے دو بیٹے تھے، ایک پانچ سال کا، ایک

تین سال کا مگر حادثے عمریں تو نہیں دیکھتے۔ وہ حادثہ ہوا اور ان دونوں کو اپنے باپ کے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اب اگر آپ کو کچھ اور نہیں پوچھنا تو میں جاؤں؟" وہ اخبار گویا پٹخنے والے انداز میں میز پر رکھ کر اٹھی اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"سنیے!" وہ پکارا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون کے قریب رکی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔

"اگر آپ کو ملازموں کی پریشانی ہے تو ہماری ملازمہ آپ کے سارے کام کر دے گی، میں اسے بھیج دیتی ہوں ابھی۔"

"نہیں...... ہاں ......میرا مطلب ہے، آپ اسے بھیج دیں مگر......ایک بات!" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ وہیں ستون کے ساتھ رکی کھڑی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک بات کہنا تھی آپ سے۔"

"کہیے، میں سن رہی ہوں۔"

"حادثوں کا مقصد انسان کو مزید مضبوط بنانا ہوتا ہے نہ کہ یہ کہ وہ مسکرانا ہی بھول جائے۔ کبھی کبھی انسان کو مسکرا لینا چاہیے۔ ورنہ مسکراہٹ اجنبی ہو جاتی ہے اور اس اجنبیت اور شناسائی کے کھیل میں انسان خود کو کھونے لگتا ہے۔ آپ کی ٹریجڈی قابلِ رقت ہے مگر کبھی کبھی مسکرا دیا کریں۔"

لالہ رخ نے ایک خاموش، لاتعلق نگاہ اس پر ڈالی اور پلٹ کر برآمدے کے زینے چڑھتی گئی۔ وہ خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"چائے۔" اس نے یک لفظی اطلاع دیتے ہوئے چائے کا مگ ابا میاں کے صوفے کے ہتھے پر رکھا اور اپنا مگ لیے آتش دان کے قریب بچھی جھولنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔

"کرائے دار سے ملاقات ہوئی تمہاری؟" وہ ریموٹ سے ٹی وی آن کرتے ہوئے یاد آنے پر پوچھنے لگے۔

"جی۔"

"کیسا لگتا ہے؟"

"پتا نہیں، مجھے انسانوں کی پہچان نہیں ہے۔"

"سب ایک سے نہیں ہوتے لالہ رخ۔" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"مجھے تو سب ایک سے لگتے ہیں ابا میاں کیونکہ جو میرے ساتھ ظلم کر گئے میں نے ان کے چہرے نہیں دیکھے، سو مجھے ہر چہرے کے پیچھے انہی چہروں کا گمان ہوتا ہے۔" وہ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔"

"ان سے حساب لے بھی لیا گیا تو مجھے کیا ملے گا ابا میاں؟ ان پر قیامت بھی ٹوٹ پڑے تو مجھے کیا پتا چلے گا کہ میں تو ان کو جانتی بھی نہیں ہوں۔"

"پھر بھی...حساب تو ان کا ہوگا نا، اس دنیا میں نہ سہی، اگلی دنیا میں سہی۔"

"قیامت بہت دور ہے ابا میاں۔"

"ہر شخص کی قیامت اس کی موت کے ساتھ آجاتی ہے۔ انتظار کرو، ان کی قیامت بھی آئے گی۔" لالہ رخ نے جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔ جانتی تھی کہ ابا میاں جو باتیں کہہ رہے تھے وہ اسے کم اور خود کو تسلی دلانے کے لیے زیادہ تھیں۔

"اندر آسکتا ہوں؟" ادھ کھلے دروازے پر مدھم دستک کے ساتھ وہ بولا تو ان دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فرہاد تیمور چوکھٹ میں کھڑا تھا۔ جینز پہ سوئیٹر پہنے، ہمیشہ کی طرح فریش اور وجیہہ۔

"آؤ آؤ بیٹا، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ابھی نوراں کو بلانے ہی لگا تھا۔ کب سے بھیجا ہے اور

پلٹ کر نہیں آئی۔" ابا میاں گرمجوشی سے اٹھے اور آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ وہ بہت ادب سے جھک کر ان سے ملا۔

لالہ رخ نے ایک لاتعلق سی نگاہ اس پر ڈالی اور ٹی وی اسکرین کو دیکھتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرتی رہی۔

"بس شاور لینے میں دیر ہوگئی۔ دوپہر میں اس لیے نہیں آسکا کہ آپ کی تھکن کا خیال تھا۔ بہت معذرت......" وہ ان کے ساتھ بڑے صوفے پر ہی بیٹھ گیا۔ البتہ بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر لالہ رخ پر ضرور ڈالی تھی۔

"السلام علیکم!" ساتھ ہی شائستگی سے سلام بھی کیا، جس کا جواب اس نے سر کی جنبش کے ساتھ زیرِ لب ایسے دیا کہ وہ دیکھ ٹی وی کو ہی رہی تھی۔

"تو میاں، انیکسی کیسی لگی تمہیں؟"

"بہت زبردست، آپ نے اس کی رینوویشن پر بہت محنت کی ہے، میں خود کو آپ کے زیرِ بار محسوس کر رہا ہوں۔"

"ارے، یہ تو میرا فرض تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں گھر پسند آیا۔" ابا میاں واقعتاً بہت خوش تھے۔ لالہ رخ کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جمی تھیں۔

"پسند تو چھوٹا لفظ ہے اور نہ صرف گھر بلکہ مجھے اس گھر کے خالص سے مکین بھی بہت پسند آئے ہیں۔"

"اچھا۔" ابا میاں ہنس دیے۔

"میں نے ممی کو صبح ہی فون کر دیا تھا کہ اب وہ جلد از جلد اپنی بہن کی خدمتوں سے فارغ ہو کر میرے پاس اِدھر ہی آجائیں۔ میری خالہ اصل میں بیمار ہیں اور ان کے بچے نہیں ہیں تو ممی انہی کے پاس رہ رہی ہیں آج کل۔"

"اوہ آئی سی، اللہ ان کو شفا دے۔ کب تک آجائیں گی تمہاری والدہ؟"

"بس انکل، ایک ڈیڑھ مہینے تک خالہ کی اوپن ہارٹ سرجری ہونی ہے۔ جیسے ہی وہ صحت یاب ہوں گی، ممی واپس آجائیں گی۔" وہ یزدانی صاحب سے اب انکل پہ آگیا تھا مگر لالہ رخ ان دونوں سے قطعاً بے نیاز سی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"چلو یہ تو اچھا ہو جائے گا، میں اس گھر میں رونق چاہتا تھا اور تمہاری فیملی سے خوب رونق ہو جائے گی۔"

"اس کی تو آپ فکر نہ کریں۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ اسی پل گھڑیال نے ٹن کی آواز کے ساتھ چھ بجائے۔ لالہ رخ چائے کا مگ میز پر دھر کر تیزی سے اٹھی، سلیپر پہنے اور باہر نکل گئی۔ اس کے عجلت بھرے انداز پر فرہاد نے گردن موڑ کر ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ لاؤنج کا دروازہ پار کر گئی تھی اور کھلی کھڑکی سے اب گیٹ کی طرف جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

"خیریت؟" اس کے انداز سے وہ ذرا پریشان سا ہو گیا۔

"ہاں، خیریت ہے۔" ابا میاں نے ایک تاسف بھری سانس اندر کو کھینچی اور سر جھٹکا۔ "تمہارا آفس تو یہاں سے قریب پڑتا ہوگا......کاشان کچھ ایسا بتا رہا تھا۔"

"جی!" وہ جو پریشانی سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا، ذرا سنبھل کر سیدھا ہوا۔ "قریب ہی ہے، پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہے۔"

"گاڑی ہے تمہارے پاس؟"

"ابھی نہیں ہے، بس دو چار دن تک نکلوا لوں گا۔"

"تب تک تم میری گاڑی استعمال کر سکتے ہو اور پلیز اب تکلف نہ کرنا۔ اگر تم میری گاڑی استعمال کرو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"جی میں بالکل تکلف نہیں کروں گا، جب بھی ضرورت پڑی، ڈھیٹ بن کر فوراً چابی مانگنے آجاؤں گا۔"

اسی پل لاؤنج کا دروازہ کھول کر لالہ رخ اندر آتی دکھائی دی۔ فرہاد نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات وہ نہیں تھے جو جاتے سمے اس نے دیکھے تھے۔ اب وہاں تھکن تھی۔ صرف اور صرف تھکن...... شاید کرب بھی تھا۔ نارسائی کا کرب۔ وہ کچھ کہے بنا اندر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔ فرہاد نے دیکھا ابا میاں نے تاسف سے سر جھٹکا تھا۔ لالہ رخ کا چائے کا ادھ بھرا مگ یونہی میز پر رکھا تھا۔ چائے اب ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

کاغذ پہ بال پوائنٹ چلنے کی تیز تیز سی آواز کمرے میں سنائی دے رہی تھی۔ وہ کاپیوں کا ایک ڈھیر سامنے رکھے بیٹھی تھی اور ہاتھ میں پکڑی کاپی کو سرخ پین سے چیک کر رہی تھی۔ آج اسکول میں بچوں کا ٹیسٹ ہوا تھا اور کاپیوں کا انبار لگ گیا تھا جسے وہ چیک کرنے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ گھنٹا ہو گیا تھا اسے کاپیاں چیک کرتے ہوئے اور ابھی بس آدھی ہوئی تھیں۔

دفعتاً اسے کسی طوطے کے بولنے کی آواز آئی، جیسے دو پرندے بہ آواز بلند چہچہا رہے ہوں۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے کھڑکی کے پردے ہٹے تھے۔ لان کا منظر وہاں سے واضح تھا۔ کیاری کے قریب نوراں کا بیٹا اصغر کھڑا ایک بڑے سے پنجرے کو درخت کی موٹی سی شاخ کے ساتھ باندھ رہا تھا۔ پنجرے میں دو خوب صورت سے بڑے بڑے طوطے تھے۔ وہ ایک دم کاپی پھینک کر اٹھی اور تیزی سے باہر آئی۔ لاؤنج کا دروازہ پار کر کے وہ بھاگتے ہوئے لان میں پہنچی۔

"اصغر......اصغر......" جتنے غصے سے اس نے پکارا تھا، اصغر ہڑبڑا کر پلٹا۔ پنجرہ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ بہ مشکل اس نے اسے سنبھالا۔

"جی باجی؟" وہ ذرا سا سہم گیا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ غصے سے کہتی تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"وہ جی...... یہ پنجرہ باندھ رہا تھا اور پر......"

"کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ طوطے کہاں سے پکڑے ہیں؟" وہ کمر پہ ہاتھ رکھے جرح کر رہی تھی۔

"میں نے نہیں پکڑے، قسم لے لو باجی۔"

"اچھا کھولو پنجرہ اور چھوڑ دو ان کو۔"

"جی؟" وہ بے چارہ ہکا بکا رہ گیا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ پنجرہ کھولو اور ان طوطوں کو اڑاؤ۔"

"پر...... پر باجی، یہ تو صاحب کے ہیں، میں کیسے......"

"جس کے بھی ہیں، انہیں پنجرے سے باہر نکالو، وہ اندر مر جائیں گے، تمہیں کیوں نہیں سمجھ آتی۔" اسے حد درجہ کوفت ہو رہی تھی۔

"باجی...... یہ باہر کے طوطے ہیں، بہت مہنگے ہیں، صاحب تو مجھے جان سے مار دیں گے اگر میں نے...... وہ صاحب آ گئے...... آپ خود ہی بات کر لو جی۔" وہ ہکلا کر کہتا، جلدی جلدی پنجرہ باندھنے لگا۔ وہ غصے سے بل کھا کر پلٹی...... فرہاد سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

"شام بخیر...... میں کافی دیر سے آپ کی گفتگو سن رہا تھا۔ سوچا ذرا مداخلت کر کے اس غریب کی جان بچا لوں، میرے طوطوں سے کیا دشمنی ہو گئی آپ کو؟" وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"فرہاد صاحب!" اس نے سنجیدہ نگاہوں سے

اس کا چہرہ دیکھا۔ "ان طوطوں کو آپ نے پنجرے میں بند کیا ہے؟"

"جی۔" اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

"شوق کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، ویسے یہ بہت قیمتی طوطے ہیں۔ پاکستانی روپوں میں پانچ چھ لاکھ سے کم نہیں ہوں گے۔"

"آپ نے انہیں خریدا ہے؟" لالہ رخ کی پیشانی پہ شکن پڑ گئی۔

"جی اور تبھی میں نے پورے استحقاق سے ان کو اس پنجرے میں رکھا ہے۔"

"اونہہ!" اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ "جس نے خریدا، اسے خریدنے کا اختیار نہ تھا...... اور جس نے بیچا اسے بیچنے کا اختیار نہ تھا۔ پانچ چھ لاکھ؟ کتنی کم قیمت لگاتے ہیں آپ لوگ کسی جیتے جاگتے وجود کی۔ یہ حق کس نے دیا آپ کو کہ کسی مظلوم کو پکڑ کر بیچتے اور خریدتے پھریں؟ زندگیاں بکاؤ مال نہیں ہوتیں فرہاد صاحب مگر کاش کہ آپ سمجھیں۔" وہ تاسف سے کہتی واپس جانے کو مڑی۔

"ایک منٹ لالہ رخ!" وہ پیچھے سے پکار اٹھا۔ اسے جاتے ہوؤں کو پکارنے کی بہت بری عادت تھی۔ لالہ رخ نے ذرا سی گردن موڑی۔ فرہاد ہولے سے مسکرایا اور ایک ہاتھ سے شاخ سے لٹکتے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ بڑا تھا۔ جیسے ہی کھلا، طوطے پر پھڑپھڑاتے ہوئے باہر کو اڑ گئے۔

"اب خوش ہیں آپ؟" وہ سینے پر بازو لپیٹے چند قدم چل کر اس تک آیا۔

"آپ یہ میری خوشی کے بجائے اللہ کی رضا کے لیے کرتے تو اچھا تھا کیونکہ اس کا بدلہ میں آپ کو نہیں دے سکتی۔" وہ اسی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ یونہی کھڑا کتنی ہی دیر اسے جاتے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر سر جھٹکا اور انیکسی کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

اس روز وہ کسی کام سے یتیم خانے آیا تھا اور اس وقت ریسپشن کاؤنٹر پہ کہنی ٹکائے کھڑا وہاں بیٹھے کلرک سے کچھ کہہ رہا تھا جب ایک دم رکا۔ اسے سامنے کاریڈور سے لالہ رخ آتی دکھائی دی تھی۔ سر پر دوپٹا اوڑھے کندھے پر بیگ لیے وہ لاتعلق سی چلتی جا رہی تھی۔

"میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔" کلرک کو عجلت میں کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اسے پکارا۔

"لالہ رخ!" وہ باہر کھلنے والے گلاس ڈور کی جانب بڑھ رہی تھی۔ آواز پہ چونک کر رکی اور ادھر اُدھر گردن گھمائی۔ فرہاد تیز قدموں سے چلتا اس تک آ رہا تھا۔

"لالہ رخ...... آپ اِدھر؟" وہ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا۔

"جی!" وہ کندھے پر لٹکتے پرس کے اسٹریپ کو پکڑے کھڑے بولی جیسے جانے کی جلدی ہو۔

"مگر...... خیریت تھی؟"

"کچھ کام تھا......" شاید اسے وضاحت سے کوفت ہو رہی تھی۔

"کام؟" وہ اچنبھے سے بولا۔ "اِدھر یتیم خانے میں؟"

"فرہاد صاحب، میں آپ کے آگے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "بہر حال، میں یہاں کھانا دینے آئی تھی۔"

"اچھا......" وہ جیسے اب بھی نہیں سمجھا تھا مگر کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔

"میں جاؤں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''جی...... ایک منٹ...... آپ گھر جا رہی ہیں؟''
''جی ہاں!'' وہ بادلِ ناخواستہ رکی تھی۔
''مجھے بھی گھر ہی جانا ہے تو میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''
''شکریہ، میرے پاس کار ہے۔''
''یہ تو اور اچھی بات ہے، پھر آپ مجھے ڈراپ کر دیں کیونکہ میرے پاس کار نہیں ہے۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔
لالہ رخ نے گہری سانس اندر کو کھینچی اور بہت ضبط سے بولی۔ ''آئیں۔'' وہ کہہ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔
''شکریہ!'' فرہاد مسکراتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔
''اس روز میں نے آپ کو کھانے کا پتیلا گاڑی میں رکھواتے دیکھا تھا، مجھے بہت تجسّس ہوا تھا کہ آپ اتنا سارا کھانا کدھر لے کر جا رہی ہیں مگر پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ اِدھر یتیم خانے میں آپ کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی اس لیے پوچھ بیٹھا۔ میں اِدھر ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ ریاض آغا، بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے ہے۔''
''میں نہیں جانتی......'' اس نے شانے اچکا دیے اور ڈرائیو کرتی رہی۔
''آپ کیا روز یہاں کھانا لے کر آتی ہیں؟ وہ ونڈ اسکرین کے پار پھیلی گیلی سڑک کو دیکھ رہا تھا جو رات کی تاریکی میں اسٹریٹ لائٹس سے روشن لگ رہی تھی۔
''جی!'' وہی مختصر جواب۔
''اور یہ سارا کھانا آپ اپنے ہاتھوں سے بناتی ہیں؟''
''جی!''
''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟''
''کیا کیوں؟'' اس نے ایکسیلیٹر کو پاؤں سے مزید دبایا۔
''اتنی محنت کیوں کرتی ہیں آپ؟ میرا مطلب ہے ہر روز اتنی مشقت اٹھانا...... آپ جاب بھی کرتی ہیں پھر یہ کام......؟'' وہ جیسے اس کے عجیب وغریب رویّے کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
''فرہاد صاحب، برا تو مجھے لگا ہے لیکن چونکہ آپ نے پوچھا ہے تو بتا رہی ہوں۔ مجھے چند بچوں کے لیے ایک وقت کا کھانا بنانے میں کوئی مشقت محسوس نہیں ہوتی، اگر میرے بیٹے میرے پاس ہوتے تو میں ان کے لیے بھی یہی کرتی، سو اب بھی وہی کر رہی ہوں۔'' کالونی کے گیٹ سے گاڑی گزارتے ہوئے اس نے لب بھینچے اسی نپے تلے انداز میں کہا تھا۔
''آپ یہ سب صرف چیریٹی کے لیے کرتی ہیں؟'' وہ کار پورچ میں روک کر لاک کھول رہی تھی جب وہ پوچھ بیٹھا۔ لاک پہ رینگتا اس کا ہاتھ تھما۔ اس نے گردن موڑ کر فرہاد کو دیکھا۔
''چیریٹی انسان کیوں کرتا ہے، یہ جانتے ہیں آپ؟''
''دل کے سکون کے لیے؟'' وہ پوچھ رہا تھا یا شاید بتا رہا تھا۔
''پھر میں چیریٹی کے لیے نہیں کرتی کیونکہ مجھے اس سے سکون نہیں ملتا یا شاید میں اس سے سکون نہیں چاہتی۔''
''پھر اللہ کی رضا کے لیے؟''
''وہ بھی ہے مگر میری نیت شاید اتنی خالص اور بے غرض نہیں ہے۔'' وہ لاک کھول کر باہر نکل آئی۔
''کیا آپ کسی غرض کے لیے یہ سب کرتی ہیں؟'' وہ اپنی طرف سے باہر نکلا اور وہیں ادھ کھلے

دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھنے لگا۔ ان دونوں کے درمیان گاڑی کی چھت حائل تھی۔
''ہاں، میری غرض ہی سمجھ لیں۔''
''کیسی غرض؟''
''فرہاد صاحب، میرا خیال ہے بہت ہو چکا، میں اس سے زیادہ کسی کو اپنے پرسنلز میں انٹرفیئر کرنے کا موقع نہیں دیتی۔'' اس نے دروازے کو لاک کیا اور کھٹ کھٹ اوپر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔
اسے پیچھے سے پکارنے کی بری عادت تھی مگر آج اس نے اسے نہیں پکارا۔ اس کا دماغ بہت سی سوچوں کے تانے بانے الجھانے میں مگن تھا۔

☆☆☆

''کیا ضرورت ہے کسی اجنبی کو اپنے گھر کے اندر گھسانے کی؟'' جب سے ابا میاں نے بتایا تھا کہ انہوں نے فرہاد کو ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے، وہ مسلسل چیزیں اِدھر اُدھر پٹختی بڑبڑائے جا رہی تھی۔ ابا میاں البتہ اس کی کسی بات کا نوٹس نہیں لے رہے تھے۔
''کیا تُک بنتی ہے کسی ایرے غیرے کو یوں گھر میں بلا کر کھانا کھلانے کی؟''
''میں تو چاہتا تھا کہ وہ روز دونوں وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے مگر بہت خود دار بچہ ہے، بہت شائستگی سے معذرت کر گیا۔ یہ دعوت بھی بہ مشکل قبول کی ہے اس نے۔''
''تو نہ کرتا...... ہم دو ٹھیک ہیں آپس میں، کافی ہیں ایک دوسرے کو۔'' وہ برتن لگاتے ہوئے مسلسل چڑچڑی ہو رہی تھی۔
''ابھی ہیں، ہمیشہ نہیں رہیں گے۔''
''ہمیشہ کس نے دیکھا ہے ابا میاں؟''
''اور شاید دیکھنے کے لیے زندہ بھی نہ رہے، اس لیے یہ بے چارہ بڈھا اپنی نا تمام خواہشات اپنی زندگی میں پوری کرنا چاہتا ہے۔'' مگر وہ لالہ رخ ہی کیا جو ابا میاں کی جذباتی بلیک میلنگ کو خاطر میں لائے، سہولت سے کہہ گئی۔
''اچھے بھلے ہیں آپ اور میری طرح سخت جان، سو کچھ نہیں ہوگا ہمیں اتنے آرام سے۔''
''آخر تم کیوں نہیں چاہتی ہو کہ میں کسی مہمان کو انٹرٹین کروں، اپنا بیٹا سمجھ کر کسی سے اپنائیت سے ملوں؟'' اس نے جھٹکے سے گردن اٹھائی، ہاتھ میں پکڑے چمچ پھسل کر کانچ کی پلیٹوں کے ڈھیر پہ جا گرے۔ ذرا سی چھنا چھن کی آواز گونجی...... جیسی کانچ ٹکرانے کی آواز آتی ہے، جیسی دل ٹوٹنے کی آواز ہوتی ہے۔
''ابا میاں!'' وہ شدید صدمے سے چور ان کو دیکھ کر رہ گئی۔ ''اسد کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ آپ کا صرف ایک ہی بیٹا ہے، اسد اور کوئی نہیں۔''
''کوئی انسان کسی کی جگہ نہیں لے سکتا، بس جذبے ہوتے ہیں جو جگہ لے لیتے ہیں۔ تم میرے جذبوں پہ پہرے تو نہیں لگا سکتیں۔'' وہ کتنی ہی دیر ڈائننگ ٹیبل کے اس پار کھڑی ان کو دیکھے گئی۔ بے یقینی، حیرت اور شاک اس کی آنکھوں میں رقم تھا۔
''آپ...... آپ اسد کو بھول گئے ہیں؟''
''کوئی باپ اپنے بیٹے کو نہیں بھول سکتا۔ میں بس فرہاد میں اسد کو تلاش کرنے لگا ہوں۔'' وہ آزردہ سے لگ رہے تھے۔
''بہت اچھے!'' اس نے غصے سے پانی کا جگ میز پر رکھا۔ ''آپ اسد کو اسی میں تلاش کرتے رہیں مگر کل کو مجھے نہ کہیے گا کہ میں بھی اسد کو اسی میں ڈھونڈوں۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں، پیر پٹختی کچن کی طرف چلی گئی۔
پھر کھانے پہ وہ خاموشی سے اپنا کھانا ختم کرتی رہی۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے مگر لالہ رخ ایک لفظ نہ بولی۔ اس کی گردن اتنی جھکی تھی کہ ٹھوڑی سینے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

چھور ہی تھی۔ فرہاد نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ابا میاں سے مختلف موضوعات پہ تبادلہ خیال کرتا رہا۔ شہر کے حالات سے لے کر اپنے بچپن کے واقعات تک۔ وہ بہت بولتا تھا اور بہت اچھا بولتا تھا۔ ابا میاں خوب محظوظ ہو رہے تھے مگر وہ خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی پھر سوئٹ ڈش کے برتن اٹھا کر جب کچن میں گئی تو پچھلے دروازے سے ہوتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ نہ کسی نے اسے بلایا، نہ وہ خود گئی۔ گھنٹے بھر بعد وہ باہر لاؤنج میں آئی تو ٹی وی چل رہا تھا اور ابا میاں صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے، مسکراتے ہوئے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔ سامنے میز پر رکھے دو چائے کے خالی مگ گواہی دے رہے تھے کہ چائے ان میں سے ہی کسی نے بنائی ہے اور یقیناً فرہاد نے بنائی تھی کیونکہ یہ سبز والے مگ اسی نے کیبنٹ سے نکالے ہوں گے، ورنہ ابا میاں چائے بناتے تو سامنے اسٹینڈ پر رکھے عام استعمال کے مگ نکال لیتے۔ باہر کے بندے کو علم نہیں ہوتا کہ کون سا برتن اس گھر میں کیسے استعمال ہوتا ہے۔

اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ابا میاں اکیلے ہی بیٹھے تھے۔ فرہاد جا چکا تھا البتہ اس کے پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

اس کے بعد ابا میاں اسے اکثر گھر پر بلانے لگے۔ وہ لاکھ چڑتی، لاکھ خفا ہوتی، وہ اثر ہی نہیں لیتے تھے۔ کبھی چائے پہ تو کبھی کھانے پہ وہ ان کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔ اس کے بعد شطرنج کا دور چلتا اور وہ دونوں گھنٹوں بیٹھے بساط پہ چالیں چلتے رہتے۔ رضا انکل کی طبیعت ذرا خراب تھی تو وہ ان دنوں کم ہی آ رہے تھے اور اگر آتے بھی تو صبح کے وقت، تب تو فرہاد آفس ہوتا تھا، یوں رضا انکل کے نہ آنے سے ابا میاں خاصے بور ہوتے لیکن شام میں وہ آ جاتا تو انہیں مکمل وقت دیتا، اس کی رکھائی کو محسوس کیے بغیر آتے جاتے کوئی چھوٹی سی بات کہہ دیا کرتا تھا۔ وہ شروع میں تو بس اس کے سلام کا جواب دیتی تھی مگر آہستہ آہستہ وہ اس کی باتوں کو ہلکا پھلکا جواب دینے لگی۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور کب ان دونوں کو فرہاد کی عادت پڑ گئی۔ روز شام کو ایک ہشاش بشاش مسکراتے چہرے کے ساتھ آنے والے فرہاد کے اب وہ عادی ہو گئے تھے۔ لاؤنج کے کسی کونے میں اخبار چہرے کے سامنے پھیلائے بیٹھی وہ لاشعوری طور پر اس کے قہقہوں اور باتوں کی طرف توجہ دینے لگی تھی۔

اس شام جب گھر میں ایک ویران سی اداسی چھائی تھی، اسے فرہاد کا نہ آنا بہت کھلا تھا۔ وہ روز شام کو آ جاتا تھا۔ آج پتا نہیں کدھر رہ گیا۔ وہ یونہی لاؤنج میں کچھ دیر اِدھر اُدھر چکر کاٹتی رہی پھر باہر آ گئی، اتنی بامروت تو تھی نہیں کہ جا کر اس کا حال پوچھتی، سو گیٹ عبور کر کے باہر کالونی کی سڑک کے کنارے واک کرنے لگی۔ جب وہ اپنے اندر کی وحشتوں سے تنگ آ جاتی تھی تو یونہی واک پر نکل جایا کرتی تھی۔ آج تو اس نے یتیم خانے کے بچوں کا کھانا بھی نہیں بنایا تھا۔ پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی بیزاری ہر سو چھائی تھی۔ جب وہ دو ایک دوسرے کو کافی تھے تو تیسرے کو اپنی زندگیوں میں داخل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے ابا میاں پہ غصہ آنے لگا تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے!'' کسی نے ایک دم اس کے عقب میں آ کر زور سے کہا تو وہ چونک کر پلٹی۔

وہ اپنی ازلی ہشاش بشاش، تروتازہ مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہر رنگ کے سوسن کے پھولوں کا گلدستہ بھی تھا جسے اس نے لالہ رخ کی طرف بڑھایا۔

''ہیپی برتھ ڈے۔''

''آپ کو کس نے بتایا کہ آج میری سالگرہ ہے؟'' وہ متعجب سی اسے دیکھنے لگی۔

''کیوں، کیا نہیں ہے؟''

''ہے مگر آپ کو کس نے بتایا؟'' وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

''ابا میاں نے بتایا تھا، میں نے سوچا کوئی تحفہ لوں گا تو آپ قبول نہیں کریں گی، اسی لیے پھول لے آیا۔ پھولوں سے تو کوئی انکار نہیں کرتا۔'' اس نے گلدستہ بڑھا رکھا تھا، لالہ رخ نے تذبذب سے اسے دیکھا اور پھر پھولوں کو...... قدرے ہچکچا کر اس نے گلدستہ تھام لیا۔

''بہت شکریہ...... مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔'' وہ اپنی ازلی سنجیدگی سے بولی مگر اس سنجیدگی میں رکھائی نہیں تھی۔

''ضرورت کیوں نہیں تھی؟ پھولوں کی ضرورت ہر انسان کو ہوتی ہے اور تازگی کی ضرورت اس سے زیادہ ہوتی ہے۔''

''انسان، انسان میں فرق ہوتا ہے!'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی پھر ایک دم کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

''اوہ، چھ بج گئے، میں ذرا آتی ہوں۔'' وہ یونہی گلدستہ اٹھائے آگے بڑھنے لگی پھر رک کر پھولوں کو دیکھا اور پھر اسے۔

''آپ یہ برآمدے میں رکھ دیں گے، میں ابھی آتی ہوں۔''

''آخر آپ ہر شام چھ بجے کدھر جاتی ہیں؟'' وہ اچنبھے سے گویا ہوا۔ پھول اس نے واپس تھام لیے تھے۔

''یہاں برابر میں ایک بریگیڈیئر صاحب ہوتے ہیں، ان سے کچھ کام تھا۔''

''پوچھ سکتا ہوں کیسا کام؟''

''کچھ پوچھنا تھا ان سے......؟''

''ایسا کیا ہے جو آپ کو روز پوچھنا پڑتا ہے لالہ رخ؟'' وہ حیران بھی ہوا اور الجھا بھی۔

''ہے کچھ، میں ابھی آئی۔'' وہ پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتی سڑک پر آگے بڑھ گئی۔ فرہاد ہاتھ میں پھول پکڑے سوچتی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

وہ واپس آئی تو پھول برآمدے کی میز پر رکھے تھے اور وہ آس پاس کہیں نہیں تھا۔ اس نے گلدستہ اٹھایا اور اندر اپنے کمرے میں لے آئی۔ کھڑکی کے ساتھ اس نے وہ پیک شدہ گلدستہ سیدھا کھڑا کر دیا

SOLE DISTRIBUTOR of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

اور پھر ان پر پانی کا چھڑکاؤ کیا، وہ پہلے سے زیادہ تازہ لگنے لگے اور سارے کمرے میں خوشبو بکھیر دی۔ وہ پھولوں کے ساتھ کرسی ڈالے بیٹھی یونہی ان کو تکتی رہی یہاں تک کہ شام بیت گئی اور یتیم خانے کے بچے اسے بھول گئے۔

☆☆☆

ہر دن اپنے ساتھ نئی ہوا لاتا اور سوسن کے رنگ دار پھول باسی ہوتے گئے۔ ہرے پتے مرجھا کر پیلے، بھورے پڑ گئے اور پھولوں کی ٹہنیاں سخت ہو کر اکڑ گئیں مگر وہ اس کی کھڑکی میں یونہی پڑے رہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور اسے ان کی باسی خوشبو اچھی لگنے لگی۔

اس شام ابا میاں نے اسے بتایا کہ فرہاد کو رات سے بخار ہے۔ اسے ایک دم ڈھیر سارے دکھ نے آن گھیرا۔ ابا میاں اس کے پاس چلے گئے تو وہ کچن میں لگ گئی۔ نوراں کو ساتھ لگائے اس نے سوپ اور کھچڑی تیار کی، ساتھ چند چیزیں اور رکھیں اور پھر جب نوراں ٹرے لیے انیکسی کی طرف جا رہی تھی تو وہ اس کے ساتھ ہی تھی۔

وہ ابا میاں کے ساتھ انیکسی کے لونگ روم میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ چہرے سے ہی نقاہت عیاں تھی۔ آنکھیں ذرا سرخ تھیں، وہ بہت دھیمے لہجے میں ان کی بات کا جواب دے رہا تھا جب وہ نوراں کے پیچھے چلتے ہوئے اندر آئی۔ اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ وہ ایک دم بہت حیرت اور تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔ اس حیرت کے درمیان ہی کہیں اس کی آنکھوں میں ایک روشنی سی جلی تھی جسے وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ یہ اِدھر رکھ دو۔'' بیک وقت دونوں کو نرمی سے مخاطب کرتی وہ ابا میاں کے ساتھ ٹو سیٹر پر جا بیٹھی۔ وہ ابھی تک کسی خوشگوار حیرت کے زیرِ اثر تھا۔

''آپ...... میں ٹھیک ہوں مگر آپ خود آئیں، تھینک یو لالہ رخ۔'' وہ حد درجہ متاثر ہوا تھا۔

''ابا میاں نے بتایا تھا کہ آپ بیمار ہیں۔'' اس نے ابا میاں کی طرف دیکھ کر کہا جو ذرا افسردہ سے لگ رہے تھے۔ نوراں ٹرے میز پر رکھ کر جا چکی تھی۔

''ابا میاں تو یونہی پریشان ہو جاتے ہیں، بس چھوٹا موٹا سا بخار ہے، ٹھیک ہو جائے گا مگر اس سب کی ضرورت نہیں تھی، مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔''

''پرہیزی کھانے کی ضرورت ہر بیمار کو ہوتی ہے۔'' وہ ذرا سا چونکا تو کیا وہ اس کی باتیں یاد رکھنے لگی تھی؟

''تھینک یو لالہ رخ۔'' وہ واقعتاً اس کا احسان مند تھا۔ وہ کافی دیر وہاں بیٹھی رہی اور اسے اچھا لگا تھا وہاں بیٹھنا۔ کوئی اپنائیت سی در آئی تھی انیکسی میں۔ سب کچھ شناسا سا لگنے لگا تھا۔

چھ بج گئے تو اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر بھی بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کیوں مگر آج اس کا دل نہیں چاہا تھا کہ وہ وہاں سے اٹھے اور بریگیڈیئر اطہر کے والدین کے گھر جائے۔ کوئی بات نہیں کل چلی جائے گی۔

اور پھر اگلے چند دن وہ یونہی نوراں کے ساتھ کھانے کی ٹرے لیے اس کا حال پوچھنے آتی رہی۔ ابا میاں وہاں بیٹھے ہوتے تو وہ بھی بیٹھ جاتی۔ ورنہ کھڑے کھڑے چند باتیں کر کے چلی آتی۔ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوا تو آفس کے چند کاموں میں ایسا گھرا کہ کچھ روز شطرنج کے لیے نہیں آ سکا۔ ان دنوں گھر یوں ویران لگتا گویا کوئی آسیب تھا جو در و دیوار سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں خاموش خاموش سے رہنے لگے۔ وہ ان کی ضرورت بن چکا تھا۔ اس اعتراف سے وہ دونوں ہی نگاہیں چرانے لگے تھے۔

وہ کھانا اب روز نہیں بناتی تھی، اکثر ناغہ کر جاتی۔ بریگیڈیئر اطہر کے والدین کے گھر بھی ہر شام نہیں جاتی بلکہ اس دفعہ تو پورا ہفتہ گزر گیا اور وہ نہیں گئی۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

اس شام وہ آیا تو گھر کے در و دیوار جاگ اٹھے، چائے پیتے ہوئے، شطرنج کی بساط سجاتے ہوئے وہ مسلسل بول رہا تھا، ہنس رہا تھا اور پھر یک دم اس کے کسی لطیفہ سنانے پر وہ دھیرے سے ہنس پڑی تو فرہاد اور ابا میاں نے رک کر اسے دیکھا تھا۔

''تم نے میری بیٹی کو ہنسنا سکھا دیا فرہاد۔'' ابا میاں نم آنکھوں سے ٹھہر کر بولے تو لالہ رخ کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ ایک دم وہاں سے اٹھ آئی۔

باہر لان میں تاریکی پھیلی تھی۔ وہ وہیں گھاس پر بچھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ تو نہیں ہنستی تھی پھر آج کیسے ہنس پڑی؟ کیا وہ لطیفہ اتنا دلچسپ تھا یا وہ فرہاد کے دوبارہ آنے پر خوش تھی؟ وہ سر ہاتھوں میں دیے بیٹھی خود سے لڑتی رہی۔

''یوں الجھنے سے کچھ نہیں ہوگا لالہ رخ!'' وہ ایک دم کہیں آس پاس سے بولا تو اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، وہ برابر رکھی کرسی کی پشت تھامے کھڑا تھا۔

''میں تو نہیں الجھ رہی۔'' وہ شانے اچکا کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

''آپ ہنستی رہا کریں، اچھی لگتی ہیں۔''

''مجھے ہنسنا نہیں آتا فرہاد صاحب...... جس کرب سے میں گزری ہوں، وہ ہنسنا بھلا چکا ہے مجھے۔''

''میں آپ کا دکھ سمجھتا ہوں لالہ۔'' وہ کرسی اس کے قریب کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ ''آپ کی ٹریجڈی بہت بڑی ہے مگر زندگی جمود کا نام نہیں ہے۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے، خود پہ چھایا ہوا جمود توڑیں، تازہ ہوا کا کوئی روزن کھولیں، ہر انسان کو تازگی کی ضرورت ہوتی ہے، آپ تازگی کیوں نہیں چاہتیں؟''

رات کے اس پہر لان کی گھاس نم تھی، وہ اس پر ننگے پاؤں بیٹھی تھی۔ آدھے چاند اور برآمدے کی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں فرہاد کا چہرہ مدھم مدھم سا دکھائی دیا۔

''آپ کو لگتا ہے میں جان بوجھ کر اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں؟''

''کیا نہیں کر رہیں؟''

''آپ اس کرب سے گزرے ہوتے تو سمجھ سکتے۔'' لالہ رخ نے قدرے دکھ سے نفی میں سر ہلایا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔''

''کیسے سمجھ سکتے ہیں آپ؟ گزرے ہوں گے آپ بھی بہت غموں سے مگر میرا غم آپ کے غموں سے مختلف ہے، یہ ہر پل کاٹنے والا ایک زہریلا ناگ ہے جو میرے آس پاس منڈلا رہا ہے۔ کھونے کا کرب بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ دکھ کو قرار نہیں پانے دیتا۔ میرے دکھ کو بھی قرار نہیں ملتا۔''

''کیا آٹھ سال بھولنے کے لیے سیٹل ڈاؤن ہونے کے لیے کافی نہیں ہوتے؟'' وہ سنجیدگی سے سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''بھولا تب جاتا ہے جب دکھ کو ٹھکانا مل جائے، میرے دکھ کو ٹھکانا نہیں ملتا، میرے آنسوؤں کو جذب ہونے کے لیے مٹی نہیں ملتی۔'' وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے کہہ رہی تھی۔ ایک موتی اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر رخسار پہ پھسل گیا۔

''مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا لالہ رخ!''

''مرنے والے؟'' اس نے بند آنکھوں سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میرا کوئی نہیں مرا، میرے بچے اور میرا شوہر... سب زندہ ہیں۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

''زندہ ہیں؟'' اس نے تعجب سے دہرایا۔ ''مگر آپ نے تو کہا تھا کہ وہ......''

''کہ وہ وہاں چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ صحیح کہا تھا میں نے۔ وہ زندہ ہیں مگر اُدھر ہیں جہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔'' چند لمحے وہ خاموشی سے سانس لیتی رہی پھر بولی تو آواز آنسوؤں سے گیلی تھی۔ ''وہ لاپتا ہیں۔''

''لاپتا؟''

''آٹھ برس پہلے، وہ جمعے کا دن تھا۔ اسد اور میرے دونوں بیٹے تیار ہو کر جمعہ پڑھنے گئے تھے، سفید کلف لگے کرتوں میں وہ پورے اہتمام کے ساتھ جمعے کے لیے جاتے تھے۔ اس روز بھی بہت خوش باش، ہنستے مسکراتے گئے تھے۔ میں نے اس دوپہر سندھی بریانی بنائی تھی، رائتا سلاد سب تیار کر کے میز پر لگا رکھا تھا اور ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھی میں گھڑی کو دیکھتے ان کا انتظار کر رہی تھی مگر وہ واپس نہیں آئے۔ کئی گھنٹے بیت گئے، ابا میاں کی طبیعت خراب تھی تو وہ گھر پر تھے جب عصر ڈھلنے کو آئی تو میں مسجد تک گئی وہاں اسد کی گاڑی ویسی ہی کھڑی تھی، امام صاحب اور دوسرے چند لوگوں نے بتایا کہ جمعے کے بعد کچھ افراد آئے تھے' چند لوگوں کو پکڑ کر گاڑیوں میں ٹھونسا اور چلے گئے۔ میں اور ابا میاں پاگلوں کی طرح ایک تھانے سے دوسرے تھانے بھاگتے رہے مگر ہر کوئی لاعلم تھا۔ میرے معصوم بیٹوں کو کس نے پکڑا، وہ ظالم کون تھے، میں نہیں جانتی، کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں نے پورے شہر کا، ہر تھانے کا، چھاؤنیوں کا ایک ایک چپّا چھان مارا، میں ہر دروازے پر گئی جہاں سے مجھے امید تھی مگر ہر جگہ میری امید توڑ کر مجھے لوٹا دیا گیا۔ میں نے پھر کبھی اپنے بیٹوں اور اپنے شوہر کو نہیں دیکھا۔ کچھ وقت گزرا تو خبریں آنے لگیں کہ میرے جیسے اور بھی بہت سے گھروں سے کچھ لوگ لاپتا ہیں پھر کچھ واقعات ابھرتے گئے۔ ہمیں پتا چلا کہ شاید اسد اور میرے بچوں کو بھی کچھ اجنبیوں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا ہے۔ میں ہر اس خاندان سے ملی جن کا کوئی یونہی پکڑ کر لاپتا کر دیا گیا تھا اور مجھے آہستہ آہستہ علم ہوتا گیا کہ چند سکّوں کے بدلے میں میری محبتوں کو بیچ دیا گیا ہے۔ جس نے بیچا اسے بیچنے کا حق نہیں تھا۔ جس نے خریدا، اسے خریدنے کا حق نہیں تھا۔ یہ سوداگر کون تھے میں نہیں جانتی مگر مجھے امید ہے کہ روزِ حشر میں ایک ایک کا چہرہ پہچان لوں گی، ایک ایک کا گریبان پکڑوں گی، اس روز انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا مگر اس دنیا میں، میں کچھ نہیں کر سکتی۔ نہ ان کو ڈھونڈ سکتی ہوں، نہ اپنے گھر والوں کو۔ پورا دن اور پوری رات مجھے یہ احساس تڑپاتا ہے کہ میرے بچے اس روز بھوکے مسجد گئے تھے۔ اس دن کے بعد سے ان آٹھ سالوں میں پتا نہیں انہوں نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا بھی ہے یا نہیں یا پھر کہیں وہ اس دن سے بھوکے تو نہیں ہیں۔ وہ زندہ ہیں اس کا مجھے یقین ہے مگر وہ کیسے ہیں، کس حال میں ہیں، میں کچھ نہیں جانتی، میں ہر شام ان کے پسندیدہ کھانوں کے دیگچے بناتی ہوں اور یتیم خانوں میں دے آتی ہوں، میں کسی کے بچوں کو کھلاؤں گی تو اللہ میرے بچوں کو کھلائے گا۔ رزق کا وعدہ تو اس نے کر رکھا ہے تو وہ اسے پورا کرے گا۔ مجھے اس پر بھروسا بھی ہے، میری امید بھی زندہ ہے مگر میرے غم کو قرار نہیں ملتا، دکھ کو ٹھکانا نہیں ملتا۔ کوئی خبر آجاتی یا وہ تینوں اگر مر چکے ہوتے تو میں چند روز، چند ہفتے، چند مہینے یا چند سال روتی، ماتم کرتی، دیواروں سے سر ٹکراتی اور پھر رو رو کر خود ہی چپ ہو جاتی۔ میرے غم کو ٹھکانا مل جاتا مگر اب یہ بے چینی، یہ لاعلمی، یہ اضطراب میرا غم بڑھاتا جا رہا ہے۔ غیر یقینی صورتِ حال یقینی غم سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے، میں ہر روز ماری ماری

پورے شہر میں پھرتی ہوں، شاید وہ نظر آجائیں، شاید کہ کوئی اپنا مل جائے، میں ہر روز شام کی چائے کے وقت..... بریگیڈیئر صاحب جو میرے ہمسائے ہیں ان کے پاس جاتی ہوں، میں روز ان سے ایک ہی سوال کرتی ہوں کہ میرے بچوں اور میرے شوہر کا کچھ پتا چلا؟ وہ روز ایک ہی جواب دیتے ہیں کہ انشاء اللہ جلد ہی پتا چل جائے گا۔ میں روز امید لے کر جاتی ہوں اور میں روز ٹوٹی امید کے ساتھ لوٹتی ہوں۔ مجھے اس امید کے کھیت کو روز پانی دینا پڑتا ہے مگر پھر بھی کبھی کبھی یہ سوکھنے، مرجھانے لگتا ہے۔ میری زندگی کا اب ایک ہی مقصد رہ گیا ہے فرہاد صاحب کہ میں بھوکوں کو کھانا کھلاؤں تا کہ میرے بچے بھوکے نہ رہیں۔ میں بے گھر لوگوں کو پناہ دوں تا کہ دور کہیں دنیا کے کسی دوسرے خطے میں میری لاپتا محبتوں کو پناہ مل جائے۔ میں گھونسلوں سے گرے پرندوں کو اٹھا کر واپس گھونسلوں میں ڈال دوں...... شاید کہ میرے بچے کبھی لوٹ آئیں۔'' اس نے بھیگی آنکھیں کھولیں تو چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ننھے ننھے قطرے رخسار پر سے پھسل کر ٹھوڑی سے نیچے لڑھک رہے تھے۔ فرہاد بالکل خاموش، دم بخود سا بیٹھا تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی۔

''یہ تھی میری کہانی، جس کو جاننے کے لیے آپ ہم دونوں کے قریب آئے تھے۔ ابا میاں تو کبھی یہ ساری کتھا آپ کو نہ سناتے، نہ ہی ہمارا کوئی جاننے والا آپ کو اتنی تفصیل بتاتا۔ میں جانتی ہوں آپ کو میرا رویہ بے چین رکھتا تھا تجسس دلاتا تھا سو میں نے چاہا کہ میں یہ تجسس ختم کردوں تا کہ آپ کی وہ وجہ ختم ہوجائے جس کے لیے آپ ہمارا اتنا خیال کرتے ہیں، غرض جس رشتے میں شامل ہو، اسے بہت جلدی توڑ دیتی ہے اور ایسے ٹوٹنے والے رشتے بہت تکلیف دیتے ہیں، سو میں نے اس غرض کے رشتے کو ختم کردیا۔ اگر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ دیں، ورنہ میں جاؤں؟'' وہ ہتھیلی کی پشت سے رخسار رگڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں، میں تو......'' وہ سخت شرمندہ لگنے لگا تھا۔

''میں نے اور ابا میاں نے ایک فیصلہ کیا ہے کاشان کہ کسی جاننے والے کی انیکسی خالی ہو رہی ہے، آپ چاہیں تو ادھر شفٹ ہوسکتے ہیں۔ کانٹریکٹ کے مطابق ہم آپ کو ایک ماہ کا نوٹس دے رہے ہیں، اس کے بعد ہمیں انیکسی واپس چاہیے ہوگی۔ یہ ہم دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ آپ اس کو مان لیں گے اور دو پہلے سے دکھی انسانوں کو مزید تکلیف نہیں دیں گے۔''

کتنے ہی پل وہ سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر دھیرے سے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

''مگر آپ نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟''

''کیونکہ ہم دو ایک دوسرے کو کافی ہیں، ہمیں کسی تیسرے کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہمارا کوئی تیسرا ہے تو صرف اللہ ہے۔ انسان ہمارے قریب اس لیے نہیں آتے کہ انہیں ہم سے محبت ہوتی ہے، وہ صرف اور صرف تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آتے ہیں، ہماری زندگیوں کی گتھیاں جاننے کے لیے آتے ہیں۔ انہیں سلجھانے کے لیے نہیں اور پھر اس کے بعد لاپتا ہوجاتے ہیں۔ ہمارے اپنے پہلے ہی لاپتا ہیں، اب مزید رشتے بنا کر انہیں کھونے کا حوصلہ ہم میں نہیں ہے۔'' وہ واپس مڑ گئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی برآمدے کے زینے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ رات کی تاریکی میں اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔ اسے پیچھے سے پکارنے کی بری عادت تھی مگر آج وہ چاہنے کے باوجود اسے نہیں پکار سکا۔

دھوپ چھاؤں

صائمہ حیدر

آج موسم بہت خوشگوار تھا، سرمئی آسمان پر جا بجا بادلوں کے ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے، ہلکی ہلکی پھوار سے لان کی ہریالی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ ماحول پر ایک خوشگوار اور رومان انگیز سحر طاری تھا۔

''یار کبھی تو تم مجھے بھی وقت دے دیا کرو، یہ کیا تم ہر وقت کاموں میں الجھی رہتی ہو۔'' آذر نے نیلما کے برابر میں بیٹھتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا۔

"اور آپ بھی تو اپنا بچپنا چھوڑ دیا کریں۔" نیلما نے آذر کے ہاتھوں کو اپنے کندھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں ایک عورت کی محبت میں دن رات تڑپ رہا ہوں اور اس عورت کو اپنے شوہر یعنی مجازی خدا کا بالکل بھی خیال نہیں ہے۔" اتنے میں آذر اور نیلما کے تین شرارتی بچے ان کے ارد گرد آکر بیٹھ گئے۔

"بالکل خیال ہے آپ کا جناب! مگر آپ کی اولادوں سے فرصت ملے تو آپ کے لیے وقت نکلے۔" نیلما نے اپنے چھوٹے بیٹے کو گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"پاپا آپ اس مرتبہ میرے لیے **peanut butter** نہیں لائے ناں!" چھوٹی ردا نے تتلاتے ہوئے کہا تو آذر اور نیلما کو ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"ویسے ایک بات تو طے ہے کوئی اب تمہیں دیکھے گا تو یقین نہیں کرے گا کہ تم وہی نیلما ہو جو تتلیوں اور جگنوؤں کے پیچھے بھاگتی تھی، خوشبوؤں کی دیوانی تھی اور پھولوں کی طرح مہکتی تھی...... اور تو اور اپنے کپڑوں پر پڑی ایک شکن جس کو پریشان کر دیتی تھی اب اسے اپنا بالکل ہوش نہیں رہتا۔" نیلما نے بچوں کو ٹی وی کی طرف بھیجا اور بولی۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا، تمہیں دیکھ کر اب کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ کہانیاں لکھنے اور شاعری کرنے والا آزادی کا دلدادہ آذر اپنے بیوی بچوں کی خاطر سب کچھ بھلا بیٹھا ہے۔"

"شادی کے بعد زندگی کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے میری جان! ہمیں بچوں کی خوشیوں میں ہی اپنی خوشیاں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ ہماری صبحیں اور شامیں بچوں کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر گزرتی ہیں۔ اچھا سنو آج موسم بہت اچھا ہے، آج شام ہم ڈنر باہر کریں گے۔" آذر نے نیلما کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔

"اوہ بہت خوب! میں بھی گھر میں بند بند تھک سی گئی ہوں، روزانہ کی وہی روٹین ہے، اسکول، بچے، ہوم ورک پھر ڈنر کی تیاری، اپنے آپ کے لیے تو کوئی ہے کہ فرصت ہی نہیں ہے...... مگر آذر تم پھر چلے جاؤ گے...... تمہیں پتا ہے تم جب یہاں نہیں ہوتے ہو تو میرے لیے ایک ایک دن صدیوں پر محیط ہوتا ہے، تم یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے، جب تک تم واپس نہیں آ جاتے میری جان سولی پر اٹکی رہتی ہے۔ تین تین بچوں کے ساتھ تمہیں پتا ہے ناں کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں بہت تھک جاتی ہوں مگر جب تم ہوتے ہو تو میں اپنے آپ کو زمانے کے سرد وگرم سے محفوظ پاتی ہوں، ہر دکھ اور تکلیف بھول جاتی ہوں۔ بس یہ یاد رہتا ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔" نیلما نے آذر کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا ہے میرے بغیر رہنا تمہارے لیے بہت مشکل ہوتا ہے مگر پرکشش تنخواہ کی وجہ سے میں یہ نوکری چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اب کوشش کیا کروں گا کہ جلدی جلدی آ جایا کروں۔ اچھا خیر وہ جو میں انڈیا سے تمہارے لیے، پنک ایمبرائیڈری والا سوٹ لایا تھا آج وہ پہننا وہ مجھے بہت پسند آیا تھا اور شام میں واپسی پر تمہارے لیے پھولوں کے گجرے بھی لیتا آؤں گا وہ پہن لینا۔" آذر نے نیلما کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کہیں جانا ہے کیا؟" نیلما نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم پریشان مت ہو، وہ جو میرے پرانے باس تھے ناں شمشاد صاحب جن کے گھر ہم ڈنر پر گئے تھے۔"

"ہاں ہاں مجھے یاد آیا۔" نیلما نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"پچھلے دنوں ان کی وائف کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی تعزیت کے لیے جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر جلدی لوٹ آنا میں تمہارا انتظار کروں گی۔ وہ کتنی اچھی تھیں بے چاری، مجھے بھی افسوس ہو رہا ہے مگر شمشاد صاحب کچھ عجیب سے لگے تھے مجھے۔"

☆☆☆

نیلما اور آذر کی شادی کو تقریباً دس سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں وہ تین بچوں کے والدین بن چکے تھے، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آذر ایک ملٹی نیشنل شپنگ کمپنی میں چیف انجینئر تھا اسی وجہ سے اسے چھ ماہ شپ پر رہنے کے بعد چھ ماہ گھر پر رہنے کی اجازت ملتی تھی۔ وہ دن گن گن کر گزارتا تھا اور بچوں کے پاس آکر وہ تمام وقت بچوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ نیلما کے آنچل میں ستارے ٹانکنا چاہتا تھا۔ اسے اور بچوں کو ہر وہ خوشی دینا چاہتا تھا جس کے لوگ صرف خواب دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

نیلما کچن میں کھڑی ہنڈیا میں چمچ چلا رہی تھی۔ اس کا چھوٹا بیٹا کچن کی سلیب پر بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ بڑی ٹینشن میں تھی اتنے میں ڈور بیل بجی۔

"ردا بیٹا دروازہ کھولو، دیکھو تو دروازے پر کون آیا ہے۔" آذر نیلما کو اسی حلیے میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"یہ کیا تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" آذر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہ، آئی ایم سوری آذر! میں تو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ وہ زین کو دیکھو کتنا تیز بخار ہو رہا ہے، نہ کچھ کھا رہا ہے نہ پی رہا ہے بس روئے جا رہا ہے، میں اس کی وجہ سے بالکل بھول گئی۔"

"لاؤ مجھے دو اس کو اور تم تیار ہو جاؤ۔" آذر نے ہاتھ پھیلا کر زین کو گود میں اٹھا لیا۔

"مگر میں نے تو کھانا تقریباً تیار کر لیا ہے۔"

"ایسا کرو ابھی چولہا بند کر دو اور اس کو کل کے لیے رکھ دو، اسے کل کھالیں گے۔ جب میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم ڈنر باہر کریں گے تو بچے کو بخار میں لے کر تم کچن میں کیوں گھس گئیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آذر مگر زین کو ڈاکٹر کو بھی تو دکھانا ہے، ہم ڈنر کل کر لیں گے باہر۔"

"ہاں ہاں ڈاکٹر کو بھی دکھا دیں گے وہاں کتنا ٹائم لگے گا، پہلے ڈاکٹر کو دکھائیں گے پھر ڈنر کرنے چلیں گے۔ تم ایسا کرو بچوں کو تیار کر کے خود بھی تیار ہو جاؤ، میں زین کو دیکھتا ہوں۔"

نیلما نے بچوں کو تیار کیا پھر خود بھی جلدی جلدی میں تیار ہو گئی۔ آذر نے نیلما کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے وہ پنک والا سوٹ نہیں پہنا جو میں نے صبح تمہیں کہا تھا۔"

"اوہ...... وہ ڈریس تو زرمین کو اپنے کزن کی منگنی میں پہننا تھا وہ لے کر چلی گئی۔"

"یار تم کیا چیز ہو تمہیں اپنے شوہر کی خوشی کا کچھ خیال نہیں، میں نہیں جا رہا اب تم گھر میں ہی بیٹھو، تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ زندگی کو انجوائے کیا جائے۔"

"آذر تم ہی تو کہتے ہو پڑوسیوں کا خیال رکھا کرو، جب تم نہیں ہوتے تو یہی لوگ تو ہمارا خیال رکھتے ہیں ناں! زرمین کو وہ ڈریس پسند آیا تو میں اسے منع نہیں کر پائی...... آذر آئی ایم سوری، میں وہ سوٹ کسی اور دن پہن لوں گی، آج میں تمہاری پسند کا فیروزی سوٹ پہن لیتی ہوں پھر تم مجھے خود اپنے ہاتھوں سے لائے ہوئے گجرے پہنا دینا، اب مسکراؤ، مجھے تمہارا یہ غصے بھرا چہرہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"اوکے بابا! میں ہی غلط تھا، چلو اب تیار ہو جاؤ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" تھوڑے توقف کے بعد آذر نارمل ہو گیا۔

انہوں نے پہلے زین کو ڈاکٹر کو دکھایا پھر باہر کھانا کھایا۔ اب وہ واپس گھر کی طرف آ رہے تھے۔ آذر کا موڈ بہت اچھا تھا، باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی بہت خوبصورت اور دلکش لگ رہا تھا سب کچھ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آذر کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں، کیا کوئی لاٹری ہاتھ لگ گئی ہے، آج تو بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو۔" نیلما نے آذر کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں لگ گئی ہے ناں ایک لاٹری ہاتھ، نیلی نیلی اور جھیل سی گہری آنکھوں والی نیلما حسن میری بیوی، بڑی خوبصورت ہے وہ اور آذر حسن اس سے بہت محبت کرتا ہے۔" آذر نے نیلما کی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اور نیلما حسن بھی آذر حسن سے بہت محبت کرتی ہے۔" آذر نے پیچھے مڑ کر دیکھا پھر نیلما سے کہا۔

"ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو۔"

"ارے، یہ کیا تینوں کیسے مزے سے ایک دوسرے کے سر پہ سر رکھ کر سو رہے ہیں۔"

"چلو اچھا ہے، اب میں تمہاری پسند کا کوئی رومینٹک سونگ لگاتا ہوں ورنہ یہ ننھے فرشتے اپنی مرضی کے آگے ہماری تو چلنے ہی نہیں دیتے۔" گانا بجتے ہی ماحول پر ایک رومانس پرور کیفیت طاری ہوگئی۔ دونوں پر ایک سرشاری سی چھا گئی۔

"آؤ گے جب تم ساجنا
انگنا پھول کھلیں گے
برسے گا ساون
برسے گا ساون جھوم جھوم کے
دو دل پیار کریں گے"

پتا ہی نہ چلا کب گھر آگیا۔ آذر اور نیلما نے بچوں کو گاڑی سے اتار کر ان کے بیڈروم میں لے جا کر سلا دیا۔ نیلما اپنے بیڈروم کے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی اور آذر اسے ستائشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

آذر کو نیلما سے محبت تھی اور نیلما کو آذر سے، یہ بات ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی، وہ ایک جان اور دو قالب تھے..... ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ ان کی زندگی کا پیالہ خوشیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

جن دنوں.... آذر اس کے پاس ہوتا تھا وہ دن اس کے لیے انمول خزانہ ہوتے تھے جنہیں وہ آہستہ آہستہ نکال کر خرچ کرتی تھی کہ وہ دن کبھی ختم نہ ہوں۔ اسے زندگی بہت حسین لگتی اور بہت مختلف بھی، اس کے لیے ان دنوں سورج بھی زیادہ چمکدار لگتا تھا، چاندنی زیادہ سحر انگیز ہوتی تھی، پھولوں کی رنگت بڑھ جاتی تھی ان کی خوشبو میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ زندگی ایک سوغات لگتی تھی۔ وہ.. وہ دھیمی آواز میں آذر سے کہتی۔

"آذر میں تمہارا کیا کروں، ان چھ مہینوں میں، میں تمہاری اتنی عادی ہو جاتی ہوں کہ ہر چیز سے بے گانہ ہو جاتی ہوں۔"

"میڈم بس آپ میرا اچار نہ ڈالیں باقی سب کچھ کر ڈالیں۔" دونوں کافی کا سپ لیتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

اب آذر کو جانا تھا، چھ ماہ کیسے چٹ پٹ گزر گئے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ بچے اور نیلما آذر کے ساتھ پورٹ پہنچے کسی کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ آذر واپس جائے مگر اس کو جانا تھا۔ چار چار زندگیاں اس سے وابستہ تھیں۔ نیلما کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور آنسو بار بار اس کی آنکھوں سے چھلک پڑتے تھے۔

"کیا ہوا جان کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" آذر نے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... بس تمہاری جدائی کا تصور ہی مجھے اندر سے جھنجوڑ دیتا ہے، نہ جانے کیوں اس مرتبہ دل نہیں چاہ رہا کہ تم جاؤ۔" نیلما نے کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جو تمہاری نیلی آنکھیں ہیں ناں یہ روتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ تم روؤ گی تو بچے کیا سوچیں گے، ان کے ننھے ننھے دل اپنی ماں کو روتا دیکھ کر کانپ جائیں گے، چلو آنکھوں سے آنسو صاف کرو ورنہ

تمہارے ساتھ میں بھی رونے لگوں گا۔" آذر نے رونے کی ایکٹنگ کی تو نیلما اور بچے اسے دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا جاتے وقت اپنے دل پر کسی قسم کا کوئی بوجھ لے کر جائے۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے نیلما سے پوچھا۔

"وہ جو پرسوں تم نے میچنگ شوز جلد بازی میں دیکھ کر چھوڑ دیے تھے ناں وہ یہاں سے واپسی میں جا کر لے لینا۔"

"آذر، تمہیں میرے شوز کی پڑی ہوئی ہے اور یہاں میری جان پہ بنی ہوئی ہے۔ ارے ہاں تم نے پیسے بینک میں ڈلوا دیے ہیں ناں۔"

"بالکل ہیں پیسے بلکہ میں ہوں ناں تمہاری چلتی پھرتی اے ٹی ایم مشین۔ میرے پیچھے تم اے ٹی ایم کارڈ سے کام چلانا اور جتنی دل چاہے شاپنگ کرنا۔"

"آذر تم بھی حد کرتے ہو۔" نیلما نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"ویسے مجھے لگتا ہے تم عورتوں کے لیے ہم مرد اے ٹی ایم مشین ہی ہیں اور یہ ساری دنیا ایک شاپنگ سینٹر ہے، ہے ناں!"

"جی نہیں، میرے لیے ایسا کچھ نہیں ہے، میرا آذر ہی میرا سب کچھ ہے۔"

"اچھا اگر آذر مر جائے نیلما تب بھی اس سے محبت کرے گی؟" آذر نے سوال کیا۔ "آذر مرے ہی کیوں، مریں اس کے دشمن!" نیلما نے جواب دیا۔ "ویسے آج پورٹ کی کافی بہت مزیدار ہے ناں، بچوں کو دیکھو کیسے مزے سے چاکلیٹ کھاتے ہوئے شپس دیکھ رہے ہیں۔" نیلما نے بچوں کو تا حدِ نگاہ شپس اور بوٹس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پریشان مت ہونا میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا اور صبح تک میں وہاں پہنچ کر تمہیں فون کروں گا۔ اچھا بچوں کو بلاؤ سیٹی بج رہی ہے جانا ہی پڑے گا۔" آذر نے اپنے بے تاب ہوتے دل پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ بچے اور نیلما اس سے گلے ملے اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

آذر کے جانے کے بعد ہر کوئی اداس تھا۔ بچے اپنے کمرے میں دبک گئے تھے جبکہ نیلما اپنے بستر پر سکڑ کر لیٹ گئی۔ اسے کچھ بے چینی اور بے کلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ آذر کے ساتھ سو رہی تھی اور آج اتنے بڑے کمرے میں وہ اکیلی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ آذر کے فون کا انتظار کرنے لگی مگر اس کا فون آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ ایک بے نام سے کرب سے گزر رہی تھی۔ کچھ وقت اور گزر جانے کے بعد وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ بچے بھی اسے دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے، وہ آذر کی خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے آفس فون کیا وہاں سے معلوم ہوا کہ جہاز پر موجود کسی بھی شخص سے رابطہ نہیں ہو پا رہا حتیٰ کہ کیپٹن نعیم سے بھی رابطہ منقطع ہے۔ وہاں بھی سب ہی پریشان تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔

ہفتہ بھر ہولتے اور پریشان ہوتے گزر گیا۔ نیلما نے اپنے بھائیوں اور دیگر رشتے داروں کو بھی اطلاع کر دی، سب ہی اس کی دلجوئی میں لگے ہوئے تھے۔ جو جس کے بس میں تھا وہ کر رہا تھا۔ لوگ حکامِ بالا تک پہنچ گئے مگر کوئی بھی کسی بھی قسم کی انفارمیشن دینے سے قاصر تھا۔ کچھ دنوں تک عزیز رشتے دار اس کے اور بچوں کے ساتھ رہے تو اس کا حوصلہ بندھا رہا پھر سب آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اب اسے اکیلے ہی تمام مشکلات کو فیس کرنا تھا۔ وہ کٹھنائیوں سے گزرنے کی عادی نہیں تھی مگر اسے گزرنا تھا۔ ہر مصیبت کو چیلنج سمجھ کر قبول کرنا تھا۔ اس کا شوہر لاپتا تھا، اس کا گھر راکھ کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ وہ گھر جہاں کبھی خوشیاں ہی خوشیاں تھیں وہاں اب موت کا سا سکوت طاری تھا۔ بے بسی اور مایوسی کی ایک بے چین کر دینے والی کیفیت اس پر طاری رہتی۔ وہ تڑپ تڑپ کر ہیڈ آفس فون کرتی مگر بے سود!

☆☆☆

نیلما کی منتظر نگاہیں دروازے کی جانب لگی رہتیں۔ دن مہینے اور مہینے سال میں تبدیل ہورہے تھے۔ وہ کب تک کسی کا در کھٹکھٹاتی، جو کچھ جمع پونجی تھی وہ تیزی سے ختم ہورہی تھی۔ وہ اعلیٰ حکام تک گئی میڈیا سے میٹنگ کی مگر وہاں سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہو پارہا تھا کہ بات کچھ آگے بڑھتی۔ سب کی سوئی ایک ہی جگہ پر آکر اٹک گئی تھی کہ یقیناً بحری قزاقوں نے جہاز کا مال لوٹ کر شپ کے عملے کو ماردیا ہوگا یا یرغمال بنالیا ہوگا مگر وہاں سے ابھی تک کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوئی تھی۔ یہاں پر جتنی بھی پاکستانی فیملیاں تھیں وہ سب ہی پریشان تھیں۔ امید کا دامن جیسے ان کے ہاتھوں سے چھوٹتا جارہا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتی ہر کوئی اسے تسلی اور دلاسا دے کر رخصت کردیتا۔

سچ ہے برے وقتوں میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کچھ عرصے تک رشتے دار اس کا ساتھ دیتے رہے۔ مگر سب کی اپنی زندگی تھی، کون کب تک کسی کے دکھ کو اپنا زخم سمجھ کر مرہم لگاتا ہے۔ وہ جوان تھی، خوبصورت تھی، پڑھی لکھی تھی لیکن اس مردوں کے معاشرے میں اکیلی عورت کے لیے سروائیو کرنا بہت مشکل ہوتا ہے یہ بات اب وہ بخوبی جاننے لگی تھی۔

زندگی اتنی آسان نہ تھی، ہاتھ میں پیسہ نہ ہو تو کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں کہ انسان ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتا ہے۔ نیلما نے کبھی غربت نہیں دیکھی تھی مگر اب اس کو غربت سے آنکھ مچولی کھیلنی پڑرہی تھی۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی، وہ دوڑتے ہوئے گئی اور فون اٹھالیا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے کوئی انجان سی آواز آرہی تھی۔

''میڈم، میں شپنگ کمپنی سے ابراہیم بات کررہا ہوں۔''

''جی بولیں، میں سن رہی ہوں۔'' اس نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

''میڈم، مجھے آپ کو یہ اطلاع دینی تھی کہ ہم کمپنی والے صرف جہاز ڈھونڈنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔''

''کیا! کیا مطلب، جہاز کا عملہ کہاں گیا؟'' اس کے الفاظ لڑکھڑانے لگے۔

''وہ تو ہمیں نہیں معلوم، ابھی تک کوئی فون کال یا ڈیمانڈ نوٹس ہمیں موصول نہیں ہوا ہے کہ ہم کوئی نتیجہ اخذ کرسکیں۔ اس جہاز پر کسی بھی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں ہے۔''

''یعنی آذر کا کوئی پتا نہیں ہے وہ کہاں ہے؟'' اس نے یک دم صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔

''نہیں میڈم وہی تو میں آپ کو بتانے کی کوشش کررہا ہوں۔ ہمیں جہاز تو مل گیا ہے مگر اس پر جو کروڑوں مالیت کا سامان تھا وہ غائب ہے اور جہاز کو بھی بری طرح توڑ پھوڑ کر کھنڈر بنادیا گیا ہے۔''

''تو ہوسکتا ہے بحری قزاقوں نے جہاز کو لوٹ کر عملے کو یرغمال بنالیا ہو۔''

''کچھ بھی ممکن ہے، ہماری حکومت اور کمپنی سرتوڑ کوشش کررہی ہے، ہم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے ہیں۔'' نیلما کو ایک کوہ گراں اپنے اوپر گرتا ہوا محسوس ہوا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ ...... کوئی احساس ہے آپ لوگوں کو، اتنے لوگوں کو آپ کی کمپنی اپنی ذمے داری پر ملازمت دیتی ہے، ان سے کام کراوتی ہے مگر ان کی جان کی حفاظت کیسے کرنی ہے یہ نہیں پتا ہے۔ کچھ علم ہے آپ لوگوں کو کہ گھر کے وارثوں کے اس طرح سے غائب جانے سے پورے پورے گھر اجڑ کر رہ گئے ہیں۔ ہم لوگ کس کرب واذیت کا شکار ہیں اس کا اندازہ ہے آپ کو؟'' نیلما نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''میڈم میں نے آپ سے کہا ناں کہ ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے ہیں جیسے ہی کوئی انفارمیشن ملے گی ہم آپ سب فیملیز کو اطلاع کردیں گے۔'' فون رکھتے ہی نیلما کے حواس جانے لگے، اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا، اس کو اپنا آپ کرچیوں میں ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ایک پُردرد آواز میں چیخی، آذر......!

وہ بری طرح روئے جارہی تھی۔ بچے اس کے گرد جمع ہوگئے، اس کے بڑے بیٹے نے سب کو فون کردیا تھا پھر سے سب رشتے دار جمع ہوگئے ہر کوئی اسے تسلی اور دلاسا دے رہا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ اب آذر واپس نہیں آئے گا، بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس کی دلجوئی کررہے تھے انہیں کچھ امید بھی کہ شاید آذر واپس آجائے۔

اس کی زندگی یونہی بے سمت گزر رہی تھی۔ راتیں جاگ کر اور دن روزگار کے چکر میں گزر جاتا تھا۔ اسے بچوں کو پالنا بھی تو تھا۔ وہ آج آفس سے آئی تو اس کا چھوٹا بیٹا تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی اس کو استھما کا اٹیک ہوا ہے۔ وہ اسے اسپتال لے جانا چاہتی تھی مگر اس کے پاس پیسے بہت کم تھے۔ وہ زرمین سے پانچ ہزار ادھار لے کر آئی اور اپنے بیٹے کو لے کر اسپتال بھاگی۔ زین کو رات بھر آئی سی یو میں رکھا گیا۔ ڈاکٹرز اور نرسیں اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد چیک کرتے رہے صبح ہوتے ہی اس کی طبیعت کچھ سنبھلتی گئی اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دوسرے دن اس نے زرمین کا شکریہ ادا کیا کیونکہ وہی تو تھی جو ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتی تھی، اس کے بچوں کو اس کی غیر موجودگی میں اپنا سمجھ کر سنبھالتی تھی۔ بڑے بھائی کو پتا چلا تو وہ گھر آئے بغیر نہ رہ سکے۔

''نیلما کیا حرکت ہے یہ؟ تم مجھے ایک فون کرکے اطلاع نہیں دے سکتی تھیں۔ اتنی غیرت کیسی بھائی ہوں میں تمہارا! اپنے بھانجے کو اسپتال نہیں لے جاسکتا تھا، میں تمہارا اچھا ہی سوچوں گا دشمن نہیں ہوں میں تمہارا۔''

''وہ تو مجھے پتا ہے بھائی لیکن میں نے سوچا آپ بلاوجہ پریشان ہوں گے بس اسی لیے نہیں بتایا تھا آپ کو۔''

''نیلما دیکھو بیٹا! اب تم حقیقت کی دنیا میں آجاؤ، تم کب تک آذر کا راستہ دیکھوگی وہ اب نہیں آئے گا۔ تمہارے بچے چھوٹے ہیں ابھی انہیں ہر قدم پر ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ تم کب تک یوں تنہا زندگی کی بقا کی جنگ لڑتی رہوگی۔'' بڑے بھائی نے نیلما کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''جب تک آذر نہیں آجاتا تب تک!'' اس کا یقین اٹل تھا۔ ''آج صبح شمشاد صاحب بھی آئے تھے، وہ مجھے ایک پُرکشش سیلری کی آفر کر کے گئے ہیں۔'' نیلما نے بڑے بھائی کو مطلع کیا۔

''کون ہیں یہ شمشاد صاحب' میں انہیں پہچانتا نہیں۔'' بھائی نے دماغ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آذر کے پرانے باس ہیں آذر کی ان سے بہت اچھی دوستی ہے، وہ کئی مرتبہ یہاں آذر کی غیر موجودگی میں بھی آچکے ہیں اور میری کچھ مالی معاونت بھی کرتے رہے ہیں۔''

''پہلے تو تم نے کبھی نہیں بتایا، کیا شادی شدہ ہیں؟'' اب نیلما کی چھوٹی بہن نے مداخلت کی۔

''ہاں ...... مگر کچھ سال پہلے ان کی بیوی فوت ہوگئی ہیں۔''

''تو کیا وہ تم میں انٹرسٹڈ ہیں۔'' زوبیہ نے پوچھا۔

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے، میں اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے افیئر چلاؤں گی۔ وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں، آذر کے ان سے مراسم تھے اسی لیے میں نے ان پر بھروسا کیا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا آپ لوگ سوچ رہے ہیں۔''

''ویسے یہ بات تو طے ہے کہ اب آذر کا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا۔ میری مانو تو تم شادی کرلو' کبھی ایک جاب کرتی ہو تو کبھی دوسری یہ سلسلہ کب تک چلے گا، بچوں کے بارے میں سوچو، ان معصوموں کے چہرے زرد پڑ گئے ہیں۔ ہم سب ہی کو تمہیں یوں رُلتا دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔''

''آپ لوگ میرے بارے میں پریشان ہونا

چھوڑ دیں اور ہاں ایک بات کان کھول کر سن لیں میں دوسری شادی ہرگز نہیں کروں گی چاہے مجھے اپنی زندگی کی بازی ہارنی پڑے۔‘‘ اس نے پختہ ارادے سے کہا اور کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

☆☆☆

دن مایوسی اور بے یقینی میں گزر رہے تھے آج کل وہ کہیں کام پر نہیں جا رہی تھی جہاں بھی جاتی لوگ اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ جب تک ممکن ہوتا وہ زبان سے جنگ کرتی، یہ زبان بھی عورت کے لیے ایک ہتھیار ہے جس کو استعمال کر کے وہ اپنا بچاؤ کسی حد تک ممکن بناتی ہے ورنہ مردوں کے اس معاشرے میں مرد عورت کو چبائے بغیر ہی نگلنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ بیٹھی اپنی بیٹی کے بال بنا رہی تھی کہ شمشاد صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے رات آٹھ بجے اسے آفس میں بلایا تھا، ان کا آفس ان کے گھر سے ہی ملحق تھا۔ پہلے تو وہ ٹائم کی وجہ سے کچھ پریشان ہوئی مگر پھر کچھ توقف کے بعد اس نے انہیں فون کر کے کہہ دیا کہ وہ آئے گی۔

اس کے پاس اب گھر میں کچھ نہیں بچا تھا سوائے چند چیزوں کے جن کو بیچ کر وہ مزید چند دن گزارہ کر سکتی تھی۔ اس کے دماغ میں یادیں اس طرح گھومتیں جیسے آسمان پر بادل کے ٹکڑے اڑتے ہیں وہ ہر لمحے آذر کے ساتھ بتائے ہوئے اپنے سنہری پلوں کو یاد کرتی رہتی۔ وہ اسی دنیا میں رہنا چاہتی تھی جو اس کی پچھلی زندگی تھی۔ پھر وہ سوچتی افلاس ایک خوفناک بیماری ہے جو انسان کے جسم کو، دماغ کو بلکہ روح تک کو تباہ کر دیتی ہے۔ کبھی خود اس کی زندگی کتنی حسین اور روشن تھی جب وہ یہ سب سوچتی اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

دھیرے دھیرے سورج چھپ گیا، سیاہی چاروں طرف پھیل گئی، گھر میں لائٹ آن کر دی گئیں۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کو ساتھ لیا اور شمشاد صاحب کی طرف چل دی۔

شمشاد صاحب اس کے ساتھ بیٹے کو دیکھ کر کچھ متذبذب ہوئے مگر پھر بولے، میٹنگ کا تقاضا ہے کہ آپ اکیلی ہی روم میں آئیں۔ شمشاد صاحب نے اس کو کمرے میں لے جا کر بڑی سی ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کو اکیلا پن دیکھ کر کچھ گھبراہٹ ہوئی، وہ بولی۔

’’شمشاد صاحب باقی افراد نہیں ہیں، مجھے اکیلے ہی آپ نے بلوایا ہے، میں تو سمجھ رہی تھی آپ کا پورا اسٹاف ہو گا۔‘‘

’’ہاں ہاں وہ بھی آتے ہی ہوں گے، میں تو بس یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ بہت خوبصورت ہیں۔‘‘

’’جی کیا مطلب ہے آپ کا؟‘‘ نیلما نے حیرانی سے کہا۔

’’دیکھو نیلما یہ دنیا ایک بازار ہے جہاں ہر چیز کو بیچا اور خریدا جا سکتا ہے اور یہاں کاروبار Give & take کی بنیاد پر چلتا ہے، ایک ہاتھ سے لو اور ایک ہاتھ سے دو۔ بعض اوقات لائف میں ان چاہے فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں کیونکہ انہی میں ہمارے مفادات پوشیدہ ہوتے ہیں۔‘‘ شمشاد صاحب نے نیلما کے قریب آتے ہوئے کہا۔

’’میں سمجھی نہیں آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟‘‘ شمشاد صاحب نے نیلما کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستگی سے بولے۔

’’اب تو سمجھ گئیں ناں، میں بھی اکیلا ہوں اور تم بھی، کیوں ناں ہم ایک خاموش معاہدہ کر لیں۔‘‘

’’دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا۔‘‘ نیلما اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی ’’آپ نے کیا سمجھا، چند پیسوں کے عوض نیلما کو خرید لیں گے۔ نیلما آذر حسن کو...... نیلما کوئی بکاؤ مال نہیں ہے، نیلما مر جائے گی مگر اپنی چادر کو کبھی بھی داغ دار نہیں ہونے دے گی میں تھوکتی ہوں آپ پر اور آپ کی دولت پر آئندہ میرے گھر آنے کی یا مجھ سے ہمدردی کرنے کی کوشش یہ کیجیے گا ورنہ آپ کو ایسا بدنام کروں گی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔‘‘ نیلما غصے سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

لگتا تھا مصیبتوں نے اس کے گھر کا دروازہ دیکھ لیا ہو۔ ہر موڑ پر ایک نئی مشکل اس کے گلے لگنے کو تیار بیٹھی تھی۔ اس کا ستارہ گردش میں تھا۔ مگر وہ ثابت قدم تھی اس کے قدم ڈگمگائے نہیں تھے۔ اس کا بال بال قرضے میں جکڑ ہوا تھا یہی صدمے کیا کم تھے کہ بینک سے نوٹس آ گیا گھر نیلام ہونے کو تھا۔ بینک سے لیے گئے لون کی بروقت ادائیگی نہ ہونے پر گھر کو خالی کرنے کا نوٹس تھا، تین مہینے کا ٹائم دیا گیا تھا۔ وہ بلبلا اٹھی اس خبر نے اسے ہلا کر رکھ دیا، اس نے پھر بڑے بھائی سے رابطہ کیا۔

بھائی نے اسے دلاسا دیا اور دوسری شادی کے لیے مجبور کیا۔ وہ اپنے بچوں کو باپ کا سوتیلا پن دینا نہیں چاہتی تھی، وہ پھر سے انکار کر کے گھر لوٹ آئی۔

کچھ دن اور روتے پیٹتے گزر گئے ایک دن سہ پہر کے وقت بڑے بھائی اچانک آئے اور کہنے لگے۔

’’تمہارا آج شام سادگی سے نکاح ہے، تم تیار رہنا، میں تمام گھر والوں کو شام میں ہی لے آؤں گا۔‘‘

’’مگر بھائی مجھے کچھ سوچنے کا وقت تو دیں۔‘‘ نیلما ہکلائی۔

’’بہت دے دیا تمہیں وقت، چند مہینوں میں اس گھر سے محروم ہو جاؤ گی پھر کیا کرو گی، خوددار تو اتنی ہو کہ اپنے بھائی کو بھی غیر سمجھتی ہو، میں کب تک تمہیں زمانے کی ستم ظریفوں کا مقابلہ کرنے دوں، اب میرا حوصلہ جواب دے گیا ہے۔ صابر صاحب بہت اچھے اور شریف انسان ہیں۔ میں اب تمہاری ایک نہیں سنوں گا میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے وہ اٹل ہے۔ وہ تمہیں اور بچوں کو سہارا دینے کے لیے تیار ہیں۔‘‘

’’نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، میں کوئی شادی نہیں کرنے والی۔‘‘

’’تو کیا تمہیں دلدل میں دھنسنے دوں، یہ دنیا اژدھوں سے بھری ہوئی ہے، جگہ جگہ عیار اور مکار لوگ گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ تم شمشاد کو تو دیکھ ہی چکی ہو یہاں پر شمشاد جیسے اور بھی نہ جانے کتنے ہیں۔‘‘

کب ٹھہرے گا دردائے دل کب رات بسر ہو گی
کہتے تھے وہ آئیں گے کہتے تھے سحر ہو گی

شام کے وقت اس کے گھر میں اس کے ارمانوں کی راکھ اڑ رہی تھی۔ اس کے بچوں کے پژمردہ اور مضمحل چہرے کچھ کہے بنا بہت سمجھا رہے تھے۔ وہ ایک نیم مردہ جسم کے ساتھ اپنی حسرتوں کی قبر میں دفن ہو جانا چاہتی تھی، اس کو گوارا نہ تھا کہ آذر کے علاوہ کوئی اور اس کے وجود کا مالک بن جائے۔ اسے لگا گھر کے در و دیوار اس کی بے چارگی پر پرسہ دینے کے لیے اس کے گلے لگ کر رو رہے ہوں۔ اس کا پورا گھر پُردرد نوحہ پڑھ رہا تھا، وہ بلک رہی تھی، پیچ و تاب کھا رہی تھی خدا سے فریاد کر رہی تھی اور پھر اچانک باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

’’باجی اٹھیے باہر آیئے دیکھیں کون آیا ہے۔‘‘ اس کی بہن کی سانس تیز تیز پھول رہی تھی۔ وہ جلدی سے آنسو پونچھ کر باہر نکلی۔

وہاں ایک شخص کھڑا تھا، شکل کچھ شناسا سی تھی مگر حلیہ کسی مجذوب سا تھا، داڑھی بڑھی ہوئی، ہاتھ اور پیر جگہ جگہ سے کٹے پھٹے۔ وہ پہچان گئی اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے آذر کو دونوں ہاتھوں سے چھو کر محسوس کیا۔

’’تم کہاں چلے گئے تھے آذر؟ کہاں تھے تم؟ تمہیں نہیں پتا تمہارے بعد میرے اوپر کیا کیا بیتی۔‘‘ آنسو اس کی آنکھوں سے تیزی سے رواں تھے مگر اس کا دل بڑا ہو کر روشن ہو گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں آذر کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ بچے باپ سے لپٹ کر پیار کر رہے تھے۔ آذر نے تینوں کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ پیچھے سے آنے والے شور کی آوازیں اور بھی تیز ہو گئی تھیں۔ میڈیا والے پہنچ چکے تھے۔

’’چار سال سے لاپتا ایک شخص واپس لوٹ آیا ہے

مگر کیسے؟ آیئے ہم اسی کی زبانی سنتے ہیں:
''دیکھیں پلیز میں آرام کرنا چاہتا ہوں''۔ آذر نے مائیک اپنے آگے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔
''دیکھیں جناب یہ ہم لائیو کوریج کر رہے ہیں، آپ کو ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔'' آذر نے مائیک لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
''میں آذر حسن اپنے شپ پر چیف انجینئر کے عہدے پر فائز تھا۔ ہم پاکستان کے پورٹ سے نکلے، ہمیں جنوبی امریکا کے قریب واقع جزائر بہاماز کی طرف جانا تھا جس کی لمبائی ایک سو میل اور چوڑائی 30 سے 70 میل ہے، ہم وہاں تک پہنچنے ہی والے تھے کہ یکا یک ہمیں بہت ہی اچھی موسیقی کی آواز سنائی دی۔ ہم سب بھاگ کر عرشے پر گئے دیکھتے کیا ہیں کہ دور سے ایک جہاز ہماری جانب چلا آرہا ہے اس جہاز سے موسیقی کی آواز آرہی تھی وہ بہت ہی قدیم طرز کا بادبانی جہاز تھا جو کوئی ڈیڑھ سو سال پرانا معلوم ہوتا تھا، اس کے بادبان رنگ برنگے ریشمی کپڑے کے تھے جو ہوا میں اِدھر اُدھر ہوتے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ کیپٹن اور چیف آفیسر نے اسے دیکھ کر آسمان کی طرف دیکھ کر سینے پر کراس بنائی۔ میں بھی انہیں دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ ہم لوگوں نے دل ہی دل میں دعائیں مانگیں۔ وہ جہاز قریب آیا تو ہم لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جہاز کے عرشے پر عجیب وغریب قسم کے لباسوں میں افراد رقص کر رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے جہاز پر کود آئے اور ہمیں بدمست کرنے والے گانوں کے ساتھ ایسا مشروب زبردستی پلایا گیا کہ ہم سب اپنے ہوشوں میں نہ رہے، اس کے بعد کیا ہوا یہ میں نہیں بتا سکتا۔ جب میں ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو کسی جزیرے میں ہاتھ پاؤں سے بندھا ہوا پایا۔ میرے علاوہ میرے دیگر ساتھی بھی آہستہ آہستہ ہوش میں آرہے تھے۔ وہاں پر ہم سب سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا، نہ ہمیں پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا اور نہ پینے کو، ہم صرف کام کرتے اور تھک کر رات کو سو جاتے۔ جن لوگوں نے بھاگنے کی کوشش کی انہیں ہمارے سامنے ہی لقمۂ اجل بنا دیا گیا۔ کیپٹن اور آدھا عملہ مزاحمت کرنے پر بہت پہلے ہی مار دیا گیا تھا۔ وہ ہم سے چاہتے کیا تھے میں نہیں جانتا پھر ایک دن خدا نے مجھے اور میرے دو انڈین ساتھیوں کو موقع دیا۔ ایک شپ جو کہ لوٹا ہوا مال لے کر آیا تھا دوسرے پورٹ پر جانے کے لیے کھڑا تھا۔ جب وہ شراب کے نشے میں دھت بے ہوش پڑے تھے میں اور میرے ساتھی لوٹے ہوئے سامان والے جہاز میں چھپ گئے اور وہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ پھر یہاں تک میں کس طرح پہنچا، میرے ساتھ اس سلسلے میں کتنے لوگوں نے تعاون کیا یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔ لیکن مجھے یہ علم ہوگیا کہ وہ لٹیرے انسانوں کے روپ میں بھیڑیے ہیں۔ وہ مرے ہوئے لوگوں کے اعضا بیچنے والے سفاک مجرم بھی ہیں۔ مجھے خدا نے بچالیا، میری بیوی اور بچوں کی دعاؤں سے میں بھی یہاں زندہ پہنچ پایا ہوں۔ میں اب آپ لوگوں سے معذرت چاہتا ہوں، میں اس کے آگے مزید بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے اور میری فیملی کو تنہا چھوڑ دیں تو مہربانی ہوگی۔''
مجمع چھٹنے لگا مگر فرطِ مسرت اور جذبات سے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ آذر نے نیلما اور بچوں کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے، غم کے نہیں خوشی کے آنسو۔
نیلما کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی اس کے بعد مایوسی کے بادل غبار بن کر چھٹنے لگے، سویرا ہونے لگا روشن اور اجالوں سے بھرا ہوا۔ یقیناً اندھیرے کے بعد روشنی ہی ہوتی ہے اور کڑی جھلسا دینے والی دھوپ کے بعد شام کی ٹھنڈی اور گھنیری چھاؤں ہماری زندگی کا حصہ بنتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

درد

نبیلہ ابر راجا

''تیرے سنگ دوستی
ہم نہ توڑیں کبھی
سنگ اپنا رہے نہ رہے''

تحریم کچن سمیٹتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ زویا کو فرینڈ شپ ڈے کے لیے سونگ کی تیاری کرواتے کرواتے وہ وقت بے وقت تیرے سنگ دوستی گنگنانے لگتی۔ آدھے گھنٹے سے کچن میں مصروفِ عمل اس نے یہ شغل جاری رکھا ہوا تھا۔ آہٹ پر بے اختیار

اس کے لب ساکت ہوگئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اشعر زویا کو اٹھائے کھڑا بڑی بھرپور اور جائزہ لیتی نگاہوں سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس شغل میں اس کی لاڈلی زویا بھی شامل تھی۔ جو اپنی ذہانت سے بھرپور نگاہیں تحریم پر جمائے ہوئے تھی۔

''کیا خیال ہے بیٹا جانی، آپ کے فرینڈ شپ ڈے پہ آپ کی مما کو ہی نہ بھجوادیں؟'' اشعر شرارتیں دل میں دبائے زویا سے پوچھ رہا تھا۔

''آف کورس پپا، مما اتنا اچھا گاتی ہیں...... مجھے مما نے تیری میری ایسی دوستی بھی یاد کروایا ہے۔ میری ٹیچرز کہتی ہیں آپ کی پریکٹس ہی اتنی اچھی ہے تو پرفارمنس کیسی ہوگی......'' زویا نے تائید کے ساتھ باقی کہانی بھی سنادی۔

تحریم دونوں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ دھلے برتن خشک کر کے اس نے اپنی جگہ پہ رکھے اور قدم آگے بڑھائے۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جب سے گھر میں زویا کے اسکول میں ہونے والے فرینڈ شپ ڈے کا ذکر چھڑا تھا اور تحریم نے اسے تیاری کروانی شروع کی تھی تب سے اشعر اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔

یہ اس کی دکھتی رگ تھی۔ کیونکہ کالج لائف میں تحریم کو گلوکاری کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کالج میں ہونے والے فنکشنز میں وقتاً فوقتاً اپنے اس شوق کا اظہار بھی کرتی پر برا ہو اس وقت کا جب اس نے احمد سیال سے کہا کہ میں باقاعدہ گلوکاری کی تربیت لینا چاہتی ہوں۔

احمد سیال کا خاندانی جاہ وجلال اس قسم کے شوق کی آبیاری پر آمادہ نہیں تھا۔ تحریم کے کالج جانے پر پابندی لگ گئی کہ یہ الٹے سیدھے کام وہ کالج سے ہی سیکھتی ہے۔ بڑے رونے دھونے کے بعد اور وعدوں کے بعد اسے دوبارہ کالج جانے کی اجازت ملی۔ یونیورسٹی پہنچنے کے بعد اس کا یہ شوق پھر سے تازہ ہوگیا جہاں ایسی سرگرمیوں کے مواقع وافر مقدار میں دستیاب تھے۔ ایسے ہی ایک فنکشن میں اشعر نے اسے پہلی بار گاتے سنا اور اس کے منہ پہ کہہ دیا آپ اونچے سُروں میں بہت بے سُرا گاتی ہیں۔ تب تحریم نے اسے بے نقط سنائیں۔ ادھر احمد سیال کو بھی اطلاع مل گئی کہ ان کی دختر نیک اختر خیر سے گلوکاری کا شوق پورا کر رہی ہیں اور یہ اطلاع پہنچائی بھی تو کس نے اشعر شیرازی نے جو اس دن اتفاق سے اپنے کزن کے ساتھ یونیورسٹی کے اس فنکشن میں موجود تھا۔ اشعر کا کزن یہاں پڑھتا تھا اشعر اس کے ساتھ آیا تھا۔ اگر تحریم کو ذرا بھی غیب کا علم ہوتا تو وہ یونیورسٹی فنکشن میں گانے کی حماقت نہ کرتی کیونکہ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کے لیے اشعر شیرازی کا رشتہ آیا ہوا ہے اور اس کی تصویر اشعر کے گھر والوں کے پاس ہے۔ رشتے اس کے لیے آرہے تھے یہ نئی بات نہیں تھی مگر یہ بات حیرت انگیز تھی کہ گھر والوں نے اس کی تصویر اشعر کے گھر والوں کو دی تھی کیونکہ احمد سیال اس حق میں نہیں تھے کہ لڑکا گھر آکے براہِ راست ان کی بیٹی کو دیکھے۔

اشعر کے گھر والوں کو تحریم بہت پسند آئی تھی اب اشعر کو لڑکی دکھانے کا مرحلہ تھا۔ احمد سیال کسی صورت راضی نہیں تھے۔ تحریم کی فوٹو اشعر کو دکھائی گئی۔ اس نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ ان محترمہ کو تو میں گاتے ہوئے سن چکا ہوں۔ یہ بات احمد سیال تک بھی پہنچ گئی اور انہوں نے فوری طور پر یونیورسٹی جانے پر پابندی لگادی۔ اس بار رونا پیٹنا، منتیں، ترلے، آہ وزاریاں کچھ بھی کام نہیں آیا۔ تحریم کو بھی خبر ہوگئی کہ یہ فساد کی جڑ اشعر شیرازی کا کام ہے۔ اس نے پہلے دن سے ہی بیر باندھ لیا۔ دھوم دھام سے منگنی ہوئی تحریم نے منہ ٹیڑھا اور ماتھے پر تیوریاں سجائے رکھیں، وہ اشعر شیرازی کو کسی قسم کی رعایت نہیں دے سکتی تھی۔

منگنی کے بعد کمالِ جرات سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنی کزن کے ذریعے اشعر شیرازی تک دل کی بات پہنچادی کہ میری یونیورسٹی آپ کی وجہ سے چھوٹی ہے، میرا گلوکاری کے میدان میں برائیٹ

فیوچر آپ کی وجہ سے ختم ہوا ہے، میں آپ کو چھوڑوں گی نہیں اور اپنی طرز کی انوکھی انوکھی بددعائیں بھی اس نے اشعر کو دیں۔ وہ تو سن کے بہت ہنسا۔ منگنی کے دو سالوں میں اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح تحریم سے ایک بھرپور ملاقات کر لے پر فریق مخالف راضی نہیں تھا۔ لاکھ کوششوں کے بعد تحریم، اشعر کی کزن کی شادی میں آئی پر اشعر کی بھرپور ملاقات کی حسرت پوری نہیں ہوئی۔ اسے دور سے ہی دیکھ کے دل کو تسلی دینی پڑی۔ اشعر کو وہ اچھی لگنے لگی تھی مگر دوسری طرف سے مستقبل کے خوفناک عزائم کا اظہار تھا اور بونس میں بددعائیں الگ تھیں۔

شادی کے پہلے دن جب وہ اس کے پاس تھی اشعر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ تیس مار خان حسینہ ہی ہے جو بھیگی بلی بنی بیٹھی ہے۔ بس پھر کیا تھا اشعر نے یونیورسٹی والی پرانی کہانی سنادی۔ تیس مار خان حسینہ نے جو دھمکیاں پہلے کزن کے تھرو پہنچائی تھیں اب بانگ دہل اس کے منہ پر دے دیں۔ وہ ہنستا چلا گیا، اس کا یہ ہنسنا تحریم کو رلا گیا۔ پورے دو سال وہ یونیورسٹی اور گلوکاری کا سوگ مناتی رہی اور یہ اشعر شیرازی مجال ہے جو اس کی اشک شوئی کی ہو۔

اشعر نے اپنے ناکردہ جرائم کے ازالے کے طور پر پہلی فرصت میں اس کا ایڈمیشن یونیورسٹی میں کروایا اور خود جاب کے سلسلے میں کراچی چلا گیا۔ اب تحریم کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا کیونکہ اب وہ اشعر شیرزای کی بیوی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر تحریم کا دل گلوکاری سے اچاٹ ہوگیا اور اشعر شیرازی کی طرف جھکتا گیا۔ اس اشعر شیرازی کی طرف جو کراچی میں بیٹھا اس کا دل جلا رہا تھا۔ لاہور چھٹی لے کے آتا اور تین چار دن رہ کر چلا جاتا۔ جتنے دن گھر رہتا وہ اور اس کے دوست ہوتے۔ باقی رہ گئی تحریم تو اس کو اشعر نے اپنے شوق پورے کرنے کی آزادی دی ہوئی تھی۔ وہ کیسے کہتی کہ میرے شوق دم توڑ گئے ہیں اور گلوکاری کے بجائے تم میرا شوق اور جنون بن گئے ہو۔ اشعر شیرازی بھی اپنے نام کا ایک تھا...... بے پروا اور بے نیاز بن کے آتشِ شوق اور ذوق کو ہوا دیتا رہا اور پھر آپ اپنے دام میں صیاد آگیا کے مصداق تحریم کے سب خوفناک عزائم دم توڑ گئے۔ اب وہ اکثر رنگ کالا ہوگیا وے میں تیرے ہجر دی ماری... سنتی پائی جاتی۔ اب اس کے شوق کا محور بدل گیا۔

اشعر کی جاب بہت اچھی تھی۔ اسے کمپنی کی طرف سے گھر گاڑی ملازم سب کچھ ملا ہوا تھا۔ تحریم نے شوقِ وصال میں کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا اور اشعر کے پاس پہنچ گئی۔

وہ سیر تھی تو اشعر سوا سیر تھا۔ لال کتاب کی صورت میں اس کے پاس تحریم کے جرائم کی لمبی فہرست تھی۔

''دو سال میں چار لال کتابیں تیار ہوگئی ہیں، ہر کتاب کے ہزار صفحے ہیں اور ہر صفحے پہ سو سزائیں ہیں۔'' وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے بتا رہا تھا۔ غم وغصے کا طوفان تحریم کے دل میں بپا تھا۔ ابھی اشعر سزائیں سنا ہی رہا تھا کہ اس نے دو دو انچ کے ناخن اشعر کی کلائی میں گاڑ دیے۔

''میں نے تو سہہ لیا ہے آہ تک نہیں کی مگر تم کیا کروگی لال کتاب کی سزاؤں کا؟'' سوال جتنا خوفناک تھا اس کے نتائج اتنے ہی خوب صورت تھے۔

زویا شادی کے چار سال بعد اس کی گود میں آئی تو اشعر خوشی سے پاگل ہوا تھا۔ وہ تحریم کو چڑاتا، میں نے تو تمہیں اپنی محبت کی نشانی دی ہے تم نے کیا دیا ہے۔ تب وہ اس کی توجہ ان نشانات کی طرف مبذول کرواتی جو اس کے ناخنوں کے مرہونِ منت تھے۔

☆☆☆

اس نے کچن کے دروازے کے آگے جمے کھڑے اشعر کو زبردستی سامنے سے پرے کیا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔

''مما کیا ہوا؟'' زویا نے اس کی قمیص کا دامن پکڑ لیا۔

''مجھے اس گھر میں پاگل، احمق اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ میرا مذاق اڑایا جاتا ہے۔'' تحریم نے غصے سے لال انگارہ ہوتی آنکھیں اشعر کے چہرے پر جمادیں۔

''کیا، کہا...... سمجھا جاتا ہے'' مجھے اس جملے پر اعتراض ہے۔''

''کیا اعتراض ہے؟'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔

''مجھے آج تم وہ سونگ سناؤ گی جس کی تیاری زویا کو کروا رہی ہو اور ابھی جو کچن میں بھی گنگنا رہی تھیں۔'' اس بار اشعر کا لہجہ و انداز بالکل سادہ تھا سو تحریم کو ایمان لاتے ہی بنی۔

''میں زویا کو سلا آؤں پھر سناتی ہوں۔'' تحریم کی آواز میں خوشی کی کھنک در آئی۔

''آؤ دونوں سلاتے ہیں زویا کو، میری بیٹی میری جان۔'' اشعر نے زویا کو گود میں اٹھالیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے کمرے میں آئے۔

زویا ان دونوں کے درمیان تھی۔ اشعر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ تحریم دونوں باپ بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ تحریم سے زیادہ اشعر، زویا کے لاڈ اٹھاتا اس کی ضدیں پوری کرتا۔ بیٹی کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا۔ ابھی دو ہفتے پہلے زویا کو بخار ہوا تو پوری رات اس نے جاگتے گزار دی تھی۔ آفس سے آنے کے بعد اسے لے کر بیٹھ جاتا اور سارے دن کی روداد سنتا۔ جب تک وہ نہ سوتی اشعر بھی جاگتا رہتا۔ ایسا ہی پاگل تھا وہ۔ برملا کہتا یہ ہم دونوں کے وجود کا حصہ ہے، میں تو جتنا بھی پیار کروں کم ہے۔

زویا دس منٹ کے دوران سو چکی تھی۔ اشعر نے سوئی ہوئی بیٹی کے ماتھے پر بھرپور پیار کی مہر ثبت کی۔ زویا کے ماتھے پر جھکتے جھکتے ہی اس کے سر کے اگلے حصے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ اذیت اتنی زیادہ تھی کہ ضبط و برداشت کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہاں سے لڑکھڑاتے قدموں سے نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے پریشان صورت لیے تحریم تھی۔ اپنے کمرے میں آکے اشعر جوتوں سمیت بیڈ پر جیسے گر سا پڑا۔ دونوں ہاتھ سر کے گرد جمے تھے۔

''بہت درد ہے؟'' تحریم نے نرمی سے اس کے ہاتھ سر کے گرد سے الگ کرنے چاہے مگر اس نے اور بھی سختی سے سر کو پکڑلیا۔

''تحریم لائٹ بند کر کے چلی جاؤ پلیز، خود ہی آرام آجائے گا۔'' اشعر کی آواز سے بھی تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ تحریم باہر تو نہیں گئی پر اٹھ کر لائٹ اور دروازہ دونوں بند کر دیے اور خود آکے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے اشعر کے اس درد کی سب کیفیت معلوم تھی۔ کچھ گھنٹے اسے ایسا ہی شدید اذیت ناک درد رہتا تھا پھر آہستہ آہستہ آرام آجاتا۔ تحریم صوفے پر ہی لیٹ گئی کافی دیر بعد جانے کب آنکھ لگی۔

اشعر کو رات کے آخری پہر اس درد سے کچھ حد تک آرام آیا تب اس نے لائٹ جلا کے ٹائم دیکھا۔ تحریم سکڑی سمٹی صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اشعر کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان آگئی، اگر رات اس کے سر میں درد نہ ہوتا تو تحریم نے اس سے خوب لڑائی کرنی تھی کہ آپ نے میری آواز کا مذاق کیوں اڑایا تھا۔

وہ بیڈ سے اتر کے اس کی طرف آیا جو بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے اشعر نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ فوراً جاگ گئی اور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آپ کو آرام آیا؟'' اشعر کا کندھا پکڑے وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

''تم اپنی نیندیں پوری کرو، ایسی ہوتی ہیں بیویاں، میں درد سے مر رہا ہوں اور تمہیں نیند کی پڑی ہے۔'' اشعر نے ساری شرارتیں چھپالیں۔ اس کی توقع کے عین مطابق سب سے پہلے تحریم کی آنکھوں میں آنسو آئے۔

''آپ کو نہیں پتا میں کتنا پیار کرتی ہوں آپ سے، آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ جب مجھے درد ہو اکیلا چھوڑ دو۔ ہر دفعہ آپ ایسا کرتے ہیں۔ جب بھی آپ کے سر میں درد ہوتا ہے آپ کمرا بند کر لیتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں باہر جاؤ۔''

''تم مجھے تکلیف میں اکیلا چھوڑو گی ایسے ہی۔'' اشعر نے اس کی آنکھوں کو لال ہوتے دیکھا۔ ''میں مذاق کر رہا تھا تحریم۔'' اشعر نے انگلی کی پور سے اس کی آنکھ سے نکلنے والا پہلا آنسو صاف کیا۔

''آپ ٹھیک ہیں اب۔''

''ہاں میں ٹھیک ہوں، تمہیں پتا ہے کچھ گھنٹے شدید درد کے بعد آہستہ آہستہ آرام آتا ہے تو اب میں بالکل سکون میں ہوں۔''

''آپ کو کیوں ہوتا ہے یہ درد؟'' تحریم اس کے کندھے سے لپٹ سی گئی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم کیوں ہوتا ہے مگر تحریم جب بھی یہ درد ہوتا ہے میرے ساتھ کچھ تکلیف دہ کچھ انہونی ہوتی ہے۔ مجھے نہیں پتا یہ سب کیا ہے مگر جو بھی ہے بہت اذیت ناک ہے۔'' اشعر کے تاثرات میں اب کی بار کچھ فکرمندی بھی تھی۔

''ڈونٹ وری، آئیں سوتے ہیں۔'' تحریم اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے بیڈ کی طرف آئی۔ ''آپ کو اب درد تو نہیں ہو رہا؟'' تحریم نے تکیہ سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، نہیں اب نہیں ہو رہا ہے کیونکہ میرے درد کا درماں جو میرے پاس ہے۔'' اشعر نے پوری سنجیدگی سے یہ سب کہا تھا۔

''اور آپ کچن میں جو میرا مذاق اڑا رہے تھے وہ سب کیا تھا؟'' تحریم سحر انگیز نشیلی آنکھیں جمائے بڑی دھونس سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ تو میری محبت ہے، تمہیں تنگ کرتا ہوں......''

''اور میری محبت بھی تو آپ کو معلوم ہوگی اس کے رنگ ڈھنگ قرینے قاعدے......'' تحریم نے اس

کے بازو میں بڑے زور سے ناخن چبھویا تھا۔

''میرے قاتل میرے دلدار بتادو قرینے اور ڈھنگ اتنے سالوں سے یہ ظلم و ستم سہتا آرہا ہوں......'' جہاں تحریم نے ہلکا سا ناخن چبھویا تھا...... وہاں خراش نظر آرہی تھی۔ اشعر دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو پھر......؟'' کیا اسٹائل تھا نہ ڈرنے والا نہ دبنے والا کی عملی تفسیر...... اشعر ہنستا چلا گیا۔ وہ چڑ کے اس کے مکا مارنے لگی تھی جب اس نے ہاتھ تھام لیا۔

''اب میرا رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھو، لال کتاب پوری طرح بھر گئی ہے۔'' تحریم کو آنکھ اٹھا کے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی اس بار۔

☆☆☆

زویا کے فرینڈ شپ ڈے کے موقع پہ ہی تحریم اور اشعر کی ویڈنگ انیورسری بھی تھی۔ تحریم چپکے چپکے تیاری کر رہی تھی۔ اس نے اشعر کے لیے گفٹ بھی لا کے رکھ دیا تھا اور اپنے لیے بہت ہی خوب صورت سوٹ لیا تھا۔ وہ اس خاص دن کو یادگار بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ انیورسری سے ایک دن پہلے اشعر کو بیڈ روم بدر کر دیا جاتا۔ تحریم پھولوں سے سارا کمرا سجاتی، جگہ جگہ پھول مہک رہے ہوتے۔ ٹھیک رات بارہ بجے تحریم اشعر کے ساتھ کمرے کا لاک کھولتی، اسے باہر کھڑا کر کے خود اکیلے اندر جاتی پھر پانچ منٹ بعد اشعر کا ہاتھ پکڑ کے بیڈ روم میں لاتی اور اسے آنکھیں کھولنے کا کہتی۔ یہ منظر اشعر کو ازبر ہو چکا تھا۔ وہ ہر بار ایسے ری ایکٹ کرتا جیسے اس کی توقع نہ کر رہا ہو۔ اشعر آنکھیں کھولتا، کمرے میں جگہ جگہ موم بتیاں روشن ہوتیں، پھول مہک رہے ہوتے اور لائٹیں آف ہوتیں۔ تب دونوں مل کے کیک کاٹتے۔ خلاف توقع تحریم اس دن اچھی بچی کی عملی تفسیر پیش کرتی۔ گفٹ دیتی سعادت مندی سے اسے کیک کھلاتی۔ اس سعادت مندی کے پیچھے بھی وہی دکھ بھرا قصہ تھا جس کے نتیجے میں اس کی یونیورسٹی چھوٹی اور شادی کی پہلی

رات ہی تحریم زار زار روئی تھی۔ شادی کے اولین سالوں کی جفا کا ازالہ کرنے کی خاطر وہ بادل کی طرح برستی اور اشعر شرارت سے کہتا کہ کاش سال کے 365 دن ہی ہماری ویڈنگ انیورسری ہو۔

تحریم نے دلبر خان سے جو باہر کے سب کام کرتا' اس کے سپرد پھول لانے کا حکم نامہ جاری کردیا۔ اس نے کل پھول لانے جانا تھا۔ تحریم نے خاص طور پر اس کے لیے اپنے پڑوسی زبیر سے گاڑی مانگی تھی اس میں پھولوں کی مطلوبہ تعداد آرام سے سما جاتی۔

زویا اسکول سے آئی تو تحریم نے کھانا کھلا کے اسے سلا دیا۔ اشعر آفس سے گھر پہنچا تب بھی زویا سو رہی تھی۔ وہ خود بھی کپڑے بدل کے اس کے پاس نیم دراز ہوگیا۔

''اشعر اپنے روم میں جائیں، زویا کو سونے دیں۔'' تحریم سے اس کا محبت بھرا انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ زویا کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا اور اس نے جاگ جانا تھا۔

''نہیں جاتا، اِدھر ہی سوؤں گا، اپنی بیٹی' اپنی رانی اور اپنی پری کے پاس۔ تم کیوں جل رہی ہو؟'' اشعر نے اسے چڑایا۔ تحریم کی توقع کے عین مطابق زویا جاگ گئی۔

''میری بیٹی، میری شہزادی۔'' اشعر نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ جواباً زویا نے بھی پیار کا اظہار کیا تو وہ پھیل گیا۔

''ایک کِس میری آنکھوں پہ ایک گالوں پہ ایک یہاں، ایک یہاں......'' زویا معصومیت سے اس کی فرمائش پوری کرنے لگی۔

''پپا جانی آئی لو یو......'' وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

عین اسی لمحے اشعر کے سر میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی۔ درد کا یہ دورانیہ صرف چند سیکنڈز ہی پر محیط تھا جو اشعر کو عجیب سے احساسات سے دوچار کر گیا۔ اس نے تحریم سے اپنے اندرونی احساسات چھپا لیے ورنہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ ابھی رونے بیٹھ جاتی۔ ایسی ہی بات بات پر نیر بہانے والی تھی وہ۔

زویا کو سینے میں چھپائے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک نمکین قطرہ پھسلا جو زویا کے بالوں میں ہی کہیں گم ہوگیا۔

☆☆☆

تیرے سنگ دوستی
ہم نہ چھوڑیں کبھی
سنگ اپنا رہے نہ رہے
آج بچی ہے تو
کل بنے گی ممی
اپنے بچوں کا دل یونہی بہلائے گی
نام جیون ملن اور جدائی کا ہے
تیرے رستے میں بھی موڑ یہ آئے گا

زویا دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے بہت محویت اور دلچسپی سے تحریم کے لبوں سے برآمد ہونے والی گنگناہٹ کو سن رہی تھی۔

''مما ہم کبھی بھی فرینڈ شپ بریک نہیں کریں گے۔'' جب تحریم کی گنگناہٹ مدّھم ہوئی تو بے ساختہ زویا نے یہ جملہ کہا۔

''ہاں بیٹا نیور ایور۔'' تحریم کے لہجے میں بھرپور یقین نمایاں تھا۔

''چلو، اب مجھے آپ یہ سونگ سناؤ کل فرینڈ شپ ڈے ہے۔ آپ کی تیاری فُل ہونی چاہیے۔''

''اوکے مما۔'' زویا سعادت مندی......سے اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔

اس کے اسکول میں آئے دن مختلف دن دھوم دھام سے منائے جاتے اور اس مد میں بھاری رقوم والدین کی جیب سے نکلوائی جاتی۔ یہ سب ادا کرتے ہوئے اشعر کے ماتھے پر کبھی بل نہیں پڑے۔ زویا شہر کے مہنگے ترین اسکول میں زیرِ تعلیم تھی۔ ساری ٹیچرز کی وہ پسندیدہ اور لاڈلی تھی۔ فرینڈ شپ ڈے پہ ہونے والے فنکشن میں اسے دوستی، امن اور محبت کی علامت

کے طور پہ پیش کیا جانا تھا کیونکہ باہر سے تعلیمی دورے پہ آئے ہوئے کچھ نمائندے بھی مدعو تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اعلیٰ سرکاری شخصیات نے بھی آنا تھا' سو اسکول میں تیاریاں عروج پر تھیں۔ ادھر گھر میں تحریم' زویا کو فرینڈ شپ سونگ کی ریہرسل کروا رہی تھی۔ اس طرف سے وہ اب مطمئن تھی۔

☆☆☆

''چلیں اٹھیں نکلیں یہاں سے جلدی۔'' تحریم لڑنے والے اسٹائل میں کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے اشعر کو دیکھ رہی تھی۔

''کیوں جاؤں میں یہاں سے، میرا روم ہے' کہاں سوؤں میں۔'' وہ ہٹ دھرمی پہ آمادہ... دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ بھول رہے ہیں محترم اشعر صاحب کہ یہ صرف آپ کا ہی روم نہیں ہے اس پر میرا ابھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا ہے، اس لیے آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔'' مجال ہے جو وہ رعب میں آئی ہو۔ اس نے اشعر کو بازو سے پکڑا اور نیچے اپنی طرف کھینچا۔

''بہت سال ہوگئے ہیں مجھے یہ غنڈا... گردیاں برداشت کرتے ہوئے۔ اب اور نہیں کروں گا۔'' اشعر نے غصے سے اس کا بازو پرے کیا اور دھم دھم کرتا کمرے سے باہر آگیا۔ باہر آنے سے پہلے وہ دروازے کو پاؤں سے زوردار ٹھوکر لگانا نہیں بھولا تھا۔ اسے بھی تو احتجاج کا پورا حق حاصل تھا۔ مگر تحریم چکنا گھڑا تھی اس نے آج کے دن مائل بہ کرم نہیں ہونا تھا۔ اس کے لیے صبر سے کل کا انتظار کرنا تھا۔ جب اس نے گھٹا کی طرح برسنا تھا۔

☆☆☆

اشعر ٹی وی لاؤنج میں پڑے صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ زویا کی کل اگر چھٹی ہوتی تو وہ تحریم کو ستانے کے لیے بدلہ لینے کے لیے اسی کو جگا دیتا۔ لیکن کل اس کے اسکول میں فنکشن تھا اس کے لیے پُرسکون نیند ضروری تھی اور اشعر کو اپنی پری اپنی شہزادی اپنی بیٹی زویا کی نیند بہت عزیز تھی۔

تحریم اسے باہر نکالنے کے بعد کمرا سجا رہی تھی۔ دلبر خان نے اسے ڈھیروں ڈھیر پھول لا دیے تھے وہ جگہ جگہ انہیں بکھیر رہی تھی ترتیب دے رہی تھی سجا رہی تھی۔ تازہ پھول اس نے گلدانوں میں سجانے تھے۔ سفید پھولوں کو گل دستے کی شکل میں ترتیب دینے کے بعد اس نے جہازی سائز بیڈ کے عین وسط میں سجایا۔ یہ اس کی طرف سے دوستی کا اظہار تھا جو اشعر کو ازحد عزیز تھا۔

سب سے آخر میں تحریم نے مومی شمعوں کو پورے کمرے میں جگہ جگہ ترتیب اور فاصلے سے رکھا۔ کل رات اس نے.... ان کو جلانا تھا۔ فینسی لائٹ وہ آف کردیتی۔ رات کے اندھیرے میں مومی شمعیں' گلاب کے پھول اور ان کی مہک خوابناک منظر پیش کرتی۔ ان سب دل کشیوں اور رعنائیوں کے بیچ تحریم، اشعر سے دلہن کی طرح سج بن کے ملتی اور ان سب شکوؤں کو دور کرنے کی کوشش کرتی جو اشعر کو شادی کے اولین کچھ سالوں سے تھے۔

کافی دیر کے بعد تحریم فارغ ہونے کے بعد کمرے سے نکلی۔ دروازہ لاک کرکے چابی چھپانے کے بعد اس نے ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا جہاں اشعر کشن بازوؤں میں دبوچے مار دھاڑ سے بھرپور فلم دیکھ رہا تھا۔ تحریم جان کے ہولے سے کھانسی پر مجال ہے جو اشعر نے توجہ دی ہو۔ اس نے ٹیبل پر پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھا کے چینل بدل دیا۔ اشعر نے ریموٹ کنٹرول چھین کے دوبارہ فلم لگادی۔ اشعر کے لال بھبوکا چہرے پر شدید غصہ اور ناراضی تھی۔

''اے میرے ہم سفر اِک ذرا انتظار۔''

تحریم مدّھم سُروں میں گنگنائی۔ اشعر پوری طرح فلم کے مناظر میں گم تھا۔ اسے مزید چھیڑنے کا ارادہ ملتوی کرکے تحریم دوسرے کمرے میں آکے سوئی۔ اسے کل جلدی اٹھنا تھا بہت سے کام کرنے

قدر داں کیسے کیسے

آج ایک عرصے کے بعد میری عروسہ سے فون پر بات ہوئی...... بات ہوتی بھی کیسے وہ تو اب سعودی عرب میں ہوتی ہے۔ ایک سال کے بعد اس کی آواز سن کر حسبِ عادت دوستوں سے کرنے والا پرانا سوال دہرایا۔

''اور سناؤ کیا مصروفیت رہتی ہے، ان دنوں کس کو پڑھ رہی ہو؟'' میرے اس سوال پر جو جواب آیا اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

''پڑھنا لکھنا تو عرصہ ہوا ماضی کا حصہ بن چکا ہے، اب کون اپنا وقت ضائع کرے۔ بس کمپیوٹر، فیس بک اور موبائل نے اتنا مصروف کر دیا ہے کہ کتاب پڑھنے میں لگتا ہے وقت کا زیاں ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح بڑی برق رفتاری سے گفتگو کر رہی تھی۔

''اچھا......'' میرا اچھا مارے حیرت کے بہت لمبا ہو گیا۔

''اور کیا کرن...... تم بتاؤ حسیب بھائی کیسے ہیں بچے تو اب بڑے ہو گئے ہوں گے...... شاپنگ وغیرہ کیسی چل رہی ہے، طارق روڈ اور آشیانے کے چکر لگ رہے ہوں گے، کون سا کلر آج کل ان ہے؟'' مجھے بھی بروقت جواب سوجھا۔

''عروسہ اب کہاں شاپنگ اور اس کے مزے، وہ تو تم ساتھ ہوتی تھیں تو وہ بات اور تھی بہت وقت ضائع ہوتا ہے اب کون بے ہنگم ٹریفک میں پھنس پھنسا کر بازار جائے...... ہاں بہت ضروری ہوتا ہے تو ہیلی کاپٹر سے چلی جاتی ہوں۔ ٹائم جو بچ جاتا ہے۔''

''ہاں...... ہاں یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر آں...... یہ ہیلی کاپٹر کیا مطلب...... اب کیا اوور ہیڈ برج کی تعمیر کے بعد کراچی میں ہیلی کاپٹر سروس بھی انٹروڈیوس کرائی جا رہی رہے۔ بھئی کیا کمال کی بات کی......'' اور لائن کٹ گئی۔

من حیث القوم ہم وقت کے کتنے قدر داں ہیں یہ ہم سب بخیر و خوبی جانتے ہیں۔ ویسے اگر ہم سوچیں تو بعض دفعہ ہم کو وقت کی اہمیت کا اندازہ کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے مثلاً کم سے کم وقت میں منزل پر پہنچنے کے لیے ہم ٹریفک سگنل کی پروا کیے بغیر یہ جا وہ جا...... سارجنٹ کی وسل پیچھا کرتی رہ جاتی ہے۔

دوسری طرف ٹرین کی آمد سے پہلے پھاٹک بند ہونے کی صورت میں ہم سائیکل یا بائیک جان ہتھیلی پر رکھ کے پٹری کراس کر جاتے ہیں اور پھر پیچھے مڑ کر رکی ٹریفک پر ایک فاتحانہ نظر ڈالتے سامنے کھڑے ہو کے بندر کا تماشا دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ اور دیکھنے والے ہماری اس جرأت رندانہ پر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ اور ہم دوسری طرف گاڑی میں بیٹھے منیر نیازی کے اس شعر کی کہ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔

ہماری وقت کی بچت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگا سکتے ہیں کہ ہم کبھی بھی کسی جگہ لائن بنا کر اپنی باری کا انتظار نہیں کرتے بلکہ دھکم پیل کرتے اپنی جوانمردی کا مظاہرہ کرتے آگے سینہ تان کر جا کھڑے ہوتے...... اس طرح انتہائی قیمتی وقت بچ جاتا۔ اب تو ہم وقت کی بچت کے سلسلے میں اتنے حساس ہو چلے ہیں کہ ہارن بجاتی ایمبولینس کو بھی راستہ نہیں دیتے بلکہ اپنی اسپیڈ مزید بڑھا کر اس سے آگے نکل جانے کی.... بھرپور کوشش کرتے آخر ہم جو ٹھہرے ''فری سگنل'' کے متوالے...... ''ہم سا ہو تو سامنے آئے'' ہماری اس قدر فراوانی سے وقت کی قدر کرنے کے آپ بھی قائل ہوئے بغیر نہیں رہیں گے کہ ہم کوڑے دان پیک دان اور سرکاری بیت الخلا کے استعمال سے انتہائی گریز کرتے ہیں۔ ''زیرِ دیوار بیٹھے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں کی تصویر بنے پھرتے ہیں یا بہترین نشانہ بازی اور پینٹنگ کے مظاہرہ در و دیوار اور پلیز یوزمی کے اطراف جان ماری جاری رکھتے ہیں کیونکہ ان کاموں میں ہوتا ہے وقت کا زیاں اور بھی زیادہ...... اور اپنے پیارے شہرِ قائد کو گل کاری کی پچکاریوں سے گل و گلزار بنانا اور سنوارنا بھی تو آخر ہمارا ہی کام ہے۔

اب یہی دیکھیں کہ ہم وقت کے کیسے قدر دان ہیں کہ ابھی لکھنے اور کہنے سننے کو بہت کچھ باقی ہے مگر اب وقت کی بچت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ مضمون فیکس...... یا ای میل بھی تو کرنا ہے۔ تو عروسہ کی بات بھی اپنی جگہ اب درست ہی لگ رہی ہے کیوں...... کیسا......؟ آپ بھی یقیناً ہمارے ہم خیال ہوں گے۔

تسنیم منیر علوی، دبئی

تھے۔ اشعر کی پسند کے کھانے بنانے تھے۔ زویا کو اسکول سے لانا تھا کیونکہ ڈرائیور چھٹی پر گاؤں گیا ہوا تھا۔ صبح اسکول سے پک کرنے کی ذمے داری مسز اشمل نے لے لی تھی جو اس کی فرسٹ ڈور نیبرز میں تھیں اور زویا کے اسکول میں میوزک ٹیچرز کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ واپسی پہ بھی انہوں نے زویا کو لے آنا تھا بر اس طرح وہ بہت لیٹ گھر آتی کیونکہ فنکشن ساڑھے بارہ بجے ختم ہونا تھا اور مسز اشمل نے شام چار پانچ بجے گھر آنا تھا۔

''آپ فکر نہیں کریں۔ میں زویا کو ساڑھے بارہ بجے اسکول سے لے آؤں گی۔'' تحریم نے کہا۔ وہ بے خبری کی نیند سو چکی تھی۔ اشعر نے ٹراؤزر کی پاکٹ سے بیڈروم کے دروازے کی دوسری چابی نکالی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ اگر تحریم دیکھ لیتی تو اس کا حشر کر دیتی۔ اشعر بیڈروم کا دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اسی طرح دروازہ لاک کر کے ٹی وی لاؤنج میں آ گیا اور سب سے پہلے ٹی وی آف کیا۔ اب اسے بھی نیند آ رہی تھی۔

☆☆☆

تحریم نے زویا کے بھورے لمبے گھنے بالوں میں برش پھیرا پھر پونی بنائی۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ تحریم نے تنقیدی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ اتنے میں گیٹ کے باہر مسز اشمل کی گاڑی کا ہارن بجا۔ اشعر نے کھلے دروازے سے پنک اور وائٹ کلر کے قیمتی فراک میں ملبوس زویا کو دیکھا، وہ تتلی کی طرح لہراتی ہوئی گیٹ کی طرف جا رہی تھی اس کے ساتھ تحریم تھی۔ اشعر تیز تیز قدم اٹھاتا ان دونوں تک پہنچا اور زویا کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ بہت ہی معصوم اور کیوٹ لگ رہی تھی۔ اسی طرح گود میں اٹھائے اٹھائے اشعر نے اسے لا کر مسز اشمل کی گاڑی میں بٹھایا اور اس کے ماتھے اور گالوں پر پیار کیا۔ عین اسی لمحے.... درد و اذیت کی ایک لہر صرف پل بھر کے لیے اس پہ حاوی ہوئی اور پھر پلک جھپکتے ہی سب کچھ پہلے کی طرح نارمل ہو گیا۔

مسز اشمل نے رشک بھری نگاہ سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ خوب صورت اور نازک سی تحریم، مضبوط اور کڑیل سا اشعر اور ان کے پیار کی گواہی معصوم اور دل میں اتر جانے کی حد تک حسین زویا...... کتنی مکمل اور خوب صورت فیملی تھی۔

''پپا، مما آئی لو یو......'' مسز اشمل کے گاڑی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔

اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کرسکتے ہیں۔

For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

اسٹارٹ کرنے سے پہلے زویا نے تحریم اور اشعر کو پیار کیا۔ اشعر نے اسے محبت سے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ وہ پلٹ پلٹ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ تب تحریم اور اشعر اندر آئے۔ تحریم کچن میں آگئی' اشعر کے لیے ناشتا بنانا تھا۔ وہ باتھ روم میں نہا رہا تھا۔ اس کے فارغ ہونے سے پہلے تحریم ناشتا بنا چکی تھی۔

کوئی تاثرات ظاہر کیے بغیر اشعر نے ناشتا کرنا شروع کردیا۔ تحریم اس کے سامنے پڑی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ تب بھی اشعر کی بے نیازی برقرار رہی۔ تحریم کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ روٹھا روٹھا سا عزیز از جان یہ شخص اسے بہت پیارا تھا۔ اسے منانے کا ارادہ ملتوی کرکے وہ ناشتے کے برتن کچن میں چھوڑ آئی۔ اتنے میں کام والی ماسی بھی آگئی۔ اسے مطلوبہ کام بتا کے تحریم اپنے کپڑے دیکھنے لگی جو سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اسے پہننے تھے۔ بہت خوب صورت قیمتی سا ریڈی میڈ سوٹ تھا یقیناً پہن کے تیار ہونے اور اشعر کے سامنے آنے کے بعد اسے تعریف ہی ملنی تھی۔

کپڑے اس نے دوبارہ خود پریس کیے اور ہینگ کردیے۔ کپڑوں کے ساتھ میچنگ کانچ کی چوڑیاں، سینڈل اور دیگر لوازمات ساتھ ہی رکھے تھے۔ ایک ہاتھ میں وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے کون سے مہندی کے نقش و نگار بنائے۔ مہندی بہت جلد خشک ہوگئی۔ بڑا خوب صورت اور گہرا رنگ آیا تھا۔ لال لال خوش رنگ دل کو لبھاتا مہندی کا مخصوص رنگ و مہک اشعر کو بہت پسند تھی اور تحریم اس کی پسند کا پورا دھیان رکھتی تھی۔ زویا کو اسکول سے لانے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ تحریم نے جلدی جلدی کپڑے بدلے تیار ہوئی اور گاڑی نکالی..... کچھ دیر پہلے ہی اشعر دوسری گاڑی لے کر ناراضی کے عالم میں پھولا پھولا منہ لے کر بتائے بغیر نکلا تھا۔ تحریم کو سب خبر تھی وہ کہاں گیا ہے وہ اس کے لیے پھول اور گفٹ لینے گیا تھا۔ وہ عین وقت پہ ہی گفٹ لیتا تھا۔ اسے یہ شک تھا کہ تحریم جاسوسی کے ذریعے اور تلاشی لے کر دیکھ لے گی اور سب تجسس ختم ہوجائے گا۔ اس لیے انیورسری والے دن وہ یہ کام اکیلے جا کر کرتا تھا۔

☆☆☆

12.30

تحریم زویا کے اسکول کے گیٹ کے سامنے تھی۔ عین وقت پہ اچھلتی کودتی خوشی سے سرخ چہرہ لیے زویا گیٹ سے باہر نکلی۔ تحریم کو وہ دیکھ چکی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور زویا کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھائی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ اسکول سے دائیں طرف کے روٹ پر مڑ رہی تھی۔ زویا اس دوران فرینڈ شپ ڈے کی ایک ایک تفصیل اسے بتا رہی تھی۔

تحریم کی توجہ ڈرائیونگ کی طرف کم اور اس کی طرف زیادہ تھی جس کے انداز و آواز میں دنیا جہان کا اشتیاق و خوشی محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ تفصیل بتا رہی تھی کہ اس نے کیسے پرفارم کیا۔ سب نے کتنی دیر تالیاں بجائیں سب نے کتنا پسند کیا، ٹیچرز نے کیا کیا کہا، اس کے پاس ایک سے ایک بات تھی۔ موڑ کاٹتے ہوئے تحریم نے اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور اپنی ہی نظر لگ جانے کے ڈر سے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔

☆☆☆

12.40

اشعر شاپنگ مال میں تحریم کے لیے گفٹ دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی بھی چیز پسند نہیں آرہی تھی۔ کافی مشکل کے بعد اس نے تحریم کے لیے پلاٹینم گولڈ کی چین اور لاکٹ لیا جو بہت نازک اور خوب صورت تھا۔ کیش کاؤنٹر پہ ادائیگی کرنے کے بعد وہ شاپنگ مال سے باہر نکلا اور پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ لاک کھولتے کھولتے وہ رک گیا عین وقت پہ یاد آیا کہ ابھی پھول اور اس ٹائپ کی دیگر چیزیں

لینی ہیں۔ تحریم کو سرخ رنگ کے گلاب بہت پسند تھے۔ اشعر اس کے لیے سرخ گلابوں کا بُکے ہر حال میں لاتا تھا۔

☆☆☆

1.10 منٹ

تحریم دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پہ رکھے سکون سے سگنل گرین ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک مصروف ترین شاہراہ پہ تھی جہاں گاڑیوں کی لمبی قطار ٹریفک کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے انتظار میں رینگ رینگ کے سست رفتاری سے رواں دواں تھی۔ عام حالات میں یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ آٹھ سے دس منٹ میں طے ہوتا تھا......اسے اسکول سے نکلے کم سے کم چالیس منٹ ہو رہے تھے اور ابھی آدھا راستہ بھی نہیں پورا ہوا تھا۔

تحریم کی گاڑی کے پیچھے موٹر بائیک پہ اٹھارہ سے بیس سال کی عمر کے درمیان کا نوجوان سوار تھا۔ اس نے گرم کپڑوں کے اوپر موٹی اونی چادر بھی اوڑھ رکھی تھی۔ موسم سرد تھا خنکی والا تھا مگر اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ موٹی گرم جرسی کے ساتھ اونی چادر بھی اوڑھی جائے۔ بہت سے لوگوں نے دیکھا بھی تو دھیان نہیں دیا۔ ویسے بھی یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی پھر کچھ لوگوں کو سردی بھی زیادہ لگتی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔

جیسے ہی سگنل گرین ہوا گاڑیاں سست رفتاری سے آگے بڑھنے لگیں۔ موٹر بائیک والے نے ہارن پہ ہارن دینے شروع کر دیے کہ تحریم تیزی سے گاڑی آگے بڑھائے۔ اسے اس طرح فضول ہارن دیے جانے پر غصہ آ گیا۔ آگے گاڑیوں کی لمبی قطار تھی وہ کیا آسمان پہ اپنی گاڑی اڑا لے جاتی۔ موٹر بائیک سوار کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا، جانے اسے کیا الجھن درپیش تھی۔

☆☆☆

1.20 منٹ

اور اس وقت اشعر فلاور شاپ پر رکھے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ سیلز مین اس کی پسند کے پھولوں کا بُکے بنا رہا تھا۔ وہ بُکے بنا چکا تو اس نے سفید موتیے کے پھول نکلوائے۔ سفید موتیے کے پھولوں کا زیور تحریم بڑے شوق سے پہنتی تھی۔ آفس سے واپسی پر وہ اکثر اس کے لیے گجرے لے جاتا اور آج تو وہ یہ تحفہ پا کے بہت خوش ہوتی آخر کو ان کی ویڈنگ اینورسری تھی۔

☆☆☆

ایک موٹر بائیک کب سے......اس ٹریفک جام میں......اس کی گاڑی کے قریب ترین چل رہی تھی۔ اسے نہ اس کا احساس ہوا تھا اور نہ ہی کوئی خدشہ۔

اپنی بیٹی کا مسکراتا چہرہ اور اس کے لبوں پر آنے والے...... محبت بھرے جملے اس کی آنکھوں کی قندیلوں کو روشن سا کر رہے تھے۔

"ممّا......اگر مجھے فرسٹ پرائز مل گیا تو......؟"

بیٹی کا یہ سوال چھٹی مرتبہ تھا یا شاید بچے اپنی بات بار بار کہا کرتے ہیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس کا جواب ایک ہی تھا۔

"وہ تو میری گڑیا کو ملے گا ہی۔ اس میں شک کی کیا بات ہے......بیٹا، اسکول سے ملنے والا ہر انعام فرسٹ پرائز ہی ہوا کرتا ہے۔"

"اخاہ......تو پھر میں پرائز کے ساتھ گھر آؤں گی۔" بیٹی نے خوشی سے تالی بجائی اور اسی لمحے ساتھ لگی ہوئی موٹر سائیکل میں زوردار دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی کار کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ تالی کی گونج اس دھماکے میں نہ جانے کہاں دب گئی۔ ہاں لاشوں کے چیتھڑے آہ و بکا کے ساتھ ہر سو پھیل گئے تھے۔

اور اشعر ویڈنگ اینورسری کے لیے ڈھیر سارے پھول لیتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ آج اس کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے دل کی خوشی کو کیا ہوا ہے جو ان ڈھیر سارے پھولوں کو لے کر بھی اس کے آنسو اس کے دل پر ٹپک رہے تھے نہ جانے کیوں؟

تہی دست

رفاقت جاوید

"میں ہر سمے عالمِ تذبذب میں گھری رہتی ہوں، ذہن ساس کی فطانت و جبروت کی گواہی دیتا ہے مگر اس نامراد دل کا کیا کروں؟ اس میں شیطانیت آسیب کے مانند حملہ آور ہو جاتی ہے اور اعصابی جنگ گستاخی کی صورت سامنے آ جاتی ہے پھر ظاہر ہے مجھے ساس سے بھرپور شیریں لیکچر سننے کے بعد احساسِ جرم کا پیمانہ ہمہ گیر اور وسیع ہو کر مضمحل کر دیتا ہے، ان کی حقیقت اور سچائی پر مبنی باتوں میں بے پناہ وقار و تمکنت

WWW.PAKSOCIETY.COM

پنہاں ہوتی ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کا ہلکا سا گمان تک نہیں ہوتا۔ آخر کار میں لاجواب ہو کر اس عظیم ہستی کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتی ہوں۔ ان کے روبرو کھڑی ہو کر ان سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی میری تمام قوت زائل ہو جاتی ہے کیونکہ وہ مجھے غلط ثابت کر کے شرمندہ کرنے میں بتدریج کامیاب ہو چکی ہوتی ہیں۔'' مومنہ کا لہجہ گلوگیر تھا۔

''میں تمہیں یہی تو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ایسی ساس بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔'' ماہم نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر ماہم ان کی اس خوبی پر ذرا غور کرو، ساس ہونے کے ناتے وہ میری نافرمانی اور بدتمیزی پر گھر بھر میں اک ہنگامہ کھڑا کرنے کی مجاز ہیں۔ بیٹے کو ورغلا کر مجھے سب کے سامنے نہایت چالبازی سے ذلیل کر سکتی ہیں۔ پھر بھی ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میرے عیبوں اور کمزوریوں کی سب کے سامنے پردہ داری رکھتی ہیں اور طرہ یہ کہ خاندان کے ہر فرد سے میری عزت افزائی کروا کر انبساط اور خوشی سے جھوم اٹھتی ہیں۔ بہت بڑی بات ہے ناں۔'' لہجہ تشکر آمیز تھا۔

''دے لو دل کو جھوٹی تسلیاں...... بے وقوف ہو نری......'' ماہم نے جز بز ہو کر کہا۔

''بس یار...... میں ان کے منطقی اور باوضع دلائل سے امپریس ہو کر اپنے رویے پر پشیمان ہو جاتی ہوں۔ میرے وجود میں گردش کرنے والا زہر آلود مادہ عارضی طور پر دب جاتا ہے۔'' وہ اپنے دل کی سچائی کو کھل کر بیان کرنے میں رتی بھر جھجک نہیں رہی تھی۔

''ان سے میرے اختلافات اور اعتراضات بغیر کسی قیل وقال کے حل ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ والدین اور اولاد میں جنریشن گیپ کی جو ٹینشن موجود ہوتی ہے وہ قدرتی امر ہے۔ ہم خیال وہم نوا ہونے کے لیے دونوں جانب ضبط وایثار کی کمند کو ہاتھ سے نہیں چھوڑیں تو مثبت تدابیر خود بخود ہمارے سامنے مسرتوں سے لبریز جھولی پھیلائے کھڑی ہوں گی۔ ماہم میں ان کے سامنے ہار جاتی ہوں۔''

خاموش ماہم کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولی۔

''تو پھر میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے کا مقصد......'' ماہم نے قہر آلود نظروں سے گھورا۔

''مجھے کئی دفعہ تمہاری باتیں بھی اپیل کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ میری اپنی نہ ہی زندگی ہے نہ خود مختاری۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرا اپنا الگ گھر ہو، اس میں میرے پھول سے بچے اور ہم پر جان نثار کرنے والا شوہر ہو اور اس گھر کی کرتا دھرتا میں ہوں۔ تمام تر ذمے داریاں میں اور عثمان احسن طریقے سے نبھا رہے ہوں۔ اپنی زیست میں اپنی مرضی اور پسندیدگی شامل ہو مگر ایسی خوش قسمتی میں کہاں، میری ساس اس رشتے کو قربانیوں سے فراخ اور بے حد وبیکراں وسعت دے کر اس کی کڑواہٹ کے مہیب حصے کو زندگی سے نکال دینے کا خواب دیکھ رہی ہیں۔'' مومنہ حسرت ویاس کی تصویر بن گئی۔

''یہ سب بڑی افسانوی اور فلمی باتیں ہیں، اس رشتے کی تلخیوں کو آج تک نہ کوئی ختم کر سکا ہے نہ ہی اس رشتے کی وقتی محبتوں کو دیرپا بنا سکا ہے۔ اپنی ساس کو اس رشتے کی اہمیت سے روشناس کرانا تمہارا فرض ہے۔ ورنہ مستقبل میں بہت بڑا دھماکا ہونے والا ہے۔ اور تمہارے گھر کا ذرہ ذرہ فضا میں تحلیل ہو جائے گا اور تم مکھی کے مانند ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔ میری بات مانو گی تو فائدے میں رہو گی۔'' ماہم نے نہایت رازدارانہ انداز میں کہا۔

''مثلاً......'' مومنہ نے حیرت سے کہا۔

''آج ہی الگ ہونے کی خواہش کا اظہار کر دو، ایسی کون سی قیامت آ جائے گی۔ ابھی تو تمہاری ساس پاس کھڑی تمہاری جیٹھانی معلوم ہوتی ہے۔ جاتے جاتے بھی کئی سال لگائیں گی۔'' ماہم حقارت سے

بول رہی تھی۔

''ایسی بے ہودہ اور فضول باتیں مت کرو ماہم۔ ان کے بے پناہ پیار اور عزت کا یہ صلہ ہمیں ذلیل کر دے گا۔ ہم ان دونوں کو چھوڑ کر اپنی الگ دنیا کیسے بسا لیں جبکہ ان کی کوئی بیٹی بھی نہیں۔ انہیں ہماری ضرورت ہے ماہم۔'' مومنہ فکر مندی سے بولی۔

''ویسے مومنہ یار تمہاری ساس اپنی چالاکی میں مکمل طور پر فتح یاب ہو چکی ہیں۔ انہوں نے یہ پیار کی خوب صورت بیڑی تمہارے پاؤں میں ڈالی ہے جواب نہیں۔ تم اس سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی چاہو تو ناکامی کا سامنا کرو گی۔'' ماہم نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''دل سے خود مختاری کی خواہشوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے لاغر وخائف وجود میں دفن کر دو۔''

''دراصل ہمیں ہماری مالی حالت الگ رہنے کی اجازت نہیں دیتی، کمر توڑ مہنگائی میں گھر چلانا خاصا دشوار ہے۔ از راہ مجبوری اس میٹھے زہر کو نوش کر رہی ہوں۔ تمہاری سوچ کے مطابق میں خاصی بے وقوف ہوں مگر ایسا ہرگز نہیں۔'' مومنہ نے کھسیانی ہو کر پینترا بدلا۔ ''دیکھو، بچوں کے لیے ٹیرینڈ فری آیا، بہترین مفتے کا خانساماں، دھوبی وغیرہ وغیرہ...... نہ بلوں کی فکر نہ گروسری کا جھنجٹ...... اوپر سے میری بے انتہا خوشامدیں۔ کس لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں۔ بتاؤ، عقلمند میں ہوں کہ تم ہو۔''

''تم دونوں کی رگوں میں شیطانیت سرائیت کر گئی ہے۔ خدا کی بندیوں ایسی عظیم ساس کے بارے میں نہ ہم نے کسی افسانے میں پڑھا نہ فلم میں دیکھا۔ کیا فرشتہ خصائل عورت ہے مومنہ ان کی قدر ومنزلت اور عزت وتکریم میں کسی قسم کی... کنجوسی مت کرنا۔ ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔ یہ مت بھولنا مکافات عمل بہت جان لیوا سزا ہے۔ تم بھی اولاد والی ہو۔'' ندا اپنا کام کرتے ہوئے ان کی گفتگو بھی سن رہی تھی۔ تڑپ کر ان کے درمیان آ گئی۔

''مجھے بھی یہی خوف کھائے جاتا ہے۔'' ماہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''رشتوں سے کنارہ کشی گناہ کبیرہ کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسے رشتوں کو نبھانا جن میں نفرت وحقارت اور دھتکار کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ اس صورت میں خاموشی اختیار کرنے میں ہی مصلحت ہے۔ بزرگوں کے پیار اور لگاؤ سے جان چھڑانے والے لوگ...... بدبختی کو بذات خود آواز دے کر تباہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔'' ندا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ مختصر توقف کے بعد مومنہ نے سعادت مندی سے سر کو جنبش دی۔

''بیٹی کیسی ہے؟ اب تو بہت پیاری ہو گئی ہوگی۔'' ندا نے پیار سے پوچھا۔

''ماما کی آنکھ کا تارہ اور پاپا کے دل کا چین ہے وہ۔ اب تو خوب صحت مند ہو رہی ہے۔'' مومنہ کے لہجے میں خوشی عود کر آئی۔

''خیال رکھنا کہیں تمہاری ساس اسے موٹا کُپا ہی نہ بنا دیں۔ آج کی ریسرچ کے مطابق چلو۔ وقت بے وقت بچوں کو ٹھونس ٹھونس کر کھلانے سے بے ڈھنگا پن اور موٹاپا ایسے آتا ہے کہ مرتے دم تک ساتھ نہیں چھوڑتا۔ آج کل بچوں میں ذیابیطس بھی بہت عام ہے۔ تمہاری ساس زمانہ جہالت کی پروردہ ہیں۔ ذرا ان کی کلاس لے کر انہیں ایجوکیٹ تو کرو۔ دیکھنے میں تو بڑی سمجھدار اور پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہیں۔ تو یہ ظاہر اور باطن میں کس قدر تضاد ہے۔'' ماہم نے جل کر تلخی سے کہا۔

''مجھے تو یہ خیال ہی نہ آیا۔ تم سچ کہتی ہو۔ خیر ماما کے لیے معمولی سا اشارہ ہی بامعنی ہو جاتا ہے۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے، میری ساس ایری غیری عورت نہیں۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے اس کے تمام رنگوں کو پرکھا ہے۔ آج کے بعد انہیں جاہل کا خطاب مت دینا۔'' وہ خفگی سے بولی۔ ''مسئلے کا حل نہ بتانا، بس ساس کے رشتے کو کوستے جاؤ۔''

"اس کے لیے ڈے کیئر سینٹر بہتر رہے گا۔ دادی کی جہالت سے نکل کر ایک دم روٹین میں آجائے گی۔ مشا پا خود بخود غائب ہوجائے گا۔ دوسرے ساس کے احسانات میں خود کو اتنا نہ پھنساؤ کہ چھٹکارا مہنگا پڑے۔" ماہم نے اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے ایک اور باغیانہ مشورہ پیش کیا۔

"وہ کیسے؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"کل کلاں ان پر فالج کا حملہ ہو گیا ناں تو خوب بھگتو گی، نوکری کو الوداع کہنا پڑ جائے گا۔ ذرا سوچ لو اپنا انجام۔" ماہم نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔"آج وہ تمہارے بچوں کی آیا گیری کر رہی ہیں ان کے مستقبل کی آیا کا انتخاب تم ہو گی اور تمہارے مسئلے کا حل ہے اپنی الگ دنیا بسانا۔ ذرا ان کی ناک میں دم تو کر کے دیکھو، چٹکی بجاتے مسئلہ حل...... نکل آؤ ان کی بے جا خوشامدوں کی دنیا سے۔"

"میں الگ گھر چاہتی ہوں مگر بزرگوں کی آمادگی سے۔ ان کی آہوں اور سسکیوں کی بنیاد پر تعمیر شدہ گھر مستحکم و مضبوط کیسے ہو سکتا ہے۔ تم مجھے غلط پٹیاں پڑھانا بند کر دو ماہم۔ بس میں جیسی ہوں ٹھیک ہوں۔" وہ حتمی اور آخری فیصلے کے انداز میں بولی۔

"ارے یار خفا نہ ہو۔ تمہاری دیرینہ ہمراز ہوں۔ اونچ نیچ تو سمجھاؤں گی۔" وہ ذرا سوچتے ہوئے توقف کے بعد بولی۔ "میں عموماً مغربی معاشرے کی قدروں کو حسرت و رشک سے دیکھتی ہوئی ان کی زندگی کے سکون و اطمینان کا اندازہ لگاتی رہتی ہوں۔ مجھے اولڈ ہوم کا تصور ہی جنت الفردوس سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ ارے بزرگوں کی کیا انجوائے منٹ ہوتی ہو گی۔ ایک ہی ایج بریکٹ کے لوگ جو بھی حرکتیں کرتے ہوں گے وہ تمام قابلِ قبول اور قابلِ معافی ہوتی ہوں گی۔ اولاد اپنی جگہ مطمئن اور فارغ البال، ہمارے معاشرے کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔" ماہم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"او مائی گاڈ! ماہم اپنی سوچ درست کر لو۔ مجھے تمہارا مستقبل بے حد تاریک نظر آرہا ہے۔" ندا نے بے اختیار ہو کر کہا۔ "مومنہ یہ تمہیں مروائے گی۔ خود ہر دوسرے دن میکے پہنچی ہوتی ہے۔ اس کی بات پر کان نہ دھرنا مومنہ۔ تم طبعاً ایک بالحاظ اور نرم دل لڑکی ہو۔ یہی خوبی تمہاری ازدواجی زندگی کی خوشحالی اور کامیابی کی کنجی ہے۔ اس کے نقشِ قدم پر مت جانا، میری نصیحت یاد رکھنا۔"

"میں ان بڑھیا کو کون سا منہ لگاتی ہوں۔ میں اپنے بچے صبح امی کے گھر چھوڑتی ہوں، ابھی جاتے ہوئے پک کر لوں گی، میں ان کا رتی بھر احسان لینے کی روادار نہیں ہوں اور نہ ہی ان کا سایہ اپنے بچوں کے لیے مناسب سمجھتی ہوں...... میرا میاں اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔ کتنی دیر گھر پر اپنا ہولڈ رکھیں گی۔ آخر ایک دن تو میرے ہتھے چڑھیں گی ناں۔" ماہم نے حقارت سے کہا۔

"تم اب بھی کم نہیں ہو، ان کے روبرو مقابلے میں اترنے سے دیس نکالا ملتا ہے تمہیں۔ خوامخواہ گھر بھر کا سکون غارت کیا ہوا ہے۔" ندا نے برا سا منہ بنایا۔ "معمولی سا خود میں دھیما پن پیدا کر کے تو دیکھو۔"

"ندا! ان میں مجھے دیس نکالا دینے کی جرات نہیں ہے۔ میں خود ان لوگوں کو سبق سکھانے میکے رخصت ہو جاتی ہوں۔ انہیں برادری میں ہر وقت اپنی ناک اونچی رکھنے کی مصیبت پڑی رہتی ہے، سو اگلے دن ہی میاں منت سماجت کر کے واپس لے آتے ہیں۔ بتاؤ جیت کس کی ہوئی۔" ماہم کی گردن قدرے تن گئی۔

"ہماری تعلیم کا کیا فائدہ ہوا ماہم، مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔" ندا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"میں اس تعلیم کے روشن اور سجل پہلوؤں سے مومنہ کے مسئلے کو حل کرنا چاہتی ہوں۔ اپنا کماتی ہے اس کی زندگی بھی اپنی پسند اور خواہش کے مطابق ہونی چاہیے۔ جو ساس میٹھی چھری کا استعمال کرنے میں ماہر ہو۔ اس کو سب کے سامنے لانا ہی تو تعلیم ہے، سمجھداری اور دانشمندی ہے۔" ماہم نے قدرے غصے سے کہا۔ "ہم تینوں اس معاشرے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندہ لاشیں ہیں۔ جن کی نہ تو اپنی سوچ ہے نہ ہی اپنا فیصلہ ہے۔ مومنہ تم قدم اٹھاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں ہمیں کسی قسم کے اندیشے یا خوف کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔" ماہم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ماہم میری بات غور سے سنو ہمارے مفادات ان کے سایۂ عاطفت سے ہی منسلک ہیں۔ میرے شوہر والدین کی خاطر شادی سے پہلے ہی یو کے سے یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔ سسرال سے علیحدگی کا اظہار گویا اک عظیم طوفان کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ انہوں نے جو تھوڑی بہت جائداد بنائی ہے اس پر پاپا کا قبضہ ہے۔ وہ اپنی زندگی میں اس کی تقسیم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ کیونکہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی انکم کا ذریعہ ہی یہ ہے۔ وہ بے حد دیانت دار، خود دار اور غیرت مند انسان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عمر ان کا ہاتھ دینے والا رہا ہے۔ ان کی اصول پرستی اور قانون سازی نے گھر کی فضا کو ہر طرح کی ذہنی اختراع سے یکسر پاک رکھا ہوا ہے۔ میری اس نامناسب اور بے جا تنقید کی یکدم گل افشانی پر گھر میں حشر برپا ہو جائے گا۔ ماما جو ہر لمحے میری حمایتی بنی ان کے عتاب و جلال سے مجھے محفوظ رکھتی ہیں میرا یہ غیر متوقع ردِعمل ان پر شاک گزرے گا۔ مجھے اس شورش اور بغاوت کے اثرات بہت بھیانک معلوم ہو رہے ہیں اس لیے کہ عثمان میں ہی دم خم نہیں کیونکہ وہ ایک فرمانبردار بیٹے ہیں۔" اس کے لہجے میں انتہائی پژمردگی سمٹ آئی تھی۔

"وہ مجھے ان کی خاطر چھوڑ سکتے ہیں۔ میرے تمام ٹھوس دلائل موہوم اور بے حقیقت ثابت کر دیے جائیں گے۔ ان کے وسیع و عریض خاندان میں میری جو عزت افزائی ہوئی ہے اس کا سبب ماما ہیں۔ میں ان تمام نوازشوں اور عنایتوں سے دستبردار کیوں ہو جاؤں؟ تمہاری ایسی گفتگو کے مہیب اثرات میرے مزاج سے ظاہر ہونے لگتے ہیں اور مجھے اپنا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ یہ درست ہے تمہاری بات کہ ہر عورت کے کچھ خواب اور امیدیں ہوتی ہیں۔ مگر میری زندگی میں ان کی دخل اندازی بھیانک تعبیر اور ناامیدی سے وابستہ ہونے کے امکان روشن ہیں۔ میرے والدین میری ایک نہیں سنتے۔ ان کی بے حسی، بے تعلقی اور بے توجہی میرے لیے اذیت ناک ہے۔ وہ میرے سسرال کی مدح سرائی میں میری حیثیت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ انہی دقیانوسی اصولوں اور پرانی روش پر رواں دواں ہیں۔ یعنی بیٹی ڈولی میں جائے جنازے میں نکلے۔" مومنہ کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

"چلو دیکھ لیتے ہیں تمہیں اس صبر و ایثار کے اجر میں کون سا تمغا ملنے والا ہے۔ تمہاری یہ معمولی سی خواہش بے پناہ آزمائش کی مرہونِ منت ہے۔ میں یہی تو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آج گھر جا کر ذرا لسی سے مکھن نکالو تمہیں میری بات سمجھ میں آجائے گی۔" ماہم اپنی بات منوانے پر تلی ہوئی تھی۔

"ماہم بی ہیو۔" ندا نے قدرے خفگی سے اسے گھورا اور مومنہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "مومنہ جو سکھ و سکون اور عزت نوشتہ تقدیر نے تمہارے حصے میں لکھ دی ہے اس کی قدر دان اور شکر گزار رہو۔ سسرال کی محبت و لگاوٹ ہمارے لیے ناقابلِ حل مسئلہ بن گئی۔ ویری بیڈ مومنہ، ماہم نے اپنی انہی حرکات کی وجہ سے اپنی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے، اس کی سسرال سے لاتعلقی کو حسرت سے دیکھ کر اس سے مشورے مت لو۔ خدا تعالیٰ نے روئے زمین پر تمہارے گھر کو جنت کا روپ بخشا ہے۔ ایسی پُرسکون فضا اور خوشگوار ماحول میں پروان چڑھنے والے بچے خاندان بھر کے لیے فخر اور قابلِ آفریں ثابت ہوتے ہیں، تم موازنہ

وقت آنے پر کرلینا۔'' ندا نے ماہم کی طرف اشارہ کیا۔

''میں کس کے مشورے پر عمل کروں۔ ایک طرف ماہم کی کبرو پندار میں ڈوبی ہوئی نصیحتیں دوسری طرف صلح کل التجائیں، مجھے تم دونوں نے کنفیوز کردیا ہے۔ میں تو پاگل ہوجاؤں گی تم دونوں کے مشوروں سے۔'' مومنہ جز بز ہوگئی اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''ندا کے سر پر تو نیک پروین بہو بننے کا بھوت سوار ہے۔ اس کی سنو گی تو سسرال میں بے دست و پا ہی زندگی گزارو گی۔ یہ سسرال اللہ مارے میٹھے بھی عذاب اور کڑوے بھی قیامت۔'' ماہم نے حرفِ آخر کے طور پر کہا۔

''ماہم مجھے سسرال میں ہر صورت نبھا کرنا ہے تو پھر رونا کیسا۔ شکوے شکایتیں کیوں؟ اس معاشرے میں مناسب اور موزوں سسرال شاذو نادر ہی ملتے ہیں۔ ہم نے اپنے اخلاقیات سے بزرگوں کے دلوں میں اپنا قابلِ ستائش مقام بنانے کی خاطر تمام تر کاوشیں بروئے کار لانی ہیں کیونکہ ہم چاہے کتنی ہی ڈگریاں حاصل کرکے ہائی لیول جاب پر کھڑی ہوجائیں پھر بھی ہمیں مرد کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ہمیں اپنا نام دے کر جہاں بھر کی دھوکے بازی، فریب کاری اور الزام تراشیوں سے محفوظ کرلیا ہے۔ ان کے ماحول میں رچ بس جانے کا فرض ہم پر عائد ہوتا ہے۔ بزرگ اپنی عمر گزار کر اپنی عادات میں اس قدر پختہ ہوچکے ہیں کہ وہ ایک بہو کی خاطر خود کو بدلنے سے رہے۔ ہمیں اپنی ذات کو منوانے کی تگ و دو کرنی ہے۔ معاشرے کے بے ہودہ رسم و رواج کو نہایت دانشمندی سے اپنے مطابق ڈھالنا ہے۔ ماں کسی بھی وقت اپنے بیٹے کے لیے نئی بہو لا کر اپنی حیثیت و اہمیت کی مثال پیش کرسکتی ہے۔ اس غلاظت اور رسوائی سے بہتر ہے کہ خود کو کچھ دھیما اور فراغ دل رکھ کر حالات کو اپنے قابو میں رکھیں۔ ناز برداری اور چاؤ چوچلوں کے ان لمحوں کو یاد کرکے مطمئن رہیں جب انہوں نے ہمیں اپنانے کے لیے پاپڑ بیلے تھے۔'' ندا بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

''اس کو تو موقع ملنا چاہیے اپنی عالمیت اور فضیلت کا ہم پر رعب و دبدبہ ڈالنے کا۔ کم از کم میں تو تمہاری کسی بات میں آنے والی نہیں۔ تمہاری غلامانہ ذہنیت تمہیں ان کا غلام بنا کر چھوڑے گی۔ دن بھر کماؤ، رات بھر سوچتے کھاؤ گنو ایک اور ان کی نسل بڑھاؤ، یہ ہے زندگی میں تمہارا رول۔'' ماہم نے اس کا تمسخر اڑایا مگر ندا نے ہنس کر ٹالتے ہوئے کہا۔

''اول فول بکنے کے علاوہ بھی تو کچھ بولو۔ تمہارے پاس کون سا نالج کا فقدان ہے۔ ہمیں اس سے مستفید تو کرو ناں۔'' مومنہ کو معاً خیال آیا اس نے گھڑی کو بغور دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔

''خواتین ہم لیٹ ہورہے ہیں۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''تمہارے مسائل کو سلجھانے میں وقت کی خبر تک نہیں ہوئی مگر حاصل آیا صفر...... خیر ہم بھی ہمت ہارنے والے نہیں۔ باقی آئندہ......'' ماہم نے مومنہ کو چٹکی بھری اور تینوں مسکراتے ہوئے اسٹاف روم سے نکل کر اپنے اپنے کلاس روم کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

مومنہ حسبِ معمول پیشانی پر بل ڈالے گھر داخل ہوئی تو بیٹا بھاگتا ہوا ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ ساس نے دعاؤں کے ہمراہ اس کا استقبال کیا۔ انہوں نے چھ ماہ کی بچی کو اس کی گود میں ڈال کر دن بھر کی باتیں اور شرارتیں سنا کر اسے تازہ دم کرنے کی کوشش کی اور کھانے تک کمر سیدھی کرنے کی تلقین کرکے اس کے کمرے میں چائے اور بسکٹ بھجوا کر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ کر نوکرانی سے کندھے دبوانے لگیں۔

''بی بی جی، بہو کے لیے اتنا نہیں کھپتے، بہت کماتی ہے، اپنی بچی کے لیے فل ٹائم آیا کا انتظام کرے۔ آپ کی عمر بچے کھلانے والی نہیں۔ پھر بھی بہو کا پھولا ہوا منہ دیکھو۔ بہت حوصلہ ہے آپ میں۔''

''بے چاری تھک کے آتی ہے۔ کیا بھنگڑا ڈالے میرے آگے پیچھے۔ تم اپنے کام سے مطلب رکھو۔ میں سب سمجھتی ہوں کہ کیا کرنا ہے؟ مجھے تمہارے صلاح مشورے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ چلو اٹھو یہاں سے۔ سلاد کاٹو، رائتا بناؤ، ٹیبل لگاؤ، میں آکر کھانا نکالتی ہوں۔ بیٹا بھی آتا ہی ہوگا۔ وقت پر کھانا لگ جانا چاہیے۔ بیٹی کو بھوک لگ رہی ہوگی۔'' ساس نے اسے ہلکی سی جھاڑ پلادی۔

''ٹھیک ہے جی۔'' اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

ماہم نے اپنے میکے سے اپنی ایک سالہ بچی اور دو سالہ بیٹے کو پک کیا۔ بھابیوں کی تنبیہی نظروں اور تلخ باتوں کو درگزر کرتی کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ باہر نکل آئی۔ ماں بھی بڑبڑاتے ہوئے تخت پوش پر ڈھے گئیں۔ جسم کا انگ انگ درد میں جکڑا ہوا تھا۔

''اماں، ماہم سے کہیں نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھے۔ اب آپ میں اتنی ہمت کہاں کہ دوسروں کی نسل کو پروان چڑھائیں۔ آپ نے بھی تو اپنے چار بچے خود پالے ہیں۔ ہماری مثال بھی آپ کے سامنے ہے۔''

''وہ کسی کی بات ماننے والی کہاں...... نہ سسرال سے بنا کر رکھی نہ بھابیوں سے موافقت۔'' اماں کے دکھی دل نے سرگوشی کی مگر زبانی کلمات خاصے ہمدردی کی مٹھاس سے بھرپور تھے۔

''بہو، جب تک زندہ ہوں، وہ عیاشی کرلے۔ میرے بعد تو اس گھر کے دروازے ہی اس پر بند ہوجائیں گے۔'' آخر کار وہ اپنی ذمے داریاں خود ہی اٹھائے گی۔ کون ہے اس کا مددگار۔'' دونوں بہوئیں حیرت سے ساس کا منہ دیکھتی رہ گئیں کہ سچ ہے بیٹی کا کوئی بدل نہیں۔

ماہم اپنی سسرال پہنچی تو سب لوگ حسبِ معمول کھانا تناول کرچکے تھے۔ وہ سیدھی کچن کی طرف چلی گئی۔ ہاٹ پاٹ میں روٹی کے بچے ہوئے چند ٹکڑے موجود تھے۔ فریج کھول کر پانچ منٹ تک اس نے ایسے جائزہ لیا جیسے فریج جادو کی مشین ہے جو فوراً اسے مرغن کھانے پیش کرے گی۔ ٹھاہ سے اس نے فریج کا دروازہ بند کیا اور برتنوں کو پٹختے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ بچی کو کاٹ میں لٹا کر واپس کچن میں آئی۔ دو انڈوں کا آملیٹ بنا کر ڈبل روٹی کے چار ٹکڑوں کو پلیٹ میں رکھا اور کمرے میں آگئی۔ جب تک بچی رو رو کر ہلکان ہوچکی تھی۔ بیٹا لپ اسٹک سے اپنا منہ رنگ چکا تھا۔ نہ نند قریب پھٹکی نہ ساس نے توجہ دی اور نہ ہی ماہم نے ان سے مدد لینے کی ضرورت محسوس کی۔

☆☆☆

ندا نے ہر دن کی طرح اپنے بیٹے کو اسکول سے لیا۔ تندوری نان پکڑے اور گھر پہنچ گئی۔ ساس اور سسر اس کا انتظار کررہے تھے۔ اس نے ٹرالی پر کھانا رکھا۔ صبح اسکول جانے سے پہلے وہ دو سالن پکا کر جاتی تھی یہ روز کا معمول تھا۔ سب کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ غسل سے فارغ ہونے کے بعد وہ بیٹے کو ہوم ورک کرانے لگی۔ رات گیارہ بجے تک وہ سب کے لیے ایک پاؤں پر کھڑی رہتی مگر کیا مجال کہ ماتھے پر ہلکی سی شکن بھی آئے۔ نسوانی وقار اور عزتِ نفس کی خاطر وہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ اس کی سلیقہ شعاری، عقلمندی اور دور اندیشی نے گھر کو جنت کا گہوارہ بنا رکھا تھا۔ شوہر ہر وقت نثار و فدا ہونے کو تیار ملتا۔ حالانکہ ساس و سسر کا رویہ نہایت روایتی تھا۔ جسے وہ ہنس کر برداشت کرجاتی۔ اسے اپنے میکے کی لعن طعن سے سسرال کا کٹھور پن قابلِ قبول تھا کیونکہ اس کی تقدیر کی تختی پر انہی لوگوں کے سنگ مرنا جینا لکھ دیا گیا تھا۔ اس نے اس حقیقت کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

☆☆☆

روز بہ روز گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ حسبِ معمول اماں کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی تھی کیونکہ گرمیاں ہمیشہ سے ہی ان کے لیے کافی

بھاری رہتیں۔ پاپا گرمی، سردی، خزاں، بہار میں کھانا ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا بے حد پسند کرتے تھے۔ شادی کے اوائل دنوں میں کمسنی کی نا سمجھی کی وجہ سے اماں کو بے حد تلخ تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ ساس سسر بھی انہی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے پر بضد رہتے تھے، وہ کھانا پکاتیں اور جی بھر کر طعنے تشنے سنتیں۔ اسی میں جوانی بیت گئی۔ وہ سلسلہ ابھی تک بدستور جاری تھا۔ ڈیمانڈز... وہی تھیں۔ فقط رشتوں کے رنگ وروپ میں تبدیلی آئی تھی۔ باقی سب کچھ وہی تھا۔ پاپا نے کبھی تعریفی کلمات بول کر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ بچے شروع سے ماں کو دیے جانے والے کوسنے سن رہے تھے انہیں بھی ماں کی خاص پروا نہیں تھی۔ عثمان کی شادی کے بعد پاپا نے کچن کا کام بہو کے ذمّے ڈالنا چاہا تو منہ کی ایسی کھائی کہ چپ سادھے تلملا کر رہ گئے۔ اماں کو بات بھی سچ ہی معلوم ہوئی.... اماں گھر میں فارغ البال ہیں۔ جاب کرنے والی بہو سے کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ گھر کی ذمّے داریوں میں ساس کا ہاتھ بٹا دے۔ بلکہ وقت کے ساتھ اماں کو ایسے لگا جیسے وہ پھر سے دو بچوں کی ماں بن گئی ہیں مومنہ اپنے بچے کسی لڑکی کے ہاتھ میں دینے کے سخت خلاف تھی کیونکہ سب سے پہلے بچے اس کی زبان اور عادات کو اپناتے ہیں۔ والدین کے لیے بعد میں بچپن کا تلفظ وفطرت کو بدلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ دادی کے زیرِ سایہ اپنے بچوں کو پروان چڑھانا چاہتی تھی۔ ساس نے اس کو ذرہ نوازی سمجھ کر ہنس کر قبول کر لیا۔ شوہر کی بے توجہی اور رشتے داروں کی دخل اندازی سے وہ سالہا سال سے آشنا تھیں۔ ان کو نظر انداز کیے عثمان اور نعمان کے لیے لڑکیاں ڈھونڈنے لگیں۔ دونوں بیٹوں نے یو کے سے ماسٹرز کر کے وہیں.... جاب کر لی تھی۔ مگر عثمان والدین کی خاطر اپنے ملک میں ہی سیٹل ہونا چاہتا تھا۔ دوسرے بچوں کو مغربی تہذیب کا پروردہ بنانے کے سخت خلاف اور مشرقی روایات وکلچر کا دلدادہ تھا۔

پاکستان آتے ہی اسے ملٹی نیشنل کمپنی میں بہترین جاب مل گئی اور عثمان اپنے والدین سمیت اندرون شہر کی تنگ گلیوں کے چوبارے سے نکل کر ڈیفنس کے وسیع وعریض بنگلے میں آ گیا۔ ظاہر ہے اماں کی دیرینہ آس وامیدوں کو جو تسکین ملی تھی وہ قابلِ دید تھی۔ ان کی سلیقہ شعاری اور ہنر مندی سے گھر سج گیا اور زندگی میں اک تناسب آ گیا۔ عثمان کے لیے دعائیہ کلمات ہر سانس کے ساتھ نکلنے لگے اور وہ دھیرے دھیرے نے ذمّے داریوں میں مصروف ہوتی چلی گئیں۔ وقت گزرتا گیا۔ دونوں بچے مونٹی سری جانے لگے تھے۔

اب ماں کے سکھ کے دن آ گئے تھے، بیٹے نے کھانا پکانے کے لیے بہترین خانساماں کا انتظام کر لیا تھا مگر ابھی بھی وہ پاپا کے لیے کھانا اپنے ہاتھ سے ہی بناتیں اور جہاں بیٹھے ہوتے ٹرالی خود ان کے سامنے حاضر کر دیتیں۔ وہ اس چھوٹی سی جنت میں سب کو متحد رکھ کر ہر پل تسکین وتشفی سے ہمکنار رہتیں۔

گرمی کا موسم عروج پر تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات کی بھی آمد آمد تھی۔ نتھیا گلی اور بھوربن جانے کے پروگرام میں مومنہ پیش پیش تھی۔ وہ اپنی بہنوں اور ان کی فیملی کو اپنے ساتھ لے جانے پر نہال ہوئی جا رہی تھی۔ بچے سمجھدار ہو گئے تھے، وہ مستی اور خوشی سے گھر بھر میں ہلا گلا مچاتے تیاریوں میں مصروف تھے۔ عثمان کی سالانہ چھٹیاں بھی ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ سیر وسیاحت کے مصرف میں بیت جاتی تھیں۔ آج کا پروگرام حسبِ معمول تھا مگر اس دفعہ اماں کی ناساز طبیعت کا کسی کو ہلکا سا احساس تک نہ ہوا۔ ہمدرد اور محسن ہستی کمرے میں بند ماحول کو انجوائے کرنے سے قاصر تھی۔ پاپا نے باتوں باتوں میں عثمان کو رکنے کی دعوت دی تھی جسے اس نے رد کر دیا۔ پاپا جنہیں نہ سننے کی عادت نہیں تھی، آج بیٹے کے انکار پر اندر ہی اندر کھول اٹھے مگر زبان پر تائب ہو جانے والے الفاظ تھے کیونکہ وہ بیٹے کی حکومت میں رہ رہے تھے۔ جہاں انہیں اپنی اولاد کی قربت کا سکون

بستر تھا۔ جس نے ان کی قوتِ گویائی کو خرید لیا تھا۔ آج اماں پر ایسی نقاہت اور غنودگی طاری تھی کہ انہیں اپنے آس پاس کی خبر تک نہیں تھی۔ ایک ہفتے سے بخار چڑھ رہا تھا۔ پاپا نے ہمیشہ کی طرح بیوی کو اسپتال لے جانے میں کوتاہی برتی۔ عثمان نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ بہو تو پرایا خون تھی۔ اس کے دل میں انسانیت کے نام پر بھی اس رشتے میں ہمدردی یا خلوص کی ہلکی سی رمق نہیں تھی۔ جب ان کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو پاپا کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے عثمان کو بلا کر ماں کی حالت سے آگاہ کیا تو وہ سیخ پا ہو کر بولا۔

”پاپا یہ ذمّے داری آپ کی ہے۔ آپ گھر میں دن بھر فارغ ٹی وی دیکھتے ہیں یا اخبار پڑھتے ہیں۔ کم از کم اپنی ذاتی ذمّے داریوں کو تو خود سے نبھائیں۔ ابھی آپ دونوں ایسی عمر کے حصے سے خاصے دور ہیں جہاں بچوں کے سہارے اور مدد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ باہر مومنہ کی گاڑی کھڑی ہے۔ ماما کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو کسی نے منع نہیں کیا۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ باہر سب انتظار کر رہے ہیں۔ خوامخواہ جاتے جاتے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔“

”بابا! ہم نہیں جائیں گے۔ اسی اثنا بچے بول اٹھے۔“ بہو نے بچوں کو قہر آلود نظروں سے گھورا اور ان کے بازوؤں کو زور سے دباتے ہوئے بولی۔

”ماما آپ کو بھی انہی دنوں میں بیمار ہونا تھا۔ ہماری چھٹی کا سارا مزہ ہی کرکرا کر دیا ہے۔“

”بہو... بیماری کوئی پوچھ کر آئے تو بتاؤ کوئی ذی روح اسے خوش آمدید کہہ سکتا ہے۔“ پاپا نے قدرے لجاجت سے کہا۔

”بیماری اور مہمان کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ بغیر دستک کے اپنی مرضی سے آتی ہے اور میزبان کی رضامندی پر واپس جاتی ہے۔“

”شکر ہے کہ آپ کو ماما کی بیماری کی آمد کا احساس ہو چلا۔ اب اسے رخصت کرنے کے انتظامات کے بارے میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔“

عثمان نے طنزیہ کہا اور سب خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔

”ایسی نافرمان اور بے لحاظ اولاد تمہارے بطن سے پیدا ہوئی ہے افسوس کی بات ہے۔ ماں کی ذمّے داری سے بھاگتے ہیں، ذرا دیکھو دیدہ دلیری اور بے باکی ان کی۔“ اماں نے نیم وا آنکھوں سے پاپا کے غصے اور بے بسی کا تجزیہ کیا۔ ان پر ترس اور رحم کی آمیزش سے بھرپور آنسو تکیہ بھگونے لگے۔ بہو اور بیٹے کی بے پروائی سے وہ تڑپ اٹھے۔

”کیا میری عمر ہے کہ خود ڈرائیور کر کے اسپتال پہنچوں اور پھر ویٹنگ روم میں سخت کرسیوں پر بیٹھا گھنٹوں انتظار کروں۔ پھر ڈاکٹر کی منحوس صورت دیکھنے کو ملے۔ یہ سب کچھ مجھ سے ہونے سے رہا۔ جوان بیٹے ہیں تمہارے، ان پر اپنی ذمّے داری ڈالتے ہوئے تمہیں ندامت کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ تم نے ان بچوں کو پالنے میں اپنی زندگی کا قیمتی وقت صرف کیا ہے۔ تم نے میرے خاندان کے ہر فرد کی دل وجان سے خدمت کی ہے۔ پوتے پوتی کو جس ناز ونعم میں پال کر تم نے بڑا کیا ہے۔ اس کا ہی جواب نہیں۔ جب تک ہم اپنی اولاد کے ہوش وحواس پر ذمّے داری بن کر چھا نہیں جاتے ہمارا یہی حال ہوگا۔ اک جیتی جاگتی مثال تمہارے سامنے ہے۔ میرے والدین نے اپنی ذمّے داری فقط مجھ پر ڈالی تو ان کے لیے میرے دل میں روز بروز ہمدردی اور انس بڑھتا گیا۔ وقت کے ساتھ ان کی خدمت کرنے کی چاہ شدت پکڑتی گئی۔ ان کے بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں کے اندیشے اور فکریں مجھے ہر وقت بے سکون رکھ کر بتدریج مجھے ان کے قریب کرتے گئے۔ جبکہ اس کے برعکس باقی تمام اولاد ایسے پاکیزہ جذبات سے محروم رہی۔ وہ ان کی مزاج پرسی کو آتے ہم سے اپنی بھی خاطریں اور ناز برداریاں اٹھواتے اور واپس اپنے گھروں میں آرام اور سکون کی نیند سوتے اور ہم دونوں رات بھر ان کے پلنگ کے ساتھ چپکے رہتے۔

اس کی کیا وجہ تھی۔ وہ بھی تو انہی کی اولاد تھی جو بالکل بے پروا اور ہر طرح کے جذبات سے عاری تھی۔ میرے دل میں جذبۂ رحم کیوں تھا؟ اس کا جواب دے پاؤ گی۔“ اماں نے ان کے افسردہ و پژمردہ چہرے کو بغور دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”کیونکہ میرے والدین نے میرے دل کی گہرائیوں میں اپنی ہمدردی، انس و لگاوٹ کا بیج بو کر اپنے ستانے کے لیے اک تناور شجر اگانے کی محنت کی تھی جس کے سائے کی ٹھنڈک اور راحت میں وہ آخری سانس تک پناہ گزین رہتے۔“ پاپا کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔

”آپ نے عثمان کی اس حرکت کو خوامخواہ دل سے لگالیا ہے۔“ وہ بہ مشکل بولیں۔ ”دس مہینے مومنہ کام پر جاتی ہے۔ یہی دو مہینے تو فری ملتے ہیں بے چاری کو۔“

”تم نے ہمیشہ بچوں کی ہر نازیبا حرکت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سب اسی کے نتائج ہیں فرحت بیگم! تم نے تو اپنے بڑھاپے کے ساتھ میرا بڑھاپا بھی ذلت کی دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ نعمان پہلے سے ہی یہاں کے کلچر اور روایات سے بھاگتا ہے۔ اس کی سوچ میں ماں باپ کی خدمت کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ تو پکا لندن کے آزاد و خودمختار ماحول کا دلدادہ ہو چکا ہے۔ جسے گناہ و ثواب کی حقیقت و سچائی پر رتی بھر یقین نہیں۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت کی عظمت کو مضحکہ خیز انداز سے جھٹلاتا ہے۔ اس کے وجود میں انگریزی بیج پروان چڑھ چکے ہیں۔ ہمیں وہ حقارت سے دیکھتا ہے۔“ پاپا ان کے ماتھے پر ٹھنڈا تولیا رکھتے ہوئے فکرمندی سے بولے جا رہے تھے۔

”ایسی بات ہرگز نہیں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ نقاہت سے بولیں۔

”چلو اب اس کو آزما لیتے ہیں۔“ پاپا طنزیہ بولے۔

”کیا اب ہم در در کی ٹھوکریں کھائیں گے۔ زمانہ ہمارا تمسخر اڑائے گا۔ حسد و عناد میں گھری ہوئی ہماری برادری خوشی سے پھولی نہ سمائے گی۔ ایسا کبھی تصور بھی نہیں کریں۔ ہم نے اسی گھر میں اپنی عزتِ نفس اور خودداری کی خاطر آخری سانس تک رہنا ہے اور یاد رکھیے گا آپ کی زبان پر بھولے سے بھی بہو اور بیٹے کے خلاف ایک لفظ نہیں آنا چاہیے۔ ہم نے اپنی زندگی کے ایام برادری کے بیچ رہ کر دنیاوی نشیب و فراز سے مقابلہ کرتے ہوئے بے پناہ رکھ رکھاؤ سے گزارے ہیں۔ ابھی تو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں کہ اپنی عزت اور آن سے کھیل جائیں اور نئے سرے سے اپنی عزت کو بحال کرنے پر محنت شروع کریں۔ بس چپکے سے صبر کا دامن ہاتھ میں تھامے بیٹے کے گھر سے مر کر رخصت ہونے میں ہی عافیت سمجھیں۔ وقت کا یہی تقاضا ہے۔“ وہ شدتِ بخار میں قوتِ فہم کو بروئے کار لا کر بولیں۔

”تم نے پھر ہتھیار ڈال دیے۔“ پاپا نے خشمگیں لہجے میں کہا۔

”ہمیشہ سے میری شخصیت کسی ہتھیار سے لیس نہیں تھی۔ میرے والدین نے مجھے بے دست و پا آپ کے حوالے کیا تھا، بغیر کسی ہتھیار کے۔“ آج پہلی دفعہ ان کے لبوں پر عورت ہونے کا شکوہ تھا۔ پاپا جو چند لمحے پیشتر انہیں تنبیہی انداز میں دیکھ رہے تھے یکدم چونک اٹھے۔ اس ایک جملے میں کیا کچھ پنہاں نہ تھا۔ حالتِ گریہ میں وہ اپنی کم مائیگی کے احساس کو پوشیدہ نہ رکھ سکیں۔ اک لمبے توقف کے بعد پاپا اٹھے اور انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

چند دن بعد بخار تو اتر گیا مگر اس کے اثرات نقاہت اور کمزوری کی صورت میں سامنے آگئے۔ پاپا حسبِ معمول سحر کی کرن پھوٹتے ہی لان میں چلے جاتے اور کھرپی سے گلاب کے پودوں کی گوڈی کرنے لگتے۔ اماں بھی مسلسل لیٹنے سے اکتا چکی تھیں۔ وہ اٹھیں، بہو اور بچوں کے بکھرے ہوئے

کمروں کی تمام چیزیں سلیقے قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھیں۔ الماریوں کو درست کیا، چادریں اور تولیے بدلے۔ ماسی کے ساتھ مل کر خوب صفائی کرائی۔ کمروں میں موتیے کی کلیاں اور گلاب کے پھول سجائے۔ مرتبان میں آم کا اچار ڈالا اور اس کے منہ کو ململ کے کپڑے سے باندھ کر دھوپ میں رکھا۔ پوتی کے لیے لان کے خوب صورت فراک کاٹ کر رکھے اور ہر دن ایک فراک سل کر تیار ہونے لگا۔ ایک مہینے کی طوالت کا احساس سالوں کو چھونے لگا۔ آخر تنہائی اور خاموشی کی جگہ معصوم قہقہوں اور شرارتوں نے لے لی۔ بہو کی متلون مزاجی کو وہ خوب پہچانتی تھیں جس نے وہاں سے ایک دفعہ بھی فون کر کے ان کی طبیعت کی خبر گیری نہ کی تھی۔ اب بار بار اظہارِ فکرمندی سے اپنی شرمندگی کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خالص اور کھرے فرشتے دادی کی گود سے نکلنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور بار بار دہرائی جانے والی یہ بات دادا اور دادی کے تقویتِ دل کا باعث بنی ہوئی تھی کہ اگلی دفعہ ہمارے ساتھ دادا اور دادی جان بھی چلیں گے۔ ان کے بغیر ہمیں مزہ نہیں آتا۔

☆☆☆

”پاپا مجھے گھر خالی کرنے کا نوٹس آگیا ہے۔“ عثمان نے فکرمندی سے کہا۔

”کیوں، کیا وجہ ہوگئی۔“ وہ حیرت و تجسس سے بولے۔

”اس گھر کے وارثین بیٹے باپ کی حیات میں اسے بیچ کر اپنا اپنا حصہ وصول کرنا چاہتے ہیں۔ آخر انہوں نے بھی اپنی زندگی کی گاڑی تو چلانی ہے نا۔“ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔

”ان کے باپ کا کوئی اور ذریعۂ معاش ہے کیا؟“ پاپا کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی تھی۔

”نہیں پاپا، وہ خود ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہ کر اس کے کرائے اور اپنی پنشن سے گزر اوقات کر رہے ہیں۔ بچوں کو بھی تو پیسے کی ضرورت ہوتی ہے نا۔“

”تو کیا بعد میں میجر صاحب اولاد کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے۔“ پاپا تذبذب میں پڑ گئے۔

”تو پاپا اس میں قباحت ہی کیا ہے؟ بوقتِ ضرورت والدین کام نہ آئیں تو ان کا فائدہ......“ عثمان کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت کو پاپا کی عقابی نظروں نے بھانپ لیا اور وہ گفتگو کے لب لباب کی تہ تک پہنچ گئے۔

”بیٹے میں اک بات بتاؤں ذرا غور سے سننا۔ جن والدین کا ہاتھ ہمیشہ دینے والا ہوتا ہے نا ان کی غیرت وانا بہت وسیع ہوتی ہے جو اولاد کی محتاجی کو قبول کرنے سے مجروح ہو جاتی ہے۔ دیکھو ہم تمہارے پاس رہائش پذیر ہیں مگر فائنینشلی ہم کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم اپنی عمر کے اس دور کے طریقے اور لحاظ سے اپنی اولاد کے لیے باعثِ رحمت و جاں فشاں ہیں۔ یہ سکیورٹی عمر کے زوال میں آبِ حیات کا کام دیتی ہے۔ تم مجھے میجر صاحب سے ملوا دو شاید انہیں کچھ سمجھا سکوں۔ ورنہ ذلیل و خوار ہو جائیں گے اولاد کے ہاتھوں۔“ وہ بے اختیاری میں بول رہے تھے۔

”پاپا ہمیں دوسروں کے نجی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، ہم اپنے بکھیڑے سلجھا لیں وہی کافی ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹا..... دوسرا گھر تلاش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولے۔

”پاپا کیوں نہ ہم یہ گھر خرید لیں؟ یہ روز روز کی پیکنگ اور شفٹنگ سے جان چھوٹ جائے گی۔ میرے اور مومنہ کے پاس یہ سب کچھ کرنے کا وقت نہیں ہے اور آپ دونوں کے پاس وقت بے حساب ہے مگر طاقت نہیں ہے۔“ وہ نہایت شریں لہجے میں بولا۔

”درست! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر خرید سکتے ہو تو یہ نیک اور خوش آئند کام ابھی سرانجام دو۔“ پاپا نے نارمل لہجے میں کہا۔

"آپ کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"بیٹے میری معمولی اور ارزاں سی جائداد تمہارے مسئلے کا حل نہیں۔ یہ کروڑوں کی جائداد ہے اگر خریدنے کی استطاعت نہیں ہے تو بھول جاؤ.... خوامخواہ اپنی زندگی کو مشکل میں مت ڈالو۔ ابھی تو تمہاری زندگی کی شروعات ہے۔ اتنا بڑا گھر تو کہیں ریٹائرمنٹ کے بعد ہی نصیب میں ہوتا ہے۔ ابھی تم پر بچوں کی بے شمار ذمّے داریاں ہیں۔ پہلے ان سے فارغ ہو جاؤ۔ اس معاملے میں تعجیل کی گنجائش نہیں ہے۔ میرا تو یہ مشورہ ہے اپنی اماں سے بھی بات کرلو۔ وہ بھی تو بہت زیرک خاتون ہیں۔" پاپا نے لرزیدہ آواز میں ٹالنے کی کوشش کی۔ عثمان اس سے پہلے کہ تاؤ میں آجاتا، مروتاً مسکرایا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ پاپا گہری سوچ میں ہچکولے کھانے لگے۔ اعصاب مشتعل ہو کر وسوسوں میں گھر گئے۔ بڑھاپے کی کمزوری اور بے بسی میں دل ڈوبنے لگا اور وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔" اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چونک کر پوچھا۔

"ٹھیک ہے... فرحت بیگم! مجھے اپنا مستقبل نہایت تاریک نظر آرہا ہے۔" لہجے میں خوف نمایاں تھا۔

"کیا ہوا؟ کچھ بتائیں تو، اُدھر عثمان اور مومنہ ایک دوسرے سے نہ جانے کس بات پر جھگڑ رہے ہیں، اِدھر آپ کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ہے۔ اِک میں ہی سخت جان ہوں اس گھر میں۔" وہ تذبذب کے عالم میں بولیں۔

"یہ تمہارا حریص اور لالچی بیٹا میرے منہ سے نوالہ چھیننے آیا تھا۔ خودغرضی کی انتہا ہے۔" وہ مبہم انداز میں بولے۔

"ایسا کیا ہو گیا ہے کہ میرے بچے کو کوسنے لگے ہیں۔" اماں برامان گئیں۔

"تمہارا یہ بے جا لاڈ پیار اور ہر طرح کی غیر ضروری اور نامناسب خدمات ہمیں ذلیل کر کے چھوڑیں گی۔ قابلِ احترام ماں اور دہشت انگیز ساس کے روپ کو اپنالو۔ اپنی عزت اور خدمت کروانا سیکھو، جو میری ماں کا وتیرہ تھا وہ اپنالو، فائدے میں رہو گی۔" وہ خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے۔ قصوروار بیوی کو ٹھہرانے لگے۔

"آپ کی ٹریننگ میں میرے لیے ہر تھوخیرے کی خدمت گزاری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب خدمت گزار اور صابر شاکر ہونا میری فطرت کا حصہ بن چکا ہے۔ کیا آپ نے کبھی مجھے خدمت کروانے کا درس دیا ہے جو آج مجھے بہو اور بیٹے سے خدمت کروانے کی تلقین کر رہے ہیں۔ میری ذہنیت میں صنفِ نازک کے احساسِ حاکمیت اور ملکیت کی جگہ غلامانہ خیالات نے لے لی کیونکہ میں جانتی تھی کہ میری ازدواجی زندگی کی کامیابی اور فتح مندی فقط ہر ایک کی نوکری چاکری اور جی حضوری میں ہے، سو میں نے وہ کیا جس کا سلسلہ ابھی منقطع نہیں ہوا اور مرتے دم تک بتدریج جاری رہے گا۔ یہ میری تقدیر ہے یا نہتے ہونے کا عذاب عظیم ہے۔" لہجے میں جہاں بھر کا دکھ سمٹ آیا تھا۔

"کاش تم نے کبھی اعتراض کیا ہوتا، کاش تم نے اپنے حقوق حاصل کرنے اور میری بے انصافیوں کے خلاف آواز بلند کی ہوتی۔ خاندان بھر میں تمہارے حسنِ عمل اور بلند کرداری پر میں تمہارا دامن تحسین و آفرین کی دولت سے بھر دیتا مگر میں ناسمجھی اور نادانی کی وجہ سے تمہارے ہر احسان کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا رہا اور تم بے عذر اور بے ضرر اپنے کام میں جتی رہیں مگر کوئی قدر دان نہ ہوا۔ میں تمہارا گناہگار اور قصوروار ہوں۔ آج تم بیٹے کے گھر کی ملازمہ بن کر زندگی گزار رہی ہو۔ زندگی بھر تم اپنی عزت کے بچاؤ کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دیتی رہیں۔ میری زبان کو تمہارے صبر کا قفل لگا رہا ورنہ تم بہت رسوا ہو جاتیں میرے ہاتھوں

نہیں اس کا علم تھا۔ فرحت بیگم تمہاری ابر آلود زندگی کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ آج کے بعد تم سب سے خدمت کراؤ گی حتیٰ کے مجھ سے بھی۔" وہ جذباتی ہو گئے تھے۔

"آج سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہونے والا ہے۔" وہ مسکرادیں۔ "بیٹے نے کیا کہہ دیا ہے۔"

"میری خودمختاری کو نیلام کر کے یہ بنگلہ خریدنا چاہتا ہے، ظالم کہیں کا۔" وہ دکھ کو اپنے من میں سموتے ہوئے بولے۔ "کل اس کی بیوی ہمیں دھکے دے کر باہر نکالنے سے باز نہیں آئے گی۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ البتہ تمہاری بہت چہیتی ہے۔ یہ بتاؤ اس نے کبھی آج تک تمہیں پانی کا گھونٹ بھی پلایا ہو۔"

"اس کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ آپ خوامخواہ عوتوں کی سی فہمائشی باتیں نہ کریں۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے۔ اب تو میرے آرام کے دن آئے ہیں۔ بچے اسکول جانے لگے ہیں۔ نوکروں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ لے دے کے اب صرف آپ کے کام ہیں جنہیں میں ہمیشہ کی طرح بہت شوق سے کرتی ہوں۔ اپنے دل کو ٹھیک کریں۔ ہمارے بیٹے اور بہو ہرگز نافرمان نہیں ہیں۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولیں۔

"بس ان کے عیبوں پر پردہ ڈالنا کوئی تم سے سیکھے۔ اپنے ساتھ مجھے نہ مروا دینا۔ تم تو فطرتاً بہت کچھ جھیل جاؤ گی مگر میں زندہ درگور ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنے بیٹوں سے خودغرضی اور خودپرستی کی بو آتی ہے فرحت بیگم میری بات پر یقین کرلو، ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم اولاد کے محتاج نہیں ہیں۔ بہترین اور انمول فیصلہ کرنے میں میری رہنمائی کرو۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"شک و شبہات انسان کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ ایسی باتیں سوچنے کی ہماری عمر نہیں رہی۔ اپنے بیٹے کے اسٹیٹس کو انجوائے کریں۔ بس اب ہمارے لیے یہ ضروری ہے اگر ہمارے بچے کو یہ گھر خریدنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو آپ اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ ہمارا جینا مرنا اسی بچے کے ساتھ جو ہے۔" ماں نے اک دھماکا خیز بات کہہ دی تھی۔ پاپا اک جھٹکے سے بیٹھے اور بیوی کا منہ تکنے لگے۔

☆☆☆

رات کافی بیت گئی تھی۔ عثمان اور مومنہ ابھی تک واپس گھر نہیں پلٹے تھے۔ اماں کو فکر لاحق ہو چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بیٹے اور بہو کے کمرے میں آگئیں۔ عالمِ تذبذب میں کمرے سے ہی بہو کو فون کیا۔ جواب ندارد، پریشانی کا پیمانہ وسیع ہو گیا۔

"کہاں چلے گئے یہ بچے۔ اتنی رات گئے تک تو کبھی گھر سے باہر نہیں رہتے۔ خدا خیر کرے۔" وہ خود کلامی کر رہی تھیں کہ دروازہ کھلا۔ عثمان اور مومنہ کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر انہوں نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

"ماما آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟" مومنہ نے تیزی سے پوچھا۔ "ابھی تک سوئی نہیں۔"

"بیٹا پریشانی میں یہاں نکل آئی ہوں۔ آپ دونوں کو علم ہونا چاہیے کہ.... یہاں کے مخدوش حالات کی وجہ سے تم لوگوں کا رات بھر گھر سے باہر رہنا میرے لیے کوفت و بے کلی کا سبب بن جاتا ہے مجھے فون ہی کر دیا ہوتا۔" لہجے میں اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔

"ماما آپ کو علم تو ہے کہ ہم ڈنر پر گئے تھے۔ دوستوں کی محفل میں گپ شپ میں دیر ہو جاتی ہے انوکھی یا غیر مناسب بات نہیں۔ ہم بچے تو نہیں جو آپ یوں پریشان ہو رہی ہیں۔" عثمان کے لہجے کی سختی کو محسوس کرتے ہوئے اماں مسکرا کر بولیں۔

"میرے لیے چھوٹے اور معصوم بچے ہی تو ہو تم۔" اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر وہ باہر نکلیں۔

"یہ ہے ہماری زندگی، نفرت ہے مجھے ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

پابندیوں اور رکھوالیوں سے۔'' مومنہ تنفر سے بولی۔

''آہستہ بولو یار، اماں نے سن لیا تو یہ گھر خریدنے کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔ پاپا تو ہم سے آشنائی، دوستی اور یگانت کے باوجود قابو میں آنے والے نہیں ہیں۔ یہ اماں ہی تو ہیں جن کی محبت وشفقت کے پل سے ہماری پاپا تک رسائی ہو سکتی ہے۔'' وہ رازداری سے بولا۔

''اس میں احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں، آخر جائداد میں آپ کا اپنا حصہ بنتا ہے۔ جس کے آپ شرعی طور پر حقدار ہیں۔'' وہ نہایت بے نیازی سے بولی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر انہیں کون سمجھائے۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''ان کی ضروریاتِ زندگی کے تمام اخراجات پہلے بھی تو ہم نے اٹھا رکھے ہیں۔ آئندہ بھی یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ انہیں ہم پر بھروسا رکھنا چاہیے۔'' مومنہ نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا مجال ہے کہ کبھی ایک پائی ہم پر لگائی ہو۔''

''خاندان بھر میں میل ملاپ، لینا دینا سب کچھ پاپا نے اپنے ذمے لے رکھا ہے پھر بچوں کے تمام اخراجات نہایت فراغ دلی سے ادا کرتے ہیں۔ آج تک انہوں نے اپنے اور اماں کے لیے کسی چیز کی ہم سے فرمائش نہیں کی۔ ہاں کچن میں انہوں نے کبھی اپنا شیئر نہیں ڈالا۔'' عثمان نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''ہم سے آگے ہو گئے یہ دور پار کے رشتے دار، انہیں کون سمجھائے کہ یہ گھر ہمارے لیے کس قدر ضروری اور اہم ہے۔ ساری زندگی اپنی جھوٹی شان وشوکت کے جھنڈے گاڑتے رہے۔ خدا کے لیے اس نفسا نفسی کے عالم میں خود کو کیوں نہیں پہچانتے۔ آج رشتے داروں سے ذرا ادھار مانگ کر تو دیکھیں، تمام نشہ ہرن ہو جائے گا۔'' وہ حقارت سے بولے جا رہی تھی۔

''ان کا اپنا رکھ رکھاؤ اور دنیا داری ہے اپنے بہن بھائیوں سے۔ میں اس کا اعتراض نہیں کر سکتا۔ ہاں مدد کے لیے پریشرائز ضرور کروں گا۔'' وہ اسے امید کی دنیا میں لے گیا۔

''بس مانی یاد رکھیں کہ مجھے ہر صورت یہ گھر چاہیے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

''کیوں فکر کرتی ہو؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تم ذرا ان کی خدمت میں ایک پاؤں پر کھڑی ہو کر انہیں اپنا بنا لو۔ والدین محبت اور شفقت کے ہاتھوں بے حد مجبور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ اولاد کی بے پناہ توجہ اور پیار میں زہر کا پیالہ بھی پی لینا ان کے لیے معمولی بات ہے مگر یہ یاد رکھنا تم زندگی بھر مجھے اور میرے والدین کو شکایت کا موقع نہیں دو گی۔ تمہاری خوشی کی خاطر میں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔ ورنہ زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد گھر بھی اپنا ہو جاتا مگر تم بضد ہو، کیا کروں؟'' وہ ابھی بھی جز بز ہی تھا۔ ''ورنہ میں پاپا پر اتنا بڑا بوجھ ہرگز نہیں ڈالتا۔ میں ان کے دل کا حال بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔ اس دن سے وہ بالکل خاموش ہیں۔ لان میں کام کرنے کا شوق بھی رفع دفع ہو گیا ہے۔ نماز کے لیے مسجد میں جانے کا ان کا دل نہیں چاہتا۔ بچوں کو پارک لے جانا یکسر ہی ختم ہو گیا ہے۔ مجھے ان کی صحت کی فکر ہو گئی ہے مومنہ۔ ذرا گہرائی سے سوچو کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ان کی زندگی میں جائداد کے حصے بخرے کی فرمائش نہ کریں، میں یہ سوچ کر اندر ہی اندر خفیف اور بے سکون ہو جاتا ہوں۔'' وہ پُر آشوب لہجے میں بول رہا تھا۔

''میں آپ کو کتنی بار ہر اونچ نیچ کے بارے میں سمجھا چکی ہوں مگر ہر بار آپ کی گفتگو کا اختتام اسی جملے پر ہوتا ہے۔ ہم ان پر کون سے مظالم ڈھانے پر تل گئے ہیں۔ اپنا حصہ ہی تو مانگا ہے۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''مومنہ انہوں نے اپنی عمر بھر کی دیانت اور

راست بازی کی کمائی دونوں بیٹوں پر صرف کر دی۔ ہمیں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیج دیا۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ بچی ہوئی تھوڑی سی پونجی پر ان کا کوئی حق نہیں۔ آخر وہ اولاد کے کیوں محتاج ہو جائیں۔ آج ہم اپنا حصہ بٹورنے کو سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ کل نعمان روبرو آ لگے گا۔ وہ ہماری اس خود غرضی سے بیمار پڑ جائیں گے۔ کیا ان کی آہوں کی بنیاد پر تعمیر شدہ یہ بنگلا ہمیں خوشیاں فراہم کر سکے گا؟ سوچ لو، ہم بھی اولاد والے ہیں فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' عثمان سب کچھ سوچ کر ہول جاتا۔ اگر خوش گفتاری سے سمجھاتا تو وہ روز روز کی چپقلش سے بچ جاتا۔ ورنہ گھر کی فضا غیر معتدل ہونے میں فقط ایک لفظ ہی بہت بھاری ہو جاتا تھا۔

''فیصلہ میں نے کر لیا ہے جان......'' وہ نہایت خوداعتمادی سے بولی۔ وہ دل ہی دل میں ملامت کرتا کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

آخر وہی ہوا جس کا پاپا کو اندیشہ تھا۔ اماں اٹھتے بیٹھتے انہیں سمجھانے لگیں۔ ''ہمارے بعد اس جائداد کے وارث ہمارے بچے ہی تو ہیں، کیا یہ درست نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں ان کو ہنستا بستا دیکھ لیں۔ آپ کا ان کے ساتھ اٹھایا ہوا یہ قدم بے پناہ خوشیوں کا حامل ہو گا۔ مگر پاپا نے ایک نہیں سنی۔ ٹینشن گھر کے کونے کونے سے ابلنے لگی۔ مومنہ دونوں کے ساتھ اِک پرانے فالتو ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کے مانند سلوک کرنے لگی۔ اپنے والدین سے گھر کے مسائل پر موشگافیاں اور اپنے دوست احباب سے الٹے سیدھے مشورے لے کر ان بزرگوں پر آزمائے جانے لگے۔ انسان بھی کس قدر حریص اور بے فیض ہے کہ دوسروں کے احسانات کو فراموش کرنے میں پل بھر نہیں لگاتا۔ اخلاق وتمدن کو الوداع کہنے میں اسے دیر نہیں لگتی مگر پھر بھی وہ اپنے ٹھوس دلائل دے کر خود کو راہِ راست پر گامزن رہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں بزرگوں سے کیا مقابلہ، ان کے لاغر اور کمزور وجود میں گردش کرتے ہوئے خون کے آخری قطرے اولاد کی زندگی میں کیسے جلترنگ بکھیر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خون سے سینچ کر ان کو مضبوط و قوی بنا دیا پھر بھی لاتعلقی اور خالی از جذبات ہو کر کن بھول بھلیوں کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آخر نعمان کی طرف سے بھی اس خواہش کا اظہار ان کو رلا گیا۔ پاپا کو تنہا دیکھ کر اماں معجزانہ طور پر ان کی طرف پلٹ گئیں۔ انہوں نے اپنے گھر واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ جہاں ان کی اپنی حکومت اور اپنی ہی رعایا ہو گی۔ تنہائی اور بے بسی کا نام ونشان نہ ہو گا۔ وہی پرانی دوستیاں، محلے داری اور کڑوی میٹھی رشتے داریاں ان کے دلوں کو بہلانے کو کافی ہوں گی۔ ان کے اس آخری اور حتمی فیصلے کا مدعا سمجھ سے بالاتر ہرگز نہیں تھا۔ یہ دھمکی یا ڈراوا نہ تھا۔ حقیقت پسندی پر مبنی بزرگوں نے اپنے مفادات کے پیشِ نظر بہت عقلمندانہ قدم اٹھانے کا جائز تہیہ کیا تھا مگر گھر بھر میں دکھ کی لہر دوڑ گئی۔

میاں بیوی کی لڑائیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آخر کار مومنہ نے گھٹنے ٹیک کر ان سے معافی مانگ لی، ماحول کی بدمزگی میں کمی آنے لگی اور گھر کا سامان پیک ہونے لگا۔ تین کلومیٹر کے فاصلے پر مومنہ کو ایک گھر پسند آ گیا۔ پاپا اور اماں نے بھی گھر اوکے کر دیا لیکن پاپا رات بھر سو نہ سکے۔ طبیعت میں ایسا خفقان تھا کہ بستر پر لیٹنا محال ہو گیا۔ رات کی خاموشی اور تاریکی میں وہ لاؤنج میں سامان کے ڈھیر میں بیٹھے سوچ رہے تھے۔ بیوی کی کچھ باتیں اپیل کر رہی تھیں اسی اضطرابی کیفیت میں صبح ہو گئی۔ بڑھاپے کی نقاہت اور کمزوری نے ایسا حملہ کیا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل نہیں رہے۔ اماں نے مارے گھبراہٹ کے شور وغل کر دیا کہ پاپا کہاں چلے گئے۔ عثمان نے ہر جگہ فون کرنے شروع کر دیے۔ مومنہ خفگی اور عالمِ ندامت میں اماں کو جھوٹی سچی تسلیاں دینے لگی۔ بچے دادا کے نعرے لگانے لگے۔ مگر دادا ضعیف ونحیف

WWW.PAKSOCIETY.COM

حالت میں لیٹے تمام آہ وبکا سن کر بھی معمولی سی آواز نکال کر انہیں تسلی دینے سے عاجز تھے کہ یکدم پوتے نے انہیں ڈھونڈ لیا اور گھر بھر میں تشکر آمیز صدائیں گونج اٹھیں۔ انہیں فوراً اسپتال لے گئے اور دو دن کے لیے عثمان کی موجودگی میں وہاں ایڈمٹ رہے۔ مومنہ بھی صبح شام ان کے لیے سوپ اور فروٹ وغیرہ فراہم کرتی رہی۔ جب پاپا گھر آئے تو بیٹے اور بہو نے ان کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا لیا کہ مبادا وہ ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ اس پرانے برگد کے سائے تلے کس قدر بے فکری اور تسکین و تشفی ہے۔ ہر ساعت یہ احساس تدریج کے ساتھ بڑھتا جارہا تھا۔ علاج معالجے کے باوجود ان کی وضع قطع پر مریضانہ اور کم ہمتی کی چھاپ لگ گئی تھی۔ عثمان انہیں روزانہ چہل قدمی کے لیے لے جاتا۔ دل ہی دل میں اپنی کوتاہ اندیشی کو کوستے ہوئے باپ سے اپنی سرخروئی کی دعا، معافی و درگزر کی التجا کرتا رہتا۔ اس ناگہانی انقلاب کا انکشاف پاپا کے لیے بے حد ثبات اور محفوظ تھا۔ ان کے دلوں میں جو فرق اور کدورت آگئی تھی وہ سب عارضی پن نکلا۔ ابھی تک سب اسی بکھرے ہوئے سامان کے ساتھ اسی گھر میں براجمان تھے۔

پاپا کی طبیعت سنبھلنے کے سبھی منتظر تھے۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے مراق سے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے عثمان سے کہہ کر میجر صاحب کو بلا لیا۔ میجر صاحب اپنی چال ڈھال سے اہلِ زبان معلوم ہوتے تھے۔ صاف ستھرا اجلا روئی سا چمکتا ہوا کڑھائی والا کرتہ، کھلے پائنچوں والا لٹھے کا اکڑا ہوا پاجامہ اور سلیم شاہی کھسہ پہنے وارد ہوئے۔ قدو قامت نہایت مناسب اور نحیف الجثہ انسان سانولے رنگ میں بھی خاصی شان وشوکت اور جلال ودبدبے کا پیکر لگ رہے تھے۔ آخر کار اس بنگلے کا سودا نہایت راز داری اور پردہ داری میں اختتام پذیر ہوا اور اگلے ایک مہینے میں پاپا نے اپنی جائداد بیچ کر یہ بنگلا خرید کر اپنی بیگم کے نام کردیا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب ہوائیں رخ بدل کر فضا کو معطر کررہی تھیں، پاپا نے خوشی سے مغلوب ہو کر کہا۔

''ماں باپ نے تمہیں میرے حوالے کردیا بغیر کسی ہتھیار کے۔ تم اپنی عزتِ نفس، نسوانی وقار و تحریم کی نگہداشت نہتے ہاتھ کیسے کرسکتی تھیں۔ جوانی تو جیسے تیسے بیت گئی۔ تمہارے بڑھاپے کو سیکیور کرکے میں... سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔ میرے تجربات کے دائرے میں اولاد کے تیور بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہمارے بچے تو بے حد فرمانبردار سہی مگر ہے اسی روئے زمین پر رہنے والی حریص اور ابن الوقت مخلوق، ذرا مضبوطی کا دامن تھامے رکھنا انہیں کبھی فرشتہ تصور کرکے بے سروسامان مت ہوجانا۔ بالائی منزل بدستور رینٹ پر رہے گی پہلے اس کا رینٹ میجر صاحب وصول کرتے تھے۔ آج سے وہ پیسہ تمہارے اکاؤنٹ میں جائے گا۔ اوہ، میں نے بینک میں تمہارا اکاؤنٹ بھی تو کھلوانا ہے نا۔ ہاں تو ایک دکان میں نے بچالی ہے اس کا کرایہ اور پنشن میرے اکاؤنٹ میں جائے گی۔ مجھے امید ہے اس فیصلے میں ہم سب کا مفاد ہے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے، مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے تھا۔ مجھے زندگی بھر آپ کی محبت، توجہ اور حوصلہ افزائی کی تشنگی نے نڈھال رکھا ہے۔ مجھے آپ کی طرف سے ملنے والی بے پروائی اور بے نیازی نے تڑپایا ہے۔ رزق تو نیلی چھت والے نے ایک ناتواں کیڑے کے مقدر میں بھی لکھ دیا ہے۔ عورت شوہر کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کو فقط اپنے نان نفقے کے لیے برداشت نہیں کرتی۔ اس معاشرے میں اپنی عزت برقرار رکھنے کی خاطر اپنا منہ سی لیتی ہے اور راضی بہ رضا ہو کر اپنی زندگی کی تمام تر تلخیوں اور نفرتوں کو دامن میں سمونے لگتی ہے۔ کسی کو دل پر بیت جانے والے خدشات کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں ہونے دیتی کیونکہ اسی میں اس کی عزتِ نفس اور اس کی ذات کا وقار ہے۔'' وہ سنجیدہ تھیں۔

''میں تمہارے ہر لفظ کی تائید کرتا ہوں۔'' پاپا

نے ممنونیت سے کہا اور انہیں چھیڑتے ہوئے گویا ہوئے، آج سے چھوٹوں سے خدمت کروانے کی ٹریننگ کا پہلا سبق شروع ہوچکا ہے۔ ذرا غور کرو چھوٹوں سے نہ کہ بڑوں سے۔'' انہوں نے اشارہ اپنی طرف کیا اور ایک طویل قہقہہ فضا میں تحلیل ہوگیا۔

☆☆☆

''اماں جان!'' عثمان ماں کے کمرے میں داخل ہوا ''میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔''

''جی بیٹا آؤ بیٹھو۔'' اماں نے تسبیح کو ایک طرف رکھ کر بیٹے کو اپنے پاس بٹھا کر پچکارا۔ ''اماں سے بات کرنے کے لیے کسی وقت یا موقع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بولو میرے بچے کیا بات ہے؟''

''آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی۔'' آپ بے حد قابلِ فہم ماں اور دور اندیش ساس ہیں۔ میری مجبوری اور مومنہ کی ضرورت کو سمجھنے میں آپ کو دیر نہیں لگے گی۔'' وہ بے حد ملائمت سے بولا۔

''کون سی مجبوری، کیسی ضرورت؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔'' اماں حیرت و اشتیاق سے بولیں۔

''مومنہ کو اس گھر کا سکون، تحفظ اور عزت راس نہیں آئی۔ وہ الگ گھر میں رہنے کی خواہشمند ہے۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''کیوں بیٹا! اسے یہاں کس چیز کی کمی ہے؟'' وہ اچنبھے سے بولیں۔

''آپ سے اسے وہ دولت ملی جو عموماً لڑکیوں کے نصیب میں شاذ و نادر ہی لکھی گئی ہو۔ میں تمام سچویشن کو سمجھتا ہوں۔'' لہجے میں شرمندگی عود کر آئی۔

''تو پھر کیا میرا رویّہ قابلِ ملامت ہے یا پاپا سے کوئی شکایت ہے۔'' حیرت بدستور قائم تھی۔

''ایسا ہرگز نہیں، اسے آپ دونوں سے پیار بھی ہے، وہ آپ کی ہمدرد بھی ہے، آپ کی مدح سرائی میں کیا کچھ نہیں کہتی۔ پاپا سے ویسے ہی اس کی جان جاتی ہے۔ اس میں بھی احترام کا پہلو سامنے آتا ہے۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''تو پھر کیا مسئلہ درپیش ہے۔ کھل کر بتاؤ، پہیلیاں مت بوجھواؤ بیٹا۔'' وہ جز بز ہوئیں۔

''مومنہ کو فقط اور فقط پرائیوسی چاہیے۔'' وہ بہ مشکل بول سکا۔

''پرائیوسی...... یہاں اس کی پرائیوسی میں کون مخل ہو رہا ہے بیٹا۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ''میرا ذہن ماؤف ہو رہا ہے۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں اماں، سیدھی سی بات ہے، آپ کو اپنی ساس کی سخت مزاجی کی وجہ سے آزادی اور پرائیوسی نصیب نہیں ہوئی، نہ ہی پاپا تک آپ کی شنوائی تھی مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آپ کی نرم مزاجی اور بے لوث خدمت سونے کی حسین زنجیر بن کر اس کے قدموں کو جکڑے ہوئے عمر بھر کی قید کی فیلنگ دے رہی ہے۔ اسے اپنی مرضی اور پسندیدگی سے سانس لینے کی جو گھٹن محسوس ہو رہی ہے وہ اس سے اب دس سال بعد کنارہ کشی چاہتی ہے۔ آج اس نے بیتے ہوئے سالوں کی ہر پابندی اور کمی کو میرے ساتھ شیئر کیا ہے۔ اس کی تڑپ کافی حد تک درست ہے۔ آپ خود کو بہو کے سانچے میں ڈال کر سوچیں۔ کل کی اور آج کی بہو کے مزاج اور سوچ میں لامتناعی فرق اور فاصلے ہیں۔ آپ کو کچھ اندازہ نہ ہوگا۔ آپ اس کی ضروریاتِ زندگی کو محسوس کرنے کی سمجھ سے نابلد ہیں اماں۔'' وہ اب بے حد سنجیدگی اور اعتماد سے بھرپور تھا۔

''بیٹے مجھے اس کے الگ ہونے پر رتی بھر اعتراض نہیں۔ حیران و پریشان ہوں کہ اسے تو میری طرف سے ہر طرح کی آزادی ہے، اس کی سیر و تفریح، شاپنگ، سہیلیوں سے میل ملاپ، تمہارے ساتھ بنائے جانے والے پروگرام میں کبھی کسی قسم کی دخل اندازی نہیں۔ میکے آنا جانا اور اس کے قیام پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ حتیٰ کہ اس گھر میں کھانا بھی اس کی پسند پر پکواتی ہوں۔ جبکہ میں نے اپنے زمانے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایسا سوچنے کی کوشش کو بھی صریحاً غلط سمجھا۔ صبح کی اذان کے ساتھ ہی میں تمہاری دادی اماں کو چائے پیش کیا کرتی تھی کیونکہ وہ تہجد گزار خاتون تھیں، یہ روز کا معمول تھا۔ چاہے بچے کے ساتھ تمام رات میں نے آنکھوں میں ہی کیوں نہ بتادی ہو۔ میری اس ڈیوٹی میں ہلکی سی لچک نہ ہوتی تھی۔ روتے بچوں کے ساتھ دو نندوں کے یونیفارم تیار کر کے ان کے لنچ بکس تیار کرنا، تمہارے پاپا کو آفس رخصت کرنے تک میں اس قدر تھک جاتی جیسے میلوں کی مسافت طے کی ہو۔ پھر اپنے بچوں اور گھر کا ہر نوعیت کا کام میرا.... ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا۔ دن میں کمر سیدھی کرنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ اگر گرمیوں کی لمبی دوپہر میں ذرا ستانے کو لیٹ جاتی تو ایسے طعنے و تشنے سننے کو ملتے جیسے مجھ سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہو گیا ہو۔ بعض اوقات بیٹھے بیٹھے ہی اونگھ جاتی تھی مگر مومنہ کے ساتھ یہ سب کبھی نہیں ہوا۔ میرے اڑوس پڑوس جانے اور کوئی سہیلی بنانے پر جو پابندی عائد کر دی گئی تھی اس کی ہلکی سی جھلک بھی مومنہ کی زندگی میں نہیں آئی۔ جبکہ میری نندوں کے لیے تمام اصول وقانون اس کے برعکس تھے۔ انہیں ہر طرح کی چھوٹ تھی۔ عید میکے میں گزارنی والی بہوؤں پر تھوکا جاتا جبکہ اپنی دونوں بیٹیاں ہر عید یہاں آ کر گزارتیں۔ میری بھابیاں بھی میکے رخصت ہو جاتیں اور میرے والدین گھر میں اکیلے پڑے رہتے مگر میں کچھ کہنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ میں اپنے سسر کی بھانجی ہونے کے ناتے ساس کے مخالف گروپ سے تعلق رکھتی تھی۔ سسر نے زبردستی اور اپنی من مانی میں مجھ سے رشتہ تو جوڑ لیا تھا مگر شادی کے بعد وہ پرانے رشتے سے دستبردار ہو کر نئے رشتے کو اپنا کر بیوی کو خوش کرنے کے سامان مہیا کرتے رہتے تھے۔ میں نے جو دیکھا، جو پایا اور جو کچھ سہا۔ اس کے اثرات میں نے اپنی شخصیت سے کھرچ کر نکال دیے اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اس معاشرے کے رسم ورواج نے جو سلوک اور روش میرے ساتھ روا رکھی ہے وہ ہر دور میں نا قابلِ قبول ہے۔ میں نے کوشش کی میرے گھر کو چار چاند لگانے والی بچیوں پر میری حسرتوں اور دکھوں کی ہلکی سی تپش و حدت نہ پڑنے پائے۔ اس خواہش کے پیشِ نظر میں صرف ماں کے رول میں ہی بہو کو بیٹی تصور کر کے اپنا تمام تر پیار اور لاڈ اس کے دامن میں ڈالتی رہی۔ میں نے تو اسے بیٹی مان لیا تھا کیونکہ میری اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی مگر اس نے مجھے ماں ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کی زندگی میں ماں کا رشتہ پہلے دن سے موجود ہے۔ بیٹا غلطی پر میں تھی۔ مومنہ بالکل راہِ راست پر ہے اب وہ مجھ سے کسی قسم کی مدد لے کر احسان مند ہونا نہیں چاہتی۔ وہ کالج جاتی ہے تو اپنا کمرا لاک کر کے جاتی ہے۔ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے انکار کر دیتی ہے۔ بچوں کو مجھ سے دور رکھنے کی کوشش میں ہر وقت ان سے چپکی رہتی ہے۔ میں یہ سب کچھ محسوس کرنے کے باوجود چپ رہی۔'' وہ رو پڑیں...... ''کیا میرے پیار، میری نرمی، عاجزی وانکساری کا یہ صلہ تھا۔ جب میں اپنی محرومیوں کے کرب کی جان لیوا گرمائش کو اپنے خون کو محسوس کرانے میں نا کام رہی ہوں تو پرائی بیٹیوں کو اس کا قصوروار کیونکر ٹھہراؤں۔ میرے اپنے رنگ ڈھنگ اور طور اطوار میں کہیں کھوٹ ہے۔ میں آج سمجھ گئی ہوں وہ کھوٹ ہے میری ملائمت۔''

''وہ آپ کی ان خدمتوں سے ہی تو تنگ آ کر اس قید سے رہا ہونا چاہتی ہے اماں! وہ ایک مقولہ ہے ناں، نہ اتنے کڑوے بنو کہ لوگ تھوک دیں، نہ اتنے میٹھے بنو کہ لوگ نگل جائیں۔'' عثمان نے بے حد دکھی ہو کر کہا۔ ''آپ کو بہو کے روپ میں کبھی کسی نے نہ پہچانا، آج ساس کے رشتے کی وضع داری میں بھی شکست ہو گئی۔'' اور وہ ہنس کر چپ ہو گئیں مگر ان کی ہنسی میں کتنی کرچیاں تھیں یہ شاید کبھی وہ اپنے آپ کو بھی نہیں بتا سکتی تھیں۔

بیٹیاں پھول ہیں

عظمیٰ افتخار

گل رخ کوچنگ سینٹر سے واپس آئی تو مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اسے منیزہ بیگم اور رعنا نظر آئیں۔ وہ دونوں گھر کے چھوٹے سے لان میں کرسیوں پر براجمان تھیں اور یقیناً شام کی چائے پی جا رہی تھی۔ گھر کے اس حصے کو لان کی شکل بھی منیزہ بیگم اور گل رخ نے ہی دی تھی۔

دونوں نانی نواسی کی ہر وقت آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔

''نانو...... یہ کس کی شادی کا کارڈ ہے؟'' وہ ان دونوں کے قریب چلی آئی اور کرسی پر بیٹھتے ہی میز پر رکھے بسکٹ اور نمکو پر ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا اور ساتھ ہی کارڈ اٹھا کر بہ آواز بلند پڑھنے لگی۔ رعنا نے چائے پیتے ہوئے اسے فقط گھورنے پر ہی اکتفا کیا جو بغیر ہاتھ منہ دھوئے کھانے پینے میں مشغول ہوگئی تھی مگر منہ سے کچھ اس لیے نہیں کہا کہ نانی کی موجودگی میں نواسی کو کچھ کہنا پہاڑ کے نیچے اونٹ لانے کے مترادف تھا۔

''بتائیں ناں نانو...... کس کی شادی کا کارڈ ہے؟'' گل رخ بھی ماں کی گھورتی نظریں تاڑ چکی تھی۔ اس لیے انجان بن کر پوری طرح نانی کی سمت متوجہ ہوگئی۔

''ارے بیٹا...... میرے پرانے محلے سے آیا ہے، تمہارے ماموں شفیق کے گھر سے دو گھر آگے عطیہ کا گھر ہے اس کی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ ہے۔ چھوٹی تھی تو میرے پاس ٹیوشن پڑھنے آتی تھی، ماشاء اللہ اب شادی کے قابل ہوگئی۔'' پرانے محلے کا تذکرہ آتے ہی منیزہ بیگم کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ ابھی بھی یہی ہوا۔ وہ خوشی خوشی نواسی کو عطیہ کی بیٹی رضوانہ کا بتانے لگیں۔

''ارے واہ نانو...... میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ مجھے بھی بڑا شوق ہے آپ کے پرانے محلے کے لوگوں سے ملنے کا۔''

''ٹھیک ہے چلی چلنا، ویسے بھی اتوار کو ہے۔'' نواسی کا اشتیاق دیکھ کر انہوں نے بھی ہامی بھرلی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اماں اسے شادی میں لے جانے کی۔ اتوار کو پہلے تو دن چڑھے تک سوتی رہے گی باقی آدھا دن اس کی شادی میں جانے کی تیاری ختم نہ ہوگی پھر رات میں دیر سے شادی سے آئے گی تو صبح کالج جانے کے لیے اٹھا نہیں جائے گا۔ بی ایس سی کا فائنل ایئر ہے۔ بہتر ہے کہ یہ اپنے امتحانات کی تیاری کرے۔ اگلے مہینے سے تو امتحانات شروع ہیں۔'' رعنا نے بیٹی کو گھرکا۔ وہ خود بھی ایک مقامی کالج میں فزکس پڑھاتی تھیں۔

''کیا نانو...... دیکھیں ناں ماما کو...... ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہیں۔ آپ خود فیصلہ کریں کہ جس لڑکی کی نانی اپنے وقت کی اتنی اچھی استاد ہوں اور ماں کالج کی لیکچرار، کیا وہ امتحانوں میں کبھی فیل ہوسکتی ہے؟ اور واحد اتوار کا دن ایسا ہے جب میں دیر تک سوتی ہوں ورنہ تو علی الصباح اٹھ جاتی ہوں۔'' گل رخ نے احتجاج کے طور پر منہ پھلالیا۔

''ارے میری گڑیا، تم فکر نہ کرو۔ جاکر منہ ہاتھ دھو پھر فریش ہوکر چائے پینا۔ تمہاری ماں سے اجازت میں لے لوں گی اور ہاں آئندہ باہر سے آکر کبھی کھانے پینے کے برتنوں میں ہاتھ نہ ڈالا کرو۔ کتنے ہی جراثیم ہمارے ہاتھوں سے لگے رہتے ہیں۔ اس لیے ہاتھوں کو اچھی طرح دھوکر کچھ بھی کھانا چاہیے۔'' منیزہ بیگم نے نواسی کی سمت جھک کر آہستہ سے سمجھایا تو وہ سر ہلاتی اندر کی جانب چلی گئی۔ کہتے ہیں اصل سے ہمیشہ سود پیارا ہوتا ہے۔ اس لیے منیزہ بیگم کو بھی نواسی سے بڑا پیار تھا اور جب سے وہ مستقل بیٹی کے پاس رہنے آگئی تھیں تب سے تو گویا نانی نواسی ایک دوسرے کی پکی سہیلیاں بن گئی تھیں۔

پانچ سال پہلے رعنا کے شوہر ریاض احمد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ اس وقت گل رخ چودہ سال کی تھی۔ رعنا چونکہ ملازمت پیشہ خاتون تھیں اس لیے گھر اور بچی کی طرف سے مستقل فکر رہتی تھی۔ اس لیے عدت کے بعد انہوں نے فوری طور پر دو فیصلے کیے ایک تو اپنی والدہ منیزہ بیگم کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رہنے کے لیے بلالیا اور دوسرا یہ کہ گھر کا اوپری حصہ جو اُن کی ضرورت سے زیادہ تھا اسے کرائے پر چڑھا دیا۔ رعنا کے گھر آنے سے پہلے منیزہ بیگم اپنے چھوٹے بیٹے شفیق اور بہو زینب کے ساتھ رہتی تھیں۔ شفیق کا ایک ہی بیٹا تھا جو ابھی سیکنڈ ایئر میں تھا۔ منیزہ بیگم خود بھی اپنے وقت میں گورنمنٹ اسکول میں ریاضی کی بہت اچھی استاد رہ چکی تھیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد گھر پر ہی محلے کے بچے بچیوں کو قرآن پاک کی تعلیم اور نویں دسویں جماعت کے مضامین پڑھایا کرتی تھیں اور آج جو کارڈ آیا تھا وہ ان کے پرانے محلے سے ہی تھا۔

''ہر وقت گل کو مت ٹوکا کرو رعنا، بچے اس طرزِ عمل سے باغی ہو جاتے ہیں۔ یہ وقت تو دراصل ان کے دوست بننے کا ہوتا ہے تاکہ وہ ہر بات آسانی سے اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے بڑوں سے شیئر کرسکیں اور ویسے بھی دو گھنٹوں کی ہی تو بات ہوگی۔ شفیق سے میں نے کہہ دیا ہے وہ لے کر بھی جائے گا اور شادی سے واپسی میں یہاں لاکر بھی چھوڑ دے گا۔'' ماں کے اتنی تفصیل سے سمجھانے پر رعنا کو پھر گل رخ کے جانے پر بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا اور یہ سچ بھی تھا کہ اماں کے زیرِ سایہ رہنے سے گل رخ میں کافی مثبت تبدیلیاں آئی تھیں۔ اسے سحر خیزی کی عادت ہوگئی تھی۔ نماز تو خیر وہ بچپن سے ہی پڑھتی تھی پر اکثر فجر قضا ہوجاتی تھی مگر اب فجر کی نماز کی ادائیگی میں بھی پابندی آگئی تھی۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کے کافی کاموں کی ذمے داری بھی اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ گھر میں ہر وقت دوپٹا سلیقے سے اوڑھے رہتی اور باہر جانے کے لیے بڑے سے دوپٹے کے

میرے نسوانی حسن کا راز
بلوسم بریسٹ ڈویلپنگ اینڈ ٹائیٹنگ کریم (ہربل)
چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کرکے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کرکے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
Rs.250/=
قیمت =/125
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔
یونانی کریم
گلیسی
قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔
خواجہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ابراہیم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
وقاص میڈیکل اسٹور الآصف اسکوائر این 22 کراچی
قمری اسٹار جنرل اسٹور مدینہ چوک ریشم بازار حیدرآباد
نیو علی دواخانہ وکٹوریہ روڈ سکھر
ذیشان ہومیو اسٹور چنیوٹ بازار فیصل آباد
ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور
صدیقی دواخانہ صرافہ بازار گوجرانوالہ
خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد
زمان دواخانہ روہتاس روڈ جہلم
قدیمی چنیوٹی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا
جان میڈیکا چوک سکندر پورہ پشاور
شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد
جعفری دواخانہ اسماعیل مارکیٹ جھنگ
حبیب پنسار مین بازار میانوالی
الشفاء ہومیو سینٹر پارہ چنار
سلیم پنساری گوجرانوالہ روڈ حافظ آباد
ڈاکٹر حسین بخاری ٹاؤن ناور علی شاہ ڈیرہ اسماعیل خان
شافی دواخانہ اندرون فرید گیٹ شاہی بازار بہاولپور
علی ہومیو کچہری روڈ ملتان
ابن سینا اسٹور گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازی خان
پاکستان جنرل اسٹور کچہری بازار گول چوک سرگودھا
یوپی پنسار اسٹور جری کیشن روڈ کوئٹہ
کلاسک ہومیو اسٹور مسجد روڈ کوئٹہ
محمد علی دواخانہ اسلام آباد 2278463
حق سائیں دواخانہ سنہری مسجد روڈ پشاور
علی ہومیو اسٹور سرکلر گجرات
ایس ایس لنکرز 22 علامہ اقبال روڈ لاہور
حی القیوم جنرل اسٹور ہسپتال روڈ چکوال
بوسال پنسار اسٹور صدر بازار منڈی بہاؤالدین
عظیم بیوٹی سینٹر مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد
ڈسٹری بیوٹر بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528 اپنا ایڈریس SMS کر کے لٹریچر مفت منگوائیں
مقیم الدین برادرز کچی گلی نمبر 1، ڈینسو ہال کراچی۔ فون 2433682 ریاض محمد 69 نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264
پورے پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفت طبی مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ ڈویلپر آلہ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔ Cell: 0333-5203553, Website: wwwdevapk.com

ساتھ اسکارف بھی استعمال کرتی تھی۔

☆☆☆

شادی ہال برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا۔ کافی سارے مہمان آچکے تھے اور کچھ ابھی آرہے تھے۔ ایک چہل پہل سی تھی۔ دونوں نانی نواسی نے بھی ایک میز سنبھالی۔ ساتھ میں زینت ممانی بھی تھیں۔

''ارے خالہ جی! کیسی ہیں آپ؟ آپ تو پرانے محلے کا راستہ ہی بھول گئیں''۔ سلمیٰ تیز نارنجی رنگ کا بنارسی شلوار قمیص پہنے ہوئے ان کے سامنے موجود تھیں۔ اتنی گرمی میں نارنجی رنگ عجب ہی تاثر دے رہا تھا۔ سلمیٰ کو سامنے دیکھ کر منیزہ بیگم کے ماتھے پر ہلکی سی شکن نمودار ہوگئی۔ جسے وہ بہ مشکل دور کرسکیں۔ حالانکہ سلمیٰ کا شمار ان کے سسرالی رشتے داروں میں ہوتا تھا اور ساتھ ہی وہ محلے دار بھی تھیں۔ زینت کی گلی سے اگلی گلی میں ان کا گھر تھا مگر کیا کہنے کہ طبیعت بڑی عجیب پائی تھی۔ کن سوئیاں لینا، دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہنا اور اِدھر کی بات اُدھر پہنچانا ان کا پسندیدہ ترین مشغلہ تھا۔

''ہوں، ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کیا حال ہیں؟ خیریت سے تو ہو؟'' منیزہ بیگم نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''ارے ہم تو ہمیشہ ہی ٹھیک ہی رہتے ہیں خالہ جی مگر آپ کے لیے ایک بڑی زبردست خبر ہے۔ بلکہ خبر بھی کیا...... سیدھے سیدھے آپ کو مبارک باد دینی ہے۔'' سلمیٰ نے سنسنی پھیلائی۔

''کیسی مبارک باد؟''

''آپ کی ہونہار شاگردہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کرلی ہے۔ اس کی مبارک باد استانی جی اور کس کی؟'' سلمیٰ بیگم چہک کر بولیں۔

''یا اللہ خیر......'' اَخبر تھی کہ دھماکا! سن کر منیزہ بیگم نے دل تھام لیا۔ گل رخ بھی اپنی جگہ حیران تھی۔

''سلمیٰ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ جو منہ میں آتا ہے کہے جاتی ہو کس بچی کے متعلق اس طرح کی بات کررہی ہو۔'' منیزہ بیگم کا لہجہ درشت ہوگیا تھا۔

''حنا کی بات کررہی ہوں خالہ جی، بانو کی سوتیلی بیٹی...... ارے میں کیا، سارا محلّہ ہی اس کے متعلق باتیں کررہا ہے اور سب سے آگے تو خود بانو پیش پیش ہے۔ سوتیلی تھی تو کیا ہوا؟ ماں تو تھی۔ پال پوس کر بڑا تو کیا تھا۔ اس کے ہی سفید ہوتے بالوں کا خیال کرلیتی۔ میری بھی تو بیٹی ہے مجال ہے جو ایسی حرکت کرجائے، ارے ہمیں تو نہ آئے ایسے پردے میں جلوے دکھانا۔ جو ہے سب کے سامنے ہی ہے، بھولی بھالی شکل بنا کر کسی کو دھوکا تو نہیں دیتے...... چندا اِدھر آؤ۔'' جملہ مکمل کرتے ہی انہوں نے اپنی بیٹی کو آواز دے ڈالی۔

''دادی کو سلام کرو۔'' چندا کے سامنے آتے ہی سلمیٰ نے اگلا جملہ داغ دیا۔

گل رخ جو اتنی دیر سے سامنے کھڑی خاتون کی زبان کے جوہر دیکھ رہی تھی، اب کبھی چندا کو دیکھتی اور کبھی نانو کو جو سلمیٰ بیگم کی زبان کے حملوں سے ابھی بھی جھٹکوں کی زد میں تھیں۔ چندا کیا تھی؟ واقعی اسمِ بامسمّیٰ تھی۔ اس نے سفید جارجٹ کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ سلائی اس درجہ قابلِ دید تھی کہ لگتا تھا جسم پر رکھ کر سلوایا ہو، آستین نہ ہونے کے برابر تھیں۔ دوپٹا ایک طرف کندھے پر پڑا ہوا تھا۔ میک اپ پوری نفاست سے کیا ہوا تھا، سارے بال دوسرے کندھے پر سے آگے کی جانب کیے ہوئے تھے۔ آنکھوں کو پوری طرح کاجل سے سنوارا ہوا تھا۔ کہنے کو وہ سلام کرنے نانی کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی مگر ان دو تین لمحوں میں بھی اس کے انگوٹھے کو قرار نہ آیا تھا جو مسلسل موبائل پر پیغام رسانی میں

مصروف تھا۔ یقیناً چندا ایس ایم ایس پیکج سے پوری طرح استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ بیٹی سے سلام کروا کر سلمیٰ بیگم اسے لیے آگے کی میز کی سمت بڑھ گئیں مگر جو کچھ انہیں استانی کے کانوں تک پہنچانا تھا اسے وہ بہ آسانی نشر کرچکی تھیں کیونکہ حنا منیزہ بیگم کی بہت شائستہ، شرم وحیا والی باادب شاگردہ رہ چکی تھی۔

چندا گو کہ آگے بڑھ چکی تھی مگر گل رخ کی نگاہیں ابھی بھی اس کی پشت پر جمی تھیں۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ اس نے چندا کو اور کہاں دیکھا ہے۔ معاً اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے یاد آگیا کہ جب وہ شادی ہال میں داخل ہورہی تھی تو اس نے چندا کو ہال کے دروازے سے ذرا ہٹ کر کسی لڑکے سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جس طرف وہ دونوں کھڑے تھے وہاں قدرے اندھیرا سا تھا۔ وہ اس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ مار مار کر ہنس رہی تھی۔ لڑکا بھی اتنی ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر گل رخ کو کچھ ناگواری کا احساس ہوا تھا مگر اگلے ہی پل اس نے اپنا ذہن جھٹکنے کی کوشش کی کہ کیا خیال وہ اس کا بھائی ہو...... پر اتنا وہ ضرور جانتی تھی کہ بھائی بیچ رستوں میں کھڑے ہوکر یوں باتیں نہیں کرتے۔

دوسری جانب منیزہ بیگم تھیں جو بالکل گم صم ہوگئی تھیں۔ گل رخ اور زینت ممانی نے ان سے باتیں کرنی چاہیں تو وہ بس ہوں ہاں میں جواب دے کر چپ ہوگئیں۔ زینت ممانی کو ڈر تھا کہ اماں کی طبیعت نہ بگڑ جائے اور اسی طبیعت کی خرابی کا ہی ڈر تھا کہ انہوں نے اماں سے حنا کے متعلق گردش کرتی افواہوں کا کوئی تذکرہ نہ کیا تھا...... مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے ان کے سامنے یہ بات آنی تھی سو آہی گئی تھی۔ واپسی میں بھی راستے بھر وہ خاموش ہی رہیں۔ بار بار ان کے دھیان میں اسکارف کے ہالے میں گھرا حنا کا معصوم چہرہ آتا رہا۔ کتنی معصوم اور بھولی بھالی ہوا کرتی تھی جب ان کے پاس پڑھنے آتی تھی۔ یہی کوئی گل رخ سے ایک آدھ سال بڑی ہوگی۔

رات میں منیزہ بیگم جب بستر پر لیٹیں تو انہیں پرانے محلے میں گزارے دن یاد آنے لگے۔ جب دیوار سے دیوار ملی تھی اور چھت سے چھت جڑی تھی۔ ایک کا دکھ دوسرے کے دل کو لگتا تھا۔ محلے کا ہر بچہ اپنا ہی بچہ لگتا تھا۔ جو کوئی غلط حرکت یا عادت کسی بچے یا بچی میں دیکھی وہیں سرزنش کرڈالی کہ عادت نہ پنپ جائے اور چونکہ وہ محلے میں استانی جی کے نام سے پہچانی جاتی تھیں، اس لیے ہر چھوٹا بڑا ان کی سنتا بھی تھا اور عزت بھی کرتا تھا۔ پھر اب چار پانچ سال کے عرصے میں ایسا کون سا بھونچال آگیا تھا... یا واقعی زمانے نے رفتار بدل ڈالی تھی کہ ہرزہ سرائی، بے حیائی اور عیب جوئی سب فیشن بن چکا تھا۔

وہ کتنی محبت سے گل رخ کو اکثر اپنے پرانے محلے کی بابت سنایا کرتی تھیں اور خود گل بھی تو کتنے ذوق شوق سے سنا کرتی تھی، پر اب کس مان کے ساتھ وہ اس کے سامنے اپنا ماضی گوش گزار پائیں گی۔ بچا ہی کیا تھا ان کے پاس، کسی ایک بچے کی تربیت میں بھی تو کردار کا گوہر نہ ڈال سکی تھیں اور کہنے کو استانی جی تھیں۔ سلمیٰ کی باتیں اب تک ان کے کانوں میں جیسے گونج رہی تھیں۔ کتنے ہی آنسو ان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے ان کے دوپٹے میں... جذب ہوگئے۔

☆☆☆

دو دن سے گل رخ اپنے کمرے میں بند تھی۔ ماں تو ماں...... وہ تو نانی سے بھی خفا تھی۔ وجہ گو اتنی خاص نہیں تھی مگر گل رخ کے پیشِ نظر کافی اہم تھی۔ ہوا

یوں کہ جس دن وہ اپنا بی ایس سی کا آخری پرچہ دے کر آئی اس کے دو دن بعد ہی وہاب رحمان اور ان کی بیگم مہناز اپنے اکلوتے بیٹے فواد کا رشتہ گل رخ کے لیے لے کر ان کے گھر آ گئے۔ وہاب رحمان، گل رخ کے والد کے بڑے جگری دوست تھے۔ دونوں کا زمانۂ طالب علمی سے ایک دوسرے کے ساتھ یارانہ تھا۔ جب تک ریاض احمد حیات تھے گل رخ اور رعنا کا ان لوگوں سے کافی ملنا ملانا تھا۔ کبھی وہ ان کے گھر ویک اینڈ گزارتے تھے کبھی یہ ان کے ہاں...... فواد، گل رخ سے تین سال بڑا تھا۔ یہ جب بھی وہاں انکل کے گھر جاتی، بھائی بھائی کر کے اس کے پیچھے لگی رہتی تھی۔ پھر ریاض احمد کی حادثاتی موت سے جہاں ہر چیز میں تبدیلی آئی وہیں رعنا بھی لوگوں سے ملنے ملانے میں کافی احتیاط برتنے لگیں مگر وہاب صاحب اور مہناز نے اس دوستی کے رنگ کو کبھی کم نہ ہونے دیا اور ہمیشہ رعنا اور گل رخ کی خبر گیری کرتے رہے اور اب جبکہ فواد ایم بی اے کر کے ایک معقول پوسٹ پر فائز ہو چکا تھا تو وہ اس دوستی کو رشتے داری میں بدلنا چاہ رہے تھے۔ بھلا رعنا اور منیزہ بیگم کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ سالوں کا ساتھ تھا پھر بھی رسمی طور پر سوچنے کے لیے ایک دو دن کی مہلت ان لوگوں سے مانگ لی تھی پر جب رعنا نے گل رخ سے اس رشتے کا ذکر کیا تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

''یہ کیا...... کیا کہہ رہی ہیں ماما آپ...... میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گی۔ کیا اتنی بھاری ہو گئی ہوں آپ دونوں پر جو مجھے اتنی جلدی اپنے آپ سے الگ کر رہے ہیں آپ لوگ۔ مجھے تو ابھی اور آگے پڑھنا ہے۔ یونیورسٹی سے آپ کی طرح اپنی پسند کی فیلڈ میں ماسٹرز کرنا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو منع کیوں نہیں کیا، سوچنے کے لیے وقت کیوں مانگا؟ اور یہ فواد بھائی ان کو تو میں اپنا بھائی سمجھتی تھی۔ شرم آنی چاہیے تھی انہیں، میں نہیں کروں گی شادی وادی۔'' وہ سخت غصے میں پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئی اور...... دو دن سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس نے ماں اور نانی کی کوئی بھی بات سننے اور سمجھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''آپ ہی اپنی نواسی کی ہر وقت دوست بنی رہتی تھیں ناں...... اب سمجھائیں اسے کہ اچھے رشتے کو یوں رد کر کے کفرانِ نعمت نہ کرے۔ ارے لوگ تو ایسے رشتوں کی راہ میں آنکھیں بچھائے رہتے ہیں۔ ذرا جا کے دیکھے کہ ہر گھر میں بیٹیاں کیسے اچھے رشتوں کی آس میں بوڑھی ہو رہی ہیں اور اس کے لیے تو پہلی دفعہ میں ہی اتنا اچھا پروپوزل آیا ہے۔'' رعنا کو بیٹی کے اس طرزِ عمل پر سخت غصہ تھا۔ انہوں نے منیزہ بیگم سے کہا۔ ''اور رہی بات آگے پڑھنے کی تو نہ وہاب بھائی اور بھابی اتنے تنگ نظر ہیں اور نہ فواد کہ اسے شادی کے بعد پڑھنے سے منع کریں، آخر میں نے بھی تو شادی کے بعد ہی اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور جہاں تک بات فواد کو بھائی سمجھنے کی تھی تو اچھے گھروں کی بیٹیاں اسی طرح رہتی بستی ہیں۔'' رعنا کی باتوں سے منیزہ بیگم سو فیصد متفق تھیں مگر کیا کرتیں سامنے عزیز از جان نواسی تھی۔ جس کی بات رد کرنا بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی صورتِ حال ہو گئی تھی کہ اس کی مانیں یا اپنی منوائیں۔ بہر حال کچھ تو کرنا ہی تھا لہٰذا کمر کس کے میدان میں کود پڑیں۔ پہلا مرحلہ تو دروازہ کھلوانے کا تھا پھر کہیں جا کے ذہن کی کھڑکیاں کھلنے کا نمبر آتا۔

''گل...... دروازہ کھولو، سن رہی ہو میری بات......'' انہوں نے دروازے پر زور زور سے دو چار ہاتھ مارے۔ ''میں نے وہاب میاں سے کہہ دیا

ہے کہ ہماری بیٹی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ چلو اب باہر آؤ، مجھ بوڑھی میں اتنا دم خم کہاں کہ دو دن سے بنا کچھ کھائے پیے تمہارے کمرے کے چکر لگاتی رہوں۔ ویسے تو تم بڑی محبت جتاتی ہو کہ میں ماں اور نانو کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ مگر یہ بھول گئیں کہ آج ماں کی سالگرہ ہے اس کے لیے کوئی تحفہ ہی خرید لیں۔'' آخر نانو کو کچھ جھوٹ کچھ سچ کا سہارا لینا ہی پڑا۔ گل رخ تو ویسے ہی دروازے سے پشت لگائے بیٹھی تھی اب جو نانو کے دو دن سے اس کے بنا کچھ نہ کھانے کا اور ماں کی سالگرہ کا سنا تو اس سے رہا نہ گیا اور جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

''آپ سچ کہہ رہی ہیں ناں، آپ نے اور ماما نے وہاب انکل کو منع کر دیا ہے ناں۔'' روئی روئی سوجی آنکھوں سمیت وہ ان کے سامنے تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر منیزہ بیگم کا دل لمحوں میں پسیج گیا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے سوچا کہ وہ واقعی وہاب میاں کو منع تو نہیں کریں گی مگر ایک دو سال کی مہلت ضرور مانگ لیں گی۔ تب تک گل رخ کو بھی اس بات کی سمجھ آ جائے گی اور اس کا آگے پڑھنے کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔

''اوہ نانو...... یو آر ریئلی گریٹ......'' کہتے ہوئے وہ ان کے گلے سے لپٹ گئی۔ انہوں نے بھی اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ ''اور ہاں نانو...... آپ کوئی بوڑھی نہیں ہیں۔ آج بھی فورٹی پلس ہی لگتی ہیں۔'' تھوڑا سا سر اونچا کر کے اس نے کچھ شرارت اور کچھ محبت سے کہا تو نانی بھی مسکرا دیں۔

☆☆☆

''استانی جی۔'' دونوں نانی نواسی رعنا کے لیے کپڑے کی دکان سے سوٹ پیک کروا کے نکل ہی رہی تھیں کہ کسی نے پیچھے سے منیزہ بیگم کو پکارا۔ دونوں ایک دم مڑیں۔ مکمل طور پر حجاب میں ملبوس

میں

****

تمہیں سوچا ہے سپنوں میں
چھڑا لو ہاتھ تو جانیں
تمہیں باندھا ہے سانسوں میں
تمہیں پاتی ہوں ساتھ اپنے
جہاں سے بھی گزرتی ہوں
میں خوشبو کی طرح پل پل
تمہیں محسوس کرتی ہوں
تمہارا مجھ سے جدا ہونا
تمہارے بس سے باہر ہے
اِدھر دنیا اُدھر تم ہو
مجھے دنیا سے کیا لینا
ادھر میں ہوں، جدھر تم ہو
میرے احساس میں تم ہو
میرے چاروں طرف تم ہو
میں خوشبو کی طرح پل پل
تمہیں محسوس کرتی ہوں
تمہیں رکھا ہے پلکوں میں
تمہیں سوچا ہے سپنوں میں

مرسلہ: انعم وقار حیدر، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

اِک لڑکی ان کے سامنے تھی۔

''معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' منیزہ بیگم کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا حجاب قدرے جھجکتے ہوئے پلٹ دیا۔

''حنا تم!'' منیزہ بیگم اسے یوں سامنے پا کر ششدر تھیں۔ اس کا چہرہ آج بھی ویسی ہی معصومیت لیے ہوئے تھا۔

''جی استانی جی، آپ جب اس دکان میں داخل ہوئی تھیں میں تب سے آپ کو دیکھ رہی تھی یقین جانیں، پانچ مہینوں بعد یوں کسی اپنے کو سامنے دیکھ کر دل کو جو خوشی ہوئی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔'' اس کے لہجے سے اس کی خوشی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''حنا بیٹی! اگر مجھے اتنا ہی اپنا سمجھتی تھیں تو میری دی گئی تعلیم کو یوں داغ کیوں لگایا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی منیزہ بیگم کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔

''اوہ...... تو آپ تک بھی میری بے حیائی کے قصے پہنچ گئے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا استانی جی۔ میں نے تو نکاح کیا ہے اپنے حق میں جائز اور پسندیدہ کام۔ آپ ہی تو بتاتی تھیں کہ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کو دو چیزیں بہت مرغوب تھیں ایک خوشبو اور دوسرے نکاح۔ کیا آپ مجھے میری سچائی بیان کرنے کا ایک موقع بھی نہیں دیں گی۔ میں کسی اور کو تو نہیں مگر آپ کو اپنے فعل کی وضاحت ضرور دوں گی اگر برا نہ مانیں تو تھوڑی دیر کے لیے میرے گھر چلیں۔ پاس ہی ہے میرا گھر۔'' اس کے لہجے میں یقیناً کچھ ایسا تھا جس نے گل اور نانو دونوں کو خاموشی سے اس کے ساتھ جانے پر مجبور کر دیا۔

''استانی جی آپ تو جانتی ہیں ناں کہ جب تک میری سگی ماں زندہ تھی، ہمارا گھر کتنا اچھا تھا، ہم بھلے سے کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ میرے والد ایک فیکٹری میں ملازم تھے مگر پھر بھی میں اور میرا بھائی نعمتوں میں پرورش پا رہے تھے۔ ہم بچپن سے آپ کے گھر پڑھنے آتے تھے۔ قرآنی تعلیم اور پھر نصابی بھی آپ سے ہی پڑھتے رہے۔ پھر جانے کیا ہوا کس کی نظر لگ گئی۔ بخار کا تو صرف بہانہ تھا اور میری ماں جھٹ پٹ ختم ہو گئیں۔ باپ نے صرف چند مہینے انتظار کیا اور اس کے بعد بانو کی صورت میں ہماری دوسری ماں آ گئی۔ وہ ماں ضرور تھی پر ماں بن نہ سکی۔ اوپر تلے ہونے والے بچوں اور بانو کے بار بار تقاضوں نے میرے ابا کو غلط راستے پر ڈال دیا اور ایک دن وہ فیکٹری گئے تو واپس ہی نہیں لوٹے، نہ زندہ نہ مردہ...... ابا کے بعد وہ میرے بھائی کے پیچھے پڑ گئیں۔ اچھے وقتوں میں ابا نے میرا اور بھائی کا رشتہ وٹے سٹے میں اپنے جاننے والوں میں طے کر دیا تھا مگر ماں کی ہر وقت کی مار پیٹ اور پیسوں کے تقاضے نے میرے بھائی کو بھی باہر کا رستہ دکھا دیا۔ اسے نشے کی لت لگ گئی۔ برادری والوں نے یہ رشتہ توڑ دیا، کھانے کو نہیں تھا ہمارے پاس تو پڑھنے کے لیے کہاں سے آتا۔ یوں تعلیم کا سلسلہ بھی میٹرک کے بعد منقطع ہو گیا۔'' اتنا کہتے کہتے حنا چپ ہو گئی۔ گل رخ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی اور چپکے چپکے بار بار آنکھوں میں آ جانے والی نمی ہاتھ سے صاف کرتی جا رہی تھی۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''گھر کا کرایہ ہر مہینے نہ ادا کرنے کی وجہ سے بڑھتا جا رہا تھا اس پر مستزاد میری ماں ہر آئے گئے سے ادھار لینے لگی۔ ان سب لوگوں کے اور مالک مکان کے تقاضے بڑھنے لگے تھے۔ وہ سب مجھے یوں دیکھنے لگے کہ جیسے میں مالِ غنیمت ہوں اور وہ میرے حسن اور جوانی کی صورت میں اپنا سارا تاوان وصول کر لیں گے۔ وقت بے وقت ان سب

لوگوں کی آمد و رفت، بہانے بہانے سے مجھے بلانا، مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنا، میں اپنے ہی گھر میں خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی اور میری ماں کی چشم پوشی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آخری صورت میرے پاس بس خودکشی کی ہی رہ جاتی تھی۔ میں کیا کرتی استانی جی آپ بھی نہ تھیں کہ کوئی راستہ ہی بجھا دیتیں پھر شاید قدرت کو میری حالت پر رحم آ گیا اور ایک دن مسجد کے امام صاحب ایک شخص کا رشتہ لے آئے۔ بیوی مر چکی تھی اس کی اور ایک چھوٹی بچی تھی جسے ماں کی ضرورت تھی۔ میری ماں نے اس شخص کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ اگر وہ مجھ سے بیاہ کے عوض انہیں منہ مانگے پیسے دے گا تو وہ راضی ہیں۔ وہ شخص واپس لوٹ گیا۔ میں ماں کے ارادوں پر ششدر تھی پر جب ایک دن واقعی میری برداشت کی حد ختم ہو گئی تو میں نے خود ہی امام صاحب کو اپنے منہ سے اس رشتے کا کہہ دیا۔ یہ بھی میرے لیے ایک رسک ہی تھا مگر میں نے اپنی عزت کی خاطر اسے مقدم جانا۔ امام صاحب کو دنیا زمانے کا ڈر تھا اس لیے وہ خود تو منظرِ عام پر نہ آئے مگر میرا نفیس احمد سے نکاح ضرور کروا دیا۔ اور نفیس احمد واقعی ایک بہت ہی نفیس شخص ثابت ہوا اس نے کبھی بھی اس طرح شادی کرنے پر مجھے طعنہ نہیں دیا بلکہ ہمیشہ عزت اور محبت دی۔ جس کپڑے کی دکان پر آپ گئی تھیں ناں وہ میرے شوہر کی ہی ہے۔ آج ان کا ورکر نہیں آیا تھا کھانا لینے تو مجھے خود دکان پر دینے جانا پڑا۔'' وہ بتا رہی تھی کہ اندر کمرے سے کسی بچی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد واپس آئی تو اس کی گود میں ایک سال کی بچی تھی۔

''استانی جی، یہ میری بیٹی ہے ماہا۔ اس کی شکل میں مجھے اپنا بچپن نظر آتا ہے۔ میں اس کی سگی ماں تو

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

آزادی کے یادگار لمحات سے وابستہ ماہ اگست 2012ء کے شمارے کی بہار

پانچواں آدمی

طبقاتی استحصال کا زخم حساس دلوں کو اس قدر گھائل کر دیتا ہے کہ...... منزل کا حاصل، کارلا حاصل ٹھہرتا ہے۔ **ایچ اقبال** اور آخری صفحات کا خوب صورت سنگم

فیصلے فقیروں کے

ہندوستان کی سرزمین پر ولیوں اور مشائخ کا قتل عام...... ''ہنوز دلی دور است'' ایک ولی کا تاریخی جملہ...... ایک یادگار داستان۔ **ڈاکٹر ساجد امجد** کی عرق ریزی

کشکول

حالات و واقعات کے نشیب و فراز...... ایک سنسنی خیز طویل داستان
انوار صدیقی کے قلم کا جادو

مسافر

جذبات کے تلاطم...... حالات کی سازشیں...... اور چاہتوں کی ریشمی ڈوریوں میں گرفتار ایک مسافر کی ہنگامہ خیزیاں۔ **ناصر ملک** کا دلکش انداز بیاں

قرض حسنہ
محبوب قلم کار **ایم اے راحت** کا ایک منفرد شاہکار...... خوابوں کا تسلسل اور تلخ حقائق کی روانی

اس کے علاوہ
حضرت سلیمان علیہ السلام کی روداد حیات، ملک صفدر حیات کا کارنامہ، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

نہیں ہوں مگر میں نے اپنے اللہ سے وعدہ کیا ہے کہ میں کبھی اس کے لیے بانو نہیں بنوں گی۔ ہمیشہ اسے سگی اولاد سے بڑھ کر چاہوں گی۔ بھلے سے میں اپنے پیچھے اپنی رسوائی کے انمٹ نقوش چھوڑ کے آئی ہوں اور ہو سکتا ہے میرا طرزِ عمل بھی غلط ہو مگر یقین جانیں استانی جی میری نیت اور ارادہ غلط نہیں تھا۔ شاید اسی لیے آج میں بے حد سکون میں ہوں۔''

کہتے ہوئے اس نے اپنی بیٹی کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ جتنی دیر وہ بات کرتی رہی، گل رخ اور نانو بنا جنبش کیے اسے سنتی رہیں اور اس کی بات کے اختتام پر ان تینوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ منیزہ بیگم نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔

☆☆☆

رات میں جب منیزہ بیگم عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو نواسی کو جانماز کے پاس بیٹھے ہوئے پایا۔

''کیا ہوا گل، ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' انہیں حیرت ہوئی۔

''نانو...... آپ وہ......'' وہ کہتے ہوئے جھجک گئی۔

''ہاں بولو! میری بچی کیا بات ہے؟'' وہ جا نماز تہ کر کے اس کے قریب بیٹھ گئیں اور محبت سے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

''نانو...... آپ ماما سے کہیں کہ وہ وہاب انکل کو ہاں کہہ دیں۔'' آخر اس نے کہہ ہی ڈالا۔

''خیریت گل، یکا یک یہ فیصلے میں تبدیلی کیسے۔ کیا رعنا نے تم پر کوئی دباؤ ڈالا ہے؟''

''نہیں نانو...... یہ بات نہیں ہے بلکہ آج حنا سے ملنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔'' اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''حنا سے ملنے کے بعد وہ کیسے؟'' منیزہ بیگم پوری جان سے اس کی سمت متوجہ ہو گئیں۔

''نانو! آج میں نے زندگی کی دو بہت اہم باتیں جانی ہیں۔ ایسی دو باتیں جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ آئندہ زندگی میں بھی وہ میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔''

''وہ کون سی دو باتیں ہیں گل، کیا مجھے نہیں بتاؤ گی؟'' منیزہ بیگم نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے...... نانو کہ کب تک زبانِ خلق، نقارۂ خدا ہونے کا فرض نبھاتی رہے گی۔ اکثر تو آنکھوں دیکھا بھی جھوٹ ہو جاتا ہے پھر ہم کیوں کانوں سنی کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں اور سلمیٰ آنٹی جیسے کردار جو ہمارے معاشرے میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایک انگلی دوسرے کی طرف اٹھانے سے پھر تین انگلیاں اپنی سمت بھی اٹھتی ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ بیٹیاں واقعی پھول ہوتی ہیں جن کو زمانے کی ہوس کے کانٹے چاروں طرف سے گھیرے ہوتے ہیں۔ ان پھولوں کی بڑے دھیان سے آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ کبھی تقدیر کے چکر اور کبھی حالات کی ستم ظریفی سے ان پھولوں میں سے کوئی گل رخ ہوتی ہے، کوئی چندا اور کوئی حنا ہوتی ہے۔ میں تو بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے ماما جیسی ماں اور آپ جیسی نانو کی تربیت ملی ہے تو پھر میں کیوں اس اچھے رشتے کو ٹھکرا کر کفرانِ نعمت کروں۔ جس میں آپ دونوں کی رضا مندی شامل ہے اور رہی بات آگے پڑھنے کی تو مجھے یقین ہے کہ جہاں اللہ پاک نے میرے لیے ہر چیز آسان کی ہے وہیں میرا یہ خواب بھی انشاء اللہ پورا ہو جائے گا۔'' گل رخ کہتی جا رہی تھی اور منیزہ بیگم کا دل طمانیت سے بھرتا جا رہا تھا۔ پہلے حنا اور اب گل رخ کی باتیں سن کر انہیں لگ رہا تھا کہ استانی جی کا جو منصب خدا نے انہیں سونپا تھا آج انہوں نے کسی قدر اس کا حق ادا کر ہی دیا تھا۔

* *

روزے داروں کے لیے احتیاط و تدابیر

شائستہ زریں

پاکیزہ کے تمام قارئین کو رمضان شریف کی آمد مبارک ہو۔ ارشادِ ربانی ہے ''روزہ میرے لیے ہے اس کی جزا میں دوں گا۔'' اس امر سے تو ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ روزہ اسلام کا وہ اہم رکن ہے جو ہمیں ضبطِ نفس کا درس دیتا ہے اور انسانی صحت کا ضامن بھی ہے۔ روزہ وہ سالانہ عبادت ہے جو محض تندرست افراد ہی نہیں رکھتے بلکہ کسی نہ کسی مرض میں مبتلا افراد بھی روزہ رکھنے کے آرزو مند ہوتے ہیں مگر چاہنے کے باوجود اپنی صحت کے مسائل کے سبب نہیں رکھ پاتے۔ چونکہ ہمارا یہ شمارہ ''رمضان اسپیشل'' ہے۔ اس لیے اس کی مناسبت سے ہم نے چیدہ چیدہ امراض کے ماہرینِ طب سے ان امراض میں مبتلا افراد کے لیے روزہ رکھنے نہ رکھنے اور روزے میں دوائی استعمال اور احتیاط کے حوالے سے رائے لی ہے۔

پہلے طبی ماہرین کی آراء

ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر اسلم سید

عارضۂ قلب میں مبتلا افراد ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق روزہ رکھیں۔ ہاں جن مریضوں کو ہارٹ اٹیک ہوئے ایک برس سے زائد عرصہ گزر گیا اور انہیں انجائنا کی تکلیف بھی ہے، وہ دوائیں بھی استعمال کر رہے ہیں تو اس صورت میں روزہ ان کے لیے مضر ہے کیونکہ دن بھر مریض پانی نہیں پی سکتا اور پانی کی کمی سے خون گاڑھا بھی ہو جاتا ہے۔ پھر سحری و افطار کے لوازمات بھی تکلیف میں اضافے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ہاں اگر اٹیک کو دو برس سے زائد عرصہ گزر گیا اور انجائنا کی شکایت بھی نہیں ہے، دوائیں بھی کم استعمال ہوتی ہیں تو معالج کے مشورے سے روزہ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن سحر و افطار میں دوا کی پابندی کے ساتھ غذائی احتیاط بھی کرنی پڑے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر راس مسعود احمد
جنرل فزیشن اور ماہر امراض سینہ

السر اور تیزابیت کے مریض روزہ رکھ سکتے ہیں لیکن سحری اور افطار میں غذائی احتیاط کے ساتھ۔ تیزابیت کے مریض کے لیے روزہ اس لیے سود مند

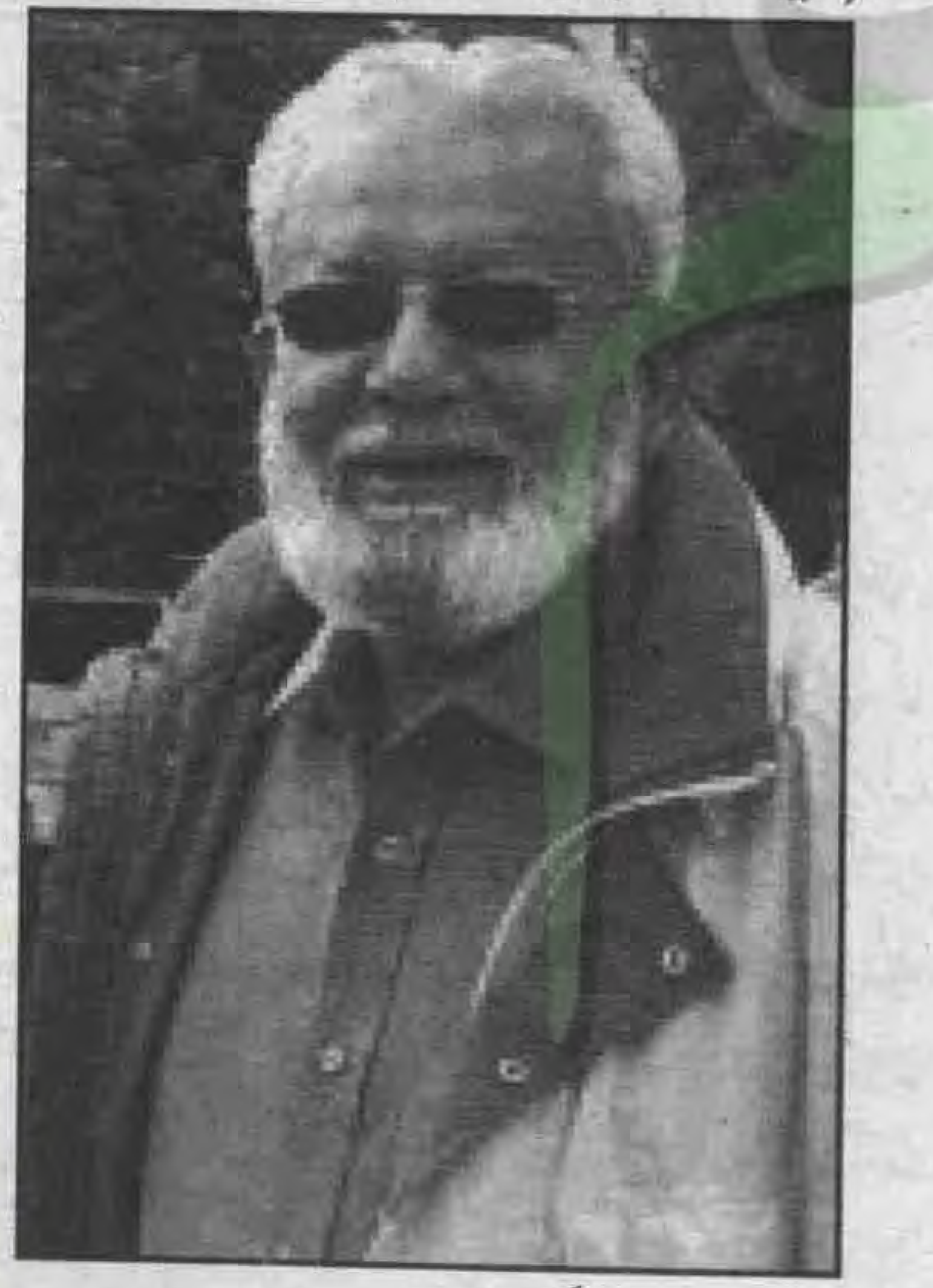

ڈاکٹر راس مسعود احمد

ہیں کہ مناسب اور متناسب غذا کے استعمال سے تیزابیت کنٹرول میں رہتی ہے۔ اس لیے چند احتیاطی تدابیر کے ساتھ روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں، تیزابیت کے وہ مریض جنہیں سحری کے بعد متلی یا الٹی شروع ہوجاتی ہے انہیں چاہیے کہ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق روزہ رکھیں۔ سانس کی تکلیف شدید یا ناقابلِ برداشت ہو تو روزہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ جہاں تک انہلر کا مسئلہ ہے اس میں علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چونکہ انہلر پھیپھڑوں میں جاتا ہے معدے میں نہیں اس لیے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ سانس کے مریض سحری و افطار میں تھوڑے سے پرہیز کے ساتھ اللہ کی ہر نعمت کھا سکتے ہیں البتہ تیز ٹھنڈی اور کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں اس کے علاوہ شربت، آئسکریم، بوتلیں وغیرہ سے پرہیز کریں اور جوسز لیں۔

ٹی بی کے مریض اگر ابتدائی اسٹیج میں ہیں تو سحری و افطار میں پابندی کے ساتھ دوا کا استعمال کریں اور روزہ رکھ لیں لیکن ٹی بی کے وہ مریض جن کے دونوں پھیپھڑے متاثر ہوں انہیں روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ مرض خواہ کوئی بھی ہو روزہ اگر انسان کی زندگی کے لیے خطرہ بن رہا ہے اس کے لیے تو قدرت کی طرف سے بھی چھوٹ ہے۔

ڈاکٹر طلحہ مسعود احمد

ماہر امراضِ ذیابیطس اور ناک کان حلق

اگر شوگر پوری طرح کنٹرول میں ہو یعنی ان کی fasting اور random دونوں بروقت کنٹرول میں ہوں تو صرف اس صورت میں شوگر کے مریض روزہ رکھ سکتے ہیں ورنہ ان کو خود نقصان ہوگا اس لیے بہتر یہی ہے کہ ایسے افراد روزہ رکھنے سے گریز ہی کریں جن کی شوگر پوری طرح کنٹرول میں نہیں رہتی۔ صرف اس بات کا خیال رکھیں کہ شوگر کی دوا سحری میں نہیں لینی، روزہ کھول کر کھائیں یا رات کو

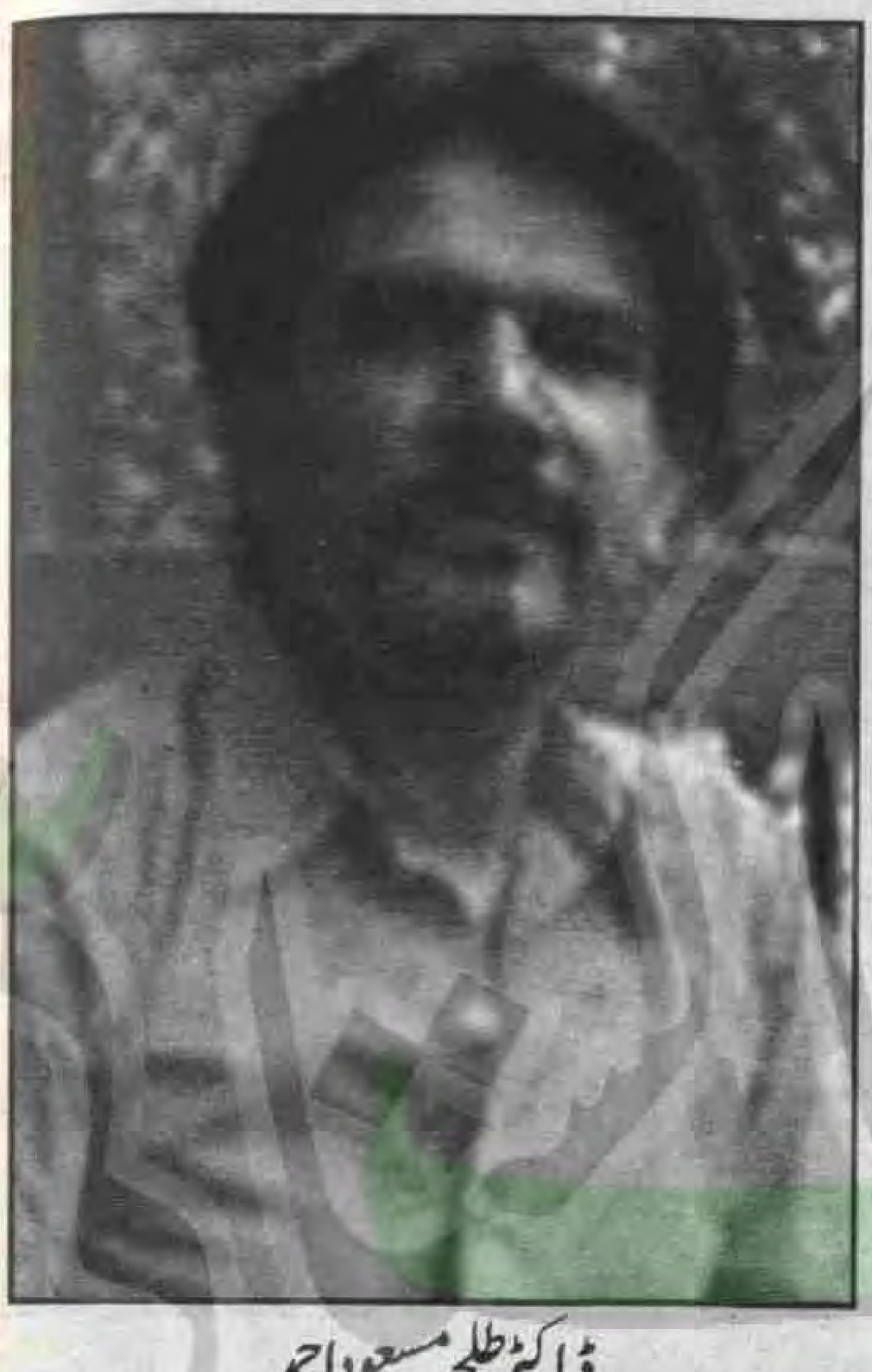

ڈاکٹر طلحہ مسعود احمد

سوتے وقت لیں۔ انسولین لینے والوں کی شوگر اگر کنٹرول میں ہے تو روزہ ضرور رکھیں اور اگر نہیں ہے تو بالکل نہیں رکھیں، انسولین دن میں دو دفعہ لگتا ہے تو اس کو ایک دفعہ کردیں وہ بھی صرف رات والی لیں، اگر رمضان میں شوگر کا اتار چڑھاؤ ہو تو پریشان نہ ہوں کہ معمولات تبدیل ہوئے ہیں۔ مریض ضرورت محسوس کرے تو روزے کے دوران شوگر کا ٹیسٹ کیا جا سکتا ہے۔ صبح صبح شوگر کم ہونے کی صورت میں روزہ توڑا جا سکتا ہے اور اگر شام کا وقت ہے تو آرام کرنے سے بھی فرق پڑ سکتا ہے اور نہ پڑے تو متعلقہ انجکشن لگا کر اس مسئلے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ابصار علی

ماہر امراضِ گردہ، پتھری

گردے کے مریض کو دو وسیع گروپ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گردے کی پتھری کے ساتھ اور دوسرا وہ جن کے گردے اپنا فعل صحیح طور پر انجام نہیں دے رہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ان دونوں گروپوں

ڈاکٹر ابصار علی

میں فرق کیا جائے کیونکہ ان کے علاج کا طریقہ بہت مختلف اور اکثر مخالف ہوتا ہے۔ پتھری کے مریضوں کے ساتھ اہم بات یہ ہے کہ روزہ ان کی بیماری کو بگاڑ سکتا ہے۔ عام طور سے لوگوں کی اکثریت بغیر کسی مسئلے کے روزہ رکھ سکتی ہے انہیں سحری اور رات میں زیادہ پانی پینا ہوگا۔ بہتر ہے اگر سحری میں جلد اٹھ کر زیادہ پانی پیا جائے اگر مریض محسوس کرے کہ روزے کے دوران تکلیف بڑھ سکتی ہے تو وہ تکلیف سے بچنے کے لیے سحری میں تکلیف کی دوا لے سکتے ہیں، گردے کے مریضوں کے لیے پیراسیٹامول پیناڈول، کوپول محفوظ ترین دوا ہے۔ دوسرا گروپ کمزور گردہ یا گردے کی ناکامی کی وضاحت سوجن سے کی جاسکتی ہے وہ کم پانی پئیں اور روزہ اس معاملے میں ان کی مدد کرے گا۔ یوریا، گوشت کی ضمنی یا ثانوی پیداوار ہے لہٰذا یہ عام طور پر کم مقدار میں استعمال ہوتی ہے۔ ڈائیلاسس کے مریض ڈائیلاسس کے دنوں میں روزہ چھوڑ سکتے ہیں اور رمضان کے بعد کے دنوں میں روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ادویات سحری اور افطار کے وقت لی جاسکتی ہیں تین اوقات کی ادویات کھانے کے اوقات میں اور رات کے درمیان لی جا سکتی ہیں۔ مجموعی طور پر

گردے کے مریض تھوڑے رد و بدل کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ یہ اہم ہے کہ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کرلیا جائے کیونکہ ہر شخص کی احتیاط کی خاص ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ فیض

ماہر امراضِ نسواں

حاملہ خواتین اور فیڈ کرانے والی ماؤں کو روزہ نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ سحری میں وہ کچھ بھی

ڈاکٹر نجمہ فیض

کھالیں تین سے چار گھنٹوں میں ہضم ہوجاتا ہے اور 12 سے 14 گھنٹے بھوکا پیاسا رہنے سے بچے پر بھی اثر پڑتا ہے۔ پانی کی کمی سے یورین انفیکشن ہوجاتا ہے۔ دودھ 90% پانی پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے دن کے کئی گھنٹے جب ماں کے جسم میں پانی نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

جائے گا تو ماں میں پانی کی کمی سے بچے کی فیڈ بھی متاثر ہو جائے گی بہتر یہی ہے کہ اس حالت میں مائیں روزہ نہ رکھیں۔

قارئین! صحت انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ دوائی بے احتیاطی کے ساتھ غذائی بے اعتدالی بھی انسانی صحت کی بہت بڑی دشمن ہے۔ کسی بھی غذا کا ناسمجھی سے استعمال جان کے بجائے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ سو سحری و افطار میں غذائی اعتدال روزے داروں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ دودھ اور کھجور سحری و افطار کے لازمی جز ہیں۔ بلاشبہ دودھ کی غذائی اہمیت مسلم ہے۔ دودھ توانائی سے بھرپور غذا ہے۔ حضور انور ﷺ کا ارشاد ہے ”دودھ کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جو بیک وقت پانی اور غذا دونوں کی قائم مقام ہو۔“ دودھ میں شامل اجزا نہ صرف قوت بخش بلکہ دودھ کی افادیت بڑھانے کا باعث بھی ہیں۔ سحری میں دودھ کی بنی کوئی بھی غذا اعتدال کے ساتھ روزے داروں کے لیے غذائی افادیت کی حامل ہیں، یہ ہی نہیں نبی کریم ﷺ اکثر اوقات رات کو کھجور بھگو کر رکھ دیتے اور صبح اس کا پانی نوش فرماتے۔ اس سے جسم میں توانائی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی طبی مسئلہ نہ ہو تو سحری میں کھجور کا پانی دن بھر کی توانائی کے لیے مفید رہے گا۔ حضور انور ﷺ نے فرمایا ”جس گھر میں کھجور نہ ہو وہ گھر ایسا ہے جیسے اس میں کھانا نہ ہو۔“ روزے دار کے لیے کھجور کی غذائی طاقت اور افادیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ”رسول اکرم ﷺ پکی ہوئی تازہ کھجور سے روزہ افطار فرماتے تھے اگر وہ نہ ہو تو پرانی کھجور سے اور اگر وہ بھی نہ ہو تو پانی اور ستّو سے۔“

اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال احمد مدنی رقمطراز ہیں کہ تازہ کھجور، چھوارے یا پانی سے رسول اللہ ﷺ کے روزہ افطار کرنے میں بہت لطیف حکمت مضمر ہے۔ روزے کی وجہ سے معدہ غذا سے خالی ہو جاتا ہے۔ اب جگر کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں رہ جاتی جس کو وہ جذب کر کے قوئ اور اعضا کو بدل کے طور پر دے۔ شیریں چیز جگر کو بہت زیادہ مرغوب ہے۔ اس لیے جگر کی طرف بہت جلد سرایت کر جاتی ہے اور اگر تازہ کھجور ہے تو جگر اسے اور بھی زیادہ نرم کر کے قبول کرتا ہے چنانچہ اس سے قوئ اور جگر دونوں کو تقویت ملتی ہے اگر کھجور نہ ہو تو چھوارے اپنی شیرینی اور غذائیت کے لحاظ سے بہتر ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو پانی کے چند گھونٹ معدے کی لپٹ اور روزے کی گرمی کو بجھا دیتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کھانے کی خواہش ابھرتی ہے اور پوری رغبت سے کھانا کھایا جاتا ہے۔

یہ معلومات تو ہم نے برسبیلِ تذکرہ فراہم کر دیں۔ سحری و افطار میں روزے داروں کے غذائی استعمال اور احتیاط کے حوالے سے ہم نے ماہرِ غذا فائزہ خان سے پاکیزہ بہنوں کے لیے خصوصی گفتگو کی اور مختلف امراض میں مبتلا افراد کے ساتھ ساتھ صحتمند روزے داروں کے لیے بھی غذائی رہنمائی حاصل کی جو انشاءاللہ آپ کے لیے معلومات افزا ثابت ہوگی اور اگر اس سے ہمارے قارئین مستفیض ہو گئے تو گویا ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ لیکن اس سے قبل فائزہ خان کا مختصر تعارف پاکیزہ بہنوں کی نذر۔

ذہین، باصلاحیت، خوش اطوار، خوش گفتار اور خوش طبع فائزہ خان رعنا لیاقت علی خان کالج آف ہوم اکنامکس سے فوڈ اینڈ نیوٹریشن میں ایم ایس سی کی سند حاصل کرنے کے بعد گزشتہ کئی برسوں سے کڈنی سینٹر میں بحیثیت غذائی ماہر خوش اسلوبی سے اپنی منصبی ذمے داریاں نباہ رہی ہیں۔ گزشتہ تین برسوں سے پاکستان نیوٹریشن اینڈ ڈائی ٹیٹکس سوسائٹی کی وائس پریذیڈینٹ ہیں۔ فائزہ خان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ گزشتہ دو برسوں میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ نے تین عالمی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ ان میں سے پہلی کانفرنس ففتھ ایشین کانگریس آف ڈائی ٹیٹکس بنکاک میں دوسری کانفرنس ایلیون کانگریس

آف نیوٹریشن سنگا پور میں اور تیسری کانگریس آف انٹرنیشنل ڈائی بیٹک فیڈریشن دبئی میں منعقد ہوئی۔ آپ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں بحیثیت غذائی ماہر شرکت کرتی رہتی ہیں، ٹی وی ون سے صبح کی نشریات میں آپ نے چھ ماہ تک غذائی ماہر کی حیثیت سے شرکت کی علاوہ ازیں مختلف اخبارات میں غذا اور غذائیت پر آپ کے مضامین شائع ہو کر قارئین سے پسندیدگی کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ہم نے بھی پاکیزہ کے قارئین کے لیے فائزہ خان کی خدمات حاصل کیں۔ آپ بھی پڑھیں اور استفادہ کیجیے۔

س: پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ محض مریض ہی کے لیے نہیں صحتمند انسان کے لیے بھی پرہیز اور غذائی احتیاط کی کیا اہمیت ہے؟

ج: ساری اہمیت اسی کی ہے ”پرہیز علاج سے بہتر ہے“ کے مقولے کو عملی طور پر اپنی زندگی میں شامل کر لیجیے۔ زبان کا چٹخارہ وقتی طور پر لذت ضرور دیتا ہے مگر اس کے نتائج کبھی کبھی بہت خطرناک بھی ہوتے ہیں اگر مریض ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا اور ماہرِ غذا کے کہے پر غذا کا استعمال کرے تو بیماری پر قابو پا سکتا ہے۔ ہمارے جسم کو توانائی کی ضرورت ہوتی ہے غیر ضروری چکنائی کی نہیں اور اس سے بچنے کا بہترین ذریعہ غذائیت سے بھرپور صحت بخش اشیا کا مناسب استعمال ہے۔ لیکن اکثر مریض اس جانب دھیان نہیں دیتے۔ ایک مرتبہ ذیابیطس کے ایک مریض میرے پاس تشریف لائے۔ جن کی شوگر بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے تک وہ مجھ سے مشورہ طلب کرتے رہے میں انہیں سمجھاتی رہی بڑھتی ہوئی شوگر کے نقصانات اور اس کے نتیجے میں مزید بیماریوں اور اس کے نقصانات کے بارے میں بھی بتایا۔ علاج کے ساتھ غذائی پرہیز اور احتیاط کے بارے میں بتاتی رہی موصوف میری تمام باتیں سن چکے تو فرمانے لگے میٹھا خاص کر رس گلے، ربڑی اور شیرمال کھانا تو نہیں چھوڑ سکتا گویا میری ساری محنت ضائع گئی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شوگر کا مریض جب مسلسل میٹھا کھانے پر اصرار کرے تو ماہرِ غذا بھی کیا کرے؟ ان سے تو کچھ نہ کہہ سکی ہاں دل میں سوچتی رہ گئی ان کی تو وہ مثال ہے ”جان جائے خرابی سے ہاتھ نہ رکے رکابی سے“ لیکن پاکیزہ کے لیے میں اس یقین کے ساتھ مشورے دے رہی ہوں کہ ہماری باشعور پاکیزہ بہنیں صرف پڑھیں گی ہی نہیں ان پر عمل بھی کریں گی۔ انشاءاللہ

س: فائزہ! آپ ہمیں بتائیں گی کہ دل کے امراض ہائی بلڈ پریشر، کولیسٹرول، ذیابیطس، گردے اور پیٹ کے امراض میں مبتلا روزے داروں کو سحری و افطار میں کون سی غذائیں استعمال کرنی چاہئیں اور کن سے اجتناب برتنا چاہیے؟

ج: دل کے امراض، ہائی بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کا شکار روزے داروں کے لیے ضروری

فائزہ

ہے کہ سحری ہو یا افطار صحت بخش غذا کو اپنا معمول بنالیں چکنائی اور نمک سے بھرپور غذاؤں کا برائے نام استعمال کریں۔ دل اور اس سے متعلقہ امراض میں ریشے کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ریشے دار

WWW.PAKSOCIETY.COM

غذاؤں میں اناج بغیر چھنے آٹے کی روٹی، سبزیاں، پھل، دالیں (چھلکے والی) لوبیا، چنے وغیرہ شامل ہیں۔ تلی ہوئی بازار کی اشیا سے پرہیز کریں جبکہ ہلکے تیل میں بنے ہوئے پراٹھے اور انڈے کی سفیدی کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ کھجلہ، پھینی میں گھی کی بڑی مقدار شامل ہوتی ہے لہٰذا بغیر چکنائی والے دودھ میں پکی ہوئی سویاں اس کے متبادل استعمال کرسکتے ہیں۔ افطار میں چھولے کی ابلی ہوئی چاٹ، تازہ کٹے ہوئے پھل کا استعمال مفید ہے، اسی طرح کم چکنائی والے دودھ یا دہی سے بنے مشروبات بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں مرغی یا مچھلی کے گوشت کو...سبزی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے جبکہ بغیر چربی والا گائے یا بکرے کا گوشت مناسب مقدار میں ہفتے میں ایک بار سبزیوں کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ انجائنا کے مریض بطورِ خاص چکنائی اور نمک سے پرہیز کریں۔ ان کے لیے ناریل دم کیا ہوا بغیر چینی کا قہوہ بہت مفید ثابت ہوگا جو وہ رمضان میں 2 سے 3 کپ پی سکتے ہیں۔

ذیابیطس کی مختلف اقسام میں مرض کی پیچیدگی کے پیشِ نظر روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کریں تاکہ وہ دوائی یا انسولین کی مقدار اور صحیح وقت کا تعین کرسکے۔ اگر وزن قد کے حساب سے مناسب رینج میں ہے تو کم مقدار میں چکنائی والی اشیا استعمال کی جاسکتی ہیں یوں بھی غذا قد، وزن اور روٹین لائف (جو ہر ایک کا جدا ہوتا ہے) کے مطابق لی جاتی ہے۔ جیسے سحری میں چکی والے آٹے سے بنا ہوا پراٹھا، انڈے کی سفیدی، مرغی کے کباب یا دہی کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں کو سحری میں اس لیے بھاری غذا لینے کو کہتے ہیں کہ دن کے کئی گھنٹے انہیں خالی پیٹ رہنا پڑتا ہے۔ اسی طرح افطار میں چھولے کی چاٹ، فروٹ چاٹ (چینی کے بغیر) اور ایک دو کھجور سے روزہ افطار کیا جاسکتا ہے مشروبات اور تلی ہوئی اشیا سے پرہیز کریں اور اگر لیں تو بہت ذرا سی۔ رات کے کھانے میں مرغی، مچھلی، سبزی کے ساتھ بھوسے والی روٹی یا چاول کا استعمال کرسکتے ہیں۔ ذیابیطس کے وہ مریض جن کے گردے متاثر ہیں ان کو کھجوریں، تازہ پھلوں کے رس اور بیسن وغیرہ کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے بہتر ہے مریض رمضان میں اپنی کیفیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی بھی غذائی ماہر کی ہدایت کے مطابق روزہ رکھے۔

گردے کے امراض کی کئی اقسام ہیں، مثلاً گردے کی پتھری، انفیکشن، گردے میں سوجن کی بیماری اور گردے کی کارکردگی کا متاثر ہونا ان تمام صورتوں میں مرض کی نوعیت کے حساب سے غذائی ہدایات دی جاتی ہیں، سو ہر بیماری کی ہدایات بھی مختلف ہوتی ہیں رمضان میں چونکہ عموماً کھانے کے معمولات میں خاصی تبدیلی ہوتی ہے اس لیے جو گردے کی خرابی کا شکار یا ڈائیلاسس پر ہیں ان کو اپنے معالج سے مشورہ لازم ہے۔ ان کو خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ غذا میں تازہ پھلوں کے رس، بیسن اور اس سے بنی ہوئی اشیا چھولے، لوبیا اور کھجوروں کا استعمال نہایت احتیاط سے کریں کہ ان اشیا کا استعمال خون میں پوٹاشیم کی مقدار حد سے زیادہ بڑھا سکتا ہے اور پیچیدگیاں پیدا کرسکتا ہے لہٰذا ڈاکٹر کی ہدایت سے اپنے غذائی ماہر سے مشورہ لازمی ہے۔

گردے کی پتھری اور انفیکشن کے مریض پانی زیادہ سے زیادہ مقدار میں افطار کے بعد سے لے سکتے ہیں۔ مشروبات میں شکر و نمک بالکل شامل نہ کریں۔ رس والے مختلف پھلوں کے رس سودمند ثابت ہوسکتے ہیں مثلاً لیموں کا رس، روزانہ پپیں، گرین بیری کا جوس پتھری کے مریض افطار میں پی سکتے ہیں مفید ہے۔ دودھ، دہی یا کیلشیم والی غذا کا استعمال سحری و افطار میں آدھے سے ایک کپ ضرور کریں۔

پیٹ کے امراض، معدے کے السر، تیزابیت اور

گیس میں مبتلا افراد میں بہت زیادہ چکنائی اور تیز مرچ مسالے کا استعمال مرض میں پیچیدگی پیدا کرسکتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ کم چکنائی، کم مسالے والی ہلکی پھلکی اور متوازن غذا استعمال کریں، اس سے تیزابیت بھی قابو میں رہتی ہے ورنہ افطار میں خوب پیٹ بھر کر مرغن غذائیں لینے سے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ہمارے یہاں افطار میں کولڈ ڈرنک کا استعمال غیر ضروری طور پر بڑھ گیا ہے۔ ایک صحتمند انسان کو اس کے استعمال سے تیزابیت کا مسئلہ ہوجاتا ہے مریض تو پھر مریض ہے۔ اس لیے سحر و افطار کے بعد ہلکی پھلکی چہل قدمی ایسے لوگوں کے لیے فائدہ مند ہے۔

س: کیا سحری یا افطار کے بعد فوری لیٹنے یا سونے سے نظام ہضم متاثر ہوتا ہے؟

ج: یقیناً اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ خوب ڈٹ کر سحری یا افطاری کے بعد فوراً لیٹنے اور سونے سے تیزابیت اور گیس کا مسئلہ ہوجاتا ہے۔ افطار زیادہ تر تلی ہوئی اور مرغن اشیا پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر گھر میں موجود خواتین افطار کے مینو کی ترتیب ایسے رکھیں کہ صحت بخش غذاؤں کی تعداد زیادہ ہو اور چکنائی والے کھانے کم ہوں تو اس قسم کی غذا مکمل توانائی فراہم کرے گی جو روزے دار کی جسمانی ضروریات کو پورا کرسکے گی چھولے، لوبیا (ابلے ہوئے) چاٹ، پھلوں کی چاٹ، فروٹ جوس کے ساتھ، دودھ دہی والے مشروبات کا استعمال افطار کے لیے بہترین ہے۔

س: آپ تخلیق کے مراحل طے کرنے والی اور فیڈ کرانے والی روزے دار ماؤں کے غذائی استعمال و احتیاط کے لیے کیا کہیں گی جن کا بلڈ پریشر ہائی یا لو ہو جاتا ہے؟

ج: عام طور پر ایسی خواتین کو ڈاکٹر کی جانب سے روزہ رکھنے کی ممانعت ہوتی ہے، اگر خواتین روزہ رکھنا چاہیں تو انہیں ایسی خوراک استعمال کرنی چاہیے جس میں وہ تمام غذائی اجزا اور اتنی مقدار میں شامل ہوں جو ماں اور بچے دونوں کی غذائی ضرورت بھی پوری کررہے ہوں اور دونوں کے لیے صحت بخش بھی ہوں۔ مثلاً اپنی خوراک .... ایک گنا بڑھا لیں کہ اس دوران 2200 سے 2500 کیلوریز کی ضرورت

ماہِ رمضان

مومنو!
لو آہٹیں قریب آرہی ہیں
ماہِ رمضان کی
نور ہی نور برسا رہی ہیں
جگ پر رحمتیں رمضان کی
مومنو!
لوٹ لو لوٹ یہ میلہ
عبادتوں کا
کہ دل و روح پر
سحر پھیلا رہی ہیں تلاوتیں قرآن کی
ہے اِک اِک گھڑی
قبولیت کی رمضان میں
مانگ لو مانگ لو
رب سے ہر اِک حاجت
دل کی رمضان میں
ہے پکار ہر روز رمضان میں
ہر گھڑی سحر و افطار میں
بٹ رہی ہیں
سخاوتیں پروردگار کی

مرسلہ: نسیم ...... کراچی

ہوتی ہے۔ اور 60 گرام پروٹین بھی درکار ہوتی ہے جسے کور کرنے کے لیے چاول، آلو، چپاتی مرغی کا سالن، شامی کباب، بھنا ہوا قیمہ غذا میں شامل کر لیں۔ کٹے ہوئے پھلوں کا ایک پیالہ، دلیا، کھیر، کسٹرڈ، انڈا وغیرہ جس میں نشاستہ زیادہ ہو سحری میں لیں۔ پانی اور لکوڈ کی مقدار 2 سے 3 کپ ضروری ہے۔ فروٹ جوس لے لیں۔ افطار میں دالوں کا استعمال زیادہ کریں دودھ اور دہی سے بنی ہوئی کوئی بھی غذا ضرور لیں۔ کھجور، فروٹ، سبزی کے پکوڑے اور کوئی پھل لے لیں لیکن بہت زیادہ چکنائی اور تیز نمک سے پرہیز کریں کہ اس سے تیزابیت اور بلڈ پریشر بڑھنے کے ساتھ اور دوسری بیماریوں کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ کھانا انہیں مغرب کی نماز کے بعد کھانا چاہیے۔ مرغی، مچھلی، گوشت کا سالن مناسب رہے گا۔ سوتے وقت دودھ کا گلاس ضرور لیں۔ سحری میں وقت کی کمی کے سبب جسم میں غذائی طاقت برقرار رکھنے کے لیے بہتر یہی ہے کہ دو کھانوں میں اس طرح اپنی غذا تقسیم کر لیں کہ سحری، افطار اور رات کے کھانے میں یہ کور ہو جائے اور متوازن غذا جسم میں پہنچے۔ دودھ بطورِ خاص ضرور استعمال کریں۔ روزے میں بعض خواتین کا بلڈ پریشر بہت لو ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ماں کے خون کے ذریعے بچے کو درست غذا نہیں مل پاتی کیونکہ ماں کا شوگر لیول کم ہو جاتا ہے تو بچے کی صحت اور گروتھ متاثر ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ روزے دار مائیں اگر غذائی احتیاط پر توجہ دیں تو ماں اور بچے کی صحت متاثر نہیں ہوگی۔ فیڈ کرانے والی ماں کو 3000 کیلوریز اور 60 گرام پروٹین کی ضرورت ہوتی ہے جو آلو، چپاتی اور چاول سے پوری کی جاسکتی ہے۔ ایسی مائیں 3 کپ دودھ ضرور پئیں اور چینی کے استعمال میں احتیاط برتیں بلکہ کوشش کریں کہ چینی کے بجائے شہد یا گڑ لے لیں، پانی جتنا ممکن ہو سکے پی لیں لیکن شربت کے زیادہ استعمال سے پرہیز کریں۔ بہت زیادہ تلی ہوئی اشیا اور تیز مسالوں سے بھی گریز کریں کہ اس سے سینے میں جلن ہوتی ہے۔ ہلکے مسالے کے دال کے دہی بڑے بنا لیں۔

س: اگر ایسی خواتین ذیابیطس میں مبتلا ہیں اور انسولین بھی لیتی ہوں تو؟

ج: ایسی خواتین کو 2300 سے 2500 تک کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے انہیں چاہیے کہ سحر و افطار میں انسولین کو ایڈجسٹ کر لیں اور ایسی اشیا سے پرہیز کریں جن سے ذیابیطس بڑھنے کا اندیشہ ہو۔ ریشے والی اشیا کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں۔

س: ساٹھ سال سے زائد عمر کی روزے دار خواتین کے لیے کیا غذائی ہدایات دیں گی؟

ج: اس عمر میں عموماً مختلف بیماریوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے خواتین کی قوتِ ہاضمہ کمزور ہو جاتی ہے تو وہ کھانا ہضم نہیں کر پاتیں۔ اور ذرا بھی زیادہ کھانا ان کا معدہ قبول نہیں کر پاتا اس صورت میں ڈائریا بھی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں سینے کی جلن پیٹ کا درد اور دوسری بیماریاں بھی بڑھ سکتی ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ڈبل روٹی کے سینڈوچ میں چکن اور سبزی ڈال کر کھائیں تلی ہوئی اشیا کم سے کم کھانا ہی ان کے لیے بہتر ہے۔

س: اکثر لوگ بھرپور سحری کھانے کے باوجود دن بھر بھوک لگنے اور کمزوری کی شکایت کرتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے اور اس کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

ج: اگر سحری میں متناسب غذا استعمال کی جائے تو دن میں کمزوری اور شکایت سے بچا جا سکتا ہے مثلاً کمپلیکس کاربوہائیڈریٹ جس میں بھوسی والے اناج کی روٹی، دلیا وغیرہ، پروٹین والی اشیا انڈا، مرغی، قیمہ یا کباب وغیرہ اور اس کے ساتھ دودھ یا دہی کا استعمال جو آہستہ آہستہ خون میں جذب ہو کر آپ کو پورے دن توانائی فراہم کرتا ہے۔ جبکہ بہت زیادہ شکر یا نشاستہ (ریفائنڈ کاربوہائیڈریٹ) کا استعمال فوری طور پر طاقت تو فراہم کرتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں جسم میں اضافی انسولین پیدا ہو جاتی ہے جو کہ خون میں بڑھی ہوئی شکر کی مقدار کو جذب کر کے دوبارہ خون میں شکر کی سطح کو کم کر دیتی ہے جس کی وجہ سے دوبارہ بھوک کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جبکہ کمپلیکس کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین کے استعمال سے چار پانچ گھنٹے کے دورانیے میں آہستہ آہستہ خون میں جذب ہو کر زیادہ دیر توانائی فراہم کرتے ہیں۔

س: روزہ کس سے کھولنا چاہیے؟

ج: روزہ کھولنے کے لیے کھجور کا استعمال اور پھلوں کے رس کا استعمال فوری توانائی فراہم کرتا ہے۔

س: بعض لوگ افطار کے دوران پانی و مشروبات کا بکثرت استعمال کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

ج: بکثرت استعمال کسی بھی شے کا مضرِ صحت ہوتا ہے۔ بیمار افراد اپنے معالج کی ہدایت کے مطابق پانی اور مشروبات کا استعمال کریں لیکن صحت مند افراد کے لیے روزہ افطار کے بعد پانی اور مشروبات کا استعمال بہت اچھا ہے لیکن تازہ پھلوں، دودھ اور دہی میں بنے مشروبات کو ترجیح دیں تو بہتر ہے۔ جو لوگ زیادہ کافی یا چائے پینے کے عادی ہیں رمضان سے ہفتہ بھر پہلے کافی کی مقدار کو کم کر دیں تا کہ اچانک caffeine کے استعمال کو ترک کرنے سے روزے کے درمیان ان کو کوئی شکایت نہ ہو یا کم سے کم ہو۔

س: رمضان میں بعض روزے داروں کا وزن بڑھ جاتا ہے اس کا بنیادی سبب کیا ہے؟ وزن اعتدال میں رکھنے کے لیے کیسی غذائی احتیاط کی ضرورت ہے؟

ج: جن افراد کو یہ شکایت ہے ان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ غذا میں بہت زیادہ چکنائی اور مٹھاس وغیرہ احتیاط سے استعمال کریں مثلاً تلی ہوئی اشیا میں صرف ایک آئٹم افطار مینو میں رکھیں۔ جیسے سموسہ یا پکوڑے۔ اسی طرح مشروبات میں شکر کا استعمال کم سے کم رکھیں پھل، چھولے، لوبیا، سبزیوں کا استعمال کرنے سے اور شکر اور چکنائی والی اشیا کو محدود مقدار میں لینے سے ہرگز ممکن نہیں کہ وہ وزن میں زیادتی کا شکار ہوں۔ ایک اندازے کے مطابق 1 سموسہ یا 5-3 عدد پکوڑوں میں 350-300 حرارے یا کیلوریز حاصل ہوتے ہیں۔ 1 کھانے کے چمچے تیل سے 120-100 کیلوریز اور 1 چمچ کھانے کا شربت سے تقریباً 100 کیلوریز۔ اسی طرح جتنے زیادہ مقدار میں شامل کریں گے وہ جسم کی ضرورت پوری کرنے کے بعد والی مقدار جسم میں چربی کی صورت میں جمع ہو گی۔

س: وزن اعتدال میں رکھنے کے لیے رمضان میں ورزش معاون ثابت ہو سکتی ہے؟

ج: ورزش یا واک کو روزمرہ کے معمولات میں شامل کرنے سے بھی بڑھتے ہوئے وزن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بہت زیادہ مرغن کھانے کے استعمال سے سستی میں اضافہ ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا کوشش کریں سحری کے بعد اپنے ضروری اور محنت طلب کام صبح کے اوقات میں سرانجام دیں اور دوپہر یا سہ پہر ہلکے پھلکے کاموں کے لیے وقف کر دیں۔

س: شدید گرمی اور برسات میں روزے داروں کو کیسی غذائی احتیاط کی ضرورت ہے کہ وہ موسم کے اثر سے محفوظ رہ سکیں؟

ج: شدید گرمی اور برسات کے موسم میں کوشش یہی کرنی چاہیے کہ صاف ستھری گھر کی بنی ہوئی چیزوں کا استعمال کریں، افطار میں تازہ پھلوں کے رس والے مشروبات، ملک شیک یا دودھ اور دہی کے مشروبات فوری توانائی اور ٹھنڈک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ مانا کہ تلے ہوئے پکوان برسات اور رمضان دونوں میں لطف دیتے ہیں اور جب رمضان اور برسات ایک ساتھ آئیں تو تلے ہوئے پکوان کا لطف ہی دوبالا ہو جائے گا لیکن ان کے بکثرت استعمال کا ردِعمل پیٹ کی بیماریوں کی صورت میں ظاہر ہو گیا تو سارا مزہ کرکرا بھی ہو جائے گا اس لیے تلی ہوئی اشیا کے استعمال میں اعتدال اور احتیاط برتیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

رجا فاطمہ

30 مئی کو نگہت اعظمی کی کتاب ”آبگینے“ کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں لوگوں کی اتنی زیادہ تعداد تھی کہ صدرِ محفل محمود شام صاحب نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ برسوں بعد آرٹس کونسل میں کسی ادبی تقریب میں اتنا رش دیکھنے میں نظر آرہا ہے۔ اس تقریب کا اہتمام انٹرنیشنل یوتھ فورم اور یوتھ ڈریم وژن نے کیا تھا۔ مہمانوں میں سب سے پہلے سیما مناف اور شائستہ عزیز تشریف لائیں۔ پھر سکینہ فرخ تشریف لائیں۔ سکینہ فرخ جتنا اچھا لکھتی ہیں ان کی شخصیت بھی اتنی ہی دلکش ہے۔ پھر انجم انصار تشریف لائیں۔ انجم انصار بہت دور سے آئی تھیں لیکن گیسٹ اسپیکرز میں سب سے پہلے پہنچ گئیں۔ انجم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے کہ جن کی شخصیت بھی دلکش اور دل آویز ہے اور جن کے لہجے اور باتوں سے گویا پھول جھڑتے ہیں۔

انجم انصار کے آنے سے پہلے فریدہ مسرور اپنے بیٹے کے ساتھ تشریف لائیں۔ فریدہ کو دیکھ کر لگتا ہے وقت انہیں چھو کر نہیں گزرا۔ ساتھ مصنفہ کی خالہ زبیدہ باجی، شاہدہ باجی، ممانی عزت بھابی اور بہت ڈیسنٹ اور خوب صورت لکھنے والی بہت خوب صورت رائٹر ثریا انجم تشریف لائیں۔ لوگ آرہے تھے اور نشستیں بھرتی جارہی تھیں۔ رخسانہ سہام مرزا آئیں وہ آج بھی اس قدر دلکش ہیں کہ ان کو دیکھ کر آنکھوں کی چمک بڑھ گئی پھر منزہ سہام محفل میں آئیں تو محفل ہی سج گئی ہر طرف جیسے اجالا ہوگیا۔ منزہ کے ساتھ غزالہ رشید اور ناصر بھائی بھی تھے۔

ان رائٹرز کے علاوہ جن جن رائٹرز نے محفل کو رونق بخشی ان میں شگفتہ سی، شگفتہ شفیق بہت نازک سنبل، بے حد ڈیسنٹ اور باوقار صبیحہ شاہ، خوش مزاج مسکراتی روحیلہ خان، بے حد خوب صورت تحریریں لکھنے والی اپنی تحریروں کی طرح دلکش رضیہ مہدی، خلوص کا پیکر پرویز بلگرامی، ڈیسنٹ اختر شہاب ایسا لگ رہا تھا جیسے رائٹرز کہکشاں کی صورت میں ایک جگہ جمع ہیں۔

نعتِ رسول مقبول ﷺ کے بعد معروف رائٹر اور ریڈیو پروڈیوسر سیما رضا نے گفتگو کا آغاز کیا۔ سیما خود بھی رائٹر ہیں اور ریڈیو میں صدا کاری بھی کرتی ہیں لہٰذا ان کی کمپیئرنگ میں بولنے کا سلیقہ بھی نظر آتا ہے۔

سیما نے سب سے پہلے انجم انصار کو اظہارِ خیال کی دعوت دی انجم جتنا اچھا لکھتی ہیں اتنا اچھا بولتی بھی ہیں۔ انہوں نے بہت مختصر وقت میں بہت خوب صورت انداز سے مصنفہ کی تحریروں پر اپنا تجزیہ پیش کیا۔ انجم کی تقریر مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع اور بھرپور تھی بلکہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر اور اپنے اندازِ گفتگو سے سامعین کو محظوظ کریں۔

دائیں صوبائی وزیرِ تعلیم پیر مظہر الحق، مہمانِ خصوصی محمود شام، انجم انصار، رخسانہ سہام مرزا، نگہت اعظمی، سیما رضا اور طلعت آفتاب ڈائس پر

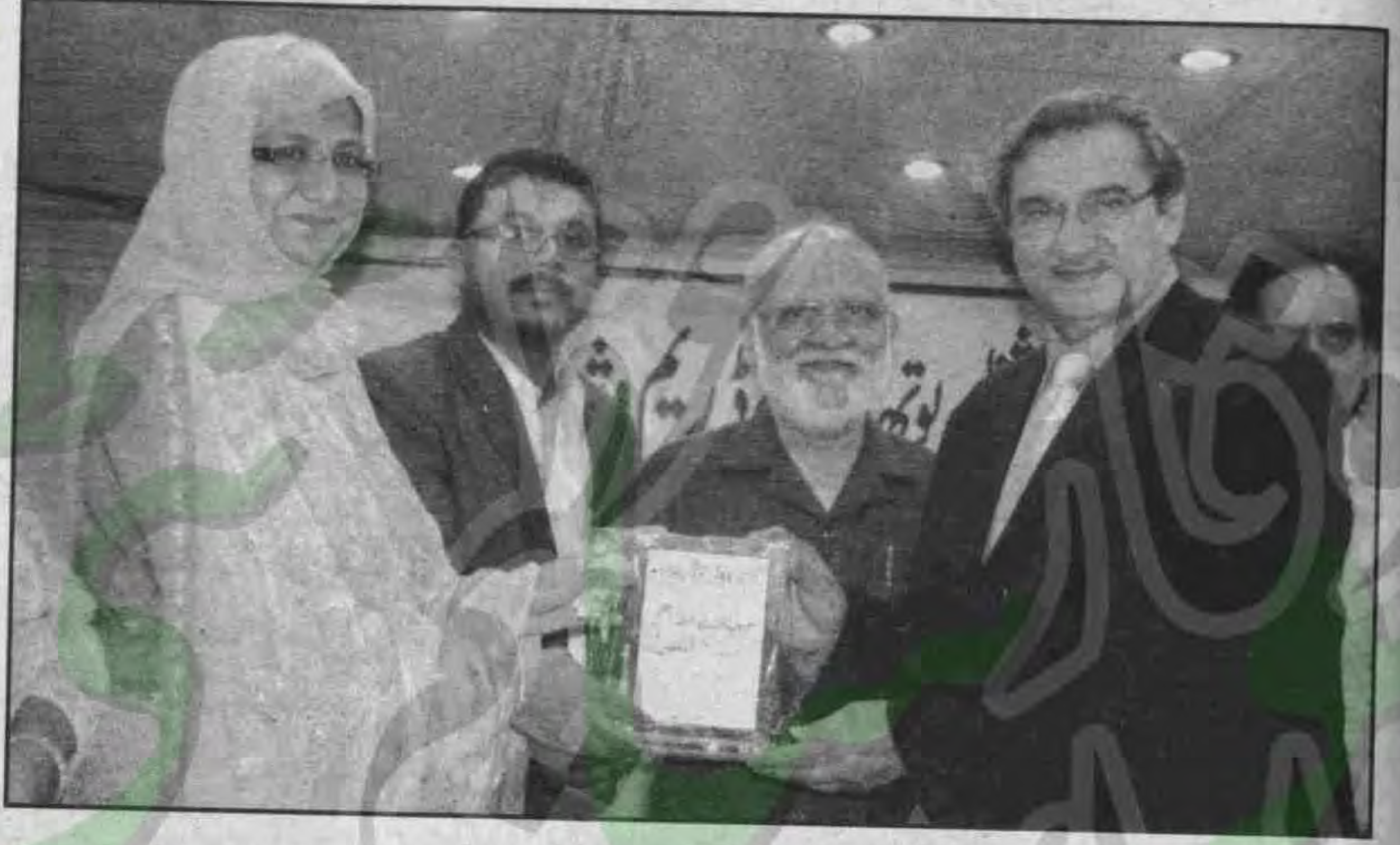

مصنفہ نگہت اعظمی صوبائی وزیرِ تعلیم پیر مظہر الحق کے ساتھ

انجم انصار کے بعد طلعت آفتاب صاحبہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ طلعت آفتاب کے بعد نسرین پرویز صاحبہ مائیک پر تشریف لائیں۔ انہوں نے میڈیا اور آج کل کے حالات کے بارے میں زیادہ گفتگو کی انہوں نے یہ بھی کہا کہ آبگینے کے دو افسانے ”بے موت“ اور ”آبگینے“ انہیں.... خاص طور پر زیادہ پسند آئے۔

پھر دعوت دی گئی بہت ہی خوب صورت اور دلکش خاتون کو کہ جن کا نام رخسانہ سہام مرزا ہے انہوں نے بہت مختصر تقریر کی اور مصنفہ کے افسانوں کی تعریف کی ان کے افسانے حقیقت سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ان کی تقریر کو بہت پسند کیا گیا۔

اس تقریب میں ایک مختصر مکالمہ بھی پیش کیا گیا جیسے ٹی وی کے نامور رائٹر دانش اقبال صاحب نے تحریر کیا تھا اور بہت منجھے ہوئے آرٹسٹ ارسلان اور بینش نے پیش کیا۔ اس میں ڈائجسٹوں کے حوالے سے مزاحیہ مکالمے بیان کیے گئے جنہیں حاضرین نے خاصا پسند کیا۔ لیکن کچھ لوگوں کو اعتراض بھی ہوا۔

رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کے بعد مصنفہ نگہت اعظمی کو اظہارِ خیال کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں تقریب منعقد کرنے کا بنیادی مقصد اور اپنی کتابوں ”آبگینے“ اور ”ہر اشک اِک ستارہ“ کا تعارف کرایا۔ اپنے والدین اور ان محسنوں کا ذکر کیا جنوں نے لکھنے کے حوالے سے ان کی حوصلہ افزائی کی جیسے احمد ندیم قاسمی، سہام مرزا اور انجم انصار اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مصنفہ کی تقریر کے بعد مہمانِ خصوصی صوبائی وزیرِ تعلیم پیر مظہر الحق صاحب نے مصنفہ کو شیلڈ پیش کی اور تمام گیسٹ اسپیکرز کو بھی شیلڈز پیش کی گئیں۔ شیلڈز کی کارروائی کے بعد محمود شام صاحب مائیک پر تشریف لائے۔ آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں آبگینے کے ٹائٹل، اس کی انفرادیت اور اس میں موجود افسانوں کی تعریف کی ان کی تقریر کو بھی حاضرین نے بہت پسند کیا پھر مہمانِ خصوصی نے خطاب کیا اور اس تقریب کو بھرپور تقریب قرار دیا۔

تقریب مجموعی طور پر کامیاب رہی جس کے لیے یوتھ انٹرنیشنل فورم ڈریم وژن فورم اور ماہنامہ دوشیزہ کے اراکین خاص طور پر سیما رضا، خرم شہزاد، آصف، منزہ سہام مرزا، دانش اقبال صاحب کی محنت اور لگن قابلِ تعریف ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

☆ حمد وستائس اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ آپ سب کو دلی مبارک باد، رمضان المبارک کی اور دوسری زبردست مبارک باد یہ کہ اس مرتبہ ہم جشن آزادی رمضان المبارک میں منارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو سلامت رکھے اور ہم سب کے دلوں میں وطن کی محبت اور اس کے لیے مثبت کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆ عزیز بہنوں، معاف کرنا فراغ قلبی کا ایک اقدام ہے لیکن یہ اس وقت بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب کوئی تلخی یا زخم دل کی گہرائیوں میں جا پہنچے۔ عام طور پر اس کا اندازہ خاصا وقت گزارنے کے بعد ہوتا ہے۔ کسی پیارے کے ساتھ ناراضی دونوں کے لیے کتنی اذیت ناک ہے۔ کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دینا کوئی مشکل بات نہیں اس سے زبردست آسودگی ملتی ہے۔ آپ نے بھی یقیناً ایسے بہت سے بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے والدین کی قبروں پر جا کر تاسف کرتے ضرور دیکھا ہوگا کہ وہ ان کی زندگی میں کیوں جھگڑتے اور تلخ رویے کا اظہار کرتے رہے لیکن اس وقت معذرت کرنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے کیونکہ جب کوئی دنیا سے ہی چلا جائے تو بہت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

اور ہمیں یہ دیر ہرگز نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے قبل ہمارا یا دوسرے کا ابدی سفر پر جانے کا وقت آجائے۔ ساری زندگی کسی نے نہیں جینا۔ موت کا ذائقہ ہر نفس نے چکھنا ہے تو پھر ہم اپنے رویوں، لہجوں اور ردِعمل سے زندہ لوگوں کو زندہ در گور کر دینے پر کیوں تلے رہتے ہیں۔ آئیں ہم سب ان لوگوں سے جا کر صلح کر لیں، معافی مانگ لیں جن کو ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔ پاکیزہ کی مدیرہ ہونے کے ناتے بہت سے لوگ اگر مجھ سے خوش ہیں اور مجھے پسند بھی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ مجھ سے ناراض بھی یقیناً ہوں گے اگر میری کسی بات، بولنے یا لکھنے کے سبب، کسی بھی حوالے سے کسی کی بھی دل آزاری ہوئی ہو تو میں ان سب سے معافی مانگتی ہوں۔ گزشتہ سال ایسی ہی ایک سطر پڑھ کر لبنیٰ عروج نے مجھ سے رابطہ کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے ناراض تھیں اور مجھے اس کا علم ہی نہیں تھا اس لیے کوئی بھی مصنفہ، تبصرہ نگار یا قاری بہن مجھ سے ناراض ہو تو پلیز مجھے معاف کر دیں۔ اگر ہم انا کے مینار پر چڑھے رہیں گے اور ہمیشہ اپنی ہر بات صحیح اور دوسرے کی ہر بات غلط سمجھتے رہیں گے تو غلط فہمیاں اپنی راہ استوار کر لیا کرتی ہیں اور ناراضی کی پہلی کونپل غلط فہمی کے بیج سے ہی پھوٹتی ہے۔ میں نے بھی معافی مانگ لی ہے اس لیے آپ بھی اپنے رشتے داروں، دوستوں سے ضرور معافی مانگ لیں اور اگر میں یا آپ ایسا نہیں کریں گے تو کیا ہمارے روزے قبول ہوں گے، پلیز اللہ کی رضا کے لیے اپنے رب کی خوشی کے لیے روٹھے ہوئے عزیز و اقارب کو منا لیجیے۔ انہیں معاف کر دیجیے...... یا معافی مانگ لیجیے کہ ہمارا رب اس بات کو پسند کرتا ہے۔ (آج ہی سے)

☆ آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل درودِ ابراہیمیؑ پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ (ابھی پڑھ لیں) آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحنك انی كنت من الظالمين

* * *

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری کرن نذیر ان دنوں امریکا سے اسلام آباد آئی ہوئی ہیں۔ وہ امریکا کی ایک یونیورسٹی میں ڈائجسٹ میں لکھنے والی رائٹرز پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہم سے ایک تفصیلی گفتگو کی۔

☆ مصنف اور ڈراما نگار رامس تنویر، کراچی کی شادی گزشتہ دنوں ہانیہ قاضی کے ساتھ خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسرت رانی خلیل، کراچی کے ہاں پوتی ہوئی ہے جس کا نام حریم عرفان رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ کپل آف فیصل آباد کو شاید نظر لگ گئی ہے۔ ہماری تبصرہ نگار شگفتہ ان دنوں خاصی پریشان ہیں۔ ان کے شوہر ناصر صاحب بسترِ علالت پر ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مصنفہ مدیحہ عدنان نے بہاول پور میں اپنا بوتیک کھول لیا ہے۔ (ماشاء اللہ، مبارک باد)

☆ ہماری ہنستی مسکراتی مصنفہ لبنیٰ عروج اسلام آباد ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ عمیرہ احمد کا ٹی وی سیریل شہر ذات ان دنوں ایک نجی ٹی پر دکھایا جا رہا ہے۔ ہر جمعہ کی شب 8 بجے اور بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ (مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ سیما مناف کے اس وقت تین سیریل ان دنوں ٹی وی کے مختلف چینلز سے دکھائے جارہے ہیں۔ تلافی میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ بہت اچھا ہے۔ (مبارک باد)

☆ آپ کی باجی انجم انصار کے دو سوپ اٹکھیلیاں اور چاندنی بفضل خداد و مختلف چینلز سے دکھائے جارہے ہیں اور پسندیدگی کی سند حاصل کر رہے ہیں۔ (مبارک باد)

☆ ہماری ابھرتی ہوئی ایک پیاری سی مصنفہ عتیقہ محمد بیگ کا ڈراما سیریل بہت جلد ٹی وی پر آن ائیر ہوگا۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ راحت وفا کا پاکیزہ میں شائع ہونے والا ناول ایک تھی نیناں کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ صفحات 352 قیمت 350 روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس علم و عرفان پبلیشرز الحمد مارکیٹ 40 اردو بازار، لاہور، فون نمبر 37232336۔

☆ کراچی میں مدفون مشاہیر یہ ایک کتاب ہے جس کی تحریر و تحقیق ایم آر شاہد کی ہے۔ یہ ایک منفرد کتاب ہے۔ پیدا ہونے والوں کے بارے میں تو بے شمار کتب ہیں کہ کون کب اور کہاں پیدا ہوا مگر مرنے والوں کے بارے میں ایسی کتاب میں نے تو پہلی بار ہی پڑھی ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں بزرگانِ دین کے بارے میں ہے۔ صفحات 590۔ قیمت 1000 روپے۔ ملنے کا پتا مقبول اکیڈمی 199 سرکلر روڈ، اردو بازار چوک، لاہور۔ فون نمبر 042.37324164۔

☆ عرضِ تمنا یہ نعتوں کا مجموعہ ہے جس کو لکھنے کی سعادت سعید بدر کو حاصل ہوئی ہے۔ سعید بدر کا شمار ان خوش بخت افراد میں ہوتا ہے جنہیں افکار کی بلندیوں کو چھوتے ہی مدحتِ رسول ﷺ کی توفیق حاصل ہوئی۔ صفحات 222. قیمت۔ 350 روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس۔ مقبول اکیڈمی 199 سرکلر روڈ اردو بازار، چوک، لاہور۔

☆ آپ کی باجی انجم انصار کا ناول محبت ہم سفر میری پاکیزہ میں قسط وار شائع ہونے کے بعد اب کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ جس کے صفحات 576 ہیں اور اس ضخیم ناول کی قیمت صرف پانچ سو روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا

ایڈریس القریش پبلی کیشنز سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور۔فون نمبر۔042.37652546۔میں اپنے قارئین کو یہ بتادوں۔محبت ہم سفر میری ٹی وی کے ایک چینل کے لیے لے لیا گیا ہے اور کچھ عرصے بعد آپ اس ناول کو سوپ کی صورت ٹی وی پر دیکھیں گے۔(انشاءاللہ)

اس صدی کا جدید ترین ترجمہ قرآن پاک عمدۃ البیان سابقہ سالوں کی طرح اس سال بھی ماہ رمضان المبارک کے آغاز سے قبل ملک اور بیرون ملک کے ہزاروں مستحقین میں فی سبیل اللہ تقسیم کیا جائے گا۔ محققین اور غربا کے لیے شائع کیے جانے والے اس خصوصی ایڈیشن میں اپنے عطیات اور زکوٰۃ وغیرہ بھی جمع کرواسکتے ہیں تاکہ قرآن پاک کو گھر گھر پہنچانے کا پروگرام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔

رابطہ۔رضویہ ٹرسٹ سنٹرل کمرشل مارکیٹ ماڈل ٹاؤن لاہور۔0423.6175173.0323.4393422۔

انتقالِ پُر ملال

☆ مصنفہ منیرہ عادل کے والد انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری صائمہ تبسم، ملتان کے بھائی چل بسے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مصباح رضا سعید، فیصل آباد کی چاچی کوثر سلیمی کی اس ماہ برسی ہے۔

نوٹ: مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ ساتھ تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

✍ نزہت اصغر، کراچی سے۔ ''کافی دنوں بعد تبصرہ بھیج رہی ہوں۔ ویسے حیرت ہوتی ہے بہنیں کس طرح ماشاءاللہ جلدی جلدی رسالہ پڑھ کر تبصرہ بھیج دیتی ہیں۔ سب اچھا ہے یا وہ اچھا نہیں لکھ کر بھیجنا آسان ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ تمام چیزیں پڑھ کر بھرپور تبصرہ آنا چاہیے جیسے ڈاکٹر ممتاز ضیا صاحبہ بھیجتی ہیں۔ رضوانہ پرنس کی اپنی کہانی بہت مزے کی مگر جذباتی تھی پھر ان کی تقریب کا احوال بھی، ویسے یہ تو اچھی بات ہے کہ کرنٹ تقریبات کا فوری احوال آجاتا ہے اس میں آپ کی مہارت کا بلاشبہ اظہار ہے۔ رخ چوہدری ہر دفعہ کورتج میں بازی لے جاتی ہیں، ویری گڈ۔ رضوانہ پرنس کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے بہت پُرلطف تقریب تھی۔ میرے لکھے ہوئے پاکیزہ سے پاکیزہ سا رشتہ کے جواب میں کافی کالز آئیں اور سب کو پرانی دوستیاں یاد آگئیں۔ عظمٰی عنبرین ڈی جی خان سے بات کی ہاں عظمٰی آپ سب بالکل یاد ہیں۔ ہاں ہماری رابعہ اسلم وڑائچ کہاں چلی گئیں۔ ویسے تمام رائٹرز قارئین کو سلام، دعائیں۔ انجم باجی آپ کا لکھا ڈراما اٹکھیلیاں کبھی کبھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ صائمہ قیصر بھی برابر اے پلس کے لیے تحریر کر رہی ہیں مگر کافی کچھ بجلی کی عدم موجودگی کی نذر ہو جاتا ہے۔ آپ کی سجائی گئی بہنوں کی محفل میں معلوم ہوتا ہے سب رشتے دار مل بیٹھ گئے ہیں آپ بھی ایک، ایک کی مصروفیت اور احوال نذرِ قلم کرتی ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے، دوریاں سمٹ جاتی ہیں۔ انجم باجی میری بیٹی ام البنین جو میٹرک میں ہے آپ کی تحریر جلترنگ کی خوب پبلسٹی کرتی ہے اور مزے لے کر سناتی بھی ہیں۔ نئے رائٹرز سے گزارش ہے کہ شروع ہی میں ناصحانہ انداز نہ اپنائیں افسانے کو افسانہ سمجھ کر لکھیں اگر پیغام پہنچ گیا ہے تو اس کی مزید تفصیل نہ لکھیں اس طرح کہانی کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی سوچ دینا اچھی بات ہے مگر خود اس سوچ پر مزید مضمون تحریر کر دینا اسی سوچ کی مات ہے۔ صرف صفحے بھرنا مقصد نہ ہو۔ امید ہے میری رائے سے اکثر رائٹرز متفق ہوں گی۔ عمیرہ احمد کی تحریر کی تعریف میں کوئی الفاظ نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تحریر آخر میں ہی پڑھنی چاہیے تاکہ منہ کا ذائقہ بالکل خراب نہ ہو۔ سچی بات ہے عکس پڑھ کر پھر کچھ پڑھنے کا دل نہیں چاہتا۔ یہ پاکیزہ سندیسوں کی جگہ بہنوں کی محفل کے صفحات بڑھا دیں۔ کھٹی ہری مرچ کی ترکیب بہت اچھی تھی نوٹ کر لی۔ کارنرز یا تراشوں میں کچھ کمی کر دیں بیچ بیچ میں اچھے لگتے ہیں مگر اب تو شاعری اتنی ہوتی ہے خیر سب کی پسند کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ہاں ایک ضروری بات عکس میں انگریزی کی غلطیوں پر توجہ کی ضرورت ہے۔ اسپیلنگ مسٹیک تمام تاثر خراب کر دیتی ہیں۔ عطیہ عمر کی تحریر کافی دنوں بعد پڑھی بہت سہل انداز میں بڑے

سے بڑا مسئلہ بیان کر دیتی ہیں اور انہیں آخر میں وعظ جیسے پیرے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ یہ تمام رائٹرز کو نوٹ کرنا چاہیے۔'' (پیاری نزہت اصغر، سب سے پہلے تو معذرت کہ آپ کا خط مجھے اس وقت ملا تھا جب بہنوں کی محفل تیار ہو کر جا چکی تھی اور ہاں اتنے دنوں بعد کیوں آئی ہو۔ مجھے اچھا لگتا ہے جب آپ کا تبصرہ اس محفل میں ہوتا ہے اور ہاں اپنی بیٹی کو میری جانب سے بہت سارا پیار اور آئندہ جب آپ آئیں تو اس کو اپنے ساتھ لے کر آنا ہے)

✍ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ''ابھی پاکیزہ ختم کیا تو سوچا کہ اس بار تو پاکیزہ پر تبصرہ کر لوں...... مجھے کچھ کہنا ہے کا اس بار کا ٹاپک زبردست ہے۔ بچے پھول ہوتے ہیں اور ان کی نگہداشت پھولوں کی طرح کرنی چاہیے۔ عکس کی پچھلی قسط مجھے پسند نہیں آئی تھیں۔ اس میں کنفیوزن تھی لیکن اس بار کی قسط بہت بھرپور ہے۔ اس میں اپنا حق نہ چھوڑنے والی جو بات سمجھائی گئی ہے وہ بہت پُراثر ہے۔ عطیہ عمر کی ہماری بھول ہمیشہ کی طرح سبق آموز اور زندگی کا صحیح رخ دکھانے والی ہے۔ اے دل ناداں، کا دوسرا حصہ بس سو سو ہے۔ اقبال بانو کا ناولٹ تیرا بیاں جاناں میں ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ رانیہ نے تیمور حسن کو اکمل شاہ کے بارے میں کیوں بتایا؟ اگر وہ محبت کرتی تھی تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ محبوب کے سامنے دوسرے مرد کی پسندیدگی کے بارے میں نہیں بتایا جاتا۔ خربوزے اچھی تحریر تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کے ناول زندگی کا... جواب ہی نہیں وہ اصلی زندگی کی تصویر ہے۔ فصلوں کا سفر عالیہ حرا کی اچھی تحریر ہے۔ خوشی کے رنگ، واقعی خوشی کے رنگ تھے جو ہر چہرے پر نظر آرہے تھے۔ جلترنگ میں انجم انصار کے قلم کا جادو صاف نظر آرہا ہے۔ مجھے ایب نارمل شوہر بہت پسند آیا۔ انجم باجی آپ کے پاس اتنے موضوعات کیسے ذہن میں آتے ہیں۔ خوش ذائقہ میں کوئی ڈش پسند نہیں آئی، معذرت۔'' (کوئی بات نہیں)

✍ رخ چوہدری، کراچی سے۔ ''زندگی موت کی امانت ہے اور جب حکم الٰہی ہوتا ہے تو دن دیکھتی ہے نہ رات نہ تاریخ نہ ہی ماہ و سال چپکے سے آتی ہے اور ان رشتوں سے چھین کر لے جاتی ہے۔ جن سے انسان بے حد پیار کرتا ہے اور وہ اس سے بے حد پیار کرتے ہیں مگر موت اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ ہمارے خاندان کی بہت ہی خوب صورت شخصیت ہارٹ اٹیک میں ہمیں چھوڑ گئی۔ چوہدری اختر رشتے میں میرے فرسٹ کزن تھے تایا جان کے بیٹے۔ ابو چونکہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لیے ان کے بہن بھائیوں کے کچھ بچے ان سے بڑے کچھ برابر اور کچھ ان سے چند سال چھوٹے تھے اور اختر بھائی بھی ابو سے چند سال چھوٹے تھے اور ہمارے خاندان کے خوبرو اور اسمارٹ فرد تھے سب سے بڑھ کر بے حد خوش مزاج بذلہ سنج انسان تھے۔ ابو کا بچپن اور جوانی اپنے بھتیجوں کے ساتھ بے حد خوشگوار گزرا تھا۔ ابو جب بھی اپنے بچپن اور نوجوانی کو یاد کرتے تو ان کی ساری یادوں اور واقعات میں بھائی جان اختر کا ذکر بھی ہوتا۔ ان کی باتیں ان کی شرارتیں ان کو خاندان اور خاندان سے باہر نمایاں کرتی تھیں۔ شہید، شہید ہوتا ہے۔ میدان جنگ میں شہید ہو، برف کے تودے کے نیچے دب کر شہید ہو یا پھر تربیتی پرواز کے دوران جہاز کریش کا شہید ہو۔ شہید بھی ہوتا ہے اور شہید کا رتبہ کیا ہوتا ہے یہ سب جانتے ہیں۔ مئی میں ہمارے کزن بریگیڈیئر شاہد مجید کے اکلوتے صاحب زادے مصطفیٰ شاہد اپنی تربیتی پرواز کے دوران جہازوں کے ٹکرانے سے چاروں پائلٹ جام شہادت نوش کر کے شہادت کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں۔ ہر شہید قوم کا وقار اور اپنے گھر والوں کا فخر ہے۔ مصطفیٰ شاہد بہن کا اکلوتا بھائی اور والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور اپنے انسٹرکٹر کے کورس کے آخری دن وہ ائیر کریش میں شہید ہو گیا۔ اس شہید کی اکتوبر میں شادی تھی مگر کس کو خبر تھی کہ کورس کا آخری دن اس کی زندگی کا بھی آخری دن ثابت ہوگا۔ شہید کا تو اللہ نے خود بھی بلند رتبہ رکھا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں اور کیا کہا جائے۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین)

✍ نسیم نیازی، لاہور سے۔ ''اس ماہ پاکیزہ کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ گرمی کے حوالے سے ٹھنڈا سا لگا۔ عمیرہ احمد کے ناول کی قسط بھی اچھی تھی۔ مگر جو افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا وہ نوشین ناز اختر کا تھا۔ یار نوشین بہت اچھا لکھتی ہو تم۔ ہماری نگہت سیما تو ہیں ہی اے ون رائٹر، پڑھ کر مزہ آگیا۔ یاسمین نشاط اختر کی تحریر بھی اچھی لگی۔ روحانی مشوروں میں شبِ

برات کے حوالے سے معلومات ہر قاری کے لیے مفید رہیں گی۔ مجھے ان تمام بہنوں سے یہ کہنا ہے جو رمضان میں عمرے کی سعادت حاصل کرنے جائیں۔ وہ مجھے بھی اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ ہاں انجم تمہارے ڈرامے انکھیلیاں اور چاندنی بہت شوق سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ بہنیں جو جلترنگ کے مزے دوبالا کرنا چاہتی ہیں وہ انکھیلیاں ضرور دیکھیں۔'' (پیاری نسیم پسندیدگی کا شکریہ، ہاں عمرے پر جانے والے قارئین اپنی دعاؤں میں اپنی باجی انجم انصار کو بھی ضرور یاد رکھیں، نوازش)

ﷺ میمونہ گل، سکھر سے۔ ''اس ماہ کا پاکیزہ پسند آیا۔ فرح کا مشورہ نوٹ کرلیا ہے۔ افسانے، ناول، ناولٹ سب ہی اچھے لگے مگر روحانی مشورے بہت ہی اچھا تھا۔'' (شکریہ)

ﷺ فریدہ خانم، لاہور سے۔ ''میں ہر ماہ خط لکھتی ہوں، پتا نہیں کیوں وہ اس محفل میں نہیں لگ پاتا۔ میں پاکیزہ کی سینئر ترین تبصرہ نگار اور شاعرہ ہوں۔ بے شک دوسرے پرچوں میں بھی میری تحریریں شائع ہوتی ہیں مگر انجم باجی مجھے جو پیار آپ سے اور پاکیزہ سے ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ میرے والد بیمار ہیں ان کی صحت اور سکون کے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔'' (پیاری فریدہ ہم بھی دعا گو ہیں)

ﷺ انیلا شاہین، راول پنڈی سے۔ ''پاکیزہ نے میری زندگی بدل دی ہے۔ یہ صرف ایک ماہنامہ ہی نہیں بہت اچھا استاد بھی ہے۔ وہ لڑکیاں جن کے سر پر ماں یا بڑی بہن نہیں ہیں۔ ان کے لیے پاکیزہ ماں بھی ہے اور بڑی بہن بھی اور انجم آنٹی اس میں آپ کا کردار مرکزی ہے۔ آپ کا بات کرنے کا، لکھنے کا ہر رویہ دوستانہ ہے۔ میری موسٹ فیورٹ رائٹر عمیرہ احمد ہیں۔ میں بچپن سے ان کی تحریریں پڑھ رہی ہوں مگر میں نے ان کی تصویر کبھی نہیں دیکھی۔ ان کا انٹرویو کبھی نہیں پڑھا۔ میں تو یہ تک نہیں جانتی کہ کیا وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں۔'' (پیاری انیلا ہماری عمیرہ احمد ایک پیاری سی لڑکی ہیں۔ جی ہاں وہ غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کی تصویر اور ان کا انٹرویو ہم ضرور شائع کریں گے۔ انشاء اللہ)

ﷺ صدف، ہری پور ہزارہ سے۔ ''باجی آپ روحانی مشوروں میں بہت اچھے وظیفے اور دعائیں دیتی ہیں۔ گزشتہ ماہ دل کی بند نالیوں کو کھولنے کا وظیفہ شائع ہوا تھا۔ میری ممانی نے صرف بائیس دن پڑھا۔ جبکہ اس کے پڑھنے کی مدت چالیس دن تھی۔ میرے ماموں کے دل کی دو نالیاں بند تھیں اور جب انجیو پلاسٹی ہوئی تو اس وظیفے کی وجہ سے ان کی ایک نالی کھل چکی تھی۔ اگر وہ وظیفہ چالیس دن پڑھا جاتا تو یقیناً ان کی دوسری دل کی نالی بھی کھل جانی تھی اور میں اس محفل کے توسط سے اپنی بہنوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ بے حد آسان طریقہ لکھا تھا۔ جن لوگوں کو شبہ بھی ہو کہ ان کے دل کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو وہ یہ عمل ضرور کریں۔'' (پیاری صدف اللہ تعالیٰ آپ کے ماموں کو صحتِ کاملہ دے۔ ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہوگا۔ اس لیے تو میں کہتی ہوں، ہم سب کو دو نفل شکرانے کے کسی بھی وقت پڑھنے چاہئیں)

ﷺ شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ''پاکیزہ کے شمارے سے ہمیشہ ہمیں اچھی اچھی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ عمیرہ احمد تو اتنا پیارا لکھ رہی ہیں میرا پیار ان تک پہنچا دیں۔ گزشتہ شمارے میں شکرانے کے نفل پڑھنے کے لیے آپ نے کہا ہے میں ہمیشہ عشا کی نماز کے بعد شکرانے کے نفل پڑھتی ہوں اور اس کے پڑھنے کے بعد اتنے سکون سے سوتی ہوں کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ میں اپنی بہنوں سے کہوں گی کہ آپ شکرانے کے نفل پڑھنے کی عادت ضرور ڈالیں۔'' (بے شک)

ﷺ مسز سمیرا احمید، فاروق کراچی سے۔ ''عکس کی قسط طویل ہے اتفاقات بھی ہیں مگر بے حد بھرپور ہے مزہ آیا۔ یاسمین نشاط اختر نے ناولٹ بہت ہی اچھا لکھا۔ ناہید سلطانہ اختر کی تو کیا بات ہے امید ہے کہ تحریر سبق آموز ہوگی۔ نگہت سیما بہت اچھی رائٹر ہیں پہلی قسط بھی اچھی لگی۔ لبنیٰ عروج کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ میری طرف سے لبنیٰ عروج کو بے حد مبارک باد۔ عروسہ عالم کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ صائمہ اکرم نے بھی بہت اچھا لکھا، پاکیزہ ایسا ڈائجسٹ ہے جسے پڑھ کر میں لطف اندوز ہوتی ہوں۔ میرے میاں بھی اس کو پڑھتے ہیں۔'' (شکریہ)

ﷺ ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس سے۔ ''اس ماہ کے سرورق کی تو کیا بات تھی۔ عمیرہ احمد کا ناول بہت پسند آیا۔ آپ ان کی تصویر کب شائع کریں گی۔ (عمیرہ جلدی سے بھیج دو۔ تمہارے چاہنے والوں کا اصرار ہے) اس ماہ سب

سے اچھی تحریر جو لگی وہ لبنیٰ عروج کی لگی۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ لبنیٰ عروج آپ کے ہاتھ چوم لوں۔'' (میرا بھی یہی دل کر رہا ہے لبنیٰ) صائمہ اکرم، عروسہ عالم اور یاسمین نشاط نے بھی اچھا لکھا۔ ہاں کانچ سی لڑکی ابھی تک یاد آرہی ہے۔ اس کا ڈراما کس چینل پر آئے گا۔'' (ابھی میں نے اس کو کسی بھی چینل کو دیا ہی نہیں ہے تو کیسے اور کیونکر بتا سکتی ہوں۔ ہاں یہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہونے والا ہے۔ اس کا انتساب بہنوں کی محفل کی ایک معروف شخصیت کے نام ہے۔ ذرا بوجھیں تو سہی)

ﷺ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ''اس محفل میں بہت عرصے بعد آئی ہوں مگر غافل ہرگز نہیں تھی۔ ہر ماہ پڑھتی رہی ہوں اداریہ بڑے کمال کی چیز ہوتا ہے۔ عکس سب سے بہترین ناول جا رہا ہے۔ میری مبارک باد پہنچا دیں۔ یاسمین نشاط نے بس ٹھیک ہی لکھا ہے۔ ایک دو باتوں سے مجھے اختلاف بھی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر نے بہت ہی اچھا لکھا ہے، نگہت سیما کا ناولٹ بھی پسند آیا، صائمہ اکرم بھی کامیاب رہیں، تابندہ جبیں کا افسانہ لاجواب رہا، لبنیٰ عروج نے بھی دل کو چھو لیا، سعدیہ رئیس، نوشین ناز اختر، قرۃ العین رائے، سکینہ فرخ اور عروسہ عالم نے بھی بے حد عمدہ لکھا۔ سب کو میری جانب سے مبارک باد اس رائے کے ساتھ کہ جلترنگ ہماری سوئیٹ ڈش ہے۔'' (نوازش، ہماری مصنفات شکریہ کہہ رہی ہیں)

ﷺ عرشیہ جنید، کراچی سے۔ ''اس ماہ سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی۔ سیما مناف نے بالکل صحیح رائے دی تھی۔ آپ کے طویل جواب کا مزہ علیحدہ ہی آتا ہے۔ ہر طرح کے خطوط پڑھ کر مجھے تسلی ہو جاتی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول اے ون جا رہا ہے، عمیرہ احمد تو میری ہارٹ فیورٹ ہیں، ان کا ناول پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ انجم باجی آپ کبھی کبھی کوئی افسانہ ہی لکھ دیا کریں۔'' (جی ضرور)

ﷺ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''اداریے میں بہت بڑی بات کہہ دی۔ عکس کی تین قسطیں ایک ساتھ پڑھیں، عمیرہ احمد بہت سے راز کھولے لیکن شیر دل کو تو صدمہ پہنچا مگر ہم کو بھی تکلیف ہوئی۔ نوشین ناز کا جیا کی امی اس ماہ کی بہترین تحریر تھی، تشنگی کا سفر میں مرد کا گھناؤنا کردار ہے، اب نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، گاڈ اور اللہ کا فرق اچھے سے سمجھایا گیا ہے، تابندہ جبیں اور سعدیہ رئیس کے افسانے بھی شاہکار کہلائے جاسکتے ہیں۔ قرۃ العین رائے نے بھی بہت اچھا لکھا۔ لبنیٰ عروج کا ناولٹ بہنوں کے لیے مثال ہے، ویل ڈن۔ سکینہ فرخ نے بھی بہت اچھا لکھا، عروسہ عالم نے ایک بے وقوف لڑکی کی کہانی لکھی ہے، جسے آخر میں رسوائی ملی ہے۔ صائمہ اکرم نے مکمل ناول دیہاتی زندگی پر لکھا مگر ربڑ کی طرح کھینچا گیا، یہ اتنا طویل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بہنوں کی محفل میں دو مہینے تک اپنا نام نظر نہیں آیا۔ رضوانہ پرنس کا انٹرویو پڑھ کر ان کے حوصلے کی داد دیتی ہوں کہ اپنے بارے میں سچ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ رضوانہ نے لکھ کر ہمیں رُلا دیا۔ عظمیٰ کی ڈائری میں بہت اچھا انتخاب ہوتا ہے خاص طور پر حمد و نعت جو میں اپنے پوتے، پوتیوں کو سناتی ہوں۔ اس ماہ عذرا کے ٹوٹکے شامل نہیں تھے۔ جلترنگ کے خاکے زبردست تھے، آلو نامہ بہت زبردست رہا۔ روحانی مشورے بہت آسان اور اچھے طریقے سے لوگوں کی رہنمائی کررہے ہیں۔ انجم آپ بہت اچھے سے سمجھاتی ہیں۔ آپ نے جو مختصر ترین دعا بتائی ہے وہ معنوں کے حساب سے بہت بڑی ہے۔ ٹی وی کی اسکرین پر جب انکھیلیاں دیکھتی ہوں تو تمہارا نام دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ پاکیزہ بہنوں سے التماس ہے کہ رمضان کی مقدس ساعتوں میں مجھے یاد رکھیں۔'' (تبصرے کا شکریہ، یہ بات میں پاکیزہ کے قارئین سے کہنا چاہوں گی کہ آپ سب ہم سب کو اپنی دعاؤں میں شامل رکھیے گا)

ﷺ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''جون کے شمارے کا سرورق دیکھ کر طمانیت کا احساس ہوا سرورق کا چہرہ ہماری ایک رائٹر اختر شجاعت سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح دین کی باتوں سے آغاز کیا۔ بے شک آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کل جہاں کے لیے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے، آپ ہمیشہ ہی اچھا اور اصلاحی لکھتی ہیں، بچوں کی تربیت کے بارے میں گفتگو اچھی رہی اور اب آتے ہیں افسانوں کی جانب، سب سے پہلے بانو آپا کی تحریر تیرا پیماں

جاناں، پڑھی، ان کا مخصوص اندازِ تحریر متاثر کرتا ہے۔ محبتیں ہمیشہ ہی وچھوڑوں کے حصار میں رہتی ہیں ان کے ہاں۔ بانو آپا اگر تبریز کو بھی تیمور کے بارے میں علم ہو جاتا تو وہ بھی تیمور کے پاس کردار کی گواہی لینے پہنچ جاتا کہ مرد تقریباً سب ہی ایک سے ہوتے ہیں فطرتاً اور محبتیں تو ہمیشہ ہی کٹھن مسافتوں میں کھوسی جاتی ہیں۔ پھر مکمل ناول فیصلوں کا سفر پڑھا۔ گرچہ موضوع پرانا تھا اور طوالت بھی کچھ گراں گزری مگر عالیہ نے تحریر میں دلچسپی کا عنصر کم نہیں ہونے دیا۔ عطیہ عمر کی تحریر بظاہر ایک کام کرنے والی مائی کے بارے میں تھی مگر اس میں ایک اصلاحی رنگ تھا۔ دونوں ناول عمدگی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ خصوصی مضامین بھی پڑھے رضوانہ پرنس کو اپنے پہلے ناول کی تقریبِ رونمائی کی مبارک باد پہنچا دیں۔ جلترنگ بھی مزہ دے گیا۔ خصوصاً ایب نارمل شوہر۔ پاکیزہ ڈائری بہترین تھی، میرا انتخاب میں سلیم کوثر اور ظفر اقبال کی شاعری اچھی لگی۔ روحانی مشورے تو ہوتے ہی اچھے ہیں جزاک اللہ، کارنر کی شاعری میں شگفتہ شفیق کی نظم پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ، گڑیا تم مجھ سے جو دل چاہے بات کر سکتی ہو، میں تمہاری بڑی بہن یا ماں جیسی ہوں، تمہاری محبت اور دعائیں میرے لیے بہت اہم ہیں)

ﷺ ایشل شادیان، گولارچی سے۔ ''مئی کے شمارے میں اپنی نظم دیکھ کر بہت خوشی ہوئی مجھے تو اب امید ہی نہیں تھی کہ اب میری نظم شائع ہو جائے گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ اور مجھے آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ ہر مسافر کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک اچھے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے اگر رہنما نہ ہو تو انسان اپنی منزل تک کبھی نہیں پہنچ پاتا بلکہ بھٹک جاتا ہے اسی طرح آپ بھی ہماری رہنما ہیں۔ آپ کی باتوں سے بہت حوصلہ ملا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ حوصلہ افزائی کرتی رہیں گی۔ جون کا پاکیزہ ملا ٹائٹل کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے واقعی بہار آ گئی ہے، ہنستی مسکراتی آنکھیں دوستی کا پیغام دے رہی تھیں اتنا اچھا لگا میرے پاس الفاظ نہیں ہیں بیان کرنے کو بس زندگی سے بھرپور ٹائٹل تھا۔ خوش ذائقہ میں حیدرآبادی مرچوں کا سالن کی ترکیب بہت پسند آئی جسے میں ضرور ٹرائی کروں گی۔ اشعار بھی زبردست تھے۔ میرا انتخاب کی تو کیا ہی بات تھی اور جلترنگ پڑھ کر بہت ہنسی آئی ویل ڈن آنٹی اور پاکیزہ ڈائری بھی لاجواب تھی۔ عظمیٰ آپی کو بھی مبارک باد۔ عقیلہ حق کی بے انت لمحے بہت اچھی کہانی تھی۔ فیصلوں کا سفر عالیہ جی آپ نے تو کمال لکھا تھا۔ زندگی نے نیا موڑ لیا ہے اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ عکس بھی زبردست جا رہا ہے سب رائٹرز کو مبارک باد۔'' (شکریہ)

ﷺ فضہ امتیاز، اسلام آباد سے۔ ''میں بہت عرصے سے پاکیزہ میں خط لکھنے کا سوچ رہی تھی مگر ہر بار یہ سوچ کر رک جاتی کہ نہ جانے آپ میرا خط شائع کریں گی بھی کہ نہیں مگر آج بہت امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے پاکیزہ میں سب سے زیادہ جلترنگ پسند ہے اور بہنوں کی محفل میں جس محبت اور اپنائیت سے آپ خطوط کا جواب دیتی ہیں وہ تو واقعی قابلِ تعریف ہے۔ تمام ناول اور افسانے بہترین ہوتے ہیں جن کو پڑھنے کا بہت ہی مزہ آتا ہے۔ میں خود بھی پانچ چھ سال سے لکھ رہی ہوں لیکن آج تک میں نے اپنی کوئی بھی تحریر کہیں ارسال نہیں کی۔ آج اگر آپ کو خط لکھ رہی ہوں تو اس ہی وجہ سے۔ میں اپنی تحریر آپ کو ارسال کرنا چاہتی ہوں۔ میری کزن نے مجھے کہا کہ آپ نئی لڑکیوں کو بھی بہت سپورٹ کرتی ہیں۔ میں پہلی مرتبہ کسی کو خط لکھ رہی ہوں اور بہت پُرامید ہوں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

ﷺ زرین زبیر کوٹھاری، کراچی سے۔ ''انجم باجی پاکیزہ پڑھا اور بہت اچھا لگا۔ میں پاکیزہ کی اور آپ کی وہ فین ہوں جو سب سے پہلے اپنی رائے سے آگاہ کرتی ہوں۔ میں پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس کے تبصرہ نگار کتنے معروف ہیں اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب لوگ مجھے پاکیزہ والی زرین زبیر کے نام سے پکارنے لگے۔ یہ ماہنامہ میری فیملی، میرے حلقۂ احباب اور میرے کالج کی پروفیسرز میں بھی پسندیدہ ماہنامہ ہے۔'' (بے شک)

ﷺ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''میں نے پاکیزہ انجم تمہارے ناول چاندنی کی وجہ سے پڑھنا شروع کیا تھا اور اب تو اس کو پڑھنے کی لت ہو گئی ہے۔ عمیرہ احمد کا ناول بہت پسند آ رہا ہے۔ وہ اپنے فین کے خطوط پڑھ کر یقیناً خوش ہو جاتی ہوں

گی۔ ایک مشورہ ہے کہ جن رائٹرز کی تحریریں پسند نہیں کی جاتیں ان کی تحریریں آپ پاکیزہ میں دوبارہ کیوں لگاتی ہیں؟'' (پیاری فیروزہ، جب ہم پاکیزہ میں کوئی تحریر شائع کرتے ہیں تو اپنی جانب سے اچھی تحریر ہی لگاتے ہیں۔ ہر شخص کی پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے۔ کسی کو کچھ پسند آتا ہے تو کسی کو کچھ اور...... اور اگر کسی افسانے پر تنقید زیادہ ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ تحریر ہی بکواس تھی بلکہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ تحریر بہت پڑھی گئی اور اچھے سے اچھا لکھنے کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ لوگ غصے میں آ کر جعلی ناموں سے مجھے گھٹیا خط لکھ کر خود اپنے آپ کو متعارف کروائیں کہ وہ اصل میں ہیں کیا۔ ہاں عمیرہ احمد کے لیے جتنے فون میرے پاس آتے ہیں ان کو اگر میں بہنوں کی محفل میں لگا دوں تو کوئی دوسرا خط ہی شامل نہ ہو۔ مجھے یہ فخر ہے کہ عمیرہ احمد ہماری ہاں لکھتی ہیں)

ﷺ مسز شمع حسین، ٹورنٹو سے۔ ''اس ماہ سب سے خوب صورت تحریر لبنیٰ عروج کی تھی۔ میری مبارک باد ان تک پہنچا دیں۔ لبنیٰ بہت اچھا لکھتی ہیں اور میں ان سے کہوں گی کہ اب وہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ لکھیں کہ ان کی یہ تحریر تو مدتوں یاد رہے گی۔ پروین عذرا تشنہ کی شاعری بھی بہت پسند آتی ہے ان سے کہیے کہ وہ ہر ماہ حاضر ہوا کریں۔'' (لبنیٰ عروج ان دنوں بیمار ہیں۔ ان کے لیے دعا کریں کہ وہ جلدی سے ٹھیک ہو کر میدان میں آ جائیں۔ پروین عذرا تشنہ اپنے بیٹے کی شادی میں مصروف ہیں جس دن ان کے بیٹے کا ولیمہ ہے اسی دن ہمارے پوتے کی سالگرہ کی تقریب ہے گو چھوٹی سی ہے اگر میں نہیں آ سکی تو پیاری پروین مجھ سے ناراض مت ہونا۔ بعض دفعہ مجبوری ہو جاتی ہے)

ﷺ مریم فضل عباسی، پنجاب سے۔ ''پاکیزہ ایک طویل عرصے سے زیرِ مطالعہ ہے۔ شیریں حیدر کے ناول امربیل کی کشش نے ہمیں پاکیزہ میں کھینچا اور پھر اس کی بھول بھلیوں میں کچھ ایسے کھوئے کہ نکلنے کا خیال ہی نہیں آیا اور اب تو عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کی منفرد اور اچھوتی تحریروں نے دل و دماغ کو کچھ اس طرح جکڑا کہ ہم اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکیزہ ایک خوب صورت چمن کے مانند ہے جس کا ہر پھول ہی بہت خوب صورت اور منفرد ہوتا ہے اور چمن کی رونق میں اضافہ کرتا ہے۔ آنٹی میں بھی اس خوب صورت چمن میں کچھ کنٹری بیوٹ کرنا چاہتی ہوں یعنی آپ کے رسالے میں لکھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے آپ سے اجازت درکار ہے کہ اس چمن میں ہم داخل تو ہو چکے ہیں اب کیا کسی کونے میں کچھ گل بوٹے ہم بھی لگا سکتے ہیں؟'' (خوش آمدید...... آپ فوراً سے پہلے اپنی تحریریں، نظم، نثر دونوں بھیج دیں)

ﷺ صدیقہ خان، باغ آزاد کشمیر سے۔ ''پاکیزہ پڑھنے والی تمام بہنوں کو میرا اسلام۔ پہلی بار پاکیزہ کی اس محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ اس امید پر کہ شاید جگہ مل جائے۔ کچھ عرصے پہلے پاکیزہ کزن سے لے کر پڑھا تو بہت اچھا لگا۔ سلسلے وار ناول زندگی میرا پسندیدہ ناول ہے جس میں مجھے تقدیم اور مونس کا کردار بہت پسند ہے۔ عمیرہ احمد کے ناول عکس میں فاطمہ عرف چڑیا کا کردار بہت دلچسپ لگا، بہت اچھی تحریر ہے۔ باقی افسانے اور ناول بھی اے ون تھے۔ آپی میں ایک افسانہ بھیجنا چاہتی ہوں پہلی بار لکھا ہے بھیج سکتی ہوں۔'' (خوش آمدید گڑیا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جو بھی لکھنا چاہتی ہیں ضرور لکھیں میں منتظر رہوں گی)

ﷺ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''ٹائٹل پر ماریہ ہمیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں دونوں سلسلے وار ناولز سچ تو یہ ہے موسم گل حیراں ہے، کوئی شہر ایسا بساؤں میں، سراپا سحر، ایکس اسٹوڈنٹ، کاش اور جیا کی امی بھی پسند آئیں۔ ہماری پیاری سے بہنا تابندہ لاری کو اللہ تعالیٰ یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت دے، آمین۔ ہم تابندہ بہن سے نعتوں کے حوالے سے بھی کافی عرصے سے واقف ہیں۔ عید کی خوشی کے موقع پر ہماری خواہش ہے کہ آپ بزمِ پاکیزہ کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیں۔'' (آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے)

ﷺ ماہم عزیز خان، کراچی سے۔ ''جون کا شمارہ پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ تمام رائٹرز ٹی وی پر بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا رہی ہیں۔ انجم جی آپ کا ہے اٹھکیلیاں ابھی تک دیکھ تو نہیں سکی مگر یقیناً اچھا ہوگا کیونکہ اس ٹینشن کے دور میں آپ کا پلے

یقیناً مزاح سے بھرپور ہوگا۔ مستقل سلسلے تمام ہی اچھے ہیں مگر اگر ایک سلسلہ کسی بھی رائٹرز کی شہرہ آفاق تحریر سے اقتباسات کا شروع کیا جائے تو یقیناً لوگوں کو پسند آئے گا۔ ایک حقیقت ایک افسانے میں عنیزہ سید کو بھی شامل کریں اور انجم جی آپ خود بھی اس سلسلے میں شامل ہوں تو کیا بات ہے۔ شمع سید کا بہار آنے کو ہے سبق آموز افسانہ تھا ایسے افسانے ضرور شامل ہونے چاہیے۔ شبنم فضل خالق کا موسموں کے تغیر بھی زبردست کاوش تھی۔ عالیہ حرا کا مکمل ناول فیصلوں کا سفر عورت کی قربانیوں کی مکمل تصویر تھا بہت خوب۔" (تبصرے کا شکریہ بہت عرصے بعد آئی ہو اب غائب مت ہو جانا)

جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ "پاکیزہ پڑھنے والے، ہر رائٹر، تبصرہ نگار پاکیزہ سے وابستہ بہنوں، انجم آپی، عذرا رسول سب کو رمضان المبارک کی بہت زیادہ مبارک باد اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی تمام عبادات قبول فرمائے، آمین۔ آپی جان اس شمارے کا ٹائٹل زبردست تھا۔ زبردست اس لیے کہ ماڈل بہت خوب صورت تھی اور سب سے خوب صورت اور دل کو چھو لینے والی بات آپی جی آپ نے جو محفل میں کی ہم نے سنی اور پلو سے باندھ لی۔ کہتے ہیں ناں کہ اگر کوئی سیانا نصیحت کر رہا ہو تو فوراً اس پر عمل کرو۔ جناب ہم نے الماری، بکسوں میں نہ استعمال ہونے والے کپڑے ٹھونس رکھے تھے نکالے۔ کچھ جوڑے پرانے کچھ نئے تھے پریس کر کے اپنے ہی محلے کی ایک غریب عورت کے گھر بھجوا دیے۔ میری تمام بہنوں سے گزارش ہے کہ اگر کسی غریب کو کچھ دے رہے ہو تو ضروری نہیں کہ وہ پھٹے پرانے ہوں بلکہ اس طرح کی چیز یا اس طریقے سے دو کہ لینے والا نہ شرمندہ ہو اور نہ اس کا دل ٹوٹے۔ تبصرہ بہت کم کر رہی ہوں کیونکہ میں نے صرف خواتین کی محفل میں حاضری دی اور جلدی سے صائمہ اکرم کا ناول موسم گل حیراں ہے پڑھا باقی کوئی ناول، افسانہ نہیں پڑھ سکی اس لیے جو پڑھا اسی پر تبصرہ کروں گی۔ صائمہ اکرم جی آپ کا ناول تو زبردست تھا۔" (شکریہ)

عقیلہ حق، کراچی سے۔ "یاسمین نشاط نے موضوع سے خوب صورت انداز میں انصاف کیا۔ سعدیہ رئیس نے بہت اچھا لکھا واقعی لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں ایک لڑکی ساری زندگی گزار کر بھی غیر رہ جاتی ہے۔ تابندہ جبیں نے ایکس اسٹوڈنٹ اچھا لکھا، میں نے بھی گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کیا تھا۔ ایک پی ایچ ڈی کا تھیسس لکھنے کے بعد کالج جا پہنچی تا کہ اپنی فیورٹ ٹیچر کو بتاؤں کہ میڈم میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی لیکن افسوس وہ مجھے پہچانی ہی نہیں بڑی تکلیف ہوئی تھی اس لمحے۔ عمیرہ احمد کی عکس پر گرفت مضبوط ہے۔ قرۃ العین رائے نے آج کل اس موضوع پر لکھا ہے جس پر نہ جانے کیوں بہت لکھا جا رہا ہے ایک کہانی میری بھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔ لبنیٰ عروج نے بہت ہی خوب صورت لکھا۔ دُرِ نایاب نایاب ہی رہا۔ عروسہ عالم کی تحریر کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکی کہ اگر رخسار اتنی ہی بولڈ تھی تو بھائی شادی ہی نہیں کرتی۔ پہلے سر جھکا کر شادی کر لی اور پھر ساری من مانی کرتی رہی۔ انجم باجی درحقیقت رسالہ بہت زبردست اور مکمل رہا تبصرہ آپ کو جلدی اس لیے بھیج رہی ہوں کہ بچوں کو لے کر مڈل ایسٹ اور امریکا جا رہی ہوں، انشاء اللہ عید سے پہلے واپسی ہو گی۔" (تبصرے کا شکریہ، چنداں نال خیر نال جاؤ اور خیر نال واپس آؤ)

حرا رشید خان، کراچی سے۔ "مجھے آپ کے جواب دینے والے اسٹائل سے بہت پیار ہے۔ اتنا میٹھا لہجہ، اتنی چاشنی میں نے پہلے کسی کے منہ سے نہیں سنی ہے۔ آپ کے ہر جواب میں اتنا پیار بھرا ہوتا ہے کہ سامنے والا اپنے آپ کو کبھی کمتر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اب آتی ہوں پاکیزہ کی تمام رائٹرز کی طرف۔ پاکیزہ ڈائجسٹ ایک باغ ہے اور اس میں لکھنے والی تمام رائٹرز باغ کے پھول جو ہمیشہ خوشبو دیتے ہیں۔ ایک بات اور کہنا چاہوں گی صرف اور صرف رضوانہ پرنس کے بارے میں۔ آپ کے متعلق پڑھا یقین مانیں میں نے اپنے اندر کچھ کر دکھانے کی لگن محسوس کی۔ افسانہ نہیں حقیقت ہے یہ پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں آپ کی فین تو تھی ہی پر اب اور زیادہ آپ کی عزت کرنے لگی ہوں۔ صدا خوش رہیں۔ آخر میں ایک شکوہ...... بھئی ہم یہ خط آپ کو چھٹی مرتبہ بھیج رہے ہیں۔ چھ مرتبہ بھیجنے کے بعد بھی کوئی خط پاکیزہ کی زینت نہ بنا۔ اب یہ خط تو شائع کر دیں۔" (گڑیا اس سے قبل آپ کا کوئی خط نہیں ملا تھا ورنہ ضرور شامل ہوتا اور رہی افسانے کی بات تو بھئی اگر آنسو گر بھی جائیں تو صدمہ نہیں کرنا چاہیے)

فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ "جولائی کا پاکیزہ ملا ٹائٹل پر معصوم سی لڑکی بے حد اچھی لگی۔ پچھلے ماہ کچھ بھی نہ لکھ سکی صرف پڑھ لیا پاکیزہ اتنی جلد مل جاتا ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے اس کے تمام ناول اور افسانے پڑھ کر بہت ہی مزہ آتا ہے۔ لاہور میں بہت شدید گرمی پڑ رہی ہے۔ فصیحہ جی کے لیے ہم نے بہت دعائیں مانگی ہیں۔ اللہ انہیں صحت سے نوازے .... وہ ہماری بہت ہی پیاری سی دوست بھی ہیں۔ افسانوں میں دُرِ نایاب، سراپا سحر، سچ تو یہ ہے، کاش، کوئی شہر ایسا بساؤں میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ٹی وی پر اٹکھیلیاں اور چاندنی ڈراما دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ مکمل ناول، موسم گل حیراں ہے، عمیرہ احمد کا سلسلے وار ناول تو پاکیزہ کی جان ہے ہمیں عمیرہ احمد کے انٹرویو کا شدت سے انتظار ہے۔ حلوا پوری اور چنے آلو کی ترکاری کھا کر مزہ آ گیا۔ پاکیزہ ڈائری میں سب نے اچھا لکھا۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ عمیرہ احمد ایک حقیقت ایک افسانے میں شرکت کریں گی تو ہمیں بھی دلی خوشی ہو گی)

مسز فرح امجد، لاہور سے۔ "جولائی کا پاکیزہ پاکیزگی لیے ہوئے تھا اور کومل سی ماڈل ماریہ کی مسکان بھلی گی۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپی آپ نے بہت کچھ کہہ ڈالا واقعی غلطیوں سے ہی انسان سیکھتا ہے اور سیکھنے کے بعد ہی وہ نئی منزل کو تلاشتا ہے۔ ہمیں بھی اپنی غلطیوں کی نشاندہی کرنی چاہیے۔ اس کے بعد میں خاص طور پر عمیرہ احمد کے عکس اور ناہید سلطانہ اختر کی زندگی ہماری زندگیوں سے بہت قریب ہیں اور ہمارے دلوں کو چھوتے ہیں۔ باقی تمام سلسلے تو ہیں ہی پاکیزہ کی جان۔ رمضان کی آمد آمد ہے اس بابرکت ماہ رمضان کی ساعتیں اور پُر کیف گھڑیوں کو اللہ تعالیٰ ہم سب کو زیادہ سے زیادہ اپنی عبادت کی توفیق بخشے اور نیک نیتی سے روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔" (آمین)

ظلِ ہما، فیصل آباد سے۔ "محفل پاکیزہ میں پہلی بار حاضر ہیں امید ہے خوش آمدید کہا جائے گا۔ پاکیزہ اور اس کے ساتھی میرے لیے بالکل بھی انجان نہیں ہیں۔ کبھی کبھار پڑھا جانے والا پاکیزہ عکس کی وجہ سے مستقل ساتھی بن گیا اور اب سوچا کہ یہ خاموشی توڑ دی جائے۔ عمیرہ کا ناول کافی زبردست جا رہا ہے۔ عکس مراد علی کا کردار مجھے بہت پسند ہے۔ جیا کی امی بہت زبردست لگا۔ واقعی خوف کی انتہا ہے بہادری کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ تشنگی کا سفر ایک بہت خوب صورت ناول جس کی تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے۔ کوئی شہر ایسا بساؤں میں اس پر تبصرہ ادھار رہا ناول اچھا لگا۔ کاش یہ کاش ہی تو زندگی تباہ کر ڈالتا ہے۔ دُرِ نایاب میں کچھ کچھ مجھے اپنی جھلک نظر آئی مجھے بھی ایسے ہی صبح شام ڈانٹ پڑتی ہے۔ سراپا سحر میں ایک آئیڈیل فیملی اور آئیڈیل بیٹی دکھائی گئی تھی۔ ایکس اسٹوڈنٹ آئیڈیلسٹک ایج کی بہت زبردست وضاحت تھی۔ زندگی بھی اچھا لگا یقیناً اور اچھا ہو جائے گا۔ آپی کیا میں پاکیزہ میں افسانے یا ناول بھیج سکتی ہوں؟" (خوش آمدید...... آپ اپنی تحریریں ضرور ارسال کریں)

مصباح رضا سعید، فیصل آباد سے۔ "سب سے پہلے آپ کو بہت سی دعائیں، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ سب کی دعائیں سمیٹتی رہیں۔ باجی آپ اب اور اچھا سا ناول لے کے آئیں۔ ہمارے پاکیزہ میں۔ نمبر دو بات آپ بھی ایک حقیقت ایک فسانہ میں حاضری دیں تا کہ آپ کے بارے میں دلچسپ باتیں پتا لگیں، آپ نے تو ہر بات کا جواب مزے دار ہی دینا ہے۔ چلیں ہم بھی تھوڑا ہنس لیں گے۔ آج میں سوچ رہی تھی کہ پہلے عظمیٰ آپ کے برابر آئی اور اب ماشاء اللہ اچھی عظمیٰ جتنی ہو گئی۔ میرا مطلب ہے جب میں نے لکھنا شروع کیا پاکیزہ میں تو عظمیٰ کالج گرل تھی۔ جب میری شادی ہوئی تو دو سال بعد عظمیٰ کی ہوئی تھی۔ یہ تو چلتا ہی آ رہا ہے۔" (اب ماشاء اللہ سب بڑے ہیں اللہ سب کی ہر خوشی دکھائے، آمین)

تسنیم منیر علوی، دبئی سے۔ "امید ہے ہمیشہ کی طرح خوش و خرم ہوں گی اور اپنی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ بہادری سے سروائیکل پرابلم سے باہر آ چکی ہوں گی انشاء اللہ۔ پرچہ تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے تبصرہ بھی ہمیشہ وقت پر نہیں موصول ہوتا ہو گا مگر آپ کا یہ ظرف کہ اس کے باوجود اشاعت کا اہتمام کرتی ہیں۔ جون تک پہنچتے پہنچتے عکس کی کہانی کافی حد تک کھل چکی ہے۔ اور بڑی سبک روی سے اختتام کی طرف گامزن ہے مجھے سب سے زیادہ حملوں کی برجستگی اور

الفاظ کے برمحل استعمال نے متاثر کیا...... ناہید بھی خوب جم کر اچھا لکھ رہی ہیں۔ مکمل ناول میں میمونہ خورشید اور عالیہ حرا کے ناول اچھے رہے۔ فیصلوں کا سفر ایک پتی ورتا عورت کی کہانی کا تاثر چھوڑتی ہے۔ شمیم فضل خالق ہماری بہت سینئر لکھاری ہیں مگر ناولٹ بہت تخیل زدہ محسوس ہوا۔ بے انت لمحے بے حس خونی رشتوں کے لیے ایک تازیانہ تھے خاص طور یہ جملہ خوب تھا آج میرے ابا مر گئے آپا مجھے سورۂ بقرہ پڑھنی ہے۔ بہار آنے کو ہے اس طرف ایک اشارہ تھا کہ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا کر زندگی کے اہم فیصلے نہیں ہوتے۔ اچھا لکھا...... اور ہاں انجم میں بھی تنزیلہ خان، راول پنڈی کے موقف کی حمایت کروں گی۔ ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس غلاظت سے بھرپور دنیا میں کیا نہیں ہو رہا۔ میڈیا کیسی کیسی گندگی نہیں دکھا رہا۔ کیا ضروری ہے کہ ہم بھی دکھائیں... یونہی شکی مزاج والدین لڑکیوں کو یونیورسٹی بھیجنے سے گھبراتے ہیں۔ میاں بیوی راضی میں ادبی حلقوں کے روح رواں اویس شگفتہ کے انٹرویو سے... بات بہت اچھی لگی خدا کرے دونوں انٹرویو میں سجی تصویر کی صورت دمکتے چمکتے رہیں (آمین) جلترنگ سمیت سلسلے بھی بہت ہی اچھے رہے۔ خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

عروج آفندی، کراچی سے۔ ''جون کا ٹائٹل گرمی کے لحاظ سے ہلکا پھلکا ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ بہت کام کی باتیں بتاتی ہیں۔ وہ باتیں جو اکثر ہم کسی سے کہہ نہیں پاتے مگر محسوس ضرور کرتے ہیں۔ دریا کو کوزے میں بند کر دینا تو انجم آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ پچھلے شمارے میں بھی رضوانہ پرنس کا احوال پڑھا تھا جس کو پڑھتے ہوئے بے اختیار آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور مجھے رضوانہ آنٹی سے بہت اپنا پن محسوس ہوا تھا۔ کچھ مصروفیات کی وجہ سے تبصرہ نہیں لکھ پائی تو مجھے ایسا لگا کہ شاید میں زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ پاکیزہ کی اتنی عادت جو ہو گئی ہے۔ زندگی کی کہانی تیز رفتاری سے موڑ.... رہی ہے۔ ناہید سلطانہ کے اندازِ بیان میں اتنا گھریلو پن ہے کہ ہم آخر تک کہانی پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے اور اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ عکس کی زندگی پیاز کے چھلکوں کی طرح ورق در ورق کھلتی چلی جا رہی ہے۔ عمیرہ احمد میری فیورٹ رائٹر بھی ہیں۔ اس کہانی میں دلچسپی کا عنصر اتنا زیادہ ہے کہ ہم آخر تک اس میں کھو جاتے ہیں خصوصاً اس قسط میں تو عمیرہ کے ایبک، شیر دل، فاطمہ کے سارے کردار کھل کر واضح طور پر سامنے آ گئے مگر ریسٹ ہاؤس میں جو غیر معمولی سرگرمیاں تھیں ان کے بارے میں تھوڑا سا واضح کر دیتیں تو اچھا تھا کہ آیا وہ واقعی بونے موجود تھے یا خیال کوئی.... اقبال بانو کا تیراپیاں جاناں بہترین کہانی تھی لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ تیمور حسن کو رانیہ سے ملوا دیا جاتا۔ فیصلوں کا سفر عالیہ حرا نے بہت دن بعد لکھا مگر بہت خوب لکھا اتنے دن کے بعد اتنا بہترین ناول پڑھنے کو ملا۔ خربوزے آج کے معاشرے پر کہانی بالکل فٹ بیٹھتی ہے۔ ہم سارے پاکستانی خربوزے ہی تو ہیں۔ بہترین نقالی کرتے ہیں دوسرے سے حسد میں۔ سندیسے بہت خوب جا رہا ہے مگر شعر و شاعری کے بجائے تھوڑا چٹپٹا مزیدار سا سندیسہ بھی ہونا چاہیے تاکہ ہم زیادہ انجوائے کر سکیں۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ میں خود چاہتی ہوں کہ یہ نثر میں ہو اور دلچسپ انداز میں۔ آپ بھی بھیجیں)

فرزانہ تسنیم، سیالکوٹ سے۔ ''مئی کے پاکیزہ رسالہ میں اپنے خط کا جواب پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی تھا کہ مجھے جواب ملے گا جب میں نے خط ڈالا تو یہی کہتی رہی کہ پتا نہیں خط ملتا ہے یا نہیں لیکن اپنے خط کا جواب پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے بڑی بہن ہونے کا حق ادا کر دیا۔ روحانی مشورے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے میں یہی پڑھتی ہوں پتا ہے کیوں، باجی میں دکھوں کی ماری ہوں آپ نے میرا بہت حوصلہ بڑھایا دوسرے اس وقت میں بالکل اکیلی ہوں۔ میرا کوئی بہن بھائی اب اس دنیا میں نہیں مجھے اکیلا پن بہت محسوس ہوتا ہے۔ اللہ پاک آپ کو ہمیشہ جیتا جاگتا خوش باش رکھے۔ لوگوں کی اتنی خدمت کر رہی ہیں آپ کے بیٹے کے ولیمے کا حال سارا پڑھا بہت اچھا لگا۔ ماشاءاللہ بہو بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ اقبال بانو اور نمرہ احمد میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ نمرہ احمد کا ابلیس اچھا رہا۔ اقبال بانو نے بھی خوب لکھا تیمور کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ فرحانہ ناز ملک نے بھی خوب لکھا۔ ماشاءاللہ

سبھی تحریریں اچھی ہیں۔ باجی کیا کنیز نبوی پاکیزہ میں نہیں لکھتی؟'' (ہمارے ہاں کنیز نبوی کی نند سدرۃ المنتہیٰ لکھتی ہیں۔ کنیز آج کل آرام کر رہی ہیں)

شازیہ سرور، شاہدرہ سے۔ ''آنٹی ہر ماہ آپ کو باقاعدگی سے خط لکھ رہی ہوں اور آپ باقاعدگی سے شائع بھی کر رہی ہیں جس کے لیے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں اور زم زم باجی آپ کا بے انتہا شکریہ آپ نے بڑے اچھے لفظوں میں تعریف کی حالانکہ میں اس کی متحمل نہیں ہوں پھر بھی میں آج بھی آپ کی بہن ہوں۔ آپ خود کو تنہا مت سمجھیں آپ کا جب بھی لاہور چکر لگے میں کھلے دل سے آپ کو خوش آمدید کہوں گی۔ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیں دنیا میں تو ہم لوگوں کا ٹھکانا عارضی سا ہے آخرت کا سامان اکٹھا کرنے کے لیے ہمیں اخلاق کے ہتھیار سے لیس ہونا چاہیے۔'' (بے شک)

ڈاکٹر کومل ستار، جام شورو سے۔ ''آنٹی اتنی گرمی اوپر سے لوڈ شیڈنگ...... وارڈز کے چکر لگا لگا کر اس قدر تھک چکے ہیں اب دل چاہتا ہے پوائنٹ میں ہی سو جاؤں مگر ایک لڑکی کے ہاتھ میں پاکیزہ دیکھ کر جلن کے مارے برا حال ہو گیا کہ ہمارے ہاکر صاحب شاید اپنی پرانی نیند پوری کر رہے ہیں۔ خیر ندیدی نظروں سے ساری راہ تکنے کے بعد گھر پہنچے تو اماں ہٹلر پاکیزہ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ دل کے کچھ ٹکڑے مزید ٹکڑوں میں تبدیل ہوئے کیونکہ اس معاملے میں مطلب پاکیزہ دینے کے معاملے میں وہ کم ہی ممتا شو کرتی ہیں خیر شام تک کافی جدوجہد کے بعد پاکیزہ ملا سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں جمپ ماری تو نو لفٹ...... خیر اس دکھے دل کے ساتھ عکس پر پہنچے۔ بے حد خوب صورت تحریر تھی اتنا اچھا لکھتی ہیں عمیرہ احمد کے بس...... عطیہ عمر نے اپنے مخصوص انداز میں اچھا لکھا۔ میمونہ خورشید کا ناول مجھے سو سو لگا۔ اقبال بانو کی ہیروئن دل لے گئی بالکل صحیح فیصلہ تھا جو آپ پر ٹرسٹ نہیں کرتا وہ محبت بھی نہیں کرتا۔ محبت میں بے اعتباری نہیں ہوتی۔ محبت ہے تو بھائی جان اعتبار کرنا سیکھو۔ خربوزے...... ہاہا یار فرحانہ اب جولائی میں ایک تحریر آم پہ بھی لکھ دو اپنے مخصوص انداز میں مگر اچھی تحریر تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کے لیے بس اتنا کہ اللہ زورِ قلم کرے اور زیادہ۔ حجاب کا فیصلہ بالکل صحیح لگا۔ عالیہ حرا دکھی دکھی سے موڈ میں تھیں مگر اچھا ناول تھا ویسے اسے تھوڑا چھوٹا کر کے بھی لکھا جا سکتا تھا۔ شمیم فضل خالق کے افسانے کا نام بہت اچھا تھا۔ افسانہ بھی اچھا ہی تھا۔ عقیلہ حق کا بے انت لمحہ بہت ہی اچھا افسانہ تھا۔ بہت ہی اچھا موضوع تھا۔ شمع سید کیا کہنا چاہ رہی تھی فی الحال سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر ممتاز کے لیے ڈھیر ساری دعائیں اللہ ان کو صبر اور ان کے شوہر کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ میرا انتخاب میں ارم کی نظم بہت اچھی تھی۔'' (پیاری کومل طویل تبصرے کا شکریہ)

عامرہ عبداللہ، بی سے۔ ''میں پاکیزہ ڈائجسٹ میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں اور مجھے یہ بھی نہیں پتا خط کیسے لکھتے ہیں اگر کوئی غلطی ہو تو معاف کیجیے گا۔ میں شروع سے دوسرے ڈائجسٹ پڑھتی رہی ہوں جھوٹ نہیں بولوں گی آپ سے پاکیزہ ڈائجسٹ میں نہیں پڑھتی تھی لیکن صرف ایک تحریر نے مجھے پاکیزہ پڑھنے پر مجبور کر دیا وہ تحریر انجم انصار کی تھی کانچ سی لڑکی زبردست بہت بہت اچھی تحریر تھی، میں نے پورا ناول پڑھا صرف مجھے اس کی ایک قسط نہیں ملی وہ بھی اس لیے کیونکہ جس شہر میں میں رہتی ہوں یہاں ڈائجسٹ کی ایک ہی شاپ ہے جہاں بہت مشکل سے ڈائجسٹ ملتے ہیں ورنہ اگر کوئی کوئٹہ جاتا ہے تو مجھے وہاں سے منگوانا پڑتا ہے پاکیزہ اپریل کا ڈائجسٹ بھی وہیں سے منگوایا تھا۔ انجم انصار نے ایک حقیقت لکھی ہے کہ آج کل اپنی بیٹیاں ہی بیٹیاں ہے دوسروں کی بیٹیاں کچھ نہیں ہمارے یہ احساسات صرف اپنی بیٹیوں کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے اس دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو دوسرں کی بیٹیوں کو بھی اپنی.... بیٹیاں سمجھتے ہیں۔ عمیرہ احمد کا عکس ناول بہت اچھا چل رہا ہے خیر عمیرہ احمد تو ہیں ہی میری فیورٹ اور انہیں اللہ اور بھی اچھا لکھنے کی توفیق دے۔ میں عمیرہ احمد کی فین ہوں مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق ہے میرا پیغام ان تک پہنچا دیجیے گا۔ میں بھی پاکیزہ کے لیے لکھنا چاہتی ہوں کیا میں اپنا ناول بھیج سکتی ہوں؟ پلیز میرا خط ضرور شامل کیجیے گا۔ پلیز پلیز۔'' (گڑیا خوش آمدید۔

آپ اپنی تحریریں ہمیں ضرور بھجوائیں۔ عمیرہ احمد آپ کا شکریہ ادا کر رہی ہیں)

☆ حافظہ مون شاہ، سرگودھا سے۔ ”حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی امید لیے پہلی مرتبہ شاہینوں کے شہر سرگودھا سے پاکیزہ کی محفل میں آئی ہوں۔ پاکیزہ معیاری رسالہ ہے مجھے پاکیزہ کی ہر تحریر پسند ہے بالخصوص آپ کی تحریر کانچ سی لڑکی جس کی گزشتہ ماہ آخری قسط تھی بہت بہت پسند آئی۔ تمام لکھاریوں کو خوب سے خوب تر لکھنے پر مبارک باد۔ پیاری آپی میں بچی کہانیاں کی لکھاری ہوں اور اب پاکیزہ کے لیے بھی لکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے میں چاہتی ہوں کہ میں مرنے کے بعد اپنے لفظوں اور اپنی تحریروں میں زندہ رہوں۔“ (پیاری مون، خوش آمدید۔ آپ اپنی تحریریں ہمیں ضرور بھیجیں اور تبصرہ تو ہر ماہ آنا چاہیے۔ پاکیزہ کی تبصرہ نگار بہنیں ہماری مصنفات سے کم معروف نہیں ہیں)

☆ روشانے عبدالقیوم، کراچی سے۔ ”انجم باجی آپ کو اور آپ کے تمام اسٹاف کو رمضان کی آمد آمد پر ڈھیر ساری مبارک باد۔ امید ہے کہ ہر ماہ کی طرح رمضان کا شمارہ بھی بہت اچھا ہوگا۔ باجی میں نے فروری کے مہینے میں آپ کے شمارے میں اپنا خط دیکھا تھا۔ آپ اس غلطی کی تصحیح کر لیجیے میرا پورا نام روشانے عبدالقیوم بونیری ہے اور میں نے کراچی سے خط لکھا تھا۔ آپ نے شہر کی جگہ کراچی کے بجائے بونیری لکھ دیا تھا۔ آپ سے درخواست ہے اس مرتبہ اس پر دھیان دے دیجیے گا۔ اللہ آپ کو اور آپ کے ادارے کو کامیابیاں اور عزت نصیب فرمائے۔“ (آمین)

☆ فائزہ فاروق، مقام نامعلوم سے۔ ”بچوں کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں۔ خوب اودھم مچا رہتا ہے اور اس روز جون میں میرے دو بھتیجوں عنان اور ارحم اور جولائی میں میری برتھ ڈے ہے۔ سو ہم سب آم کھا کھا کر پلاننگ کر رہے ہیں کہ کیسے منائی جائے۔ پاکیزہ میں سب سے پہلے جلترنگ پڑھا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی لائٹ چلی گئی اور اتنا شور مچا کہ راتوں رات سارا رسالہ پڑھ ڈالنے کی ادا بھول گئی۔ میں شاید اب بوڑھی ہوگئی ہوں وہ اسپیڈ ہی نہیں رہی نہیں ورنہ تو پاکیزہ صرف ڈیڑھ دن میں ختم ہو جاتا تھا اب تو ہفتوں تک جا کر کہیں ہوتا ہے۔ بہنوں ماہ بدولت اس جولائی میں پینتیس سال کے ہو رہے ہیں۔ سب بہنوں کو بہت بہت سلام و پیار اس امید کے ساتھ کہ کراچی بھی تاحیات امن و امان میں رہے جب تک یہ کائنات رہے۔ خوشیاں مقدر ہوں اللہ میرے شہر کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور میرے ملک کو نیک و ہمدرد حکمران عطا کرے، عوام خوشحال اور شاد و آباد رہے۔“ (آمین)

☆ نسرین خالد، سانگھڑ سے۔ ”میرا نام نسرین خالد ہے، میں سانگھڑ کے قریبی گاؤں میں رہتی ہوں۔ گریجویشن کر رہی ہوں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر لیتی ہوں۔ اپنے کالج اور میرپور خاص بورڈ کے بہت سے تقریری مقابلے اور بیت بازی مقابلے جیت چکی ہوں۔ لکھنے کا بے حد شوق ہے دیگر ڈائجسٹوں میں افسانے چھپ چکے ہیں۔“ (گڑیا آپ کا افسانہ ابھی میری نظر سے نہیں گزرا ہے آپ اپنی تحریریں ہمیں بھی بھیج دیجیے)

پاکیزہ کا ستمبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا اور اکتوبر کا شمارہ دلہن نمبر ہوگا۔ عید، شادی، دلہن اور دلچسپ رسومات کے حوالے سے دلچسپ مراسلات جلد از جلد ہمیں بھیجیں اور ہمیں خط لکھنے اور اپنی تحریریں بھیجنے کے لیے ہمارا ایڈریس نوٹ کر لیں۔

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ c-63 فیز 11 ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

اب اجازت دیجیے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی و سماوی آفات، تمام پریشانیوں، بیماریوں اور شیطانوں اور حاسدین کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے، آمین ثم آمین۔

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

اے ربِ کریم تیرا کام عطا
تیری صفتیں ہیں یہ جود و سخا
ہمیں اتنا دیا کے گن نہ سکے
تو ہی بخشا کیے میری ساری خطا
تو ہی روزِ اول سے آخر تک
تو ہی قائم ہے باقی سب فنا
یہ کرم بھی مولا کر دینا
ملے ساتھ نبی ﷺ کا روزِ جزا
تیرا شکر کریں ہر سانس کے ساتھ
تیری رضا میں ہو کوثر کی رضا

شاعرہ: کوثر خان، کراچی
مرسلہ: صائمہ شاہ، راول پنڈی

نعت رسولِ مقبول ﷺ

زمیں ان سے زماں ان سے
ہوا پُر نور جہاں ان سے
بشر ہے کون؟ بشر ہے کیا؟
پہچان ان سے نشاں ان سے
الٰہی کی ذات سے منسوب بھی قصے
نعت و سخن و بیاں ان سے
رونقِ چمن بوئے گل، نغمۂ بلبل
بہارِ زیست و کون و مکاں ان سے
ان کے نور سے تاباں سورج، چاند اور تارے
صبا کی یہ روانی اور جمالِ کہکشاں ان سے
نوخیز ان کے جلووں تک کہاں تو پہنچ پائے گی
ہے اول و آخر اور درمیاں ان سے

کلام: نوخیز انجم
مرسلہ: فوزیہ ناز، اوکاڑہ

چار خوب صورت باتیں

1۔ جو شخص ہر وقت باوضو رہے گا اللہ اس کی روزی کشادہ فرمائے گا۔
2۔ سود اور حرام کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔
3۔ اللہ کی خوشی باپ کی خوشی، اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی۔
4۔ جس نے اپنی نمازوں کی فکر چھوڑ دی اللہ نے اس کی فکر چھوڑ دی۔

مرسلہ: جبین ہاشمی، بھیرہ

پیاری بات

☆ تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن مجید خود سیکھے اور سکھائے۔

مرسلہ: عنبرین اقبال، گاؤں بدر مرجان

انمول موتی

☆ انسان کا سب سے بڑا بوجھ غصہ ہے۔
☆ محبت اظہار نہیں مانگتی مگر کبھی اظہار کر دینا چاہیے دوسرے کو مطمئن کرنے کے لیے۔
☆ کچھ کانٹے اپنے پاس رکھو کہ یہ پھولوں کی یادگار ہیں اور باقی اپنے دل میں پیوست کر لو تا کہ دوسروں کا درد محسوس ہو۔
☆ کتنے عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جو دوسروں کو خوش رکھنے کی خاطر خود کو فنا کر دیتے ہیں۔
☆ اگر احساس مر جائے تو انسانیت کی قدریں بھی مر جاتی ہیں۔
☆ عقل مند وہ ہے جو جاہل کی بے ہودگی کو خاموشی سے ختم کر دے۔
☆ محبت اور نفرت دونوں اگر حد سے بڑھ جائیں تو جنون کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنون کسی بھی چیز کا اچھا نہیں ہوتا۔

☆ محبت اور عداوت کبھی پوشیدہ نہیں رہتی۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

انٹرویو

میرا نام سدرہ خالد ہے، میرا تعلق گاؤں سے ہے۔ میرے گاؤں کا نام تحصیل میلسی اور ڈسٹرکٹ وہاڑی ہے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں، سب سے بڑا میرا بھائی ہے پھر دوسرے نمبر پر میں اور تیسرے نمبر پر ہماری سب سے چھوٹی بہن ہے۔ ابو کا اپنا کاروبار ہے۔ میں نے اس دفعہ اپنے بھائی کے ساتھ میٹرک کلیئر کیا ہے۔ ہم لوگ جٹ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب میں سلائی کا کام سیکھ رہی ہوں۔ آگے پڑھنے کا فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میرا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا لکھنے کو لیکن بھائی نے مجھے حوصلہ دیا ہے کہ کوئی بات نہیں جب سب لکھنے والی خواتین ہی ہوتی ہیں تو کیا ہوا۔ مگر پھر بھی کہیں ایسا نہ ہوتا ہو کہ لڑکے، لڑکیاں بن کر لڑکیوں کے نام سے لکھتے ہوں۔ آنٹی جی کیا آپ اس بارے میں کوئی چھان بین کرتی ہیں۔ ہاں مجھے پاکیزہ کی تمام مصنفات پسند ہیں اور ڈائجسٹ تو صرف اور صرف پاکیزہ ہی کہ اس کے بعد کچھ اچھا لگتا ہی نہیں ہے۔

سدرہ خالد، دہاڑی

زندگی

بارہا دل نے یہ سوچا کہ
زندگی کیا ہے؟
زندگی ایک سوز ہے
زندگی درد ہے کیا
یا پھر زندگی وہ نغمہ ہے جو
لبوں پر کسی کی چاہت کی صورت
میں محسوس کیا جاتا ہے
یا زندگی دھڑکن کا نام ہے
جو کسی کی زندگی بن کر
جیا جاتا ہے

شاعرہ: سائرہ احمد، جرمنی

خوش بختی

خوش بختی ایک نٹ کھٹ دوشیزہ ہے جس کے لیے کسی ایک جگہ رکنا ممکن ہی نہیں۔ وہ کرسی کی پشت سے تمہارے بالوں کو اپنی انگلیوں سے چھیڑتی ہے اور پھر کھلکھلاتی ہوئی بھاگ جاتی ہے۔

مرسلہ: صائمہ الطاف پراچہ، سرگودھا

لمحے

ہزار لمحوں
ہزار ساعتوں
میں مانگی ہوئی رات
یوں ملی ہے، ہم کو
کہ اک عمر کے سارے
عذاب
گلاب بن چکے ہیں

شاعرہ: نسیم نیازی، لاہور

عورت

☆ عورت کائنات کی بیٹی ہے اس پر غصہ نہ کرو۔

☆ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جلدی اعتبار کر لیتی ہے۔

☆ عورت کے ساتھ نیک خو رہنا چاہیے اس کو رنج نہ دے بلکہ اس کا رنج سہہ۔

☆ عورت سب سے اچھا اور سب سے بہترین آسمانی تحفہ ہے۔

☆ عورت کا بناؤ سنگھار اس کے دل کی حالت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

مرسلہ: سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم

تیری یاد

اس بار بھی تیری یاد میں
بہاروں کی رُت گزر گئی

وعدہ کیا نہ شام کا
نہ صبح کی کوئی آس دی
کلیاں کھلیں میرے چار سو
پھولوں میں رنگ ہیں بھرے
مصروف تتلیاں بہت
بھنورے کی گونج بھی سنی
پروا کان میں کہے
ملنے کی رُت ہے یہ صنم
مجھے انتظار ہے تیرا
آنکھیں ہیں آنسوؤں سے نم
صدا میری سنتے نہیں
آواز تم دیتے نہیں
پھر بات ہو تو کس طرح
گزرے یہ موسم کس طرح

شاعرہ: خالدہ نسیم، یوکے

ہائے اے معصومیت

اکبر صاحب دولت مند مگر نہایت کنجوس آدمی تھے۔ اس لیے ہمیشہ بوسیدہ اور بے ڈھنگے لباس میں نظر آتے۔ آخرکار ایک روز ان کا دوست کہنے لگا۔

”اکبر صاحب! خدا کے لیے ڈھنگ کا لباس پہنا کریں کچھ نہیں تو اپنے والد مرحوم کا خیال کریں، وہ تو بڑے خوش لباس تھے۔“

اکبر صاحب نے ناراضی سے کہا۔ ”اب پھر مجھ پر خفا کیوں ہو رہے ہیں؟ میں تو ہمیشہ ان ہی کے کپڑے پہنتا ہوں۔“

مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

غزل

میں زندگی کی جنگ ہار چکی ہوں مجھے سونے دو
میں اپنا ہر غم منا چکی ہوں مجھے سونے دو
کسی بھی پھول پہ لکھا نہیں نام میرا
میں بخت اپنا آزما چکی ہوں مجھے سونے دو
اب بچا ہے کیا دامن میں، ہو جس کے لٹنے کی فکر
میں آپ، اپنا آشیاں جلا چکی ہوں مجھے سونے دو
بھٹکتے پھرتے ہو کیوں اب بھی آنکھوں کے ساحل پر
سو بار کہا، تیری آرزو دل سے مٹا چکی ہوں مجھے سونے دو
مسکرانے کی تمنا بھی دفنا دی اب تو
ہر درد سے ساتھ نبھا چکی ہوں مجھے سونے دو
یہ میری ہی امیدوں کی لاش ہے، ذرا غور سے دیکھو
میں اپنا ہر سوگ منا چکی ہوں مجھے سونے دو
صدیوں کے رتجگوں کا ہے بوجھ میری پلکوں پر
خود کو بہت تھکا چکی ہوں مجھے سونے دو
گردشِ دوراں نے رکھا ہے کہاں یہ تیرا وجود بختاور
میں آپ اپنا بھلا چکی ہوں مجھے سونے دو

شاعرہ: بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان

انمول باتیں

☆ رشتوں اور انسانوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ مخلص اور پُرخلوص ہوں۔

☆ بددعا کبھی زبان سے نہیں دی جاتی بلکہ دکھا ہوا دل خود ایک بڑی بددعا کی گزرگاہ بن جاتا ہے۔

☆ جن سے ہم محبت کرتے ہیں انہیں کبھی بھلا نہیں سکتے اور جن سے نفرت کرتے ہیں وہ بالکل ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں۔

☆ دوست کبھی نہیں بچھڑتے، جو چلے گئے وہ یادوں میں زندہ رہتے ہیں۔

مرسلہ: عروج ذکی آفندی، کراچی

دوستی

دوست بنائے نہیں جاتے بلکہ بن جاتے ہیں اور بنتے بھی وہ لوگ ہیں جو دوست بننے کے قابل ہوتے ہیں اور بنتے صرف وہ لوگ ہیں جو کہ آپ کے دل میں گھر کر جائیں اور آپ کے دل میں وہ لوگ رہ سکتے ہیں جو کہ خوش اخلاق، خوش سیرت، خوش مزاج، خوش شکل اور باکردار ہوتے ہیں۔

مرسلہ: عفت گلزار عفی، ضلع لیہ

جلترنگ

انجم انصار

بات کا بتنگڑ

کس قدر سیدھے تھے وہ بیوی جو کھانا دیتیں چپ چاپ سر جھکا کر خاموشی سے کھالیتے۔ اس دن دال روٹی کھاتے ہوئے منہ میں آئے کنکر چپ چاپ منہ سے نکال کر ٹرے میں رکھ رہے تھے کہ ان کی بیگم نے دیکھ لیا۔

''اے ہے یہ بجری کا کیوں ڈھیر لگا دیا ٹرے میں؟''

''یہ دال میں سے نکل رہے ہیں۔'' وہ دانتوں تلے آیا کنکر نکالتے ہوئے بولے۔

''اللہ...... تین گھنٹے پکائی ہے یہ دال۔ تھک گئی میں، نہ جانے آپ کہاں سے یہ دالیں لاتے ہیں۔ مجال ہے کہ کنکر گل جائیں۔ سبزی پکانے میں یہی تو آسانی ہے کہ سب کیڑے سبزی کے ساتھ گھٹ جاتے ہیں۔ نامراد نظر آکر دل تو نہیں جلاتے مگر یہ کنکر...... توبہ ناک میں دم کر دیتے ہیں حالانکہ میں کفگیر زور زور سے پتیلی میں مارتی رہی تھی مگر اب بھی نکل رہے ہیں تو میرا کیا قصور ہے۔''

''بیگم کھانا کھاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے کہ یہ کنکر اگر میرے پیٹ میں چلے گئے تو پھر درد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔''

''افوہ، بات کا بتنگڑ بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ دال میں کنکر ہی نکل رہے ہیں ناں کوئی ہاتھی، شیر تو نہیں برآمد ہو رہا ہے جن سے جان کا خطرہ ہو۔''

لوڈ شیڈنگ

بجلی یوں تو اگر نہ آئے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ہر کام رک گیا مگر ہمارے ہاں بجلی نہیں جاتی۔ جی ہاں! ہمارے ہاں بجلی نہیں جاتی چونکہ صوبے کے بہت بڑے وزیر کا گھر ہمارے گھر کے نکڑ پر ہے اسی لیے ہمارے علاقے کو ریڈ زون کا درجہ حاصل ہے۔ چھوٹی نند نے مجھ سے لوڈ شیڈنگ کے دکھڑے رونے کے لیے فون کیا۔ ''بھابی قسم لے لو کہ چار دن سے منہ دھویا ہو۔''

''وہ تو تم دھو بھی لو تو پتا نہیں چلتا۔'' میں نے دل میں سوچا۔

''ارے بجلی ہوگی تو پانی آئے گا ناں!'' وہ دکھوں میں ڈوبی آواز سے بولی۔

''ارے، یہ سب مسئلے مسائل چھوٹے علاقوں کے ہوتے ہیں شبانہ۔'' اب شو مارنے کی باری میری تھی۔

''وہ کیسے بھابی؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''ارے بھئی ریڈ زون ایریا میں یہ پرابلم نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں تو لائٹ جاتی ہی نہیں ہے۔ بچے اے سی چلا کر دیر تک اپنی پسند کی فلمیں دیکھتے رہتے ہیں۔ میں الگ کمرے میں اے سی چلا کر کھانا کھاتی ہوں۔ تمہارے بھائی جب آتے ہیں تو ان کی ناز برداریاں الگ کہ نصرت آرا گرمی سے آیا ہوں ٹھنڈا جوس دو اور کسی کمرے کا اے سی آف نہ کرنا۔''

''ہیں بھابی!'' اب حیران ہونے کی باری نند صاحبہ کی تھی۔

''اور نہیں تو کیا! گرمی میں تو ویسے ہی طبیعت خراب ہو جاتی ہیں اوپر سے لائٹ بھی چلی جائے۔ میں تو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ ایک دوسرے کی شکل سے نفرت ہو جائے گرمی میں اگر لائٹ بھی چلی جائے تو۔'' میں نے فلسفہ جھاڑا۔

''یہی تو ہو رہا ہے، اسلم مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔''

''وہ کیوں بھئی؟'' میں نے کھوجی بن کر بات نکالنے کی کوشش کی۔

''اب بتائیں اگر جو لائٹ نہیں ہے اور ایک جوتا مل رہا ہے تو کیا میری غلطی ہے؟ بھئی بجلی نہ ہونے پر ایک بھی مل گیا تو غنیمت ہے۔ میں نے کہیں کہہ دیا کہ ایک جوتا پہن کر ہی آفس چلے جائیں تو بھڑک گئے۔''

''لیکن شبانہ ایک جوتے میں تو وہ عجیب سے لگیں گے۔'' میں نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

''کہہ دیتے کہ دوسرے پیر میں چوٹ لگ گئی ہے تبھی چپل پہن کر آیا ہوں بات ختم۔ چاہتے ہیں کہ بہانے بھی میں بنا کر دوں۔ دماغ چلتا ہی نہیں ہے اس آدمی کا۔'' شبانہ بھی بھری بیٹھی تھی۔ ''بچہ کیوں رو رہا ہے، گھر کیوں گندا ہے، منی سر کیوں کھجا رہی ہے، نل میں پانی کیوں نہیں آرہا۔ سب کی ذمے دار میں ہوں۔'' اب تو شبانہ رو دی۔

''چلو، چلو چپ ہو جاؤ۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔

گھنٹے دو گھنٹے بعد دروازے پہ اتنے زور کی دھڑ دھڑاہٹ ہونے لگی کہ لگتا تھا کہ اب دروازہ ٹوٹ کر گر جائے گا کھولنے پر پتا چلا کہ شبانہ اپنے لاؤ لشکر سمیت تشریف لا چکی ہے۔ شبانہ تو شبانہ اس کے پانچ عدد غلیظ بچے گندے کپڑوں کے پوٹلے پانی کی خالی بوتلیں وغیرہ۔

''اگر شبانہ آنا تھا تو بتا کر تو آتیں۔ ایسے بغیر اطلاع کے کیسے آنا ہوا۔ خیریت تو ہے ناں؟'' میرے منہ میں جو آتا جا رہا تھا میں بولے جا رہی تھی۔

''وہ بھابی میں نے سوچا کہ آپ کے گھر تو لائٹ جاتی نہیں تو ہفتہ دس دن رہنے آجاؤں۔ مجھے بھی سکون مل جائے گا روز روز کی کل کل سے اور بچے بھی سکون میں آئیں گے۔'' (اور ہمارا سکون تو برباد ہو گیا) میں نے دل میں سوچا۔ ''اے سی میں سوئیں گے۔ یقین کریں گرمی کی وجہ سے بچوں کے پورے جسم پھنسی پھوڑوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے چیچک ہو گئی ہے مگر شکر ہے کہ چھوٹی والی چیچک ہے جلدی صحیح ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی اسلم سے کہہ دیا کہ مجھے دس بیس دنوں تک لینے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہوں لیکن راستے میں ہی تھی کہ ان کا فون آگیا کہ میری شبو تمہارے بغیر بھی میں کبھی رہا ہوں جہاں تم وہاں میں۔ آفس سے واپسی پر میں بھی وہیں آرہا ہوں رہنے کے لیے۔'' شبانہ نئی دلہنوں کی طرح شرم سے لال ہو رہی تھی۔ کالا رنگ لال ہو کر عجیب جامنی سا لگ رہا تھا۔

''تمہارا چھوٹا بھی چلنے لگا۔'' جب نند کے چھوٹے بچے نے میز پر رکھا گلدان کھینچ کر زمین پر توڑا تو میں نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں بھابی میرے بچے تو مہینے میں چل پڑتے ہیں۔ بہت شریر ہیں کوئی چیز نہیں چھوڑتے تبھی تو ہمارا گھر کھنڈرات کا منظر پیش کرتا ہے۔'' وہ فخریہ غرور سے بولی اور میں اپنے گھر کو موہن جو ڈرو کے کھنڈرات جیسا بنتا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی بال لے کر بھاگ رہا تھا تو کوئی بستر پر کود رہا تھا۔ دو آپس میں لڑ رہے تھے اور نند صاحبہ آرام سے بستر پر لیٹ کر ٹی وی کا پروگرام دیکھنے میں مصروف تھیں۔

دو دن کے بعد میں میاں جی کے سینے سے لگ کر چیخ کر بولی۔ ''سنیے ہمارے گھر لائٹ کیوں نہیں جاتی؟''

''نصرت آرا اللہ کا شکر کرو پورا ملک پریشان ہے بدحال ہے لوڈ شیڈنگ سے سب کا برا حال ہے اور تم کہتی ہو کہ ہمارے گھر لائٹ چلی جائے۔ پاگل

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگئی ہوتم۔‘‘ وہ ڈکرائے۔
’’ہاں، ہاں میں پاگل ہوگئی ہوں اور اب اس وزیر کے بچے کو میں ووٹ بھی نہیں دوں گی جس کی وجہ سے ہمارے علاقے کو ریڈ زون قرار دیا گیا ہے۔ نہ ہوگی لائٹ نہ آئے گی شبانہ۔‘‘

سن تو سہی

’’سنیے زمین جو پڑی ہے اس پر گھر بنوالیں ناں۔‘‘ ایک دن میاں کا موڈ اچھا دیکھ کر میں نے بالآخر دل کی بات زبان پر لاکر ہی دم لیا۔
’’دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔‘‘ وہ دہاڑے۔ ’’گھر بنانا مذاق ہے کیا۔ آج کے زمانے میں عزت سے دو وقت کی روٹی مل جائے تو شکر ادا کرو۔ ہم میں سے کون سے چار لوگ لندن لگے ہوئے ہیں۔‘‘ وہ بھی پوری بھڑاس نکال کر ہی رکے۔
’’لندن لگے ہوئے ہیں، مطلب؟‘‘ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ’’میرے میکے سے تو کوئی بھی لندن نہیں گیا۔ ہاں ایک دفعہ چھوٹے خالو آفس کے کام کے سلسلے میں نیپال گئے تھے اور......‘‘
’’بس چپ ہوجاؤ۔‘‘ انہوں نے بات کاٹی۔ ’’بے وقوف عورت اس کا مطلب یہ ہے کہ کافی روٹیاں لگ رہی ہیں تمہیں جو گھر بنوانے کا سوچ رہی ہو، سمجھیں!‘‘ پھر یہ جھڑپیں ہمارے ہاں آئے دن کا معمول بن گئیں۔ جہاں کہیں میاں کو اچھے موڈ میں پایا وہیں ان کے پیچھے لٹک گئے۔ وہ بھی جان چھڑانے میں ماہر مگر ہم بھی ان کی بیگم۔ وہ عورت ہی کیا جو کہے سے پھر جائے یا مقصد سے باز آئے۔ سو آخر کار عورت کی جیت ہوئی اور ہمارے میاں میرے خوابوں کا گھر تعمیر کروانے کے لیے تیار ہوگئے۔ جیسے تیسے گھر بنا اس کی روداد پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ گھر تیار ہونے کے بعد یہ کیا بات ہوئی کہ کسی نے داد دی اور نہ سراہا سو سارے خاندان کے لیے زور شور سے دعوت کا اہتمام ہوا۔ جس میں سسرال در سسرال بلاوا دیا گیا۔ جس کو نہ صرف زور شور سے منظور کیا گیا بلکہ سوزوکیاں، ٹیکسیاں بک کر کے لوگ اس دعوتِ عام میں پہنچے۔ بڑے خالو کو چاہ سے گھر کے ایک ایک کونے کا وزٹ کرایا گیا حتیٰ کہ غسل خانے بھی نہ چھوڑے۔ گھر دیکھنے کے بعد بولے۔
’’بھائی مجید برا نہ ماننا گھر تو تمہارا نرا دوزخ ہے۔ نہ ہوا کے لیے کوئی کھڑکی، نہ گھر میں کوئی خاص روشن دان۔ یہ نقشہ کس سے بنوایا ہے میاں۔ باتھ روم کی کھڑکیاں، ٹی وی لاؤنج میں کھل رہی ہیں۔‘‘
’’رضیہ ایک غلطی کردی تم نے باورچی خانہ بالکل پیچھے بنوالیا تم نے۔‘‘ چھوٹی پھپھو بولیں۔ اب ان کو کون بتاتا کہ پیچھے بھی جب میاں سے دس صلواتیں سنی ہیں اور اپنی چوری کیے ہوئے پیسے (بچت سے) جب سب ان کے سامنے نچھاور کردیے جب جاکر مکمل ہو پایا تھا۔
’’خیر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ کچھ مال مجھے لگ رہا ہے کنسٹرکشن کا باہر رکھا ہے۔ بیٹا بس پیچھے سے باورچی خانہ تڑوا کر آگے کا پورشن بنوالو تاکہ ہوادار ہوجائے۔‘‘
’’ارے چھت بڑی نیچے کروالی، یہ دیواریں تڑوالو تو کمرا ذرا بڑا ہوجائے گا۔ یہاں کا دروازہ فوراً بند کرواؤ اور یہ کھڑکی کھولو۔ یہ گھر کہاں جنگل میں بنوالیا۔ آئے گا کون تمہارے گھر صرف دو بسیں چلتی ہیں۔ فرش کی ڈھلان خراب ہے، یہ کیا نیلے پیلے رنگ ہر کمرے میں کرالیے بالکل اسکول لگ رہا ہے۔‘‘ اس وقت میرے دل کا حال تو میں جانتی تھی یا پھر اللہ۔ ہونٹوں پر ہنسی رکھ کے رونا کس کو کہتے ہیں یہ جان لیا تھا میں نے۔ سب کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی میں۔
’’کیوں رو رہی ہو میری رضیہ، کیا بہت تھک گئیں؟‘‘ میاں بڑی ہی چاہ سے پوچھ رہے تھے۔ سچ بتادیتی کہ آج آنے والے مہمانوں نے میرا کتنا دل توڑا اپنے لفظوں سے مجھے کتنا زخمی کیا، میرے ارمانوں کو مٹی میں ملادیا تو کہتے تم ہی پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ گھر گھر میں تو تبھی منع کررہا تھا۔ دیکھو پیسہ بھی خرچ ہوا اور تھو تھو الگ ہوئی۔ سو عورت پھر جیتی۔
’’نہیں، نہیں جان یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ ایسا گھر بنوایا ہے کہ سب حیران رہ گئے قسم سے۔‘‘ میں کہہ رہی تھی، ہنس رہی تھی رو بھی رہی تھی اور میاں جی مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔

دھوم دھام

پتا نہیں وہ کس قوم کی خاتون ہوتی ہیں جن کا تلوا کبھی اپنے گھر میں ٹکتا ہی نہیں ہے۔ جب دیکھو کبھی یہاں، کبھی وہاں مجال ہے کہ وہ چین سے گھر میں بیٹھیں۔ شاہدہ کے گھر میں جب بھی گئی ان کی ساس نے ناک چڑھا کر یہی بتایا کہ گھومنے پھرنے گئی ہوئی ہے۔ شاہدہ گھومنے کی تو واقعی رسیا ہے مگر ایک مرتبہ وہ نمونیہ ہوجانے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تب بھی ان کی ساس نے یہی جواز بتایا تھا اس کی غیر حاضری کا خیر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے رشتوں میں۔
سلمیٰ کے موبائل پر فون کر کے جب بھی کہا میں تمہارے گھر آرہی ہوں تو وہ کبھی حیدرآباد ہوتی تو کبھی سکھر اور ایک مرتبہ میں اس کے محلے میں ہی تھی سوچا سلمیٰ سے ملتی چلوں تو اس نے بتایا کہ اس وقت وہ خیرپور اپنی نند سے ملنے گئی ہے۔
’’جب تمہاری نند تمہارے محلے میں رہتی تھی تو تم اس کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتی تھیں اب اتنا سفر کر کے اس سے ملنے کیوں کر پہنچ گئیں؟‘‘ میں نے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

’’دور جانے سے محبت بڑھ جاتی ہے ناں۔‘‘ مگر اس دن میں حیران رہ گئی موبائل میں کریڈٹ نہ ہونے کی وجہ سے میں فون کیے بغیر سلمیٰ کے گھر چلی گئی تو وہ محترمہ گھر پر ہی تھیں۔
’’آج تم گھر میں کیسے نظر آرہی ہو؟‘‘ میں نے حیران ہوکر پوچھا۔
’’بس ابھی ابھی آکر بیٹھی ہوں۔‘‘
’’تایا کے چچا کی بیٹی کے بھانجے کی بہن کی لڑکی کا انتقال ہوگیا ہے اور دس منٹ میں واپس جارہی ہوں۔ وہاں سوگ کی تقریب میں ایک سلیبرٹی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ میری بھابی کے ماموں کی بیٹی کے دوست کی بہن ایک چینل پر کام کرتی ہے۔ مجھے ان کا انٹرویو کروانا ہے۔‘‘ (کتنا قریبی تعلق......اُف)
اور میں ان کے تعلقات کی قربت اور شوق ذوق کی وارفتگی دیکھ کر پانچ منٹ سے پہلے ہی گھر آگئی جہاں جاکر اپنے منہ کی بساند نہ نکلے وہاں جانے کا بھلا فائدہ کیا ہوتا ہے۔ کسی جگہ جاکر اگر ہم مظلومیت کی اوڑھنی نہ اوڑھیں تو یہ اپنی ذات سے خود نفرت کرنے کے برابر ہے۔ گھر کے ملازمین بے شک آنکھ بچا کر ہانڈی کی آدھی بوٹیاں اڑالیں، فریج سے پھل غائب کریں اور جوسز کے ڈبے ڈکار جائیں اس کا اتنا صدمہ نہیں ہوتا جتنا کہ سسرال والوں کو کچھ کھلانے پلانے پر ہوتا ہے۔ یوں بھی بھانجے، بھانجیاں تمیز دار اور سسرال کے بچے مہا بدتمیز کہلائے جاتے ہیں اور بچے ہر بری بات اپنے ددھیال سے ہی سیکھا کرتے ہیں۔ میرے بچوں نے بھی ساری بدتمیزیاں، گالی گلوچ، مار پیٹ حتیٰ کہ چوری چکاری بھی سب اپنی ددھیال سے ہی تو سیکھی ہے۔ ایسی باتیں اگر کسی جگہ بیٹھ کر مارکیٹ میں نہ لائی جائیں تو طمانیت کی پنیری کہاں لگائی جائے۔

☆☆☆

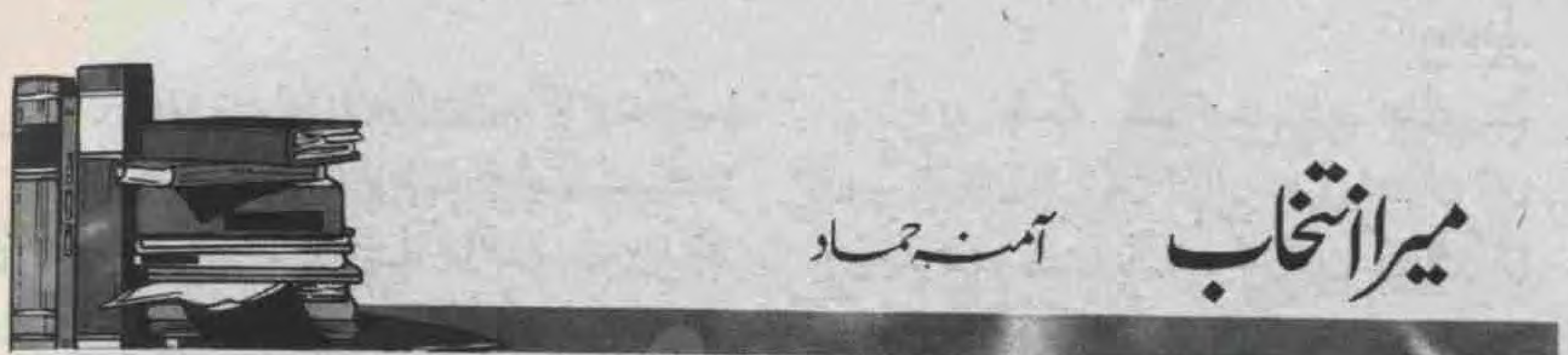

میرا انتخاب

آمنہ حماد

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دل کا موسم بہت شاندار ہوتا ہے لیکن ہمارے گرد بکھرے کردار اور ماحول اس طرح ہم پہ اپنا تاثر ثبت کرتے ہیں کہ دل کا موسم یکا یک اپنا رنگ تبدیل کر لیتا ہے اور ہم اپنے ماحول کے دکھ میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ یہی تاثر ہمیں فیض احمد فیض کی غزل میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کا انتخاب کیا ہے۔ تہذیب فاطمہ نے کراچی سے۔

غزل

یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے
خوش دعوتِ یاراں بھی ہی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے
یوں پیرِ مغاں شیخِ حرم سے ہوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفی پرہیز بہت ہے
اِک گردن مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اِک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے
کیوں مشعلِ دل فیض چھپاؤ تہ داماں
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

محبت میں عجب اسرار پوشیدہ ہے کچھ لوگ اس اسرار کو پالیتے ہیں اور کچھ اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ پانے اور کھونے کا یہ احساس کیفی اعظمی کی نظم اندیشے میں نظر آتا ہے جسے صائمہ امین نے لاہور سے منتخب کیا ہے۔

اندیشے

روح بے چین ہے اِک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوزِ محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا
جھک گئی ہوگی جواں سال امنگوں کی جبیں
مٹ گئی ہوگی للک ڈوب گیا ہوگا یقیں
چھا گیا ہوگا دھواں گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھروندے کو جو ڈھایا ہوگا
دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اِک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا
اس نے گھبرا کے نظر لاکھ بچائی ہوگی
مٹ کے اِک نقش نے سو شکل دکھائی ہوگی
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا
بے محل چھیڑ پہ جذبات ابل آئے ہوں گے
غم پشیمان تبسم میں ڈھل آئے ہوں گے
نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا
زلف ضد کر کے کسی نے جو بنائی ہوگی
روٹھے جلوؤں پہ خزاں اور بھی چھائی ہوگی

برق عشووں نے کئی دن نہ گرائی ہوگی
رنگ چہرے پہ کئی روز نہ آیا ہوگا

فاصلے اور وقت کے ہندسوں کو بدلتے ہوئے ہم اپنی آنکھوں میں خواب سجاتے ہیں...... کچھ خواب، خوابِ بے تعبیر ہوتے ہیں لیکن ان کو بھلانے کی سوچ کبھی نہیں ہوتی...... جونؔ ایلیا اپنے مخصوص انداز میں اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کا انتخاب شمسہ نے کراچی سے کیا ہے۔

غزل

تم حقیقت نہیں ہو حسرت ہو
جو ملے خواب میں وہ دولت ہو
میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں
مر ہی جاؤں جو تم سے فرصت ہو
تم ہو خوشبو کے خواب کی خوشبو
اور اتنی ہی بے مروت ہو
تم ہو پہلو میں پر قرار نہیں
یعنی ایسا ہے جیسے فرقت ہو
کس طرح چھوڑ دوں تمہیں جاناں
تم مری زندگی کی عادت ہو
کس لیے دیکھتی ہو آئینہ
تم تو خود سے بھی خوب صورت ہو
داستاں ختم ہونے والی ہے
تم مری آخری محبت ہو

عشق ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے جس کے مظاہر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ فنا کا ہاتھ ان کو کبھی نہیں چھو سکتا...... متضاد چیزیں ہمیشہ ایک دوسرے کو متوجہ اور متاثر کرتی ہیں۔ یہی بات رویّوں اور انسانوں میں بھی ہے...... عشق کے دیے کی لو بھی تبھی بھڑکتی ہے جب وہ دو متضاد رویّوں کے درمیان روشن ہو ورنہ یہ لو بجھتی چلی جاتی ہے۔ تضاد اور متضاد کا امتزاج ہمیں شہزاد احمد کی اس نظم میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا انتخاب طارم فاطمہ نے اسلام آباد سے کیا ہے۔

عشق

ہم آپس میں عشق کرتے ہیں
مگر تمہارے اور میرے درمیان
محبت کا نہیں گریز کا رشتہ ہے
جو میں چاہتا ہوں تم بھی وہی چاہتے ہو
جو میں نہیں چاہتا تم بھی نہیں چاہتے
اس کے باوجود جب ہم قریب آتے ہیں
تو ایک دوسرے سے مماثلت
ہمیں خوف زدہ کر دیتی ہے
کاش تم وہ چاہتے جو میں چاہتا ہوں
کاش میں وہ نہ چاہتا جو تم چاہتے ہو
محبت کا المیہ یہ نہیں ہے
کہ ہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں
یا گریز پا ہیں محبت کا المیہ یہ ہے
کہ ہم ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں
قریب آنا چاہتے ہیں
ہم چونکہ ایک دوسرے کی طرح ہیں
اس لیے ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکتے
کاش ہم ایک دوسرے کی طرح نہ ہوتے
ایک دوسرے کی ضد ہوتے
اور یہ تضاد
ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ دیتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تنہائی میں سوچنا اور کچھ کھوجنا یہ دو کام ضرور ہوتے ہیں کسی کی کہی بات ...... کسی کا بے اعتبار ہونا...... یقین نہ کرنا یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ شخص ہمیں کتنا سمجھتا ہے اور یہ احساس انا کو چوٹ لگاتا ہے ......انسان کو توڑ ڈالتا ہے۔ شکست و ریخت کے اس عمل کو محسن نقوی اپنے کلام میں عیاں کر رہے ہیں۔ جسے نگہت پروین نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

غزل

انا پہ چوٹ پڑے بھی تو کون دیکھتا ہے
دھواں سا دل سے اٹھے بھی تو کون دیکھتا ہے
میرے لیے کبھی مٹی پہ سردیوں کی ہوا
تمہارا نام لکھے بھی تو کون دیکھتا ہے
اجاڑ گھر کے کسی بے صدا دریچے میں
کوئی چراغ جلے بھی تو کون دیکھتا ہے
ہجوم شہر سے ہٹ کر حدودِ شہر کے بعد
وہ مسکرا کے ملے بھی تو کون دیکھتا ہے
ہے آنکھ میں کوئی چہرہ نہ کوئی عکسِ طلب
وہ آنکھ جل کے بجھے بھی تو کون دیکھتا ہے
ہجوم درد میں کیا مسکرایئے کہ یہاں
خزاں میں پھول کھلے بھی کون دیکھتا ہے
ملے بغیر جو مجھ سے بچھڑ گیا محسن
وہ راستے میں رکے بھی تو کون دیکھتا ہے

کڑواہٹ میں بھیگے لمحے کچھ عجیب ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں ضرورت بہت توجہ کی ہوتی ہے ......یاد آؤ تو کم یاد نہ آؤ...... زندگی جمود کا شکار ہوجاتی ہے...... ایک خوابِ بے تعبیر کہ جس کو بھلانے کی نیت نہیں ہوتی اور اس کے بغیر جینے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔ چاہت کے اس سلسلے کو جاں نثار اختر نے قلمبند کیا ہے جسے شازیہ حمیر نے کوئٹہ سے منتخب کیا ہے۔

تجزیہ

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی جب پاس تو نہیں ہوتی
خود کو کتنا اداس پاتا ہوں
گم سے اپنے حواس پاتا ہوں
جانے کیا دھن سمائی رہتی ہے
اک خموشی سی چھائی رہتی ہے
دل سے بھی گفتگو نہیں ہوتی
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی شب کی طویل خلوت میں
تیرے اوقات سوچتا ہوں میں
تیری ہر بات سوچتا ہوں میں
کون سے پھول تجھ کو بھاتے ہیں
رنگ کیا کیا پسند آتے ہیں
کھو سا جاتا ہوں تیری جنت میں
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی احساس سے نجات نہیں
سوچتا ہوں تو رنج ہوتا ہے
دل کو جیسے کوئی ڈبوتا ہے
جس کو اتنا سراہتا ہوں میں
جس کو اس درجہ چاہتا ہوں میں
اس میں تیری سی کوئی بات نہیں
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!

سندیسے
پاکیزہ بہنیں

مرضی

جب کوئی کام تمہاری مرضی سے ہو جائے تو شکر ادا کرو کہ اللہ نے تمہاری مرضی کو اہمیت دی اور اگر کوئی کام تمہاری مرضی سے نہ ہو تو اور زیادہ شکر ادا کرو کیونکہ اب وہ کام اللہ کی مرضی سے ہوگا اور اللہ کی مرضی ہماری مرضی سے زیادہ بہتر اور افضل ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر کومل ستار، جامشورو

شکر

اگر تم اپنے روزگار میں ناقابلِ یقین اضافہ چاہتے ہو تو بھی دسترخوان پر رکھے کھانے میں عیب نہ نکالو اور شکر ادا کر کے کھاؤ اس سے تمہیں دو فائدے ہوں گے۔ (۱) تمہارے حلال رزق میں اضافہ ہوگا۔ (۲) تم پر آنے والی ستر بیماریوں سے تمہیں اللہ محفوظ رکھے گا۔

مرسلہ: عروج ذکی آفندی، کراچی

ایک پیغام

سنو!
اس رمضان میں
ہمارے گھر تم
افطاری اچھی بھجوانا
ورنہ یہ نہ ہو
کہ پچھلے سال کی طرح
میری ساری بھابیاں
تمہارے گھر سے آنے والی
افطاری خود کھانے کے بجائے
ملازمہ کو دے دیں

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

سچ

مانا کہ بہت سچ بولتے ہو تم
مگر پلیز میرے والد کے سامنے
یہ سچ کبھی نہ بولنا
کہ تم روزے رکھنے کے بجائے
افطاری کھانے کو پسند کرتے ہو

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

پیارے پیغامات

☆ اللہ سے مانگو تو بے حساب مانگو کیونکہ وہ واپسی کا تقاضا نہیں کرتا۔

☆ ہمیشہ دعا مانگتے رہو کیونکہ ممکن اور ناممکن تو ہماری سوچ میں ہے۔ اللہ کے لیے تو سب کچھ ممکن ہے۔

☆ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا۔ ''فاطمہؓ عورت کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟'' حضرت محمدﷺ کی لختِ جگر نے فرمایا۔ ''وہ غیر محرم کو نہ دیکھے اور غیر محرم اسے نہ دیکھ سکے۔'' اور آپ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ''اے علیؓ میرا جنازہ رات کو اٹھانا۔'' حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ''کیوں؟'' حضرت فاطمہؓ نے فرمایا۔ ''کیونکہ میرے کفن پہ بھی غیر محرم کی نظر نہ پڑے۔''

☆ وہ انسان ہمیشہ خزاں کی قدر کرتا ہے جس نے بہار میں زخم کھائے ہوں۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆یاسمین رحیم......چکوال
دل کے شیشے پہ نہ لکھو راز کی باتیں کبھی
آنکھ کی کھڑکی کھلی ہے عکس باہر آئے گا
☆فائزہ......لیہ
جس بھی فنکار کا شاہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا
☆عائشہ نعیم......کراچی
حسرت پہ اس مسافرِ بیکس کی روئیے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے
☆فریدہ رحمان......کوئٹہ
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا
☆شازیہ شاہ......ساہیوال
سنتے ہیں قیمت تمہاری لگ رہی ہے آج کل
سب سے اچھے دام کس کے ہیں بتلانا ہمیں
تاکہ اس خوش بخت تاجر کو مبارک باد دیں
اور اس کے بعد دل کو بھی ہے سمجھانا ہمیں
☆نزہت کریم......میاں چنوں
کبھی تو چاند بھی اترے گا دل کے آنگن میں
کبھی تو موج میں آئے گا یہ کنارہ بھی
☆رابعہ سعید......نواب شاہ
خواب ہوتے جاتے ہیں شہرِ دل کے سب موسم
اب کہاں وہ نیند اپنی اب کہاں وہ رات اپنی
فوزیہ شاز میر......اسلام آباد
لو دیکھ لو یہ عشق ہے، یہ وصل ہے، یہ ہجر
اب لوٹ چلیں آؤ بہت کام پڑا ہے
☆ناہید ریاض......میرپور خاص
نہ زادِ راہ نہ رہبر نہ منزلِ مقصود
عجیب شان سے یاروں کا قافلہ نکلا
☆فرحت احمد......ملتان
اتر رہے ہیں کسی خواب کے سمندر میں
جہاں ہے ناؤ وہاں بادباں بنانا ہے
تعلقات محبت میں ڈھلنے والے ہیں
سو اِک زمانہ ہمیں درمیاں بنانا ہے
☆عظمیٰ ضیا......حیدر آباد
ہم سے یہ کھیل عجب کھیل گئی ہے قسمت
ان کا آنا تھا، ہوئی ختم کہانی اپنی
☆ثمینہ رضا......کراچی
خوشبو کی طرح پھیلے گی یہ بات کبھی تو
بخشے گا ہمیں شرفِ ملاقات کبھی تو
اب تک کی ملاقاتیں ہیں آئندہ کی خاطر
مل جائیں گے آپس میں خیالات کبھی تو
☆فرحت اشفاق......راولپنڈی
کہیں آنکھوں سے چھلکنے نہیں دیتے تجھ کو
اپنی وحشت میں ترے خواب سنبھالے ہوئے لوگ
☆زینت رحمان......اوکاڑہ
جس کی معصوم سی صورت پہ ترس آتا تھا
وہی درویش بڑا گہرا شکاری نکلا

☆انیقہ کاشف......جہلم
اپنے کردار کے بارے میں بھی سوچا ہوتا
میرے کردار پہ جب وار کیا ہے تو نے
☆ناہید سحر......کراچی
ہر اِک شخص کو خواہش ہے روشنی کی مگر
سوال یہ ہے کہ پہلا دیا جلائے کون
☆ہانیہ عزیز......کراچی
مار ڈالے گا اسے جرم کا احساس ندیم
قتل کر کے جسے مقتول پہ سبقت نہ ملی
☆زہرہ......سیالکوٹ
موسم نے بال و پر تو سنوارے بہت مگر
اڑتے کہاں کہ ہم تو اسیرِ کمند تھے
☆شائستہ اکرم......نوشہرہ فیروز
آپس میں رسم و راہ کا فقدان ہو گیا
دیوانہ وار ملنے کی عادت نہیں رہی
تعبیر بن کے خواب کی آتے وہ خواب میں
افسوس ان کو اتنی بھی فرصت نہیں رہی
☆طاہرہ گوجر......گوجرانوالہ
بہت دنوں سے وہ گمبھیر خامشی ہے فراز
کہ لوگ اپنے خیالوں سے آپ ڈرنے لگے
☆فاطمہ نیاز......آزاد کشمیر
اس تشنگی کے ساتھ کہ آئے گی اب بہار
ہم نے تمام عمر بتا دی خزاں کے سنگ
☆لبنیٰ غفار......لاہور
حیرت نہ کیجیے یہ اصولِ تضاد ہے
دھوکا وہیں پہ ہوگا جہاں اعتماد ہے
☆فریحہ شاہ......راولپنڈی
اب تو پہچان کا معیار جدا ہے اے دوست
بے رخی سے جو ملے گا وہی اپنا ہوگا
☆روحا علی......چکوال
کچھ خواب میری جاگتی آنکھوں کو بخش کر
وہ آندھیوں میں ریت کے گھر دے گیا مجھے
☆قرۃ العین......کوٹ غلام محمد
کیوں ہیں کب تک ہیں کس کی خاطر ہیں
بڑے سنجیدہ مسئلے ہیں ہم
☆زرین ریاض......سیالکوٹ
تمہیں بھی یاد نہیں اور میں بھی بھول گیا
وہ لمحہ کتنا حسیں تھا مگر فضول گیا
☆روشانے شاہ......اسلام آباد
میں پا سکا نہ کبھی اس خلش سے چھٹکارا
وہ مجھ سے جیت بھی سکتا تھا جانے کیوں ہارا
☆ریحانہ صدف......حیدر آباد
تھی اس قدر عجیب مسافت کہ کچھ نہ پوچھ
آنکھیں ابھی سفر میں تھیں اور خواب تھک گئے
☆منزہ فیاض......خانیوال
چبھتی ہے قلب و جاں کو ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے
☆رابعہ کامران......میاں چنوں
ختم ہونے کو ہیں اشکوں کے ذخیرے بھی جمال
روئے کب تک کوئی اس شہر کی ویرانی پر
☆انیلا عرفان......پشاور
یوں دل کے تڑپنے کا کچھ تو ہے سبب آخر
یا درد نے کروٹ لی یا تو نے اِدھر دیکھا
☆زینب زریں......سرگودھا
پھر اس کے بعد تمہیں اور کچھ نہ بھائے گا
ہمارے چہرے کو دیکھو کتاب رہنے دو
اب اپنی یاد کی خوشبو بھی ہم سے چھینو گے
کتابِ دل میں یہ سوکھا گلاب رہنے دو
☆سمیرا ظہور......بہاول پور
وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی
☆حفصہ عزیز......کراچی
یہ شرط ہے دستک ہو اگر دستِ یقیں سے
در چھوڑ کے دیوار بھی کھل جائے کہیں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں

کیری کی چٹنی

اشیا: آم، ڈیڑھ کلو۔ چینی، ایک کلو۔ پسا ہوا نمک، ایک چھٹانک۔ گرم مسالا، آدھی چھٹانک۔ سرخ مرچ، ایک تولہ۔ سرکہ، ایک پاؤ۔

ترکیب: چٹنی کے لیے کیری ایسی ہونی چاہیے جو کہ زیادہ پکی نہ ہوں اور نہ ہی زیادہ کچی۔ ان کو اچھی طرح دھو کر صاف اور خشک کرلیں پھر تیز چاقو سے چھیل کر باریک پھانکیں کاٹ لیں۔ ان کی گٹھلی نکال دیں۔ تراشی ہوئی پھانکوں میں چینی اور نمک اچھی طرح سے ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس طرح یہ پھانکیں کافی پانی چھوڑ دیں گی اور چینی اور نمک بالکل ان میں مل جائے گا۔ اب ان کو ہلکی آنچ پر رکھ کر پکنے دیں۔ تمام مسالا اور مرچیں ململ کی پوٹلی میں باندھ کر پکتی ہوئی آم کی پھانکوں میں ڈال دیں تاکہ ان کا اثر قوام میں چلا جائے۔ مسالا اور مرچ براہِ راست قوام میں ہرگز نہ ڈالیں کیونکہ ایسا کرنے سے چٹنی کی رنگت بدنما ہوجائے گی۔ جب آم کی پھانکیں اچھی طرح گل جائیں اور قوام گاڑھا ہوجائے تو اتارلیں۔ مسالے کی پوٹلی نکال دیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ٹھنڈی ہونے پر یہ چٹنی کسی چینی یا شیشے کے مرتبان میں ڈال کر رکھ دیں اور جب جی چاہے استعمال کریں۔ یہ چٹنی تین چار ماہ تک خراب نہیں ہوسکتی۔

شازیہ حنیف، کراچی

قیمہ بھرے کریلے

اشیا: قیمہ، ایک کلو۔ بڑے سائز کے کریلے، سوا کلو۔ مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ ٹماٹر، ایک پاؤ۔ ادرک، ایک چھوٹی گانٹھ۔ پیاز، ایک پاؤ۔ ہری مرچیں، دو عدد۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ گھی، ایک پاؤ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: قیمہ ابال کر اسے باریک پیس لیں۔ پیاز باریک کاٹ کر قیمے جیسی بنالیں۔ ادرک، ہری مرچیں، دھنیا اور ٹماٹر کو بھی باریک کاٹ لیں۔ گرم مسالا، سفید زیرہ باریک پیس لیں۔ کریلوں کی کڑواہٹ دور کریں۔ پسا ہوا اور کٹا ہوا سارا مسالا قیمے میں ملا دیں۔ یہ قیمہ کریلوں میں بھر دیں اور انہیں گھی میں دھیمی آنچ پر باری باری تلیں یہاں تک کہ خوب سرخ ہوجائیں۔ قیمہ بھرے مزیدار کریلے تیار ہیں۔

عذرا حمید، لاہور

فالسے کا شربت

اشیا: فالسے، پانچ سو گرام۔ چینی، سات سو گرام، پانی، ایک لیٹر۔

ترکیب: فالسے اچھی طرح صاف کریں اور تھوڑے سے پانی میں فالسے ڈال کر ہاتھوں کے ذریعے ملیں اور بیج الگ کرلیں۔ گودا ملا پانی گرائنڈر میں ڈال کر پتلا رس نکال لیں پھر اس میں بچا ہوا پانی اور چینی ملا کر پکائیں۔ جب گاڑھا ہونے لگے تو ایک تار کی چاشنی کی طرح کرلیں اور بوتل میں بھرلیں شدید گرمی اور لو میں انتہائی فرحت بخش ہے۔

سونیا عزیز، حیدرآباد

ستو اور پیاز کی سلاد

اشیا: بھنے ہوئے جو کا ستو، دو سو پچیس گرام۔ سفید پیاز باریک کٹی ہوئی، دو عدد۔ سرخ مرچ کتری ہوئی، ایک عدد۔ اجوائن کے تنے کترے ہوئے، ایک عدد۔ زیتون کا تیل، دو کھانے کے چمچ۔ لیموں کا رس، چار کھانے کے چمچ۔ سبز پیاز، چھ سے آٹھ کتری ہوئی۔ پودینہ باریک کٹا ہوا، چھ کھانے کے چمچ۔ پارسلی باریک کتری ہوئی، چھ کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سیاہ مرچ، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: جو کے ستو میں ٹھنڈا پانی ڈال کر تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ستو کو انتہائی باریک سوراخوں والی چھلنی میں ڈال کر رکھ دیں تاکہ سارا پانی نکل جائے بچے کھچے پانی کو چمچ سے دبا کر نکال دیں۔ سفید پیاز کو باریک کاٹ لیں پھر تمام اجزا کو بڑے پیالے میں ڈالیں اور چمچ کی مدد سے اچھی طرح مکس کرلیں۔ اس کے ساتھ ہی اس میں حسبِ ذائقہ نمک اور سیاہ مرچ بھی چھڑک لیں اچھی طرح مکس کرنے کے بعد تیس منٹ کے لیے رکھ دی تاکہ تمام اجزا کا ذائقہ اچھی طرح مکس ہوجائے نارمل یا ٹھنڈی کرکے پیش کریں۔

خالدہ نسیم، گوجرانوالہ

قیمے کی کچوریاں

اشیا: قیمہ (بغیر چربی والا)، آدھا کلو۔ پیاز، دو عدد (آملیٹ کی طرح کاٹ لیں)۔ ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا، ایک گٹھی۔ ہری مرچ باریک کٹی ہوئی، تین عدد۔ ادرک اور لہسن پسا ہوا، ایک کھانے کا چمچ۔ لال مرچ پسی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ کالی مرچ پسی ہوئی، آدھا چائے کا چمچ۔ گرم مسالا پسا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ لیموں، دو عدد۔ تیل، حسبِ ضرورت۔ آٹا، آدھا کلو۔ کھانے کا سوڈا، آدھا چائے کا چمچ۔ اجوائن، تھوڑی سی۔

ترکیب: سب سے پہلے آٹے میں اجوائن، نمک اور سوڈا ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں اور گیلے کپڑے سے ڈھانک کر تقریباً آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں تیل ڈال کر قیمہ ڈال دیں ساتھ ہی ادرک، لہسن اور نمک، مرچ بھی ڈال دیں اور اچھی طرح بھون لیں۔ پانی خشک ہوجائے تو پیاز، ہری مرچ، ہرا دھنیا اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں اور ٹھنڈا ہونے دیں۔ اب آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنالیں پھر پیڑے کو پھیلا لیں۔ اس میں تھوڑا سا قیمہ بھریں اور چاروں طرف سے بند کردیں، ذرا سا دبا کر کچوری کی طرح پھیلا لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ جب تیل اچھی طرح گرم ہوجائے تو آنچ ہلکی کرلیں اور کچوریاں تلنا شروع کردیں۔ کسی اخبار یا ٹشو پر نکالتی جائیں تاکہ تیل جذب ہوجائے۔ پودینے کی میٹھی چٹنی اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

عائزہ بیگ، کراچی

نیپالی رول

اشیا: مرغی، ڈیڑھ کلو۔ آلو بڑے سائز کے، دو عدد۔ انڈے، چار عدد۔ پیاز درمیانی سائز کی، ایک عدد۔ ڈبل روٹی کے سلائس بڑے، بیس عدد۔ کالی مرچ پسی ہوئی، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ مکھن، آدھی پیالی۔ ہرا دھنیا، آدھی گٹھی۔ پودینہ، آدھی گٹھی۔ ہری مرچ، دس عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: مرغی، آلو اور انڈے ابال لیں۔ گوشت کے باریک ریشے کرلیں۔ آلو چھیل کر میش کرکے گوشت میں شامل کریں۔ انڈوں کے باریک ٹکڑے کرکے انہیں بھی شامل کرلیں۔ پیاز باریک کاٹ کر ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ بھی باریک کاٹ کر شامل کریں۔ اب اس میں مکھن اور کالی مرچ شامل کریں۔ ڈبل روٹی کے سلائس کا براؤن حصہ علیحدہ کرلیں۔ اب ایک پیالی میں پانی لیں اور ہلکے ہاتھ سے سلائس پر لگائیں۔ درمیان میں آمیزہ رکھ کر رول کی شکل بنالیں۔ اب ان سب کو کم از کم ایک گھنٹا فریج میں رکھیں پھر فریج سے نکال کر درمیانی آنچ پر تل لیں۔ رائتے کے ساتھ نوش فرمائیں۔

نائمہ طارق، کراچی

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

روحانی مشورے

ادارہ

عزیز قارئین پاکیزہ! السلام علیکم

آپ سب کو ماہِ رمضان مبارک ہو۔ دلی دعا ہے کہ یہ مقدس مہینہ خیروعافیت کے ساتھ گزرے اور ہم سب کو نیکیاں کرنے پر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا موقع ملے اور ہم پوری زکوٰۃ ادا کریں (اللہ تعالیٰ اس کی توفیق بھی دے) اور ہمارے دیگر اعمال بھی ایسے رہیں جو اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہیں اور ہم سب یہ پختہ ارادہ کرلیں کہ اس ماہ رمضان میں بے حساب عبادت کریں گے اور بے انتہا ثواب کمانے کی کوشش کریں گے۔ تلاوت اور نوافل کا اہتمام تو کریں گے ہی ساتھ ہی روزانہ دو نفل توبہ کے کسی بھی وقت پڑھیں گے اور دو نفل شکرانے کے بھی۔ سحری کرنے سے قبل تہجد کے نفل پڑھیں گے جو کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ کہیں چھ لکھے ہوئے ہیں اور کہیں آٹھ۔ بہت سی بہنوں نے ہم سے پوچھا ہے کہ ماہِ رمضان میں کیا پڑھیں تو اس کے لیے یہ کہنا ہے کہ آپ پہلا کلمہ، تیسرا کلمہ، استغفار اور درود شریف کثرت سے پڑھیں اور لوگوں کو بھی بتائیں اور اپنی دعاؤں میں اپنی اس آپا اور اس کی فیملی، ادارہ پاکیزہ کے تمام اراکین، تمام مصنفات اور تمام قارئین پاکیزہ اور سب مسلمانوں کو یاد رکھیں۔

یاد رکھیے ہماری جانب سے کسی کے لیے بھی یہ بہترین تحفہ ہوتا ہے کہ اس کو آپ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور آپ کی یہ بہن آپ کے ان تحفوں کی شدت سے منتظر رہے گی کہ کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کس کی دعا کس کو اور کب لگ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو روزے رکھنے کی سعادت عطا فرمائے اور ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو جن کے روزے قبول کرلیے گئے ہیں (آمین)

رمضان المبارک کا چاند

رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر بسم اللہ پڑھ کر ایک مرتبہ درودِ ابراہیمیؑ پڑھیں اور پھر رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر 133 مرتبہ یہ دعا پڑھیں۔

ذلک فضل اللہ یو تیہ من شیاء و اللہ ذو الفضل العظیم0

(پارہ ۲۸، سورۂ جمعہ)

نوٹ☜ پڑھ کر ہاتھوں پر دم کر کے چہرے پر پھیرلیں اور پانی پر دم کر کے پی لیں۔

رمضان المبارک کی پہلی شب

رمضان المبارک کی پہلی شب عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد تین مرتبہ سورۂ فتح پڑھنا بہت افضل ہے۔

رمضان المبارک کی ہر شب

پہلی شب سے آخری شب تک ایک تسبیح پہلے کلمے کی، ایک تسبیح استغفار کی روزانہ یاد سے پڑھیں۔

روزانہ سحری کے وقت

ماہِ رمضان کی ہر شب بعد نمازِ تہجد آسمان کی طرف منہ کر کے بارہ مرتبہ یہ دعا پڑھیں، بہت افضل ہے۔

لاالہ الا اللہ الحی القیوم القائم علی کل نفس بما کسبت۔

روزے کا کفارہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جس نے بغیر عذر کے رمضان کا ایک بھی روزہ چھوڑ دیا اس کے بدلے زمانے بھر کے روزے بھی کافی نہیں ہوں گے۔“

روزہ کھولنے میں جلدی کرنا

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔“

(بخاری شریف)

ماہِ رمضان میں دعا کی قبولیت کا وقت

قبولیتِ دعا کی خصوصی گھڑی رمضان المبارک کی ہر شب آتی ہے لیکن شب قدر میں اس گھڑی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے، اس کی شان اور تاثیر ہی جدا ہوتی ہے۔ وہ گھڑی نہ معلوم کون سی ہو اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو ایک مختصر مگر بہت جامع دعا سکھائی تھی۔ جو اس رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کثرت سے پڑھتے تھے۔ اس لیے اس دعا کو ہم سب کو بھی کثرت سے یعنی بہت زیادہ پڑھنا چاہیے۔

اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی (ترمذی)

آپ یہ دعا اردو میں بھی مانگ سکتے ہیں۔ اس دعا کا ترجمہ یہ ہے۔ جو آپ ہر نماز کے بعد بطورِ دعا مانگ سکتے ہیں۔ ”اے اللہ تو بہت معاف کرنے والا ہے، معاف کرنے کو پسند کرتا ہے پس مجھے معاف کردے۔“

کیا آپ جانتے ہیں

☆ لاالہ الااللہ کا اقرار جنت میں جانے کا سبب ہے۔ (مسلم)

☆ لاالہ الااللہ صرف ایک مرتبہ کہنے سے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے اور ہم سب نے اس رمضان میں اپنے لیے اپنے خاندان کے لیے بڑے بڑے باغ بنانے ہیں۔ اس لیے پہلا کلمہ ہمہ وقت پڑھنے کی عادت ڈالیے۔

☆ جو کام بسم اللہ پڑھ کر کیے جائیں وہ شیاطین اور جنات کے شر اور فتنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

☆ کثرت سے استغفار پڑھنے والے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری دی ہے کہ وہ جنتی ہے۔

☆ اذانیں دینے والے قیامت کے دن لمبی گردنوں والے (سب سے نمایاں طور پر) ہوں گے۔ (مسلم)

چند عظیم تحفے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے روزانہ ایک مرتبہ سبحان...... درج ذیل پڑھا تو وہ شخص موت سے پہلے اپنا ٹھکانا جنت میں دیکھ لے گا یا کسی کو دکھا دیا جائے گا۔

(روایت حضرت انسؓ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
سُبْحَانَ الْقَائِمِ الدَّائِمِ ط
سُبْحَانَ الْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ط
سُبْحَانَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ ط سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ ط سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰئِکَۃِ وَالرُّوْحِ ط سُبْحَانَ الْعَلِیِّ الْاَعْلٰی ط سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی ط (ایک بار)

۲۔ دو مختصر درود شریف ان حضرات کے لیے جو کثرت سے درود پڑھنا چاہتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلِّمْ ط

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس درود کو بیٹھ کر پڑھے تو کھڑے ہونے سے پہلے بخشا جاتا ہے جو کھڑے ہو کر پڑھے وہ بیٹھنے سے پہلے بخشا جاتا ہے۔

☆☆☆

شوابے ہومیو کلینک

from Nature for Health

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

ماہانہ نظام کی خرابی

مجھے تیرہ سال کی عمر میں مینسز شروع ہوئے، دو تین ماہ لگاتار مینسز آئے پھر سال کے لیے بند ہوگئے پھر دوبارہ مینسز شروع ہوئے تو کبھی تین ماہ بعد کبھی چار ماہ بعد اسی طرح دو سال سسٹم رہا پھر اب ڈیڑھ سال سے مینسز بالکل بند ہوگئے ہیں، سال بھر سے میں نے کوئی دوا نہیں کھائی، پھر اب چار ماہ سے لگاتار فرانس ہی کے ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوا لے رہی ہوں۔ لیکن مینسز نہیں آئے سخت پریشان ہوں۔ خون ٹیسٹ کروایا رپورٹ بالکل ٹھیک ہے۔ ڈر سے انگلش دوا نہیں لے رہی کہ زیادہ خرابی نہ ہوجائے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے پاکیزہ میں جواب دیں کہ میں مینسز کے لیے کون سی دوا کھاؤں۔

زارا فرانس

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb 200، ایک خوراک یعنی 5 قطرے ½ کپ پانی میں ہفتہ میں ایک مرتبہ لیں Pulsatilla 30 اور Ferr.Pho3x کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

ستمبر 2012

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ....

پتا: ....

یادداشت

میں پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں۔ میرے شوہر سپنس ڈائجسٹ اور میں پاکیزہ پڑھتی ہوں۔ پڑھنے کا شوق ہے لکھنے کا نہیں اس لیے اس کے کسی سلسلے میں کبھی نہیں لکھا۔ مئی کے پاکیزہ میں پڑھا کہ ادارہ پاکیزہ نے شوابے ہومیو کلینک کے نام سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے تو ...... خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ میرے تین بیٹے ہیں، بڑا بیٹا عمر 13 سال چھوٹا عمر 10 سال سب سے چھوٹا 7 سال

کا ہے۔ درمیان والا بیٹا ٹھیک ہے لیکن بڑے اور چھوٹے بیٹے کا حافظہ کمزور ہے۔ جو سبق یا کام یاد کرواتی ہوں کچھ دنوں بعد بھول جاتے ہیں۔ اپریل کے پاکیزہ میں آنٹی انجم نے ایک آیت بھی بتائی تھی میں وہ بھی پڑھ کر دم کررہی ہوں اگر شوابے والوں کی کوئی دوائی ہے تو ضرور بتادیں۔ یادداشت کے لیے میں کریٹکس ٹیبلیٹ استعمال کرنا چاہتی ہوں، میری عمر 35 سال ہے کیا میں یہ دوا استعمال کرسکتی ہوں، بچوں کو استعمال کراسکتی ہوں کہ نہیں کیونکہ کوئی بھی دوا استعمال کرتے اور کراتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کچھ ہو نہ جائے ویسے بچے صحت مند اور ایکٹو ہیں مجھے بھی کوئی بیماری نہیں ہے میں گھر میں رہتی ہوں باہر جاکر کوئی نوکری وغیرہ نہیں کرتی ہوں۔

(مسز فرحت تنویر کراچی)

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی کریٹکس ایک بہترین دوا ہے بالکل خود بھی استعمال کریں بچوں کو بھی کراسکتی ہیں۔

جگر کی خرابی

ڈاکٹر صاحب آپ نے میرا نسخہ تجویز کیا تھا ستمبر کے شمارے میں یہ دوائیاں (kali bromide-30 اور (Pkt.45) تب سے اب تک میں یہ دوائیاں استعمال کررہی ہوں۔ شروع میں کچھ افاقہ ہوا اور بعد میں حالت پہلے جیسی ہوگئی۔ آپ نے خون کی کمی کے لیے یہ گولیاں بتائی تھیں۔ جب تک استعمال کروں فرق نظر آتا ہے اور چھوڑتے ہی حالت پہلے جیسی ہوجاتی ہے۔ بچپن میں یرقان ہوا تھا جس کا اثر جگر پر ہوا اور جگر نے خون بنانا بند کردیا۔ رنگت زرد رہتی ہے اور ہاتھ پاؤں سن۔ آپ کی تجویز کردہ دوائیاں میں اب تک استعمال کررہی ہوں۔

میرا رنگ سانولہ یا کالا نہیں کافی حد تک صاف ہے لیکن اب سانولے سے بھی زیادہ خراب ہوگیا ہے، ہر آنے والے دن میں صحت گرتی جارہی ہے۔ میں چائے کا استعمال بھی زیادہ کرتی ہوں اور اس وقت میری عمر 23 سال ہے، چہرے پر رونق بالکل نہیں بالکل مرجھایا ہوا لگتا ہے۔

SCHWABE

تقریباً 4 سال پہلے میری آنکھوں کے نیچے سفید رنگ کی باریک پھنسیاں نکلی تھیں تو اسکن کے ڈاکٹر سے علاج کروایا، ڈاکٹر نے اتنی سخت دوائیاں دیں کہ پھنسیاں تو ختم نہیں ہوئیں بلکہ پورے جسم پر دانے نکل آئے یعنی الرجی ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب اس کے بعد تو دوائیوں کا سلسلہ چل پڑا، جتنے بھی مشہور ڈاکٹر تھے سب سے علاج کروایا لیکن مسئلہ اب بھی وہی ہے۔ اب جسم پر ہر طرح کے دانے ہیں پھنسیاں اور پیپ والے دانے لیکن یہ دانے اتنے سخت ہیں کہ ان سے مواد نکلتا نہیں۔ پورے جسم میں ان کی وجہ سے درد رہتا ہے رات کو سونے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ پورے جسم پر خود بخود کھرنڈ سے بن جاتے ہیں جیسے دانے چھیلے گئے ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان دوائیوں سے پیشاب کا مسئلہ بھی ہوگیا ہے۔ ہر وقت قطرہ قطرہ پیشاب گرنے سے کپڑے ناپاک رہتے ہیں اور لیکوریا بھی بہت زیادہ ہے ہر وقت کپڑوں سے گندی بو آتی ہے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ پیریڈ کا ہے، دانے نکلنے پیریڈ کی خرابی کے بعد شروع ہوئے۔ ان کا کوئی ٹائم نہیں کبھی مہینے میں 2 سے 3 دفعہ اور کبھی ڈیڑھ مہینے تک نہیں ہوتے۔ پیریڈ کے دوران بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے تقریباً ہر دفعہ بخار اور الٹیاں اس کے ساتھ ہی شروع ہوجاتی ہیں۔ تکلیف اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جب تک کوئی پین کلر نہ لو آرام نہیں آتا اور ہر دفعہ پین کلر لینے سے اسکن پر الرجی ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب دوائیوں کی وجہ سے میرے بال بھی بہت خراب ہوگئے ہیں۔ بالکل بے رونق اور اتنے کمزور کہ ہاتھ لگاتے ہی ٹوٹنے لگتے ہیں۔ زیادہ تو جڑ سے نکل آتے ہیں۔ جب دیکھو کپڑوں پر اور تکیے پر بال پڑے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے دوا ضرور بتائیں۔ ایلوپیتھی دوائیاں میرے جسم کو نہیں لگتیں، پیریڈ کے دنوں میں مجھے لینی پڑتی ہیں اس سے میرے جسم پر الرجی زیادہ ہوجاتی ہے۔ پورے چہرے گردن اور چھاتی پر بے تحاشا دانے

اورکالے داغ ہیں۔ میرے لیے کوئی اچھا نسخہ تجویز کریں۔
ڈاکٹر صاحب پرہیز ضرور بتائیے گا، ہوسکے تو غذائی چارٹ بنادیں کہ مجھے کس قسم کی خوراک لینی چاہیے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

(نائلہ حسن گجرات)

جواب: آپ کا علاج کرانے کا طریقہ صحیح نہیں، کبھی کوئی سی دوا کبھی کوئی سی پھر باقاعدگی نہیں۔ اصل خرابی کیا ہے اور کس وجہ سے یہ مختلف کیفیات جنم لے رہی ہیں اس کے لیے بالمشافہ ڈاکٹر سے ملاقات کریں جن پیتھالوجیکل رپورٹس کی ضرورت ہو وہ کرائیں فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Sul-1M کی ایک خوراک 5 قطرے ایک دفعہ لے کر 2 دن بعد Ferr Phos30 Chelidonium 30 Pulsatilla 30 کے 5، 5 قطرے دن 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ کھانے میں مرغن مصالحے دار اور ٹھنڈی، کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔

چہرے کی رنگت نکھر جائے

میری عمر بیس سال ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رنگ سانولا ہے، چہرے اور جسم پر بہت زیادہ بال ہیں اس کے ساتھ چہرے پر کیل بھی نکلتی ہیں جب انہیں نکالوں تو نشان چھوڑ جاتی ہیں۔ چہرے پر بال کی وجہ سے چہرہ بہت برا لگتا ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوا تجویز کریں جس سے میرا مسئلہ حل ہوجائے۔

شازیہ بہاولنگر

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا- Sar saprilla30، Oleumjec30 اور Calc sul30 کے 5،5 قطرے ½ کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں ہمارا فیس واش فیرنس لوشن استعمال کریں۔

یوٹرس میں رسولیاں

ڈاکٹر صاحب! میری عمر 35 سال ہے۔ میری شادی کو نو سال گزر چکے ہیں اولاد نہیں ہے بقول ڈاکٹر کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں ہے جو اولاد کے سلسلے میں روکاوٹ بن سکے۔ کہتے ہیں کہ رسولیاں بن رہی ہیں جن کے دو آپریشن پہلے بھی کراچکی ہوں ایک 2003 میں اور دوسرا 2008 میں اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے لیے علاج کراچکے ہیں جو کہ ناکام ہوا ماہواری کے دنوں میں جسم میں درد اور بے چینی، پاؤں میں ٹھنڈے پسینے آنا، چکر آنا اور ماہواری بہت زیادہ آتی ہے۔ عام دنوں میں پیٹ کے اگلے حصے میں درد اکثر رہتا ہے جس ڈاکٹر سے اب چیک اور رپورٹس کرائی وہ کہتے ہیں آپ پھر سے آپریشن کرالیں، جبکہ میں اب آپریشن کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی، آپ جو دوائی وغیرہ دیتے ہیں وہ یا اپنا نسخہ مجھے دیں تاکہ میں عملِ جراحی سے بچ سکوں۔ اولاد دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن یہ مسائل تو جان چھوڑیں۔

جواب: محترمہ آپ نے اب تک علاج صحیح طور کرایا ہی نہیں رسولیاں ابھی یوٹرس میں موجود ہیں تو پھر اولاد کیسے ہوگی۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی Pulsatilla1M کی خوراک لے کر ایک دن بعد Calc iod30 کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں اور ایک ماہ بعد الٹراساؤنڈ کراکر رپورٹ کریں۔ ہر قسم کا گوشت اور تیز مرچ مصالحے بالکل استعمال نہ کریں، فروٹ اور سبزیاں خوب کھائیں۔

چہرے پر بال

صورتِ حال یہ ہے کہ میری ایک بیٹی کی عمر 14 سال ہے۔ اس کو دو سال سے ماہانہ ایام شروع ہوچکے ہیں۔ لیکن پہلی بار کے بعد چار ماہ بعد آئے اس کے بعد مستقل کبھی تین ماہ بعد کبھی چار ماہ بعد ہی آتے ہیں اور اب تو تقریباً دوائی کے بغیر آتے ہی نہیں۔ بچی کے چہرے اور گردن پر بال بڑھ رہے ہیں۔ شروع میں بچپن میں بالکل نہیں تھے دس سال سے بال ہلکی روئیدگی کی صورت میں پیدا ہوگئے اب بہت بڑھ گئے ہیں...... سر کے بال کان کے گرد سے ہوکر آپس میں ملے رہتے ہیں۔ بچی بہت زیادہ محسوس کرتی ہے بچی کی ٹانگوں پر سخت کھردرے اور سیاہ بال ہیں جس کی وجہ سے بڑی پریشان ہے۔ مہربانی فرماکر دوا لکھ کردیں۔

فقط والسلام مسز سعدیہ شبنم

جواب: Pulsatilla 200 ایک خوراک ہر ہفتہ اور Oleum jec 3x کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ دیں دوائیں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ہونی چاہئیں۔ 3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

صاف سفید، چمکدار دانت صرف آپ کی خوبصورتی ہی نہیں صحت کی بھی ضمانت ہیں مائیں بچوں کو دانت صاف کرنے اور برش استعمال کرنے کا طریقہ بتائیں

سمندر کی گہرائیوں میں پائے جانے والے سیپیوں میں پوشیدہ، چمکدار سفید موتیوں جیسے دانت مسکراہٹ کی دل کشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ہر کوئی خوب صورت سفید موتیوں جیسے دانتوں کا مالک نہیں ہوتا لیکن ایسے دانتوں کی خواہش ہر ایک رکھتا ہے۔ ماضی میں جس بچے کے دانت ٹیڑھے میڑھے اور پیلے ہوتے، مائیں افسوس کے سوا کچھ نہ کرتیں، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے بچوں نے جب شعور کی منزل پر قدم رکھا ہوگا، ہنستے مسکراتے وقت ان کی نگاہ اتفاقاً آئینے کی طرف اٹھتی ہوگی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتے ہوں گے، بالکل اسی طرح جس طرح مور اپنے پیر کو دیکھ کر شرماتا ہے۔ اگر مائیں بچوں کے دانتوں کا بچپن سے خیال رکھیں، انہیں ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کا صحیح طریقہ بتائیں، ایسی چیزیں کھانے سے باز رکھیں، جن سے دانت کالے، بدرنگ اور خراب ہوجاتے ہیں۔ ہر کھانے کے بعد دانت صاف کرنے کی ترغیب دیں تو خراب سے خراب دانت بھی صاف ہوسکتے ہیں۔

دانتوں کی بقا اور صحت کے لیے ٹوتھ برش کا استعمال ضروری ہے۔ اس کے ریشے مسوڑھوں اور دانتوں کی ریخوں میں جمی ہوئی کثافت کو ختم کردیتے ہیں اور کیڑوں سے محفوظ رکھتے ہیں، خاص طور پر رات کے کھانے کے بعد برش ضرور کرنا چاہیے۔ بچوں کے دانت نکلنے کے بعد مائیں چھوٹے ٹوتھ برش میں معمولی سا پیسٹ لے کر خود سے ان کے دانت صاف کریں۔ بچے سمجھ دار ہوجائیں تو انہیں تصویر سے یا خود اپنے دانت برش سے صاف کرکے بتائیں کہ روزانہ کھانے کے بعد میرے بتائے ہوئے طریقے سے دانت صاف کریں۔ بہت سے بچے ٹوتھ پیسٹ کھالیتے ہیں۔ انہیں ایسا کرنے سے منع کریں اور خود ٹیشو پیپر سے ان کی زبان پر لگا ہوا پیسٹ فوری صاف کردیں۔ ٹوتھ پیسٹ ہر ماہ تبدیل کریں۔ تاکہ زبان کے وہ خلیے جو ذائقہ دار ہوتے ہیں وہ ایک ذائقے کے عادی نہ ہونے پائیں۔ عموماً مائیں بچوں کی انگلی پر ٹوتھ پیسٹ لگاکر دانتوں کو صاف کرواتی ہیں، غالباً ان کو ڈر ہوتا ہے کہ ٹوتھ برش کرنے سے کہیں مسوڑھوں سے خون نہ نکلنے لگے۔ یہ طریقہ غلط اور دانتوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ کیونکہ برش کرنے سے خوراک کے ذرات دانتوں کی اندرونی اور بیرونی سطح سے نکل جاتے ہیں اور جراثیم نہیں ہوتے۔

ٹوتھ برش کرنے کے بعد چند فوائد

☆ مسوڑھے صحت مند رہتے ہیں۔
☆ چکناہٹ جمع نہیں ہوگی۔
☆ دانتوں کو کیڑا نہیں لگتا۔
☆ برش کرنے سے مسوڑھوں کی ورزش ہوتی ہے۔ خون گردش کرتا ہے۔ منہ کے امراض کو روکتا ہے اور منہ میں بدبو نہیں ہوتی۔

بچوں کو ٹوتھ برش کرنے کا طریقہ بتائیں

☆ اوپر والے جبڑے سے اوپر سے نیچے برش کریں۔
☆ نیچے والے جبڑے سے نیچے سے اوپر کی طرف برش کریں۔
☆ دانتوں کے اندرونی حصوں میں بھی اسی طرح برش کریں۔
☆ برش اس وقت تک ضرور کریں جب تک پیسٹ

سے جھاگ نہ نکلنے لگیں۔ جھاگ نکلنے کے بعد اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی جانب اور منہ کھول کر اندرونی حصوں میں آہستہ آہستہ برش کریں۔

تین سے چھ سال تک کے بچوں کے لیے ٹوتھ برش چھوٹے سائز کا لیں۔ ان سے بڑے بچوں کے لیے درمیانے سائز کا لیں۔ یہ نہ زیادہ سخت ہوں اور نہ زیادہ نرم۔ اگر برش کے ریشے نہ زیادہ نرم ہیں اور نہ لمبے اور نہ زیادہ چھوٹے یعنی ہر لحاظ سے اوسط درجے کا برش ہے اور مسوڑھوں سے برش کا رخ دانتوں کی طرف ہو تو دانت اچھی طرح صاف ہوں گے۔ اگر برش کرتے وقت مسوڑھوں سے خون نکلے تو پریشان نہ ہوں، عموماً بچے خون دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح کلیاں کرائیں۔

دانتوں کا جسمانی صحت سے گہرا ربط ہے۔ دانت جسم کا حصہ ہیں۔ خون کی باریک نالیوں سے دانتوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ دانت جبڑوں کی ہڈی میں پیوست ہوتے ہیں۔ ان کی نشوونما اچھی صحت پر مبنی ہے۔ اگر مسوڑھوں میں پیپ ہو تو اس کے جراثیم خون کی شریانوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور مختلف جگہوں میں داخل ہو کر جہاں مدافعت کم ہوتی ہے، بیماری کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک گیارہ سالہ بچے کی آنکھیں ایک سال سے سرخ تھیں۔ ماہر امراض چشم نے بچے کی آنکھوں کا معائنہ کیا، دوا دی لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا، بعد ازاں پتا چلا کہ بچے کے مسوڑھوں کے اندر پیپ ہے اور مسوڑھوں کے ساتھ پاکٹ بنی ہوئی ہے، لیکن بچے کے مسوڑھوں اور دانتوں میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بہرحال بچے کو دوا دی۔ مسوڑھوں کا آپریشن کیا گیا۔ چند دن میں آنکھوں کی سرخی ختم ہو گئی۔ اسی طرح ایک بارہ سالہ بچے کے کان میں درد مسوڑھوں میں پیپ کی وجہ سے تھا۔ ایک آٹھ سالہ بچے کو مسلسل ایک ڈیڑھ ماہ سے بخار تھا۔ معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس بچے کے چند دانتوں میں کیڑا لگا ہوا ہے۔ اس کا علاج کیا گیا، ساتھ ماں کو ہدایت کی گئی کہ بچے کو پابند کریں کہ وہ روزانہ کھانے کے فوراً بعد ٹوتھ برش ضرور کرے اور دن میں جس وقت میٹھا یا چاکلیٹ وغیرہ کھائے تو دانت ٹوتھ برش سے ضرور صاف کرے۔

پائیریا اور مسوڑھوں کے امراض سے نہ صرف دانت متاثر ہوتے ہیں بلکہ جسم میں کئی اور امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے بچنے کے طریقے یہ ہیں کہ بچوں کو تاکید کریں کہ وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے ٹوتھ برش ضرور کریں۔ اور اس کے بعد پانی کے علاوہ کوئی اور چیز کھانے پینے کی نہ لیں۔ ناشتا کرنے کے بعد پھر برش کریں۔ اسی طرح دوپہر اور رات کے کھانے کے بعد ضرور برش کریں۔ سوتے وقت میٹھی چیزیں ہرگز کھانے کو نہ دیں۔ اگر بچہ ضد کرے تو میٹھا کھانے کے بعد بچے کو ٹوتھ برش ضرور کرائیں۔ دانت گندے اور پیلے ہوں تو ٹوتھ برش پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر معمولی سا کھانے کا سوڈا اور چند لیموں کے قطرے ڈال کر دانت صاف کرائیں۔ یہ عمل ہفتے میں دو بار ضرور کریں۔ بچے کے دانت چمک دار اور صاف ہو جائیں گے۔

پیلے، گندے دانت شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ بچوں کو ان دانتوں کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ بچپن کی حدود پھلانگ چکے ہوتے ہیں۔ اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اگرچہ سائنسی ایجادات نے پیلے دانتوں کا مسئلہ کسی حد تک حل کر دیا ہے۔ مشینوں سے صفائی کر کے یا کیمیکل پیسٹ وغیرہ کے استعمال سے دانت موتیوں جیسے سفید اور چمک دار ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ کمزور بھی ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی ماں یہ ہرگز نہیں چاہے گی کہ اس کے بچے کے دانت کمزور ہوں۔ اس لیے بچوں کو ٹوتھ برش استعمال کرنے کی عادت ڈالیں اور اگر بچہ انگوٹھا چوستا ہے تو اس کی یہ عادت ختم کرائیں، کیونکہ انگوٹھا چوسنے کی وجہ سے سامنے کے دانتوں کی ہیئت بگڑ جاتی ہے۔ بچہ اسکول جائے تو ماؤتھ واش کے استعمال کی بھی عادت ڈالیں۔

Dr. Willmar Schwabe , Germany.
Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com